انسان کے اندر دو کمزوریاں بہت عام ہیں :
بھلانے کے قابل بات کو یاد رکھنا اور
یاد رکھنے کے قابل بات کو بھول جانا ۔

The Islamic Centre Publications
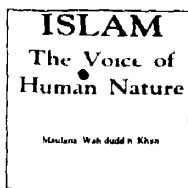
ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE
22×14.5cm 64 pages
ISBN 81 85063 74 5
Rs 30
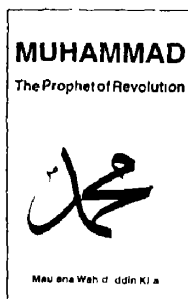
MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION
22×14.5cm 228 pages
ISBN 81 85063 00 1
Rs 85

GOD-ORIENTED LIFE
22×14.5cm 186 pages
ISBN 81 85063 97 4
Rs 70
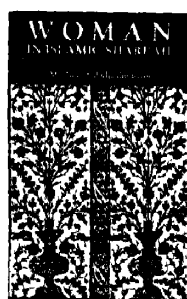
WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH
22×14.5cm 150 pages
Rs 65 (Paperback)
Rs 185 (Hardbound)
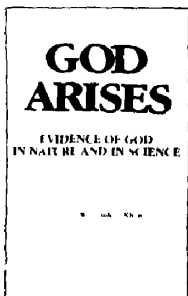
GOD ARISES
22×14.5cm 271 pages
ISBN 81 85063 14 1
Rs 85
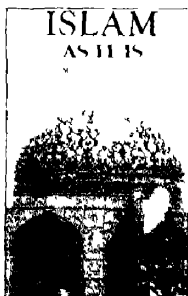
ISLAM AS IT IS
22×14.5cm 114 pages
ISBN 81 85063 95 8
Rs 55
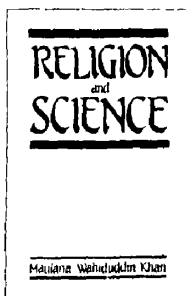
RELIGION AND SCIENCE
22×14.5cm 96 pages
Rs 45
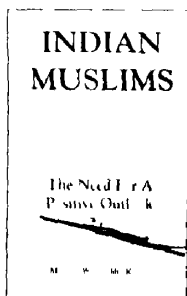
INDIAN MUSLIMS
22×14.5cm 192 pages
Rs 65 (Paperback)
Rs 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this Introduction to Islam series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way The complete series is as follows

1. The Way to Find God (20 pages Rs 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages Rs 15)
3. The Good Life (36 pages Rs 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages Rs 15)
5. The Fire of Hell (44 pages, Rs 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty five separate headings Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013 Tel 4611128 Fax 11-4697333

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

دور جدید کی نسبت سے فکر اسلامی کی تشریح وتوضیح وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہی وہ ابتدائی نکتہ ہے جہاں سے اسلام کی تجدید اور ملت مسلمہ کے احیاء نو کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ذیل کے مقالہ میں اسی اہم موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

تشکیل جدید کیا ہے

"فکر اسلامی کی تشکیل جدید" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے فکری اور عملی مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کا ایسا جواب فراہم کیا جائے جس میں ایک طرف اسلام کے روح اور مزاج کی مکمل رعایت شامل ہو، دوسری طرف وہ جدید تقاضوں کو پوری طرح سمیٹے ہوئے ہو۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر موجودہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا اور بولا گیا ہے۔ غالباً اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنے والے اور اس کی طرف توجہ دلانے والے سید جمال الدین افغانی (۹۷ - ۱۸۳۸) تھے۔ اسی طرح شیخ محمد عبدہ (مصر) سر سید احمد خان، سید امیر علی (انڈیا) اور نامق کمال (ترکی) وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے، ان سب لوگوں نے اسلام کی تعبیر نو کی کوشش کی۔ اس کا دو مقصد تھا۔ ایک یہ کہ جدید خیالات کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنا، اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو اطمینان دلانا کہ اسلام آج بھی ان کی رہنمائی کی اہلیت رکھتا ہے:

All undertook to reinterpret Islam with the dual purpose of accomodating modern ideas and outlooks within the framework of Islamic principles and at the same time ensuring to the Muslims that Islam was capable of a modern orientation. (9/924)

علامہ اقبال نے ۲۹ - ۱۹۲۸ کے درمیان مدراس، حیدر آباد، علی گڑھ میں چھ تفصیلی لکچر دیے تھے۔ یہ لکچر اصلاً اسی موضوع پر تھے۔ چنانچہ ان کا مجموعہ چھپا تو اس کا نام رکھا گیا ——— اسلام میں مذہبی افکار کی تنظیم جدید:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

مجمع البحوث الاسلامیہ (قاہرہ) کے زیر اہتمام خاص اسی موضوع پر ایک سے زیادہ بار سیمینار اور کانفرنس کا انعقاد ہو چکا ہے۔ عام طور پر ان کانفرنسوں کا عنوان تھا: الاجتہاد فی شریعۃ الاسلام۔ اس موضوع پر پہلی مؤتمر شوال ۱۳۸۳ (مارچ ۱۹۶۲) میں ازہر میں ہوئی۔

کویت میں حکومت کے تعاون سے ہر سال اعلیٰ پیمانہ پر ایک انٹرنیشنل سیمنار کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی مسلم شخصیتیں جمع ہوتی ہیں۔ اس سالانہ سیمنار کا موضوع ہوتا ہے: ندوۃ مستجدات الفکر الاسلامی۔ یعنی فکر اسلامی کے جدید پہلو۔

اسی طرح پروفیسر مشیر الحق مرحوم نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت دسمبر ۱۹۷۶ میں بڑے پیمانہ پر ایک سیمنار نئی دہلی میں کیا تھا۔ اس کا موضوع بھی عین یہی تھا۔ اس سیمنار میں منتخب علماء اور اہل فکر جمع ہوئے اور انھوں نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ان مقالات کا مجموعہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے نام سے مکتبہ جامعہ لیمٹڈ (نئی دہلی) کے تحت شائع ہو چکا ہے جو ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس قسم کی کوششیں بہت بڑے پیمانہ پر سارے عالم اسلام میں جاری ہیں۔ مگر کوششوں کی کثرت کے باوجود وہ ابھی تک نتیجہ خیز نہیں ہوئیں۔ ان کوششوں کا خاص مقصد یہ تھا کہ دور جدید کی نسبت سے مسلمانوں کو فکری اور عملی رہنمائی دی جائے۔ مگر یہ اہم ترین مقصد ابھی تک حاصل نہ ہو سکا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ایک مجتہدانہ عمل ہے۔ اس کے لیے ایک اعلیٰ اجتہادی کوشش درکار ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، چوتھی صدی ہجری کے بعد سے مسلم دنیا میں ذہنی جمود کی ایسی فضا چھائی ہوئی ہے کہ کوئی بھی شخص اجتہاد کی ہمت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اجتہاد کی اہمیت

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ حقیقۃً مسائل حاضرہ کے مقابلہ میں اجتہاد جدید کا مسئلہ ہے۔ چوں کہ موجودہ زمانہ کے علماء اجتہاد کے لیے تیار نہیں، اس لیے وہ ابھی تک فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا کام بھی نہ کر سکے۔ حالاں کہ اسلام میں اجتہاد کو جاری رکھنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں مسلمانوں کی غیر معمولی ہمت افزائی کی گئی ہے۔

صحیح البخاری (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) اور صحیح مسلم (کتاب الاقضیۃ) میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حاکم فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے، اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہے۔ اور جب وہ فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے پھر وہ غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے (اذا حکمَ الحاکمُ فاجتہدَ ثم اصابَ فلہ اجران۔ و اذا حکمَ فاجتہدَ ثم اخطأ فلہ اجر)

ابن حجر العسقلانی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے شخص کے لیے دو اجر ہے، کوشش کا اور درستگی کا۔ اور دوسرے شخص کے لیے صرف کوشش کا اجر ہے (فالاول لہ اجران، اجر الاجتہاد واجر الاصابۃ والآخر لہ اجر الاجتہاد فقط) فتح الباری ۱۳/۳۳۱

اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد اسلام میں اتنا زیادہ مطلوب ہے کہ اس میں غلطی کرنے پر بھی ثواب رکھ دیا گیا ہے، بشرطیکہ اجتہاد کرنے والے کی نیت درست ہو۔ اس حدیث کے مطابق، اجتہاد کا عمل کسی حال میں روکا نہیں جائے گا، خواہ اس کے لیے رسک لینا پڑے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد لوگوں نے اس اندیشہ کی بنا پر اجتہاد کو ترک کر دیا کہ کہیں ہم سے غلطی نہ ہو جائے، جب کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ غلطی کا اندیشہ ہو تب بھی تم اجتہاد کا عمل جاری رکھنا۔

اس کا سبب اجتہاد کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا نظام اجتہاد کے بغیر چل نہیں سکتا۔ جہاں اجتہاد نہیں ہوگا وہاں جمود ہوگا۔ اور ذہنی جمود درحقیقت ذہنی موت ہے جس کے بعد حقیقی ترقی کا کوئی امکان نہیں۔

اجتہاد مطلق، اجتہاد مقید

اجتہاد کیا ہے۔ لغت میں اجتہاد کے معنی ہیں انتہائی کوشش کرنا۔ اصولِ فقہ کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ ممکنہ سعی وکوشش ہے جو کسی معاملہ میں شریعت کا حکم جاننے کے لیے صرف کی جائے (استفراغ الوسع فی معرفۃ الحکم الشرعی فی أمر معین)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ قدیم ائمہ مجتہدین نے جو علمی میراث چھوڑی ہے وہ ہمیشہ کے لیے کافی ہے، اب کسی کو اجتہاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر محقق علماء نے ہمیشہ اس کے برعکس موقف اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ خود وہ ائمہ بھی جن کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند سمجھا

جاتا ہے۔ اس بات پر شدت سے زور دیتے رہے ہیں کہ علما کو کسی ایک کا مقلد بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ نئے حالات اور نئے تقاضوں کا حل براہ راست قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔

علامہ شاطبی نے اپنی کتاب الموافقات (جلد چہارم) میں اجتہاد کی بحث کے تحت لکھا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی۔ کیوں کہ انسان قیامت تک اس بات کا مکلف ہے کہ شریعت پر چلے۔ لیکن شریعت ہمیں کلی اصول فراہم کرتی ہے۔ وہ جزئی تفصیلات سے بہت کم بحث کرتی ہے۔ جب کہ زندگی کے حالات اور تقاضے وقت کے ساتھ ساتھ مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ جب اصول شریعت محدود ہیں اور بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کی کوئی حد نہیں، تو شریعت پر عمل کیسے ممکن ہوگا۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے تاکہ شرعی اصولوں کی مزید توسیع یا از سر نو تشریح کر کے مختلف حالات اور تقاضوں کی نسبت سے ہم اپنا موقف متعین کر سکیں۔

خالص فنی اعتبار سے اجتہاد کی بہت سی قسمیں کی جاتی ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجتہاد مطلق، دوسرے اجتہاد مقید۔

اجتہاد مطلق اور اجتہاد مقید کی جو تعریفیں اصول فقہ کی کتابوں میں درج ہیں، اگر ہم ان کا خلاصہ آج کے انسان کی قابل فہم زبان میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہوگا کہ اجتہاد مطلق کا تعلق ایسے مسئلہ سے ہے جو اپنی نوعیت میں بالکل نیا ہو۔ جس کے لیے سابق میں کوئی نظیر موجود نہ ہو جس پر قیاس کرتے ہوئے شریعت کا حکم متعین کیا جا سکے۔ ایسی حالت میں مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ روح اسلام کو رہنما بنا کر یہ فیصلہ کرے کہ پیش نظر مسئلہ میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے برعکس اجتہاد مقید کا تعلق ایسے مسئلہ سے ہے جو بالکل نیا نہ ہو، بلکہ اس کی کوئی نظیر سابق میں پائی جاتی ہو۔ ایسی حالت میں مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ سابقہ عملی نظیر کو سامنے رکھتے ہوئے پیش آمدہ صورت حال پر شریعت کے حکم کا انطباق کرے۔ گویا اجتہاد مطلق میں اصل رہنما روح اسلام ہوتی ہے اور اجتہاد مقید میں اصل رہنما کوئی عملی نظیر۔

اجتہاد مطلق کی ایک مثال حکومت وقت کے خلاف خروج کی حرمت کا مسئلہ ہے جس کے بارے میں واقعۂ کربلا سے پہلے کوئی مماثل واقعہ تاریخ اسلام میں نہیں ملتا۔ چنانچہ علما نے قائم شدہ

حکومت، خواہ وہ ظالم ہو، کے خلاف خروج کی حرمت کا جو متفقہ فتویٰ دیا اسے اجتہاد مطلق کی تاریخی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں محض روح اسلام کو رہنما بنا کر ایک عملی موقف متعین کیا گیا۔ علامہ ابن کثیر نے حسین اور یزید کے معاملہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یزید اگرچہ ایک فاسق امام تھا۔ لیکن امام اگر فاسق ہو تو محض فسق کی بنا پر اس کو معزول نہیں کیا جائے گا، بلکہ علماء کے صحیح قول کے مطابق، اس کے خلاف خروج (بغاوت) کرنا جائز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں فساد اور بدامنی اور خوں ریزی اور لوٹ مار اور عورتوں کی آبرو ریزی جیسے سنگین واقعات پیش آتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی برائی اور سنگینی امام کے فسق و فجور سے کئی گنا زیادہ ہے :

والامام اِذا فسق لا یُعزل بمجرد فسقہ علی اصح قولی العلماء۔ بل ولا یجوز الخروج علیہ لما فی ذلک من اثارۃ الفتنۃ ووقوع الھرج وسفک الدماء الحرام ونھب الاموال وفعل الفواحش مع النساء وغیرھن وغیر ذلک مما کل واحدۃ فیھا من الفساد اضعاف فسقہ کما جری مما تقدم اِلی یومنا ھذا (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۸/۲۴-۲۲۳)

حدیث میں ایک طرف امام جائر کے سامنے حق بات کہنے کو افضل جہاد کہا گیا ہے اور ایسے مجاہد کو اگر امام قتل کر دے تو وہ افضل الشہداء قرار پائے گا۔ ایسی حالت میں فاسق امام کے خلاف خروج کی حرمت کا فتویٰ بظاہر مذکورہ حدیث سے متعارض معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل یہاں علماء نے اسلام کی دائمی اسپرٹ کو ملحوظ رکھ کر اجتہاد کیا۔ وہ یہ کہ اجتماعی معاملات میں اصل فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ کسی اقدام کے نتیجہ میں منفعت اور مضرت کا تناسب کیا ہوگا۔ اگر ایک عمل کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو تو فی نفسہٖ جائز ہوتے ہوئے بھی وہ عمل ناجائز ہو جائے گا۔ یہ اصول انفرادی معاملات میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے مثلاً شراب اور جوا کی حرمت کا ایک سبب یہ بیان کیا گیا کہ ان کا نقصان ان کے فائدہ سے بڑا ہے (البقرہ ۲۱۹) تاہم اجتماعی امور میں یہ اصول زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے گا۔ اسی بات کو اصول فقہ کی زبان میں ترک المصلحۃ للمفسدۃ کہا گیا ہے۔

اجتہاد مقید کی وضاحت کے لیے استعانت بالکفار یا غیر مسلموں کے ساتھ موالات (تعاون) کا مسئلہ بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ تحریکِ آزادی کو موثر بنانے کے لیے اس صدی کے اوائل میں جب

ہمارے علمار نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقے متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑ سکیں، اس وقت ایک طبقہ نے علمار کے اس موقف پر سخت تنقید کی۔ حتیٰ کہ اس بنیاد پر کفر کے فتوے بھی صادر کیے گئے۔ ان صاحبان کی نظر اس آیت پر تھی جس میں اہل اسلام کو غیر مسلموں کے ساتھ دوستی اور تعاون سے منع کیا گیا ہے۔ علمار بلاشبہ اس قرآنی حکم سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن ان کے سامنے رسول اللہ کے زمانے کی ایک ایسی عملی نظیر موجود تھی جس کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے انھوں نے پیش قدمی کر کے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کیا۔

جس وقت مکہ والوں نے رسول اللہ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ حکم خداوندی سے ہجرت کی تیاری میں لگ گئے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ سیرت کی تمام مستند کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ آپ نے صحرائی راستوں کے ایک ماہر سے ربط قائم کیا تاکہ اس کی رہنمائی میں آپ ایسے خفیہ اور مختصر راستے سے مدینہ کا سفر کریں کہ مکہ والے آپ تک نہ پہنچ سکیں۔ صحرائی راستوں کا یہ ماہر مشرک تھا جس کا نام عبداللہ بن اُریقط بتایا جاتا ہے۔ یہ استعانت بالکافر کی ایک قطعی مثال ہے۔

اس عملی نظیر پر قیاس کرتے ہوئے ہمارے علمار نے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کا جو فیصلہ کیا وہ بلاشبہ ایک درست فیصلہ تھا۔ جہاں تک قرآن کی مذکورہ آیت کا معاملہ ہے تو اس کا تعلق دراصل ان غیر مسلموں سے ہے جو نہ صرف اسلام کے دشمن ہوں بلکہ بالفعل وہ اس کے خلاف برسرِ جنگ ہو گئے ہوں۔ ایسے لوگوں سے دوستی اور تعاون غداری کے ہم معنی ہے جس کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں۔

اجتہاد کی شرطیں

اجتہاد نام ہے —— شرعی مآخذ کی روشنی میں غیر منصوص مسائل کا استنباط کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے حد نازک کام ہے۔ مگر وہ جتنا نازک ہے اتنا ہی زیادہ وہ ضروری ہے۔ اسی لیے علمار اصول نے لکھا ہے کہ کسی وقت اگر ایک ہی مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والا آدمی پایا جائے تو اس پر اجتہاد کرنا فرض عین ہو جائے گا۔ اور اگر اجتہاد کی مطلوبہ صلاحیت کے حامل کئی افراد ہوں تو اس وقت اجتہاد فرض کفایہ ہوگا۔ یعنی اگر ان میں سے ایک شخص نے اجتہاد کر کے شرعی حکم بتا دیا تو بقیہ کے اوپر سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ شرائط اجتہاد کیا ہیں۔ کوئی شخص کب اس قابل بنتا ہے کہ وہ بوقت

ضرورت اجتہاد کرے۔ اس سلسلہ میں علما نے متعدد شرطیں مقرر کی ہیں۔ مثلاً عربی زبان سے بخوبی طور پر واقف ہونا۔ قرآن و حدیث کا گہرا علم ہونا۔ ماضی کے علما اور مجتہدین کی آرا سے واقف ہونا۔ اصول فقہ اور اصول استنباط سے پوری طرح آگاہ ہونا۔ مقاصد شریعت سے کامل واقفیت رکھنا۔ ان تمام علمی قابلیتوں کے ساتھ لازمی طور پر اس کا متقی ہونا۔ وغیرہ

یہ شرطیں سب کی سب نہایت درست ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص ان اوصاف اجتہاد کا مالک بن چکا ہے، اس لیے اس کو حق ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔ اس کا فیصلہ کوئی بھی خارجی شخص نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر تقویٰ ایک انتہائی داخلی کیفیت ہے۔ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر کون شخص طے کرے گا کہ فلاں آدمی اس کا اہل ہو چکا ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔ اس معاملہ میں شرائط اجتہاد تو بیان کی جا سکتی ہیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی شخص خاص کے بارہ میں کہا جائے کہ تمہارے اندر تمام شرائط جمع ہو چکی ہیں، اس لیے اب تم کو حق ہے تم اجتہاد کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد، اس قسم کے دوسرے کاموں کی طرح، ذاتی داعیہ کے تحت کیا جانے والا ایک عمل ہے، وہ کوئی تقرری کا معاملہ نہیں۔ دور اول کے ائمہ فقہ جن کو مجتہد کامل کا درجہ دیا جاتا ہے انھوں نے ذاتی داعیہ ہی کے تحت اجتہاد کا عمل کیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دوسروں کی عطا کردہ سند کی بنیاد پر کوئی شخص اجتہاد کی مسند پر بیٹھا ہو۔

اس میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ کچھ لوگ نااہلی کے باوجود اجتہاد کریں گے۔ مگر ایسے لوگوں کا چیک کسی بھی قاعدہ اور ضابطہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ایسے نااہل مجتہدین ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی وہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کے خلاف چیک خدا کا یہ قانون ہے کہ اس دنیا میں صرف حق کو فروغ حاصل ہوتا ہے، اور باطل اپنی موت آپ مر کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ غیر ضروری طور پر مصنوعی پابندیاں وضع کرنے کے بجائے خدا کی ابدی سنت پر اعتماد کریں۔ یہی ممکن ہے اور یہی مطلوب بھی۔

شخصیت پرستی : اصل سبب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام میں اجتہاد کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی تھی کہ غلطی کا اندیشہ ہو تب بھی اپنی نیت بخیر رکھتے ہوئے اجتہاد کرو۔ دوسری طرف عقل کہتی ہے کہ حالات

ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے اجتہاد کا عمل لازمی طور پر جاری رہنا چاہیے۔ان دوطرفہ تقاضوں کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ اجتہاد کا عمل قولاً یا عملاً بند کر دیا گیا۔

اس پر غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے، یعنی رجال اجتہاد کا معدوم ہو جانا۔ اس کی اصل وجہ شخصیت پرستی ہے۔ یہ دراصل شخصیت پرستی کا ظاہرہ (Phenomenon) ہے۔ اس کے پیچھے کوئی بھی حقیقی وجہ، عملی یا نظریاتی موجود نہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اجتہاد مقید کو اس لیے جائز رکھا گیا کہ اس میں اکابر پر زد نہیں پڑتی۔ اور اجتہاد مطلق کو اس لیے ممنوع قرار دے دیا گیا کہ اس میں اکابر کی شخصیت زد میں آجاتی ہے۔

اجتہاد کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے تنقید کا ماحول انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اسلام کی ابتدائی چار صدیوں میں تنقید اور اختلاف کی کھلی اجازت تھی۔ امام محمدؒ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ مگر انھوں نے اپنے استاد سے ایک سو سے زیادہ مسائل میں اختلاف کیا۔ مگر بعد کی صدیوں میں بڑھی ہوئی اکابر پرستی نے تنقید و اختلاف کو ایک امر ممنوع (taboo) بنا دیا۔ یہی وہ فکری صورت حال ہے جس نے اجتہاد کے عمل کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی توجیہہ کے لیے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب چونکہ پہلے جیسے بڑے علما پیدا نہیں ہو سکتے اس لیے اب اجتہاد کا دروازہ بھی عملاً بند رہے گا۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بعد کے دور میں اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ تنقید و اختلاف کا دروازہ بند ہوگیا۔ اب اصول یہ قرار پایا کہ جس اجتہاد کی زد کسی شخصیت پر نہ پڑے وہ اجتہاد جائز ہے، اور جس اجتہاد کی زد کسی شخصیت پر پڑے وہ اجتہاد ناجائز۔

اجتہاد کی ضرورت ہمیشہ اس وقت پیش آتی ہے جب کہ نئی صورت حال سامنے آنے کی بنا پر پچھلے علما کی رائیں یا فتاوی غیر متعلق بن گئے ہوں، اور ضرورت پیش آگئی ہو کہ دین کے اصل مآخذ (قرآن و سنت) پر از سر نو غور کر کے نئے مسئلہ کے بارہ میں شرعی حکم کا تعین کیا جائے۔ مثال کے طور پر فتاوی قاضی خان (م ۱۱۹۶ء) میں لکھا ہوا ہے کہ ایک شخص اگر قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ میں ہوا میں اڑوں گا اور اڑ نہ سکے تو اس پر قسم کا کفارہ لازم نہیں آئے گا، کیوں کہ یہ ایک لغو قسم ہے۔ اب ہوائی جہاز کے زمانہ میں ہوائی پرواز ممکن ہوگئی ہے۔ اس لیے اب ایسی قسم لغو قسم نہیں

رہی۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص اجتہاد کر کے اس معاملہ میں نیا فتوی دے تو وہ دور سابق کے حنفی فقیہ قاضی خاں پر تنقید کے ہم معنی ہوگا۔ سابق فقیہہ کی رائے کو رد کیے بغیر اس مسئلہ میں نیا فتوی نہیں دیا جا سکتا۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر بعد کے دور میں لوگ معاملات میں مجتہدانہ رائے دینے سے گھبرانے لگے۔ ایسی ہر رائے دور سابق کے کسی عالم کی رائے سے ٹکراتی تھی، اور چونکہ دور سابق کے علماء کو تنقید سے بالاتر سمجھ لیا گیا تھا اس لیے قولاً یا عملاً اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ تاکہ نہ اجتہاد کرنا ہو اور نہ ماضی کے علماء پر تنقید کی نوبت آئے۔

دار الحرب یا دار الإعداد

ہندستان میں جب انگریزوں کا نفوذ بڑھ گیا تو شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ۱۸۰۶ء میں یہ فتوی دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان میں اسلام خطرہ میں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا یہ شرعی فرض ہو چکا ہے کہ وہ انگریزوں سے لڑ کر انھیں نکالیں اور ملک کو ان کے فساد سے پاک کریں۔

جس وقت یہ انتہائی فتوی دیا گیا اس وقت مسلم معاشرہ مکمل طور پر شخصیت پرستی میں مبتلا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس فتوے کے خلاف کوئی کھلی تنقید سامنے نہیں آئی۔ حتی کہ کسی نے یہ کہنے کی بھی جرأت نہیں کی کہ اتنا بڑا اعلان شخصی طور پر نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے علماء کا ایک نمایندہ اجتماع ہونا چاہیے۔

یہ فتوی جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۱ میں سید احمد بریلوی نے اپنے ساتھیوں کو لے کر عملی جہاد کیا۔ جس میں تمام کے تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں کے درمیان شخصیت پرستی اپنی آخری حد پر تھی۔ لوگ "بڑوں" کے خلاف بولنا تو درکنار سوچنا بھی نہیں جانتے تھے۔ اس وقت صرف ایک عالم میر محبوب علی دہلوی (۱۲۰۰ — ۱۲۸۰ھ) نکلے جنھوں نے سید صاحب سے کہا کہ جہاد کا فیصلہ کشف اور خواب کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ صرف شوریٰ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ مگر شخصیت پرستی کی فضا کی بنا پر ان کی بات بے وزن ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد ۱۸۵۷ میں جب علماء دیوبند نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد کیا۔ اس وقت بھی ایک عالم شیخ محمد صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کو ناجائز بتایا۔ ان کا کہنا تھا کہ

حریف کے مقابلہ میں ہماری تیاری کچھ نہیں ہے۔ اس لیے عملاً یہ جنگ نہیں بلکہ خودکشی ہوگی، مگر اس بار بھی شخصیت پرستی رکاوٹ بنی اور ان کی بات غیر موثر ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد ۱۹۱۴ میں عرب عالم محمد رشید رضا دیوبند آئے۔ یہاں انھوں نے اپنی تقریر میں انگریزوں کے خلاف جہاد سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس کے بجائے آپ کو دعوت کا کام کرنا چاہیے۔ مگر ان کی یہ رائے "اکابر" کی رائے سے ٹکراتی تھی۔ اس لیے کسی نے اس کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔ رشید رضا کی تقریر صرف دار العلوم دیوبند کی سالانہ روداد کا ایک غیر اہم حصہ بن کر رہ گئی۔

انگریزوں کے خلاف جہاد کا یہ عمل مختلف صورتوں میں بلا انقطاع جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی نے آکر اس کو ختم کیا۔ بے فائدہ جنگ کا یہ خاتمہ "اجتہاد" ہی کے ذریعہ ممکن ہوا۔ اگرچہ یہ ایک سیکولر اجتہاد تھا نہ کہ کوئی شرعی اجتہاد۔

علماء اپنی غیر مجتہدانہ سوچ کے تحت صرف ایک ہتھیار کو جانتے تھے۔ اور وہ تشدد کا ہتھیار تھا۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ ان کی جدوجہد آزادی کے لیے موجودہ زمانہ میں ایک عظیم تر نظریاتی ہتھیار وجود میں آچکا ہے۔ یہ ہتھیار وہ ہے جس کو حکومت خود اختیاری (self-determination) کہا جاتا ہے۔ یہ تصور اٹھارویں صدی کے فرنچ ریولیوشن کے دوران ظہور میں آچکا تھا۔ جس نے قوموں کو یہ حق دیا کہ وہ تشدد کا استعمال کیے بغیر محض دلیل کی پر امن طاقت سے قومی آزادی کی موثر جدوجہد کر سکیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ۱۹۱۹ میں بننے والی جمعیۃ اقوام (League of Nations) کے متعلق مسلمانوں کے رہنما علامہ اقبال صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کفن چوروں کی ایک انجمن ہے جو قبروں کی تقسیم کے لیے منظم کی گئی ہے :

چیست جمعیت اقوام کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ جمعیت اقوام نے پہلی بار انٹرنیشنل تصدیق سے یہ سیاسی معیار طے کیا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے درمیان اپنی مرضی کی حکومت قائم کرے۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں جب اقوام متحدہ (United Nations) بنائی گئی تو تمام قوموں کے اتفاق رائے سے یہ اصول آخری طور پر ایک مصدقہ سیاسی اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا (IX/41)

مہاتما گاندھی نے عالمی سیاست کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ان زمانی تبدیلیوں سے آگاہ تھے۔ چنانچہ

وہ ساؤتھ افریقہ سے ہندستان آئے اور اپنے "سیکولر اجتہاد" کے ذریعہ ہندستان کے عوام نیز علماء کو بتایا کہ ہمیں اب متشددانہ ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ حکومت خود اختیاری" کے نظریاتی ہتھیار کو ہم زیادہ موثر طور پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علماء کی مقلدانہ رائے پر گاندھی کی مجتہدانہ رائے برتر ثابت ہوئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ اب تمام لوگوں کے لیے ایک معلوم تاریخ بن چکا ہے۔

اس پورے معاملہ پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے تمام علماء سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جہاد کے نام پر ایک ایسے خونیں عمل میں مشغول رہے جس کا کوئی بھی نتیجہ تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہ تھا۔ اس خونیں جہاد کے دوران انھوں نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ناقابل بیان تباہی سے دوچار کیا۔ یہ صرف مہاتما گاندھی تھے جنھوں نے ان کو اس تباہ کن غار سے باہر نکالا۔

اس مہلک تجربہ کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا۔ اور وہ ہے ہمارے علماء کرام کا اپنے لیے اجتہاد کو شجر ممنوعہ سمجھ لینا۔ تنقید و تحقیق اور بحث واختلاف کو ممنوع قرار دے کر تقلید کے خول میں اپنے آپ کو بند کر لینا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے مقلدانہ فکر کی بنا پر صرف دو حالتوں کو جانتے تھے —— دار الاسلام، دار الحرب۔ ہندستان جب ان کو دار الاسلام نظر آیا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اب یہ دار الحرب ہے، اور اسی کے مطابق فتویٰ دے دیا۔ اگر وہ مجتہدانہ نگاہ رکھتے تو وہ وسیع تر دائرہ کے اعتبار سے معاملہ کی تحقیق کرتے اور پھر وہ اعلان کرتے کہ قرآن کے الفاظ میں، ہندستان اب دار الإعداد بن چکا ہے (الانفال ۶۰) یعنی ہمارا روایتی دفاع اب بالکل غیر موثر ہو چکا ہے۔ تم لوگ مغربی زبانوں کو پڑھو۔ سفر کر کے یورپ جاؤ اور معلوم کرو کہ ان قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ زمانہ کی تبدیلیوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھو اور پھر اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد زندگی ہے اور تقلید صرف موت۔ مگر تقلید کے خول سے نکلنا اور اجتہاد کے فوائد کو حاصل کرنا صرف آزادانہ اظہار رائے کے ماحول میں ممکن ہے۔ اور آزادانہ اظہار رائے کا ہم نے صدیوں سے اپنے درمیان خاتمہ کر رکھا ہے۔

شناخت کا مسئلہ

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان تشخص کے بحران (crisis of identity) کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ وہ اپنے تشخص کا شعور کھو بیٹھے ہیں۔ ایک عرب اسکالر کے الفاظ میں، موجودہ زمانہ کے مسلمان ابھی تک اس بنیادی سوال کا جواب دریافت نہ کرسکے کہ ہم کون ہیں (مَن نحنُ)۔ میں سمجھتا ہوں کہ دورِ جدید کے مجتہد کے لیے یہ سب سے بڑا فکری چیلنج ہے۔ کیوں کہ اسی سوال کے صحیح جواب پر امتِ مسلمہ کی صحیح رخ بندی کا انحصار ہے۔

اگر آپ خالی الذہن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھیں تو آپ نہایت آسانی سے اس سوال کا جواب پالیں گے۔ قرآن سے غیر مشتبہ طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کے دین کے گواہ (شہداء علی الناس) ہیں۔ ٹھیک یہی بات حدیث میں بھی موجود ہے۔ صحیح البخاری کی روایات میں ہمیں المومنون شہداء اللّٰہ فی الارض (۵/۲۹۹) اور انتم شہداء اللّٰہ فی الارض (۳/۲۴۰) کے الفاظ ملتے ہیں۔

ان واضح نصوص کے مطابق، مسلمان کا تشخص یا اس کی حیثیت دنیا میں یہ ہے کہ خدا کے رسولؐ کے ذریعہ اس کو جو دینِ رحمت ملا ہے، اس کو ہر دور میں وہ تمام انسانوں تک پہنچاتا رہے، وہ گواہ یا نذیر عریان کے درجہ میں اس کو پیش کرنے والا بن جائے۔

مسلم شناخت کے بارہ میں اتنی واضح بات آج کی مسلم نسلوں کے اوپر مخفی کیوں ہوگئی۔ اس کا سرا ہزار سال پیچھے تک جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں، اور اس کے بعد سلطنت عثمانی کے زمانہ تک مسلمانوں کی قومی حالت اس سے بالکل مختلف تھی جو آج ساری دنیا میں نظر آتی ہے۔ اس وقت مسلمان زمین کے اوپر واحد سپر پاور کی حیثیت حاصل کیے ہوئے تھے۔ شاعر کے الفاظ میں:

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں نہ تھا پلہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے

اس ماحول میں مسلمانوں کے اندر اپنی جو شناخت ابھری وہ غلبہ و اقتدار کی شناخت تھی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا خلیفہ ہے (نحن خلفاء اللّٰہ فی الارض)۔ قرآن میں خلیفہ کا لفظ پہلے سے موجود تھا۔ اس میں اللہ کے لفظ کا اضافہ کرکے انھوں نے اپنی شناخت کا تعین حاصل کرلیا۔

خلیفہ کے لفظی معنی ہیں جانشین یا بعد کو آنے والا۔ قرآن میں یہ لفظ بنی نوع انسان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ اور سمندر کروروں سال سے وہی کے وہی ہیں۔ اس کے برعکس انسان سو سال میں یا اس سے کم مدت میں مر جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا انسان آتا ہے۔ گویا انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں ایک کے بعد ایک کی آمد کا نظام قائم ہے۔ اس طرح باری باری لوگ آکر زمین پر بستے ہیں اور اپنی آزمائش کی مدت پوری کرکے چلے جاتے ہیں تاکہ ان کی جگہ دوسرے لوگ آئیں اور خدا کی اسکیم کے مطابق اپنا امتحان دیں۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے : پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو (یونس ۱۴)

اس سادہ امتحانی تصور کو سیاسی تصور کا مفہوم دے کر یہ کہا گیا کہ خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے۔ خدا نے کائنات میں اپنے تکوینی قوانین براہ راست نافذ کر رکھے ہیں۔ اور شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے اس نے اہل اسلام کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے تاکہ وہ ان قوانین کو بزور تمام انسانوں پر نافذ کریں۔

خلافت کا یہ سیاسی مفہوم تمام تر خود ساختہ تھا، مگر غلبہ و اقتدار کے زمانہ میں لوگوں کو وہ بہت زیادہ مطابقِ واقعہ نظر آیا۔ چنانچہ وہ بیشتر مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اگرچہ محقق علماء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہ نے کہا کہ جو شخص کسی کو خدا کا خلیفہ قرار دے اس نے خدا کے ساتھ شرک کیا (فمن جعل لہ خلیفۃ فھو مشرک بہ) ابن تیمیہ، الفتاوی الکبری ۲/ ۵۵۳

انیسویں صدی میں جب مغربی قومیں نئی طاقت سے مسلح ہو کر ابھریں اور انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو تمام دنیا کے مسلم دانشور نحن خلفاء اللہ فی الارض (ہم زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں) کے اسی تصور میں سرشار تھے۔ وہ اپنی صرف ایک ہی شناخت جانتے تھے، اور وہ یہ کہ وہ زمین پر امام اور قائد کی حیثیت سے پیدا کیے گئے ہیں ——— یہ صورت حال آج تک پوری طرح باقی ہے۔ ایک شاعر کے الفاظ میں، اس فکر کا خلاصہ یہ ہے :

جس طرح احمدِ مختار ہیں نبیوں میں امام ان کی امت بھی ہے دنیا میں امامِ اقوام

اس ذہن کی بنا پر مسلم علماء اور دانشوروں کو کرنے کا ایک ہی کام نظر آیا۔ یہ کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی حاکمانہ حیثیت کو دوبارہ حاصل کریں۔ پچھلے تقریباً دو سو سال سے کسی نہ کسی صورت میں یہ جدوجہد

جاری ہے۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس میدان میں مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہ کرسکے۔

مسلم علماء اور دانشور اپنے آپ کو "خلفاء اللہ فی الارض" کی حیثیت سے دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے تو اب وہ مایوسی اور جھنجلاہٹ کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ وہ ساری دنیا میں اپنے آپ کو بے جگہ محسوس کر رہے ہیں۔ یہی وہ حالت ہے جس کو تشخص کے بحران کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بحران فرضی ہے، اور وہ ذہنی تخیل اور خارجی صورت حال کے درمیان عدم مطابقت کی پیداوار ہے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کو ایک عجیب وغریب قسم کی فکری دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ وہ چونکہ ایک ہی ملی نشانہ سے واقف ہیں، اور وہ غلبہ و قیادت کا نشانہ ہے۔ اس لیے اب ان کو وہی آوازیں اپیل کرتی ہیں جس میں ان کی اس مخصوص نفسیات کی غذا موجود ہو۔ جو رہنما بڑے بڑے الفاظ بولیں، جو ہائی پروفائل میں کلام کریں، جو عظمت کے سبز باغ دکھائیں، وہی مسلمانوں کے اندر قبولیت حاصل کرتے ہیں۔ لو پروفائل میں کلام کرنے والے رہنما موجودہ مسلمانوں کے درمیان قبولیت کا مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ جذباتی سیاست مسلمانوں میں خوب مقبول ہوتی ہے اور حقیقت پسندانہ سیاست ان کے درمیان غیر مقبول ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کی قیادت کے معاملہ کو گویا فرضی امیدوں کی تجارت (false-hopes business) بنا دیا ہے۔ تقریباً دو سو سال سے یہ صورت حال جاری ہے کہ ایک کے بعد ایک کوئی شخص اٹھتا ہے۔ وہ جذباتی تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک بڑے نشانہ کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ مگر چونکہ یہ نشانہ غیر حقیقی ہوتا ہے، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ مسلمانوں کا ہر اقدام ایک نئی تباہی پر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس فکری بحران یا ذہنی دلدل سے مسلمانوں کو صرف جرأت مندانہ اجتہاد ہی نکال سکتا ہے۔ آج پہلی ضرورت ہے کہ مسلم علماء اور مسلم دانشور دور اقتدار میں بننے والی شناخت "انتم خلفاء اللہ فی الارض" کے خول سے نکلیں اور براہ راست قرآن وسنت میں دی ہوئی ابدی شناخت "انتم شہداء اللہ فی الارض" پر قوم کو دوبارہ کھڑا کریں۔ اس طرح تشخص کا بحران اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ مسلمان مَن نحنُ؟ (ہم کون ہیں) کا ایک ایسا جواب پالیں گے جو ہر حال میں کافی وشافی

رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ بلا تاخیر جان لیں گے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ انھیں اہل عالم کے سامنے کون سا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ دریافت مسلمانوں کے لیے زندگی کے تمام راستے کھول دے گی۔ کوئی بھی دروازہ ایسا نہیں ہوگا جو اس کے بعد انہیں اپنے اوپر بند نظر آئے۔

محقق علما کا اختلاف

علما کی اکثریت کا دعوی اگرچہ یہی ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اب صرف اجتہاد مقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مگر محقق علما کی ایک تعداد اس نقطۂ نظر کو نہیں مانتی۔ اس نے اس کو بے بنیاد قرار دے کر اسے رد کر دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس مشہور حدیث کے مطابق ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اللہ میری امت کو کبھی ضلالت پر جمع نہیں کرے گا (ان اللہ لا یجمع اُمتی علی ضلالۃ) الترمذی، کتاب الفتن، بحوالہ جامع الاصول فی احادیث الرسول ۹/۱۹۶)

یہ رائے کہ اب چار مروجہ فقہی اسکول کے باہر جا کر اجتہاد نہیں کیا جا سکتا، یقینی طور پر خدا کے دین میں ایک انحراف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کہ تم میں سے کسی شخص سے جب سوال کیا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ کتاب اللہ میں دیکھے۔ اگر وہ اس میں نہ پائے تو سنت رسول میں دیکھے۔ اگر اس میں بھی نہ پائے تو جس پر مسلمان مجتمع ہوئے اس میں دیکھے۔ اور اگر اس میں بھی نہ پائے تو اس کو چاہیے کہ وہ خود اجتہاد کرے (اذا سئل احدکم فلینظر فی کتاب اللہ فان لم یجد ففی سنۃ رسول اللہ فان لم یجدہ فیہا فلینظر فیما اجتمع علیہ المسلمون، والا فلیجتہد) جامع الاصول ۹/۱۹۲

مذکورہ حدیث رسول کے مطابق، ضروری تھا کہ سارے ہی علما انحراف میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ کچھ علما پھر بھی موجود رہیں جو اس معاملہ میں امر حق کا اعلان کریں۔ چنانچہ ہر دور میں ایسے محقق علما اٹھتے رہے ہیں جنھوں نے دین میں اس فکری انحراف کی تردید کی ہے۔ یہاں ہم چند رائیں نقل کرتے ہیں:

علامہ بحر العلوم عبد العلی حنفی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں کا قول ہے کہ اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کا دعوی ہے کہ اب امت پر ان چاروں میں سے کسی ایک امام کی تقلید واجب ہے۔ مگر یہ سب محض بے عقلی کی باتیں ہیں جن پر وہ کوئی دلیل نہیں دے سکے ہیں۔ ان کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں پر وہ حدیث صادق آتی ہے جس

میں آپ نے فرمایا کہ انھوں نے علم کے بغیر فتویٰ دیا اور پھر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا :

واما الاجتهاد المطلق فقالوا انه اختتم بالائمة الاربعة حتى اوجبوا تقليد واحدٍ من هؤلاء على الامة وهذا كله هوس من هوساتهم لم يأتوا بدليل ولا يُعبأ بكلامهم وانما هم من الذين حكم الحديث ، انهم افتوا بغير علم فضلوا واضلوا (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ، مطبع نول کشور لکھنؤ ، جلد ثانی ، صفحہ ۶۲۴)

شیخ محمد مصطفیٰ المراغی (۱۹۴۵ - ۱۸۸۱) کا شمار جدید مصر کے اکابر علماء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ازہر شریف اور اس سے ملحق دینی اداروں کے تعلیمی و تربیتی نظام کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے میں قابل قدر اصلاحی و تجدیدی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اجتہاد کے پرزور حامی تھے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اجتہاد کو ناممکن بتاتے ہیں ان کے خیال کی تردید کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب بحوث فی التشریع الاسلامی (صفحہ ۱۱-۱۰) میں لکھا ہے کہ مصر کے موجودہ دینی اداروں میں ایسے علماء موجود ہیں جن کے اندر اجتہاد کی شرائط پوری طرح پائی جاتی ہیں اور اس لیے ان کے اوپر تقلید حرام ہے (و انى مع احترامى لرأى القائلين باستحالة الاجتهاد اخالفهم فى رأيهم و اقول ان فى علماء المعاهد الدينية فى مصر من توافرت فيهم شروط الاجتهاد و يحرم عليهم التقليد)

مشہور یمنی عالم محمد بن علی الشوکانی (۱۸۳۴ - ۱۷۶۰) ان لوگوں میں سے ہیں جو اجتہاد کو علماء امت پر فرض قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب (القول المفید فی الاجتهاد والتقلید میں لکھا ہے :

"لا يخفى على من له أدنى فهم أن الاجتهاد قد يسّره الله للمتأخرين - تيسيراً لم يكن للسابقين - لأن التفاسير للكتاب العزيز قد دونت و صارت من الكثرة إلى حد لا يمكن حصره ، والسنة المطهرة قد دوّنت و تكلم علماء الامة على التفسير والتصحيح والترجيح والتجريح بما هو زيادة على ما يحتاج إليه المجتهد - فالاجتهاد على المتأخرين أيسر وأسهل من الاجتهاد على المتقدمين ولا يخالف فى هذا من له فهم صحيح وعقل سوى "

یعنی جو شخص بھی ادنیٰ فہم و ادراک رکھتا ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعد کے لوگوں کے لیے اجتہاد اتنا آسان کر دیا ہے جتنا کہ وہ پہلے لوگوں کے لیے آسان نہ تھا! اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ جن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ اور حدیث کی بھی تدوین ہو چکی ہے۔ پھر امت کے علماء نے اس سلسلہ میں تفسیر و تصحیح اور ترجیح و تجریح کے اعتبار سے جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس اجتہاد پچھلے لوگوں کی بہ نسبت بعد کے لوگوں کے لیے زیادہ سہل اور آسان تر ہے۔ جس شخص کے پاس بھی فہم صحیح اور عقل سلیم ہے وہ اس میں اختلاف نہیں کر سکتا۔

سلطان العلماء عبد العزیز ابن عبد السلام (۱۲۶۲-۱۱۸۱) نے اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اجتہاد کا درجہ حاصل کرنا ممکن ہے جو کہ فتویٰ اور قضاء کے لیے ایک بنیادی شرط ہے۔ اور یہ اس زمانے تک باقی رہے گا جس کے بارے میں رسول اللہ ؐ نے خبر دی ہے کہ اس وقت علم اٹھا لیا جائے گا۔ مگر ہم ابھی اس زمانے تک نہیں پہنچے ہیں، ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ امت غلطی پر مجتمع ہو چکی ہے، جو سراسر باطل ہے (إن رتبة الاجتهاد مقدور على تحصيلها، وهي شرط في الفتوى والقضاء، وهي موجودة الى الزمان الذى أخبر عنه عليه الصلاة والسلام بانقطاع العلم. ولم نصل اليه الآن، وإلا كانت الأمة مجتمعة على الخطأ. وذلك باطل) شرح مختصر ابن الحاجب، باب القضاء

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ دیکھئے ابن عبد السلام نے کتنی صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ اجتہاد ناممکن نہیں، اور یہ کہ وہ ان کے زمانے تک باقی رہا ہے، اور یہ کہ اجتہاد کے فقدان سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری امت ناحق پر اکٹھا ہو جائے اور یہ محال ہے (فانظر كيف صرّح بأن رتبة الاجتهاد غير متعذرة، وأنها باقية إلى زمانه، وبأنه يلزم من فقدها اجتماع الامة على الباطل وهو محال) الرد علی من اخلد الی الارض، صفحہ ۲۴

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے: اگرچہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں۔ یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر و منحصر ان چار میں ہے۔ مگر اس پر بھی

کوئی دلیل نہیں۔ کیوں کہ اہل ظاہر ہر زمانہ میں رہے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہ سب اہل ھوی ہوں۔ وہ اس اتفاق سے علحدہ رہے۔ دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جائے تو تقلید شخصی پر کبھی اجماع نہیں ہوا (تذکرۃ الرشید، جلد اول، صفحہ ۱۳۱)

قدیم و جدید کا فرق

ایک مسلم اسکالر نے لکھا ہے کہ آرتھوڈاکسی کے فریم ورک میں رہ کر ہی اجتہاد کیا جانا چاہیے۔ یہ بات بجائے خود غلط نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آرتھوڈاکسی سے کیا مراد ہے۔ کیا اس سے مراد وہ چار فقہی اسکول ہیں جو چوتھی ہجری میں رائج ہوئے یا قرآن و سنت۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دعوی کے حق میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں کہ آرتھوڈاکسی کے فریم ورک سے مراد ائمہ اربعہ کا فریم ورک ہے۔ ایسا دعویٰ نہ خود ائمہ اربعہ نے کیا۔ اور نہ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت پایا جاتا ہے۔ اس لیے آرتھوڈاکسی کے فریم ورک سے لازمی طور پر قرآن و سنت کا فریم ورک مراد لینا ہوگا۔

اس وضاحت کی روشنی میں دونوں قسم کے اجتہاد کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اجتہاد مطلق میں براہ راست قرآن و سنت پر غور کر کے حکم معلوم کیا جاتا ہے، جب کہ اجتہاد مقید میں آدمی پابند ہوتا ہے کہ وہ مدون فقہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی رائے قائم کرے۔ موجودہ زمانہ میں اسلامی تفکیر کے معطل ہونے کا اصل سبب یہی تقسیم ہے۔ موجودہ زمانہ کا عالم شعوری یا غیر شعوری طور پر مدون فقہ کے ڈھانچہ سے باہر جا کر سوچ نہیں پاتا، اس لیے وہ موجودہ زمانہ کے فکری مسائل میں گہری رہنمائی دینے سے بھی قاصر رہتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، فقہاء اربعہ کا زمانہ دور جدید سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کی مدون کی ہوئی فقہ اپنے بعد کے زمانہ کا احاطہ کرنے والی نہ ہو۔ بعد کے زمانہ کے لیے رہنمائی کتاب و سنت سے ملے گی جو کہ ابدی ہے، نہ کہ مدون فقہ سے جو یقینی طور پر وقتی اور زمانی ہے۔

اس معاملہ کو مثال سے سمجھئے۔ موجودہ فقہ خلافت عباسی کے زمانہ میں بنی۔ اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ یہ تو بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمراں حیثیت میں ہوں تو ان کے لیے شرعی احکام کیا ہیں۔ اس میں ایسے ابواب کثرت سے پائے جاتے

ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمراں حیثیت میں پائیں، اس وقت ان کے لیے شرعی حکم کیا ہے۔ تو اس کا واضح جواب آپ کو موجودہ مدون فقہ میں نہیں ملے گا۔

اسی طرح موجودہ فقہ جس وقت مدون کی گئی اس وقت شخصی حاکمیت کا زمانہ تھا۔ موجودہ قسم کی عوامی جمہوریت اس وقت قائم نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس فقہ میں خلیفہ اور سلطان سے متعلق احکام تو بہت ملیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کسی ملک میں تنہا حاکم نہ ہوں، البتہ وہ جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ شریکِ حکومت ہوں، ایسی حالت میں ان کے لیے شرعی احکام کیا ہیں، تو اس کی بابت بھی موجودہ مدون فقہ میں آپ کوئی رہنمائی نہیں پائیں گے۔

یہ کمی صرف مدون فقہ کے اندر ہے۔ اگر آپ اس فقہ سے گزر کر قرآن و سنت تک پہنچ جائیں تو آپ پائیں گے کہ قرآن و سنت میں ہر صورت حال کے لیے کامل رہنمائی موجود ہے۔

اب آپ دیکھیں گے کہ قرآن (اتقوا اللہ ما استطعتم) کا اصول بتا رہا ہے۔ یعنی جتنا وُسع اتنی ہی تکلیف (ذمہ داری) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی چار بڑے دوروں میں تقسیم تھی۔ کی زندگی کے دو دور، اور مدنی زندگی کے دو دور۔ کی زندگی کے ابتدائی چند سال خفیہ تبلیغ اور تنہا نماز پڑھنے کے سال ہیں۔ اس کے بعد کی زندگی کا نصف آخر ہے جس میں علی الاعلان تبلیغ اور کھلم کھلا عبادت کا حکم دے دیا گیا۔

یہی معاملہ ہجرت کے بعد مدنی دور کا ہے۔ مدنی دور کے ابتدائی چند سال وہ ہیں جب کہ ایک صحیفہ یا چارٹر کے ذریعہ مسلمان اور یہود یا مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک مشترک نظام بنایا گیا (للیھود دینھم وللمسلمین دینھم) مگر مدنی دور کے نصف آخر میں حالات بدل گئے تو مدینہ میں وحدانی طرز کا نظام قائم کر دیا گیا۔

اس مثال کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہماری مدون فقہ صرف ایک صورت میں ہم کو رہنمائی دے رہی تھی، اس صورت میں جب کہ ہم زمین پر حاکم کی حیثیت میں ہوں۔ مگر براہ راست قرآن و سنت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ ہر صورت حال کے لیے ہمارے پاس رہنمائی موجود ہے۔ مکہ کے نصف اول جیسے حالات ہوں تب بھی ہمارے لیے نمونہ ہے، اور مکہ کے نصف آخر جیسے حالات ہوں تب بھی۔ اسی طرح اگر ہم مدینہ کے نصف اول جیسے حالات میں ہوں تب بھی ہمارے

پاس رہ نمائی موجود ہے اور اگر ہم مدینہ کے نصف آخر جیسے حالات میں ہوں تب بھی۔

اجتہاد مقید کی صورت میں ہم گویا ایک بند گلی میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ مگر اجتہاد مطلق ہمارے لیے زندگی کے تمام دروازے کھول دیتا ہے، اس کے بعد کوئی دروازہ ہمارے لیے بند نہیں رہتا۔

صلاحیتوں کا فقدان نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اجتہاد مطلق کو "مجتہد مطلق" کی پیدائش کے ساتھ جوڑنا بجائے خود ایک غیر معقول بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق تمام تر ذہنیت سے ہے نہ کہ کسی مفروضہ مجتہد مطلق کی پیدائش سے۔ یعنی ملت کے اوپر اگر ذہنی جمود کی حالت طاری نہ ہو، بلکہ اس کے اندر آزادانہ فکر کی فضا موجود ہو تو اجتہاد مطلق کا عمل بھی لازمی طور پر جاری رہے گا۔ مجتہد مطلق تو ہمیشہ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ آزادی فکر کی فضا نہ ہونے کی وجہ سے ان کو وہ سازگار ماحول نہیں ملتا جس میں وہ اپنے حصہ کا عمل انجام دے سکیں۔

عالی دماغ انسانوں کی پیدائش کبھی بند نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ چنانچہ خود نظام فطرت کے تحت اسلام کی بعد کی تاریخ میں بار بار اعلیٰ صلاحیت کے اہل علم پیدا ہوتے رہے ہیں، مثال کے طور پر الغزالیؒ (۱۰۵۸ - ۱۱۱۱) ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳ - ۱۳۲۸) الشاطبیؒ (م ۱۳۸۸) جلال الدین سیوطیؒ (۱۴۴۵ - ۱۵۰۵) شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ - ۱۷۶۲) انور شاہ کشمیری (۱۸۷۵-۱۹۳۴) وغیرہ۔

یہ کہنا امت محمدی کی تصغیر ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد اس صلاحیت کے لوگ امت میں پیدا نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بھی ایسے لوگ امت میں پیدا ہوتے رہے جو اپنے وسیع علمی مطالعہ، اپنی اعلیٰ ذہنی استعداد اور اپنی بے داغ اسلامیت کے ساتھ اس قابل تھے کہ وہ مجتہد مطلق کا کردار ادا کر سکیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بہت سے ایسے لوگ ابھرے جو مجتہدانہ زبان میں کلام کرتے تھے۔ مثلاً عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عمر، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، امام شعبی اور دور اول کے علما رفقہ، وغیرہ۔ مگر چوتھی صدی ہجری کے بعد اٹھنے والے علما، اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود، مجتہدانہ انداز میں بولنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس کی وجہ شخصی استعداد کا فرق نہیں ہے بلکہ دور کا فرق ہے۔ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مکمل آزادیٔ رائے تھی۔ لوگ کھلے طور پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔ انسانوں کو اکابر اور اصاغر میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ لوگ قائل کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ قول کو دیکھتے تھے۔ ہر صاحب دلیل کو حق تھا کہ وہ اپنی بات کو دلیل کے ساتھ بیان کرسکے۔ اس ماحول نے اجتہاد کا عمل جاری کر رکھا تھا۔ بعد کو جب یہ ماحول ختم ہوگیا تو اجتہاد کا عمل بھی باقی نہ رہا۔

پہلے اگر حق پرستی کی فضا تھی تو اب اکابر پرستی کی فضا پیدا ہوگئی۔ اب لوگ ایسی بات کہنے سے ڈرنے لگے جو ماضی کے بڑوں کی رائے سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس فضا میں قدرتی طور پر اجتہاد مطلق (آزادانہ اظہار رائے) ختم ہوگیا۔ اب وہی بات کہی جانے لگی جو کسی نہ کسی طرح مسلّمہ اکابر کے اقوال سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہی وہ ماحول ہے (نہ کہ کوئی شرعی حکم یا پیدائشی نقص) جس نے بعد کو اجتہاد مطلق کا دروازہ بند کر دیا اور صرف اجتہاد مقید کا دروازہ لوگوں کے لیے کھلا رکھا۔

میرے علم کے مطابق، بعد کی اسلامی تاریخ میں صرف ایک شخص ہے جس نے مجتہد مطلق کی زبان میں بولنے کی ہمت کی، اور وہ ابن خلدون (۱۴۰۶-۱۳۳۲) ہے۔ مگر ابن خلدون بھی یہ کام صرف جزئی طور پر کرسکا۔ اس نے عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ میں بلاشبہ مجتہدانہ کلام کیا۔ مگر خالص دینی معاملات میں اس نے بھی غیر مقید اجتہاد کرنے کی بہت کم جرأت کی۔

دور جدید کا آغاز

جدید مسائل کا آغاز خاص طور پر اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲-۱۷۰۳) ظاہر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کو غالباً خواب میں اس کا اشارہ بھی دیا گیا کہ وہ ایک نئے دور کے سرے پر پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں (رأیتنی فی المنام قائم الزمان) مگر شاہ ولی اللہ اپنے آپ کو رواجی سانچہ سے باہر نہ نکال سکے، اس لیے وہ دور جدید کے اعتبار سے افکار اسلامی کی تبئین بھی نہ کرسکے۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ نئے مسائل کا جواب فراہم کرنے کا کام صرف اجتہاد کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔ مگر شاہ ولی اللہ نے ایک طرف اپنے قائم الزماں ہونے کا اعلان کیا، دوسری

طرف اپنے اوپر اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا، حالانکہ قائم الزمان کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اجتہاد کا عمل لازمی طور پر ضروری تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید اور بعض دوسری کتابوں میں اجتہاد کے مسئلہ پر کلام کیا ہے۔ اس معاملہ میں ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجتہاد مطلق، اور دوسرا اجتہاد مقید۔ وضاحت کی خاطر اس کو ہم کلی اجتہاد اور جزئی اجتہاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک اب اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ کیوں کہ امام شافعی (۷۶۷ - ۸۲۰) کے بعد اب کوئی مجتہد مطلق پیدا ہونے والا نہیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک اب قیامت تک کے لیے اجتہاد کی صرف دوسری قسم (اجتہاد مقید) کی گنجائش باقی ہے۔ اب جو شخص بھی اجتہاد کرنا چاہے گا اس کو لازمی طور پر ائمہ اربعہ کے مقرر کیے ہوئے طریقوں کی بنیاد پر استنباط کرنا ہوگا۔ وہ بلا قید اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اجتہاد مطلق کا حق اب کسی کو نہیں، مگر اجتہاد مقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور وہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غیر ضروری تقسیم ہے۔ اجتہاد کا انقطاع ہو گیا یا نہیں، یہ سوال اصلاً اجتہاد مطلق یا اجتہاد مستقل کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ جہاں تک اجتہاد مقید کا تعلق ہے، وہ تو ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ وہ ہر حال میں جاری رہے گا، خواہ اس کا دروازہ بند کیا جائے یا نہ بند کیا جائے۔ حتی کہ لفظی اعلان کے بغیر بھی وہ ہمیشہ خود اپنے زور پر جاری رہتا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے قوت فراہم کرو (الانفال ۶۰) حدیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ سن لو کہ قوت سے مراد تیر مارنا ہے، سن لو کہ قوت سے مراد تیر مارنا ہے (الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی)

موجودہ زمانہ میں بم اور گن کی ایجاد ہوئی تو ساری دنیا کے مسلمان جنگ کے مواقع پر بم اور گن کا استعمال کرنے لگے۔ حالاں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ علماء نے "اجتہاد مقید" کر کے یہ اعلان کیا ہو کہ قدیم زمانہ میں قوت کا مطلب تیر تھا، مگر آج قوت کا مطلب گن اور بم ہے۔ اس قسم کے کسی اعلان کے بغیر ساری دنیا کے مسلمانوں نے خود بخود اس معاملہ میں مجتہدانہ روش کو اختیار کر لیا۔

اس لیے اجتہاد کی بحث میں اصلاً قابل غور معاملہ اجتہاد مطلق یا اجتہاد کلی کا ہے۔ کیونکہ اجتہاد

مقید تو خود حالات کے زور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وہ ایک فطری ضرورت ہے، اور اس کا انقطاع سرے سے ممکن ہی نہیں۔

تاہم اجتہاد کی یہ درجہ بندی صرف یہ ثابت کرتی ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اجتہاد کی مستقل اہمیت سے واقف نہ ہو سکے۔ بظاہر وہ سمجھتے تھے کہ وہی پچھلا روایتی دور اب بھی چلا جا رہا ہے جو امام شافعی (۸۲۰ - ۷۶۷ء) کے زمانہ میں تھا۔ حالاں کہ زمانہ یکسر بدل چکا تھا۔ اور اب نئے حالات کے نتیجہ میں اجتہاد مطلق کی ضرورت پیش آ چکی تھی۔

اجتہاد کا مقصد یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں شریعت کا از سر نو انطباق (re-application) کیا جائے۔ پھر جب حالات وہ نہ رہیں جو فقہاء اربعہ کے زمانہ میں تھے تو اجتہاد مقید کس طرح کافی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد تو لازم ہو جاتا ہے کہ اسی طرح دوبارہ اجتہاد مطلق سے کام لیا جائے جس طرح فقہاء اربعہ نے اجتہاد مطلق سے کام لیا تھا۔ تاکہ اسلام کو دوبارہ وقت کے حالات پر منطبق کرنا ممکن ہو سکے۔

بنو عباس کے دور میں فقہاء اربعہ کو اجتہاد مطلق کا حق اسی لیے ملا تھا کہ اس وقت معاشرہ کے حالات بدل گئے تھے، جب کہ قرآن و حدیث کا ذخیرہ پوری طرح لوگوں کے پاس موجود تھا۔ اب انسانی حالات میں اس سے بھی زیادہ بڑی تبدیلی آ چکی ہے جو بنو عباس کے زمانہ میں آئی تھی۔ پھر اگر کمتر تبدیلی کی بنا پر قرآن و حدیث اور آراء صحابہ کے مقابلہ میں اجتہاد مطلق کیا جا سکتا تھا تو زیادہ بڑی تبدیلی کے بعد فقہاء کی آراء کے مقابلہ میں اجتہاد مطلق کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کوئی بے جا جسارت نہیں، بلکہ زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے جس کا شعور خود ہمارے قدیم مجتہدین کو بھی تھا۔ مثلاً ابوداؤد کہتے ہیں کہ امام احمد ابن حنبل کو میں نے کہتے ہوئے سنا کہ تم میری تقلید نہ کرو، نہ ہی مالک اور ثوری اور اوزاعی کی تقلید کرو۔ بلکہ تم وہاں سے لو جہاں سے انھوں نے لیا ہے یعنی قرآن و سنت سے (لا تقلدنی، ولا تقلد مالکاً ولا الثوری ولا الأوزاعی، وخذ من حیث أخذوا) اعلام الموقعین ۲/۴۰-۱۳۹

شاہ ولی اللہ کے مذکورہ موقف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر نہ وہ مقامی تبدیلیوں سے پوری طرح باخبر تھے اور نہ عالمی تبدیلیوں سے۔ حتی کہ ان کی کتابوں سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان علمی ترقیوں سے بخوبی طور پر واقف تھے جو ان کی پیدائش سے پہلے خود مسلم اسپین میں ہو چکی تھیں۔

مسلم اسپین کی ترقیاں اس بات کی علامت تھیں کہ اب دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے جب کہ "سیف" کے مقابلہ میں "علم" قوت کا نشان ہوگا۔ یہ ترقیاتی سفر پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے دائرہ سے نکل کر لاتینی یورپ کے دائرہ میں پہنچ گیا۔ مگر بظاہر شاہ ولی اللہ کے لیے یہ سب کچھ لامعلوم تھا۔

یورپ کے مختلف ملکوں (اٹلی، فرانس، انگلینڈ، وغیرہ) میں مذکورہ علمی ترقی اضافہ کے ساتھ جاری رہی۔ یہاں تک کہ مختلف یورپی قوموں میں وہ باہمی رقابت پیش آئی جس کو نوآبادیاتی کش مکش (colonial struggle) کہا جاتا ہے۔ آخر کار ان قوموں کے درمیان مشہور سات سالہ جنگ (Seven Years' War) پیش آئی۔ یہ جنگ ۱۷۵۶ سے لے کر ۱۷۶۳ تک جاری رہی۔ ۱۷۶۳ میں معاہدۂ پیرس ہوا جس نے اس نوآبادیاتی جنگ کا آخری فیصلہ برطانیہ کے حق میں کیا۔ برطانیہ نے شمالی امریکہ اور انڈیا پر فتح حاصل کرلی۔ اس کے بعد برطانیہ کو سمندر پار کی نوآبادیات میں غیر متنازعہ قائد کی حیثیت حاصل ہوگئی:

By the Treaty of Paris (February 10, 1763), which settled the colonial aspects of the war, Britain won North America and India and became the undisputed leader in overseas colonization. (16/580)

پندرھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک کے دور کو کھوج کا دور (age of exploration) کہا جاتا ہے۔ ان صدیوں میں تاجر، مشنری، سیاح، فن کار، بحری ماہرین اور سائنسی علما مسلسل اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یورپی قوموں کی وہ عالمی توسیع تھی جس کو نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے۔ یہ سرگرمیاں اس حد تک موثر تھیں کہ انھوں نے سمندروں کو پار کر کے ۱۶۱۱ء میں مسولی پٹم پر قبضہ کرلیا۔ ۱۶۳۹ء میں مدراس اور ۱۶۶۱ء میں بمبئی ان کے قبضہ میں آگیا، وغیرہ (4/880-887)

اس طرح شاہ ولی اللہ کی پیدائش سے بھی پہلے انڈیا کے تقریباً تمام سواحل پر یورپی قومیں قابض ہو چکی تھیں۔ مغل سلطنت سمٹ کر محدود بری دائرہ میں باقی رہ گئی تھی۔ برصغیر ہند کے وسیع تر دائرہ میں نوآبادیاتی طاقتوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ سب کچھ جدید معلومات، جدید فنی ترقیوں اور جدید وسائل کے ذریعہ وجود میں آیا۔

مگر شاہ ولی اللہ دہلوی کی کسی بھی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان تاریخی تبدیلیوں سے باخبر تھے۔ شاہ صاحب کی مشہور ترین کتاب حجۃ اللہ البالغہ پہلی بار صرف انیسویں صدی (۱۸۷۰) میں چھپ سکی۔ جب کہ یورپ میں پرنٹنگ پریس کا استعمال پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکا تھا۔ یہ ایک علامتی فرق ہے جو بتاتا ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے اصحاب کا فکر کس طرح عالمی فکر سے کئی سو سال پیچھے تھا۔

موجودہ صورت حال

خلافت عباسی کے دور میں جب بیرونی افکار و علوم سے مسلمانوں کا مقابلہ پیش آیا تو انھوں نے بہت جلد ان کے مقابلہ میں اسلام کا موقف متعین کر لیا۔ مگر یہی بات موجودہ زمانہ میں حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنو عباس کے زمانہ میں مسلمان فاتحانہ نفسیات کے حامل تھے۔ انھوں نے کھلے ذہن (عقلیۃ الانفتاح) سے افکار و علوم کا جائزہ لیا۔

اس کے برعکس موجودہ زمانہ کی تبدیلیاں اس وقت پیش آئیں جب کہ مسلمان مغلوبانہ نفسیات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ اب انھوں نے ہر چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھا۔ جب بھی ان کا مقابلہ مغربی قوموں سے پیش آیا تو فوراً وہ ان کے لیے عزت نفس کا سوال بن گیا۔ یہی وہ نفسیاتی فرق ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ماضی کی تبدیلیوں کو اپنی غذا بنانے والے لوگ جدید تبدیلیوں کو صرف اپنا حریف سمجھ کر اس سے دور ہو گئے۔

ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات تھی کہ ہمارے علماء اور دانشوروں کو جدید حقائق کی کوئی خبر نہ ہو سکے۔ سازش کا نظریہ یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ موجودہ صورت حال کا کوئی حقیقی سبب نہیں۔ وہ صرف مکر و فریب کا ایک نتیجہ ہے۔ جب کہ علمی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ پیش آمدہ واقعہ کو آپ حقیقی تاریخی اسباب کے تحت پیش آنے والا واقعہ سمجھیں۔ سازش کے اس غیر واقعی نظریہ نے دور جدید کے مسلمانوں سے یہ جذبہ چھین لیا کہ وہ غیر جانب دارانہ انداز میں دوسری قوموں کا مطالعہ کریں۔ اور ان کی قوت اور ترقی کے اسباب کو جاننے کی کوشش کریں۔ اپنے موجودہ ذہن کے تحت وہ زیادہ سے زیادہ بس "سازشوں" کی کھوج میں مصروف ہو سکتے تھے۔ فطری حقائق اور تاریخی عوامل کی تلاش کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک وہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

دور جدید کے ظہور پر اب تقریباً تین سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ آج بھی ہمارے کتب خانہ میں تہافت الفلاسفة (الغزالی) اور الرد علی المنطقیین (ابن تیمیہ) جیسی کتابیں موجود نہیں جو وقت کے افکار کے مقابلہ میں اسلام کے موقف کو مستحکم کرتی ہوں۔ حتی کہ جدید افکار کے تعارف کے لیے بھی مقاصد الفلاسفہ جیسی کوئی مستند کتاب تیار نہ کی جاسکی۔

تاہم میں کہوں گا کہ یہ مسئلہ موجودگی رجال کے فقدان کا نہیں ہے بلکہ استعمال رجال کے فقدان کا ہے، یعنی باصلاحیت افراد موجود ہیں۔ مگر غیر صحت مند ماحول کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں اپنا صحیح رخ پانے سے محروم رہیں۔

موجودہ زمانہ کے اخبارات، جرائد اور کتابیں آپ پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے تقریباً تمام علماء اور دانشور ایک ہی نظریہ کو اپنے ذہن میں جگہ دیے ہوئے ہیں، اور وہ سازش (مؤامرات) کا نظریہ ہے۔ ہمارے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے مسلسل یہ بتا رہے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پستی اور مغلوبیت کا سبب صرف اغیار ہیں۔ صلیبی اور صہیونی اور امریکی استعمار کی سازشوں نے ہمارے لیے مصنوعی مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔

ایسی حالت میں ذہن ہمیشہ انکشافِ سازش پر چلے گا نہ کہ دریافتِ حقائق پر۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مفروضہ سازشوں کے "انکشاف" پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر جہاں تک جدید افکار کا تعلق ہے، ان کے مستند تعارف پر بھی کوئی کتاب موجود نہیں، کجا کہ ان افکار کے مقابلہ میں اسلام کی تشریح و تبیین پر کوئی طاقت ور کتاب تیار کی گئی ہو۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ پہلے رخ پر لوگوں کا ذہن خوب چلا، اور دوسرے رخ پر سرے سے ان کا ذہن متحرک ہی نہیں ہوا۔

اسلامی لٹریچر کی ترتیب جدید

دور اول میں جو اسلامی لٹریچر تیار ہوا، وہ سب کا سب دور اقتدار میں تیار ہوا۔ اس کا نتیجہ فطری طور پر یہ تھا کہ وہ زمانی حالات سے متاثر ہوگیا۔ مثال کے طور پر شاتم رسول کی سزا کے مسئلہ پر متعدد کتابیں ہمارے اسلامی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ یہ سب کی سب دور اقتدار میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

ابن تیمیہ الحرانی، الصارم المسلول علی شاتم الرسول

ابن عابدین الشامی، تنبیہ الولاة والحکام علی احکام شاتم خیر الانام

تقی الدین ابوالحسن علی السبکی، السیف المسلول علی من سبّ الرسول

ان کتابوں میں بے دریغ طور پر شاتم رسول کے بارہ میں اسلام کا یہ حکم بتایا گیا ہے کہ وہ بطور حد قتل کیا جائے گا (یُقتل حداً) سب وشتم کرنے والا قتل کیا جائے گا خواہ وہ مسلم ہو یا کافر (ان الساب یُقتل سواء کان مسلماً او کافراً)

یہ کتابیں جب لکھی گئیں، اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ آج کل کی زبان میں وہ واحد سپر پاور کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وقت کا مفتی اور عالم اس پوزیشن میں تھا کہ اس کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ واقعہ بن جائیں۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت یہ تمام کتابیں لکھی گئیں۔

مگر موجودہ زمانہ میں دو ایسی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں جن سے ہمارا قدیم مفتی یا عالم مکمل طور پر بے خبر تھا۔ ایک یہ کہ آج مسلمان مغلوب ہیں اور ہر قسم کا غلبہ ان قوموں کی طرف چلا گیا ہے جن کے مذہب کا اولین مقدس اصول یہ ہے کہ انسان کو لامحدود طور پر اظہار خیال کی آزادی حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اگر کسی کی تصنیف پر اس کو شاتم قرار دے کر اس کے قتل کا فتوی دیں تو فوری طور پر وہ شخص اِن غالب قوموں کا ہیرو بن جاتا ہے۔ یہ قومیں اپنے اعلیٰ وسائل کے ساتھ اس طرح اس کی حمایت پر آجاتی ہیں کہ مسلمان عوام اور خواص سب کے سب ان کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قتل کا فتوی صرف ایک مضحکہ خیز لفظی اعلان بن کر رہ جاتا ہے۔

دوسری اس سے بھی زیادہ شدید بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایک بالکل نئی طاقت ظہور میں آئی ہے جس کو میڈیا کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا، دونوں ہی مکمل طور پر انھیں غالب قوموں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ مسلم علماء کے فتووں کو ساری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر وہ اسلام کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا کہ وہ کوئی وحشیانہ مذہب ہے جو بات بات پر لوگوں کو مارنے اور قتل کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اسلام امن کا مذہب نہیں ہے بلکہ تشدد کا مذہب ہے۔ وغیرہ

اس طرح شاتم کو قتل کرنے کے موجودہ فتوے شاتم کو تو قتل نہ کر سکے۔ البتہ وہ شدید طور پر اسلام کی بدنامی کا سبب بن گئے۔ وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والے (counter-productive) ثابت ہوئے۔

حالاں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس معاملہ میں خود اسلام میں حالات کے اعتبار سے فرق کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہ اور دوسرے حضرات شاتم کی سزا کے جتنے بھی واقعات کا حوالہ دیتے ہیں وہ سب مدنی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی اس دور سے جب کہ اسلام کو با اقتدار حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس مکی دور میں جب کہ اقتدار اعلیٰ اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھا، ابولہب کی بیوی ام جمیل نے علی الاعلان بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذمم کہا (مذمما ابینا) مگر نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاتم کی حد بیان فرمائی اور نہ آپ کے اصحاب دوڑے کہ اس شاتمہ کو قتل کر ڈالیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ قسم کی کتابوں میں بعد کے زمانہ میں پیش آنے والے حالات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتابیں اپنی تمام خوبیوں کے باوجود، موجودہ زمانہ کے اعتبار سے غیر متعلق ہو کر رہ گئی ہیں ـــــــ یہی کم و بیش اس پورے تصنیفی ذخیرہ کا حال ہے جس کو آج اسلامی کتب خانہ کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی مستند تفسیر کو پڑھیے۔ آپ پائیں گے کہ اس میں صبر و اعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے۔ مثلاً القرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں واعرض عن المشرکین کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے : ھو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین (۱۰/۶۲) اسی طرح آیت واصبر وما صبرک الا باللہ کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیت نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہو گئی : ھی منسوخۃ بالقتال (۱۰/۲۰۲)

صبر و اعراض اسلام کا اہم ترین حکم ہے۔ قرآن میں کہیں بالواسطہ انداز میں اور کہیں براہ راست طور پر اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پورا قرآن کتاب صبر ہے۔ مگر جو آدمی تفسیر کی ان کتابوں کو پڑھے اس کا عام تاثر فطری طور پر یہ ہوگا کہ صبر و اعراض کی آیتیں اب صرف تلاوت کے لیے ہیں۔ اب ہم سے متعلق جو قرآنی حکم ہے وہ صرف جہاد و قتال ہے۔ صبر و اعراض کا حکم کمزوری کے دور میں تھا، اب مسلمان طاقتور ہیں۔ اب ہمیں صبر نہیں کرنا ہے، بلکہ لڑ کر غیر اسلامی عناصر کو زیر کرنا ہے۔

اسی طرح حدیث کی کتابیں بے شمار قیمتی تعلیمات سے لبریز ہیں، مگر اپنی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے وہ غلط فہمی کا باعث بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ صحاح ستہ یا حدیث کی اور کوئی مستند کتاب

اٹھا کر دیکھیں، اس میں آپ کو دعوت و تبلیغ کا باب نہیں ملے گا۔ موجودہ کتب حدیث میں، باعتبار ترتیب، ہر قسم کے ابواب ہیں، مگر دعوت و تبلیغ کا باب ان میں سرے سے موجود نہیں۔

جو لوگ ان کتب حدیث کو پڑھتے ہیں، وہ قدرتی طور پر تراجم ابواب کے تحت انھیں پڑھتے ہیں۔ اس طرح ان کو پڑھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے اندر غیر دعوتی ذہن بنتا ہے۔ جہاد و قتال کے ابواب سے تو وہ خوب آشنا ہو جاتا ہے۔ مگر دعوت و تبلیغ کی اہمیت سے وہ یکسر غافل رہتا ہے۔

اسی طرح سیرتِ رسولؐ پر لکھی جانے والی کتابوں کو دیکھئے۔ سیرت کی تقریباً تمام مستند کتابیں غزواتی پیٹرن پر لکھی گئی ہیں۔ ابن ہشام کی مشہور چار جلدوں کی سیرت کا ایک جلد سے کچھ زیادہ حصہ ۱۲ سالہ مکی دور پر ہے، اور بقیہ تقریباً تین جلدیں ۱۰ سالہ مدنی دور پر۔ مدنی دور کے ابواب کی ترتیب سیرت کی تمام کتابوں میں غزوات کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ سیرت کی ابتدائی کتابوں کا نام ہی 'مغازی" ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ بعد کی کتابوں کے نام مغازی پر نہیں رکھے گئے، مگر عملاً سیرت کی تقریباً تمام کتابیں مغازی ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ تک پہنچ کر یہ صورت حال اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابیں، تقریباً بلا استثناء، جنگ آزمائی اور کشورکشائی کی داستان نظر آتی ہیں۔ یہ سیاسی فتح و شکست اور بادشاہوں کی موت و حیات کا بیان ہو کر رہ گئی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے پہلی بار اسلامی تاریخ کی اس کمی کا احساس کیا۔ اور وسیع تر انداز میں اسلام کی جامع تاریخ لکھنا چاہا۔ انھوں نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں کامیابی کے ساتھ اس جدید تاریخ کے اصول مقرر کیے۔ مگر وہ خود بھی اس انداز پر اسلام کی تاریخ مرتب نہ کر سکے۔

بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں (صوفیاء کی غیر معتبر کتابوں کو چھوڑ کر) تقریباً سب کی سب اسی نہج پر تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک معرکۃ الآراء کتاب بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اس میں دین و نظامِ شریعت کا نہایت مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے (صفحہ ۲۱۵)

مگر اس کتاب کا حال یہ ہے کہ اس میں مسواک اور سُترہ تک کے ابواب ہیں۔ مگر اس میں

دعوت و تبلیغ کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اس کے برعکس اس میں جہاد و قتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل بتایا گیا ہے۔ یہ یقینی طور پر زمانی حالات کے زیر اثر ہے۔ کیوں کہ ابدی تناظر میں اسلام کی سب سے بڑی خارجی تعلیم دعوت ہے، اور جہاد (بمعنی قتال) صرف ایک اتفاقی یا نسبتی (relative) عمل ہے۔ یعنی دعوت کا عمل علی الاطلاق طور پر ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ جب کہ جہاد (بمعنی قتال) صرف مخصوص شرائط و احوال میں وقتی طور پر مطلوب ہوتا ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ایک جنگ جو قوم بن گئے ہیں۔ اس جنگ جوئی میں کوئی براہ راست طور پر شریک ہے اور کوئی بالواسطہ طور پر۔ مسلمانوں کے محبوب رہنما اقبال نے اس ذہن کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مسلم نوجوان آج کل ساری دنیا میں گن اٹھائے ہوئے ہیں اور دنیا بھر کے مسلم دانشور اور علماء اس کو عملاً جہاد کہہ کر یا کم از کم خاموش رہ کر اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ان نوجوانوں کا ترانہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

دل میں ہے اللہ کا خوف — ہاتھ میں ہے کلاشنکوف

یہ جنگ جویانہ اسلام یقینی طور پر خدا و رسولؐ کا اسلام نہیں۔ خدا و رسولؐ کا اسلام رحمت کلچر پیدا کرتا ہے نہ کہ گن کلچر۔ پھر اس قسم کا اسلام کہاں سے آیا۔ یہ نظریاتی طور پر اسی لٹریچر سے ماخوذ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ موجودہ زمانہ میں اس پر مزید اضافہ اسلام کی وہ انقلابی تعبیر ہے جو سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے لوگوں نے پیش کی ہے۔ قدیم لٹریچر میں یہ چیز صرف فکری کمی کے درجہ میں تھی، مگر جدید سیاسی اور انقلابی تشریح نے اس میں اضافہ کرکے اس کو فکری برائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات بخوبی طور پر واضح ہوتی ہے کہ ہمارے کتب خانہ کا بیشتر ذخیرہ زمانی حالات کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ اس لیے اس نے آج اپنی مناسبت کھو دی ہے۔ جدید انسانی ذہن کے لیے ان کے اندر سامان اطمینان موجود نہیں۔ اگر ہم اپنی جدید نسلوں کو دوبارہ اسلام کی سچی روح پر اٹھانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس لٹریچر کی مذکورہ کمی کا اعتراف

کریں، اور پھر نیا صحت مند لٹریچر لوگوں کے مطالعہ کے لیے تیار کریں۔ یہ لٹریچر اصلاً قدیم ذخیرہ ہی پر مبنی ہوگا۔ وہ ہرگز اس سے بے نیاز ہو کر تیار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اپنی ترتیب و انداز کے اعتبار سے وہ زمانی اسلوب اور عصری زبان کا حامل ہوگا۔ تاکہ وہ آج کے انسان کے لیے ذہنی خوراک بن سکے۔

مسائل قدیم، دلائل جدید

دار العلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب (۱۹۸۳ - ۱۸۹۵) جو حکیم الامت کے نام سے مشہور ہیں، ان کا ایک طویل مقالہ میں نے پڑھا۔ یہ پورا مقالہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر تھا۔ مگر اس میں مجھے اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملا۔

مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ "اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں، تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافتِ الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں"۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، صفحہ ۸۳

"مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں" ——— یہ بات اگر قرآن کے بارہ میں کہی جائے تو وہ صد فی صد درست ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں یہ حکم آیا ہے کہ مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں (الرجال قوامون على النساء) النساء ۳۴

قدیم علماء نے اس تقسیم کی روایتی توجیہہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ عورت پر مرد کی فضیلت کا سبب یہ ہے کہ وہ عقل اور تدبیر میں عورت پر بڑھا ہوا ہے (والتفضيل للرجال لكمال العقل وحسن التدبير) صفوة التفاسير ۱/۲۷۴

موجودہ زمانہ میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اس توجیہہ کے حق میں نئے سائنسی دلائل پیش کیے جا سکیں۔ جدید بیالوجی (علم الحیاۃ) کے مطالعہ سے ثابت ہوا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان پیدائشی طور پر ہی فرق پایا جاتا ہے۔ عورت کے جسم کے ایک ایک سل (cell) سے لے کر اس کے دماغ کی بناوٹ تک سب کی سب مرد سے مختلف ہوتی ہے۔ اس بنا پر مرد کے مقابلہ میں عورت جذباتی، منفعل مزاج اور ضعیف ہوتی ہے۔ زندگی کے چیلنجوں کا سامنا کرنا اس کے لیے سخت مشکل ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں یہ بالکل فطری ہے کہ گھر اور سماج کے نظام میں مرد کو عورت کے اوپر قوام کا درجہ دیا جائے۔

اس طرح جدید سائنس نے ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم ایک قدیم مسئلہ کے حق میں جدید دلائل پیش کر سکیں اور اس کو از سر نو مدلل کر کے لوگوں کے سامنے لے آئیں۔

مگر "مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں" کا نظریہ فقہ کے بارہ میں کلی طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ قرآن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہے۔ جب کہ فقہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں وقتی اور زمانی ہے۔

مثال کے طور پر ہماری مدون فقہ پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کرتی ہے — دار الاسلام اور دار الحرب۔ دار الاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہو۔ اور دار الحرب وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ نہ ہو۔ اس فقہ کی روشنی میں، مسلمان دار الحرب کے مقابلہ میں امکانی طور پر برسر جنگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاری طیب صاحب کے مذکورہ اصول کے مطابق، اس قدیم فقہی اصول کو جدید دلائل سے آراستہ کر کے دوبارہ مستحکم کیا جانا چاہیے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ طرز فکر یقینی طور پر درست نہیں۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ اس فقہی تقسیم پر نظر ثانی کی جائے، نہ کہ اس کو از سر نو مدلل کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔

قدیم فقہ اور جدید حالات میں فرق کی بنا پر اس طرح کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر جامد تقلید کی بنا پر لوگ نہ تو انھیں سمجھ سکے اور نہ اس کے حل کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

خلاف زمانہ تفکیر

فقہ کی کتابوں میں "دار الحرب" کی جو تعریف کی گئی ہے، اس کو لفظی طور پر لیجئے تو موجودہ دنیا کے تمام ملک دار الحرب قرار پاتے ہیں۔ اور جب کوئی ملک دار الحرب کی حیثیت اختیار کر لے تو خود اسی فقہ کے مطابق، مسلمانوں پر دو میں سے ایک چیز لازم ہو جاتی ہے۔ یا تو جنگ کر کے اس کو دار الاسلام بنائیں۔ یا وہاں سے ہجرت کر کے کسی دار الاسلام میں چلے جائیں۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ مسلمانوں میں جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ اور جہاں تک دوسرے انتخاب (ہجرت) کا سوال ہے تو بقول مولانا شبلی نعمانی :

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں　کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

اس طرح یہ قدیم فقہ ہم کو ایک بند گلی میں لے جاکر چھوڑ دیتی ہے۔ اور مولانا قاری طیب صاحب اور ان کے جیسے حکماء امت یہ کہہ رہے ہیں کہ اس قدیم اصول کو جدید دلائل سے مزین کرکے اس کو دنیا کے سامنے پیش کرو۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے انداز میں یہی کام کیا ہے۔ انھوں نے قدیم مسائل کو جدید دلائل کے لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فکر کو فقہی زبان میں غالباً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ـــــ دار الحرب کے خلاف لڑکر اس کو دار الاسلام میں تبدیل کرو۔

آپ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر کا مطالعہ کریں تو اس کا خلاصہ آپ کو یہ ملے گا کہ ـــــ مسلمان کا اصل مشن خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ کام اقتدار کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے تم اٹھو اور اہل اقتدار سے اقتدار کی کنجیاں چھین لو۔ جس طرح ٹرین کو اس کا انجن چلاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی گاڑی کو اہل اقتدار چلاتے ہیں۔ اگر تم زندگی کی گاڑی کو اسلامی رخ پر چلانا چاہتے ہو تو تمھیں اپنی طاقت کو منظم کرکے اقتدار کے انجن پر قبضہ کرنا چاہیے۔

مولانا مودودی اور ان کے جیسے انقلابی مفکرین کے خیالات سے متاثر ہوکر مسلم نوجوان آج کل دنیا میں جگہ جگہ گن کلچر چلا رہے ہیں تاکہ "دار الحرب" کو دار الاسلام میں تبدیل کرسکیں۔ خود مولانا مودودی نے اپنی زندگی کے آخری بہترین سالوں میں پاکستان میں یہی کیا۔ وہ "اقتدار کی کنجیاں" چھیننے میں سرگرم رہے یہاں تک کہ ۱۹۷۹ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۴۷ میں پاکستان پہنچ کر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے پہلے لیاقت علی خاں سے اقتدار کی کنجیاں چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جنرل ایوب خاں سے اور پھر ذوالفقار علی بھٹو سے۔ مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں ان کی زندگی ہی میں اقتدار کی کنجیاں ان کے ایک ہم فکر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ میں آگئیں، جن کے متعلق مولانا مودودی سے لے کر مولانا علی میاں تک تمام اسلام پسندوں نے گواہی دی کہ وہ ایک مرد صالح ہیں۔ مگر پاکستان کو دار الاسلام بنانے کا خواب بدستور بے تعبیر رہا۔ اس کے بعد مولانا مودودی کی جماعت کے اشتراک سے پاکستان میں "اسلامی محاذ" بنا۔ اس نے الکشن میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور اقتدار کی کنجیاں پوری طرح اسلام پسند گروہ

کے ہاتھ میں آگئیں۔ مگر اب بھی پاکستان کو دار الاسلام بنانا ممکن نہ ہو سکا۔

یہ شدید ناکامی اس لیے پیش آئی کہ یہ اسلام پسند لوگ صرف ماضی کی فقہ کے دائرہ میں سوچتے رہے۔ وہ جدید تبدیلیوں سے باخبر نہ ہو سکے۔ ان لوگوں کا ذہن، قدیم فقہاء کی طرح، الناس علی دین ملوکھم کے دور میں بنا تھا۔ قدیم زمانہ میں ایک شخص (بادشاہ) کے ہاتھ میں اقتدار کی تمام کنجیاں ہوتی تھیں۔ جب کوئی چھیننے والا اس سے اقتدار کی کنجیاں چھیننے میں کامیاب ہوتا تو عین اسی وقت یہ کنجیاں ایک ہاتھ سے نکل کر مستقل طور پر دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ جاتی تھیں۔ اس قدیم روایت کے تحت انھوں نے سب سے زیادہ سیاسی اقتدار کی کنجیاں چھیننے پر زور دیا۔

لیکن دور جدید کی تبدیلیوں سے گہری واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ قدیم زمانہ اگر الناس علی دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں) کا زمانہ تھا، تو موجودہ زمانہ الناس علیٰ دین عصرھم (لوگ اپنے زمانہ کے دین پر ہوتے ہیں) کا زمانہ ہے۔ اب سیاسی حکمراں کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے جو انتخابی جمہوریت کی وجہ سے عملاً صرف چند سال کے لیے حکومت میں آتا ہے نہ کہ قدیم بادشاہوں کی طرح ساری عمر کے لیے۔

اسی طرح موجودہ زمانہ میں دوسرے غیر سیاسی عوامل زیادہ فیصلہ کن حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب اقتدار کی کنجیوں میں سے ایک کنجی صرف وقتی طور پر سیاسی حکمراں کے ہاتھ میں آتی ہے، اور بقیہ تمام کنجیوں پر دوسروں کا قبضہ مستقل طور پر باقی رہتا ہے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ہی کی طرح، ہمارے بیشتر علما اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک مغربی اقتدار کے خلاف ایک بے حد مہنگی جنگ لڑی گئی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ ہندستان سے اگر مغرب کا سیاسی اقتدار ختم ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسلم ممالک آزاد ہو جائیں گے۔

موجودہ صدی کے وسط میں آزادی کا یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ لیکن اب تمام علما اور دانشور اس شکایت اور احتجاج میں مشغول ہیں کہ مغرب نے مسلم دنیا کے اوپر اپنا خطرناک تر تہذیبی حملہ (cultural invasion) کر رکھا ہے۔ مگر احتجاج کی یہ مہم دراصل زمانۂ جدید سے اپنی بے خبری کا اعلان ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے علما اور رہنما یہ نہ جان سکے کہ موجودہ دور پچھلے تمام

زمانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اب جدید وسائل نے قوموں کو یہ موقع دے دیا ہے کہ اگر آپ انھیں خشکی سے نکالیں تو وہ سمندروں کے راستہ سے داخل ہو جائیں گے۔ اگر آپ انھیں اپنی زمین میں داخل نہ ہونے دیں تو وہ آسمان سے اپنا راستہ نکال لیں گے۔ اگر آپ ان سے سیاسی اقتدار کی کنجیاں چھین لیں تو وہ بہت سی دوسری کنجیاں پالیں گے جن سے وہ آپ کے گھروں اور بستیوں کے اندر داخل ہو جائیں۔ حتی کہ جدید ترقیوں نے غیر قوموں کو یہ برتر حیثیت دے دی ہے کہ اگر آپ انھیں اپنے ملکوں سے پوری طرح نکال دیں تو آپ کے بہترین نوجوان خود اپنی مرضی سے پرواز کر کے دوبارہ انھیں کے شہروں میں چلے جائیں گے تاکہ ان کے زیر سایہ اپنے لیے ایک پسندیدہ زندگی حاصل کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا زمانہ تھا۔ قدیم زمانہ میں نقلی دلائل کسی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے، اب عقلی دلائل کی اہمیت بڑھ گئی۔ قدیم معقولات کی بنیاد قیاس پر قائم تھی، جدید معقولات کی بنیاد بدیہیات پر قائم ہے۔ قدیم علم کلام داخلی اسلامی فرقوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا۔ جدید علم کلام خارجی گمراہیوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ قدیم دور روایتی تکنیک کا دور تھا، اب سائنٹفک ٹکنالوجی کا دور دنیا میں آگیا ہے۔ قدیم زمانہ محدود معاشروں کا زمانہ تھا، اب جدید کمیونی کیشن نے ساری دنیا کو ایک واحد بستی بنا دیا ہے۔ قدیم زمانہ میں مالیات کا انحصار زراعت پر ہوتا تھا، اب مالیات کا سب سے زیادہ تعلق انڈسٹری سے ہو گیا ہے۔ قدیم زمانہ میں سیاست سب سے زیادہ غالب شعبہ تھا، اب بے شمار جدید ذرائع نے سیاست کے شعبہ کو ایک ماتحت شعبہ کی حیثیت دے دی ہے۔ وغیرہ۔

اجتہادی کوتاہی کے نتائج

مجتہدانہ بصیرت سے خالی ہونے کا نقصان سب سے پہلے ملت کو نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑائی میں بھگتنا پڑا۔ اصل صورت حال سے عدم واقفیت کے نتیجہ میں عرصہ تک یک طرفہ قربانی دی جاتی رہی، جب کہ ان قربانیوں کا کوئی بھی فائدہ ملت کے حصہ میں آنے والا نہ تھا۔

جس وقت مغربی استعمار کا مسئلہ پیدا ہوا، ساری دنیا کے مسلم علماء پر روایتی اور تقلیدی ذہن چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ جب مغربی قومیں مسلم دنیا میں داخل ہوئیں تو اس کو انھوں نے ویسا ہی ایک سیاسی

دائرہ سمجھا جیسا سیاسی دائرہ اس سے پہلے بار بار مسلم دنیا میں پیش آیا تھا۔ وہ اپنے روایتی ذہن کے تحت اس کے سوا کچھ اور نہ سوچ سکے کہ ماضی کے مماثل واقعات کی طرح اس کو بھی محض سیاسی جارحیت کا ایک واقعہ سمجھیں، اور دوبارہ اسی انداز کی دفاعی تدبیر اختیار کریں جو اس سے پہلے اس طرح کے مواقع پر اختیار کی گئی تھی۔

ہمارے علماء اگر زمانہ کی تبدیلیوں سے واقف ہوتے اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لے سکتے تو وہ کہتے کہ مغربی قوموں کا پیدا کردہ مسئلہ سادہ معنوں میں صرف سیاسی جارحیت (political aggression) کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک علمی اقدام (scientific advancement) کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ بروقت اس راز کو جان لیتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ وقتی طور پر تم ان کی سیاسی بالادستی کو گوارہ کرلو، اور جن علوم کی طاقت سے وہ آگے بڑھ رہے ہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کرو۔

یہ ٹھیک وہی تدبیر ہوتی جس کو اس سے پہلے خود ہمارے مقابلہ میں یورپ کی صلیبی قوموں نے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کو قبول کرکے ان کے علوم کو سیکھنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ان میں اضافہ کرکے خود تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی قوموں کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ٹکرانے کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ سیکھنے اور تیاری کرنے کا مسئلہ تھا۔ مگر مجتہدانہ صلاحیت سے محرومی کی بنا پر ہمارے علماء مسلمانوں کو یہ رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔

اگر ہمارے رہنما بروقت اس اجتہادی بصیرت کا ثبوت دیتے تو آج مسلم دنیا کی تاریخ اسی طرح عظمت کی تاریخ ہوتی جس طرح ماضی میں صلیبیوں کی تاریخ دوبارہ عظمت کی تاریخ بنی۔ اور جس کا ایک جدید نمونہ ہمیں جاپان کی صورت میں نظر آتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں جاپان پر امریکہ کی سیاسی اور فوجی برتری قائم ہوگئی۔ مگر جاپان کے دانشور طبقہ نے فوری طور پر یہ جان لیا کہ امریکہ کی فوجی اور سیاسی بالادستی کسی "سازش" کا نتیجہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جاپان کے مقابلہ میں امریکہ نے سائنس اور ٹکنالوجی میں برتری حاصل کرلی ہے اور جاپان اس اعتبار سے امریکہ سے پیچھے چلا گیا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے امریکہ کو یہ موقع دیا کہ وہ جاپان کو شکست دے کر اس پر قابض ہوجائے۔ جاپان نے اس فکری رہنمائی کی روشنی

میں امریکہ کی سیاسی اور فوجی بالادستی کو نظر انداز کیا اور اپنی ساری توجہ سائنسی تعلیم پر لگادی۔ اس کا نتیجہ حیرت ناک طور پر جاپان کی موافقت میں نکلا ——— نصف صدی سے بھی کم مدت میں مفتوح نے فاتح کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا۔

انیسویں صدی کے علماء اگر مجتہدانہ بصیرت کے حامل ہوتے تو وہ اپنے لحاظ سے اسی قسم کا کام کرتے جو صلیبیوں اور جاپانیوں نے اپنے لحاظ سے کیا۔ وہ جہاد کا فتویٰ دینے کے بجائے علم کا فتوی دیتے۔ وہ جنگی تیاری کے بجائے قوم کو علمی تیاریوں کی طرف متوجہ کرتے۔ وہ دین کے ضروری تحفظ کے ساتھ تمام مسلم قوموں کو علوم جدیدہ کے حصول میں لگادیتے۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلتا اس کے بارے میں کسی فرضی قیاس کی ضرورت نہیں۔ اولاً یورپ اور پھر جاپان کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے ہمارے لیے اس معاملہ میں واضح تاریخی مثال قائم کر دی ہے اور کوئی بھی صاحب نظر آدمی اس تاریخ کا مطالعہ کرکے اس معاملہ کو بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے۔

اجتہاد کے سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ کسی مخصوص صورت حال سے نمٹنے کے لیے اگر کوئی ایسی عملی تجویز پیش کی جائے جو ایک طرف مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی ہو اور دوسری طرف اسلام کے روح و مزاج سے بھی ہم آہنگ یا غیر متصادم ہو تو اسے ایک مجتہدانہ رائے قرار دیا جائے گا۔ خواہ اس کو پیش کرنے والا کافر اور اسلام کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ نیز ایسی رائے کو قبول کرنا اہلِ اسلام کے لیے درست بلکہ وقت کا عین مطلوب ہوگا۔ یہی بات شاطبی نے ان لفظوں میں لکھی ہے :

"وقد اجاز النظار وقوع الاجتهاد فى الشريعة من الكافر المنكر لوجود الصانع والرسالة والشريعة ، اذ كان الاجتهاد انما ينبنى على مقدمات تفرض صحتها كانت كذلك فى نفس الأمر أولاً" (الموافقات ۴/۵۸)

اسی لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندستان کے اکابر علماء اور مسلم دنیا کے علماء کی اکثریت نے خلافت تحریک کے زمانے میں تشدد کے مقابلہ عدم تشدد کی پالیسی کو عملاً اختیار کیا جو ایک غیر مسلم کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔

یہ بات عین فطری ہے۔ کیوں کہ اجتہاد کا تعلق امور آخرت سے نہیں ہے بلکہ امور دنیا سے ہے۔ اور امور دنیا میں کسی بھی شخص سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

تقلید کے نقصانات

اجتہاد کا بدل تقلید ہے۔ جہاں اجتہاد کا عمل بند ہوگا وہاں تقلید کا عمل جاری ہوجائے گا، اور تقلید انسانی صلاحیتوں کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان جس الم ناک صورتِ حال سے دوچار ہیں اس کی کوئی ایک وجہ بتانا ہو تو بلاشبہ وہ یہی ہوگی کہ اجتہاد کا دروازہ بند کرکے امت کو تقلید کے اندھیرے میں ڈال دیا گیا۔

اجتہاد کا عمل رکنے سے جو خرابیاں آتی ہیں ان میں سے ایک ہلاکت خیز خرابی یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے دین کے نئے امکانات کو دریافت کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو جو دین دیا گیا ہے وہ ایک ابدی دین ہے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہے کہ وہ ہر آنے والے دور کی امکانیات کو سموئے ہوئے ہے۔ ان مخفی امکانیات کو مجتہدانہ بصیرت ہی کے ذریعہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب اجتہاد کو ممنوع ٹھہراکر تقلید کو رائج کردیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس واحد دروازہ ہی کو بند کردیا گیا جس کے ذریعہ مسلمان اپنے دین کے نئے نئے امکانات تک پہنچ سکتے تھے۔

قرآن میں بہت سی آیتیں استقبال کے صیغہ میں ہیں۔ مثال کے طور پر تمام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم (آیندہ) ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (حم السجدہ ۵۳)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریلؑ آئے اور یہ خبر دی کہ آیندہ فتنے اٹھیں گے۔ آپ نے جبریل سے پوچھا کہ اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ خدا کی کتاب۔ اس میں آپؐ سے پہلے کی خبریں ہیں اور آپؐ کے بعد جو کچھ پیش آئے گا اس کی بھی خبریں ہیں (فیہ نبأ ما قبلکم ونبأ ما ھو کائن بعدکم) اور یہ کہ قرآن کے عجائب ختم نہ ہوں گے (ولا تنقضی عجائبہ)

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ قرآن میں اللہ نے اولین اور آخرین کے علم کو جمع کردیا ہے اور جو ہوا اور جو ہوگا ان سب کا علم بھی (جمعَ اللّٰہ فی ھذا الکتاب علمَ الاولین والآخرین وعلمَ ما کان وعلمَ ما یکون) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۸/ ۴۶۴

جب خدا کے بھیجے ہوئے دین میں قیامت تک کی باتیں چھپا دی گئی ہیں تو لازم ہے کہ وہ ہر دور میں ظاہر ہوتی رہیں۔ مگر یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ پچھلے چھ سو سال سے مسلم دنیا کوئی بھی ایسی کتاب پیش نہ کرسکی جس کو تخلیقی عمل (creative works) کہا جاسکے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اجتہاد کے مسئلہ پر کتاب لکھتے ہیں اور اس کا نام خالص تقلیدی انداز میں عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید رکھتے ہیں۔ غالباً آخری تخلیقی کتاب جو مسلم دنیا پیش کرسکی وہ مقدمہ ابن خلدون ہے۔ اس کے بعد پچھلے چھ سو سال کے اندر جو کتابیں لکھی یا چھاپی گئی ہیں وہ تقریباً سب کی سب روایتی اور تقلیدی انداز میں ہیں۔ نہ کہ تخلیقی اور اجتہادی انداز میں۔

مثال سے اس معاملہ کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، موسیٰ کا ہم زمانہ مصری بادشاہ سمندر میں غرق کر دیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے کہ اللہ نے اس فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ——— : "پس آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں" (یونس ۹۲)

اس آیت میں ایک حتمی اعلان تھا کہ فرعون کا جسم معجزاتی طور پر محفوظ رکھا جائے گا، تاکہ اہل اسلام اس کو استعمال کر کے بعد کی انسانی نسلوں کے سامنے کتاب الٰہی کی صداقت کا اظہار کرسکیں۔ یہ علمی خزانہ مصر کے اہرام میں محفوظ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ مصری علماء صرف اتنا ہی جان سکے کہ یہ بلند اہرام "لعنۃ الفراعنۃ" کے حامل ہیں۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں اور کسی بھی مسلم عالم کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ خدا کی اس چھپی ہوئی نشانی سے پردہ اٹھائے اور قرآن کی ایک ناقابل انکار صداقت کے طور پر اس کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

سب سے پہلے ایک فرانسیسی اسکالر پروفیسر (Loret) نے ۱۸۹۸ء میں فرعون کے اس محفوظ جسم کو اہرام کے اندر سے نکالا۔ پھر اس ممی کیے ہوئے جسم کو لاکر قاہرہ کے میوزیم میں رکھا گیا۔ اس کے بعد پہلی بار ۸ جولائی ۱۹۰۷ء کو پروفیسر اسمتھ (Elliot Smith) نے اس جسم کے غلاف کو کھول کر اس کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور پھر وہ کتاب لکھی جو حسب ذیل نام سے مشہور ہے :

The Royal Mummies (1912)

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی پہلا شخص جس نے اس دریافت شدہ مواد کو صداقت اسلام کے لیے استعمال کیا وہ صرف ایک فرانسیسی عالم ڈاکٹر موریس بکائی تھا۔ وہ جون ۱۹۷۵ میں قاہرہ گیا۔ وہاں اس نے براہ راست طور پر میوزیم میں اس کا مطالعہ کیا۔ حتی کہ اس معاملہ کی کامل تحقیق کے لیے اس نے عربی زبان سیکھی، تاکہ قرآن میں موسیٰ اور فرعون کے قصہ کو براہ راست مطالعہ سے سمجھ سکے۔ ان سب کے بعد اس نے اپنی شاہکار تصنیف فرانسیسی زبان میں لکھی۔ جس کا ترجمہ اب مختلف عالمی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی پیشین گوئی کو واقعاتی طور پر ثابت کرنے والا صرف ایک فرانسیسی عالم تھا۔ اسی کو یہ توفیق ملی کہ وہ اس کی بابت یہ پر اہتزاز بیان (thrilling statement) تاریخ میں ثبت کر سکے کہ وہ لوگ جو مقدس کتاب کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں۔ وہاں وہ قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پالیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے متعلق ہیں:

> Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo (p. 241)

موجودہ زمانہ میں جب مہلک جنگی ہتھیار وجود میں آئے تو ساری دنیا میں جنگ کو برا سمجھا جانے لگا۔ تمام سنجیدہ لوگوں کی نظر میں جنگ ایک ناپسندیدہ چیز بن گئی۔ کیوں کہ جدید ہتھیاروں کے بعد جنگ اب صرف تباہی کی چیز بن چکی تھی۔

ایسے ماحول میں یہ کہا جانے لگا کہ اسلام اب نئے دور کے لیے غیر متعلق (irrelevant) ہو چکا ہے۔ دور جدید میں وہ کوئی تعمیری رول ادا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اسلام کا انحصار جنگی طاقت پر ہے، اور جنگی طاقت میں اب سرے سے کوئی تعمیری رول ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

اس نئے ماحول میں ضرورت تھی کہ اسلام کی امن کی طاقت کو دلائل و شواہد سے واضح کیا جائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم ذہن صرف مدافعت کرنے میں مشغول رہے۔ انھوں نے اسلامی جنگ کے قوانین پر موٹی موٹی کتابیں لکھ ڈالیں۔ پہلا شخص جس نے

اسلام کی امن کی طاقت، یا دوسرے لفظوں میں، اسلام کی دعوتی طاقت کو منظم اور مدلل انداز میں پیش کیا، وہ ایک عیسائی اسکالر ڈاکٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ تھے۔ انھوں نے لمبی محنت کے بعد ۱۸۹۶ء میں اپنی کتاب دعوت اسلام (The Preaching of Islam) چھاپی۔ اس کتاب میں انھوں نے نہایت مسکت انداز میں دکھایا کہ اسلام کی سب سے بڑی طاقت اس کی نظریاتی طاقت ہے، اور یہ نظریاتی طاقت خود اپنے آپ میں یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ انسانوں کو مسخر کر سکے۔

اسی طرح موجودہ زمانہ میں جب سائنسی حقائق ظاہر ہوئے اور سائنس کی عظمت لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئی تو اس کی ضرورت پیدا ہوئی کہ خدا کے دین کی صداقت کو سائنس کی سطح پر از سرِ نو مدلل کیا جائے۔ یہاں بھی کوئی مسلم اسکالر اس ضرورت کو پورا کرنے والا نہ بن سکا۔ پہلی بار جس نے اس کام کو وقت کے علمی معیار پر انجام دیا، وہ فرانسیسی اسکالر موریس بوکائی تھا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس کی اس کتاب کا نام یہ ہے :

Maurice Bucaille, The Bible, The Quran, and Science (1976)

اسی طرح جدید ذوق کے مطابق ضرورت تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو خالص تاریخی معیار پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہاں بھی مسلم علماء اور دانشور اس ضروری کام کو انجام نہ دے سکے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم سیرت نگاروں نے سیرت پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ تقریباً سب کی سب اعتقادی انداز میں ہیں نہ کہ جدید مفہوم کے مطابق، علمی انداز میں۔

اس ضرورت کو بھی پہلی بار جس شخص نے پورا کیا وہ ایک مسیحی ڈاکٹر مائیکل ہارٹ تھا جس نے تاریخ کے سو بڑے انسانوں پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اور اس میں دکھایا کہ پوری بشری تاریخ میں جو سب سے زیادہ کامیاب انسان پیدا ہوا وہ محمد بن عبد اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے :

Michael H. Hart, The 100 (1978)

صحیح البخاری (کتاب الجہاد) میں یہ روایت ہے کہ اللہ فاجر شخص کے ذریعہ بھی اس دین کی مدد کرے گا (ان الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر) فتح الباری ۲۰۸/۶

مذکورہ تاریخی واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں اس حدیث رسول پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ رجل فاجر کے اندر اگر اجتہادی اسپرٹ ہو تو وہ [illegible]

دے گا۔ اور رجل مومن اگر اجتہادی اسپرٹ سے خالی ہو جائے تو اس دنیا میں وہ کوئی بھی بڑا کام نہیں کر سکتا، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو سرتاج انسانیت اور امام قافلۂ بشری ہی کیوں نہ سمجھ رہا ہو۔

پیغمبر اسلام کی سنتیں

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کتابی صورت میں مدون کیے گئے تو اس وقت کے علما نے کچھ چیزوں کو "سنن" کے ابواب کے تحت درج کیا اور کچھ چیزوں کو دوسرے دوسرے عنوانات کے تحت اپنی کتابوں میں جمع کر دیا۔

قدرتی طور پر یہی کتابیں بعد کو دین کا ماخذ بن گئیں۔ لوگوں نے ان کتابوں میں جن چیزوں کو سنت کے نام سے پڑھا ان کو سنت سمجھا۔ اور جن چیزوں کو ان کتابوں میں بطور سنت درج نہیں کیا گیا تھا ان کو شعوری طور پر فہرست سنت سے خارج سمجھ لیا۔ اس طرح داڑھی اور ازار اور مسواک جیسی چیزوں کو تو سنت سمجھا جانے لگا۔ اور دوسری بہت سی چیزیں ان کے ذہن میں سنت کی حیثیت سے جگہ نہ پا سکیں، حالاں کہ وہ بھی بلاشبہ سنت رسول تھیں۔ بعد کو جب کھلے ذہن سے سوچنے کا ذوق ختم ہو گیا اور تقلیدی ذہن ہی تمام لوگوں کے اوپر چھا گیا تو یہ غلطی مزید پختہ ہو کر عوام و خواص کے ذہنوں پر چھا گئی۔

یہاں اس نوعیت کی چند سنتیں بطور مثال درج کی جاتی ہیں۔ جو اگرچہ سنت ہیں اور نہایت اہم سنت ہیں۔ مگر قدیم کتابوں میں بطور سنت درج نہ ہونے کی بنا پر عملاً وہ ہماری فہرست سنت سے خارج ہو گئی ہیں۔

۱۔ صحیح البخاری میں ایک باب ہے جس کے الفاظ ہیں "باب فضلِ مکۃَ و بنیانِہا" یعنی مکہ کی فضیلت کا اور اس کی تعمیر کا باب۔ اس باب کے تحت حضرت عائشہ کی روایت نقل کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ایک بار کعبہ کی دیواریں گر گئیں۔ اس کے بعد مشرکین نے کعبہ کی عمارت کو دوبارہ بنایا۔ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ لمبا تھا۔ مگر مشرکین کے پاس چونکہ سامان کم تھا، انھوں نے نئی تعمیر میں کعبہ کو چوکور کر دیا۔ اور اس کا ایک حصہ خالی چھوڑ دیا جو اب حطیم کہا جاتا ہے

روایت بتاتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (فتح مکہ کے بعد) کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، آپ کیوں نہیں اس کو دوبارہ ابراہیمی اساس کی طرف لوٹا دیتے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ تمہاری قوم ابھی جلد ہی جاہلیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ ان کے دلوں میں ناگواری پیدا کرے گا (فاخاف ان تنکر قلوبهم) فتح الباری ۳/۱۴-۱۳-۵۱۳

موجودہ فہرست بندی میں ایک قاری اس روایت کو پڑھے گا تو وہ اس کو فضیلت مکہ یا قصۂ کعبہ کے خانہ میں ڈال کر آگے بڑھ جائے گا۔ اس سے وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی رہنمائی نہیں لے سکے گا۔ حالانکہ اس روایت میں ایک عظیم حکمت اور عظیم رہنمائی موجود ہے۔ اس پیغمبرانہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں آدمی کو آئیڈیل کے بجائے پریکٹیکل کو دیکھنا چاہیے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ وہ سچے اہل ایمان کے ساتھ معاملہ کر رہا ہو جیسا کہ اصحاب رسول تھے۔

اجتماعی زندگی میں معاملہ کرتے ہوئے بار بار ایسا پیش آتا ہے کہ ایک صورت وہ ہوتی ہے جو اس معاملہ میں آئیڈیل صورت ہوتی ہے۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ اگر آئیڈیل یا معیاری حل پر اصرار کیا گیا تو بات مزید بگڑ جائے گی۔ ایسی حالت میں پیغمبرانہ سنت یہ ہے کہ معیاری حل پر اصرار نہ کیا جائے، بلکہ عملی حل کو قبول کر لیا جائے۔

آزادانہ غور وفکر کا ماحول ہو تو آدمی اس سنت رسول کو دریافت کرے گا جس میں بیشمار فوائد چھپے ہوئے ہیں۔ اور اگر قدیم ذخیرہ پر آزادانہ غور وفکر کا ماحول نہ ہو تو وہ اس عظیم سنت سے آگاہ نہ ہو سکے گا۔ اور نتیجۃً اس کے دور رس فائدوں سے بھی محروم رہے گا۔

۲۔ انھیں "نامعلوم" سنتوں میں سے ایک سنت وہ ہے جس کو سنت حدیبیہ کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس عظیم سنت رسول سے اتنا زیادہ بے خبر ہیں کہ اگر اس کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے تو عوام سے لے کر خواص تک یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تو بزدلی اور پسپائی ہے :

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ایک ثابت شدہ سنتِ رسولؐ سے یہ اجنبیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سنت کو سیرت

کی کتابوں میں غزوۃ الحدیبیۃ کے تحت درج کیا گیا ہے (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۲/۲۱۲)

حدیبیہ کا واقعہ مختصر طور پر یہ ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کا مقصد عمرہ کرنا تھا۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے مشرکین نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

یہ ایک بڑی نازک صورت حال تھی۔ یقینی معلوم ہوتا تھا کہ اگر آپ نے مکہ میں داخلہ پر اصرار کیا تو جنگ کی نوبت آ جائے گی اور پھر جان و مال کی ہلاکت کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوگا۔ اس وقت آپ نے قریش مکہ سے گفت و شنید جاری کر دی۔ اس کا نتیجہ دونوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ یہ دراصل ایک ناجنگ معاہدہ (no-war pact) تھا جس کی بیشتر دفعات بظاہر قریش کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ اس کے باوجود آپ اس صلح نامہ پر دستخط کر کے مدینہ واپس آ گئے۔

یہ معاہدہ چودہ سو سال سے کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر تمام عوام و خواص اس کو بس "غزوۃ الحدیبیۃ" کا ایک معاملہ سمجھتے ہیں، کیونکہ کتابوں میں وہ اسی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ ایک امن کا معاہدہ تھا اور امن کی طاقت کو استعمال کرنے کی ایک عظیم تدبیر۔

اس معاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عمل (Islamic activism) ایک پر امن عمل ہے۔ اسلامی عمل تشدد کی طاقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ امن کی طاقت پر مبنی ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر جنگ اور ٹکراؤ کی حالت قائم ہو جائے تو اسلام کی طاقت امن کا ظہور رک جائے گا۔ اس لیے اہل ایمان کو ایسا کرنا چاہیے کہ جب دونوں فریقوں میں اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جائے تو وہ فریق ثانی کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان کر اس سے صلح کر لیں۔ تاکہ وہ فضا پیدا ہو جس میں اسلام کی امن کی طاقت کو بروئے کار آنے کا موقع مل جائے۔

یہ ایک عظیم حکمت ہے۔ اس حکیمانہ عمل میں، قرآن کی شہادت کے مطابق، فتح مبین کا راز چھپا ہوا ہے۔ مگر موجودہ مسلمان اس تسخیری سنت کو اختیار کرنے سے محروم ہیں، اور اس کی سادہ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے تقلیدی ذہن کی وجہ سے اس کو سنت رسول کے طور پر جانتے ہی نہیں۔

۳- اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب کہا جاتا ہے۔ یہ غزوہ شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ اس میں بارہ ہزار کی نہایت مسلح فوج نے مدینہ کو گھیر لیا تھا۔ یہ نہایت سخت معاملہ تھا۔ قرآن میں اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے کہ جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ جب خوف سے آنکھیں پتھرا گئیں۔ کلیجے منہ کو آ گئے۔ اور تم لوگ اللہ کے بارہ میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور وہ بری طرح ہلا مارے گئے (الاحزاب ۱۰-۱۱)

اس وقت مسلمان مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ چنانچہ شہر کے باہر خندق کھود کر ٹکراؤ سے بچنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم مسئلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ شدید محاصرہ کی یہ حالت تقریباً ۲۵ دن تک جاری رہی۔ اس انتہائی مشکل موقع پر ایک مسلمان نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس کا نام نُعیم بن مسعود تھا۔ نعیم بن مسعود نے رات کے وقت آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور کہا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کو دونوں طرف کا اعتماد حاصل ہے۔ ایک طرف میں سچے دل سے مسلمان ہو چکا ہوں۔ دوسری طرف سابقہ تعلق کی بنا پر ابھی تک قریش اور یہود میری عزت کرتے ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بھاگ جاؤ، تم ہمارے دشمن کے ایجنٹ ہو۔ بلکہ آپ نے خوش ہو کر فرمایا : انما انت فینا رجل واحد (سیرۃ ابن ہشام ۲۴۰/۳) یعنی تم تو ہمارے درمیان ایک ہی ایسے آدمی ہو۔ چنانچہ آپ نے اس آدمی کو استعمال کیا، اور اس نے ایک ایسی حکیمانہ تدبیر کی کہ دشمن محاصرہ ختم کر کے واپس چلے گئے۔ اس معاملہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نُعیم بن مسعود نے اس موقع پر وہی رول ادا کیا جس کو درمیانی (intermediary) شخص کا رول کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ "درمیانی شخص" کی عزت کی جائے۔ اس کے اوپر بھروسہ کیا جائے۔ اور اس کو باہمی معاملات کی اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان چونکہ "سنت رسول" کی کتابوں میں اس سنت کو لکھا ہوا نہیں پاتے، اس لیے وہ اس سنت سے واقف بھی نہیں ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اس کا زبردست نقصان بھگتنا پڑا ہے۔ سرسید احمد خان گویا مسلمانوں اور انگریزوں کے بیچ میں درمیانی شخص تھے۔ مگر ہمارے علماء ان کی قدر نہیں کرسکے بلکہ ان کی تکفیر و تفسیق کر کے انہیں مسلم معاشرہ سے کاٹنے کی کوشش کی۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ میں درمیانی شخص بن گئے تھے۔ مگر سنتِ نبوی سے اس ناواقفیت کی بنا پر ان کو بھی مسلمانوں نے مشتبہ سمجھا اور انھیں "شوبوا ہے" کا لقب دے کر ذلیل کیا۔ اس طرح مسلمان ان فوائد سے محروم ہو گئے جو مولانا آزاد کے ذریعہ انھیں اس ملک میں پہنچ سکتے تھے۔

اسی طرح ساری مسلم دنیا میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی قوموں اور مسلمانوں کے بیچ میں درمیانی گروہ بن گیا تھا۔ ان کے ذریعہ مسلمان بہت سی مضرتوں سے بچ سکتے تھے اور بہت سے فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ساری دنیا کے مذہبی طبقہ نے ان کو شبہ کی نظر سے دیکھا۔ اور انھیں مغرب زدہ قرار دے کر ان کو دشمنوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

اسپین کی تاریخ برعکس صورت میں

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ اجتہادی بصیرت سے محرومی کی بنا پر موجودہ صدی میں ہمارے ساتھ جو المیہ پیش آیا، یہی برعکس صورت میں مسیحی چرچ کی بے بصیرتی کے نتیجہ میں اسپین میں ان کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ محض ایک سیاسی داخلہ نہ تھا، وہ نئے علوم اور نئی ٹکنیک کا داخلہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسپین میں صرف اپنی سیاسی بالادستی قائم نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے غیر معمولی محنت سے ملک کی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے اسپین کو ہم عصر یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔

لیکن اس زمانہ کے مسیحی علماء ٹھیک اسی طرح اجتہادی بے بصیرتی کا شکار تھے جس طرح مسلم علما انیسویں صدی میں اجتہادی بے بصیرتی میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان مسیحی علماء نے اپنے ملک میں مسلمانوں کے سیاسی داخلہ کو تو دیکھا مگر وہ ان کے اس پہلو کو نہ دیکھ سکے کہ وہ جدید علمی اور فنی ترقیوں کے نقیب (harbinger) بن کر یہاں آئے ہیں۔ اپنی اس بے بصیرتی کو انھوں نے مسلمانوں کے اوپر انڈیل دیا اور انھیں اپنے ملک سے نکالنے کی مجنونانہ کوشش شروع کر دی۔ جب کہ مقامی اسپینیوں کی علمی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ مسلمان جب مجبورانہ طور پر اسپین سے واپس آگئے تو ان کی چھوڑی

رصدگاہوں کا کوئی مصرف اسپینی مسیحیوں کو معلوم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان رصدگاہوں کو چرچ کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دیا۔

نومبر ۱۹۹۴ میں میں نے اسپین کا سفر کیا تھا۔ میں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اسپین دوسرے ترقی یافتہ یورپی ملکوں کے مقابلہ میں کمتر درجہ کا ملک نظر آتا ہے۔ جب کہ آٹھ سو سال پہلے وہ جدید ترقیات کا ہراول بنا ہوا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء اسپینی مسلمانوں کے علمی پہلو کو نہ دیکھ سکے۔ وہ صرف ان کے سیاسی پہلو کو دیکھ کر ان کے ساتھ منتقمانہ لڑائی لڑنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں خود یورپ کے انصاف پسند مفکرین نے اعتراف کیا ہے کہ اسپین اگر مسلمانوں کے ساتھ سیاسی انتقام میں نہ پڑتا اور ان کی لائی ہوئی علمی اور فنی ترقیوں میں شریک ہو جاتا تو آج بلاشبہ اسپین براعظم یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہوتا۔

انیسویں صدی میں جس مجتہدانہ رہنمائی کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ مسلم علماء یہ فتویٰ دیتے کہ یورپی قوموں سے سیاسی ٹکراؤ کو نظر انداز کرو اور اس کے بجائے ایک طرف ان قوموں کو پر امن انداز میں دعوت حق کا مخاطب بناؤ، اور دوسری طرف جدید تعلیم اور ریسرچ میں ان کے شریک بن جاؤ۔ اس طرح ایک طرف اسلام کی اشاعت ہوتی۔ اور دوسری طرف مسلمان جدید علوم اور جدید ترقیوں میں دوبارہ اپنا وہ سفر شروع کر دیتے جو پندرھویں صدی میں اسپین میں ختم ہو گیا تھا۔ مگر مجتہدانہ بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے یہ سارا امکان استعمال ہونے سے رہ گیا۔

موجودہ زمانہ میں جب مغربی قومیں مسلم علاقوں میں گھس گئیں تو مسلم علماء نے قدیم روایات کے مطابق، ان کے خلاف تیر اور تلوار اکٹھا کیے اور ان سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ان کا یہ اقدام کامل شکست اور تباہی کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس المیہ کا سبب مغربی قوموں کی سازشیں نہیں تھیں، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، بلکہ خود مسلم رہنماؤں کی اجتہادی نااہلی تھی۔

اصل یہ ہے کہ ہتھیار کا تعلق زمانی حالات سے ہے۔ قدیم زمانہ کا حریف چونکہ تیر اور تلوار سے مسلح ہو کر آتا تھا اس لیے ہمارے اسلاف نے تیر اور تلوار سے مسلح ہو کر اس کا بھرپور مقابلہ کیا۔ لیکن مغربی استعمار کا معاملہ قدیم حریفوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پچھلے کئی سو سال کے عمل کے نتیجہ میں خود قوت کے معیار کو بدل دیا تھا۔ اب قوت کا سرچشمہ علم تھا نہ کہ تلوار۔ مسلم رہنما اگر

اس راز کو جانتے تو وہ کہتے کہ نئے حریف سے مقابلہ کرنے کے لیے علم کی قوت فراہم کرو۔

موجودہ زمانہ میں بعض سیکولر مسلمانوں نے مسلمانوں کو جدید علوم کے حصول کی طرف متوجہ کیا اور اس سلسلہ میں قرآن کی ان آیتوں کا حوالہ دیا جن میں علم کا ذکر ہے۔ لیکن ہمارے علماء نے یہ بحث چھیڑ دی کہ قرآن میں علم سے مراد علم دین ہے نہ کہ جدید طبیعی علوم جو یورپ کے راستہ سے آرہے ہیں۔ ہمارے علماء کم از کم دو سو سال تک اس غیر متعلق بحث میں الجھے رہے یہاں تک کہ مسلم قوم علوم جدیدہ میں ساری دنیا سے پچھڑ گئی۔

ہمارے علماء اجتہاد کا دروازہ بند کرکے اگر اپنے آپ کو مجتہدانہ بصیرت سے محروم نہ کر چکے ہوتے تو وہ کہہ سکتے تھے کہ جدید علوم کی اہمیت اگرچہ قرآن کی آیتِ علم سے نہیں نکلتی مگر وہ قرآن کی آیت قوت سے پوری طرح نکل رہی ہے۔ یہ علوم دورِ جدید کی قوت ہیں اس لیے قرآن کے حکم (اعداد قوت) کے مطابق، ہمیں چاہیے کہ ان کو بھرپور طور پر حاصل کریں۔

موجودہ زمانہ میں ایک عجیب منظر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ مسلمان جو دورِ زراعت میں دنیا کی امامت کر رہے تھے وہ دورِ صنعت میں ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ گئے۔ اس منظر کی توجیہہ عام طور پر صرف ایک کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہ المیہ صلیبیوں اور صہیونیوں کی سازش کی بنا پر پیش آیا ہے۔ اسی ذہن کی ترجمانی کرتے ہوئے ۸۰ سال پہلے شبلی نعمانی نے کہا تھا:

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

آج بھی مسلمانوں کے تمام اخبار و رسائل خواہ وہ اُردو کے ہوں یا عربی کے یا کسی اور زبان کے، سب کے سب "نظریۂ سازش" کی تفصیلات سے بھرے رہتے ہیں۔ مگر یہ نظریہ نہ صرف لغو ہے بلکہ وہ قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ قرآن میں صاف طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں آدمی جو کچھ بھگتتا ہے وہ صرف اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس پس ماندگی کا واحد سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن ہے۔ مسلمان جدید علوم میں پیچھے ہو گئے، اس لیے وہ جدید صنعت میں بھی پیچھے ہو گئے، اور جدید صنعت میں پیچھے ہونے کے نتیجہ میں وہ دورِ جدید کے ہر شعبہ میں پچھڑ کر رہ گئے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں تمام چیزوں کا تعلق علم سے ہو گیا ہے۔ (باقی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۱

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

دلیل نبوت

رمضان کا مہینہ اسلام میں روزہ کا مہینہ ہے۔ قرآن میں صوم رمضان کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر وہ فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳)

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا یا بڑا مذہب ایسا نہیں ہے جس میں روزہ کا تصور موجود نہ ہو۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر روزہ کا رواج پایا جاتا ہے۔ انسانی معاشروں کے ایک مغربی عالم نے لکھا ہے کہ یہ مشکل ہوگا کہ کسی بھی ایسے مذہبی نظام کی نشاندہی کی جائے جس میں روزہ (fasting) کو بالکل ہی نہ مانا گیا ہو:

It would be difficult to name any religious system of any description in which it is wholly unrecognized. (X/193)

مزید یہ کہ عرب قبائل میں اس زمانہ میں جو مذہب تھا اس میں روزہ کا رواج پایا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے مشرکانہ سماج میں روزہ کا کوئی رواج موجود تھا:

We have no evidence of any practice of fasting in pre-Islamic pagan Arabia. (p. 133)

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مذکورہ الفاظ محض سادہ الفاظ نہیں۔ بلکہ وہ دلیل نبوت ہیں۔ مواصلات اور معلومات کے جدید دور سے چودہ سو سال پہلے عرب کا ایک آدمی ہرگز یہ نہیں جان سکتا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ کا رواج کسی نہ کسی طرح پایا جاتا ہے۔ جب کہ حال یہ تھا کہ اپنے قریبی معاشرہ میں وہ ایسے عمل کا مشاہدہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے پیغمبر تھے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو اُس وقت آپ کو اس عالمی واقعہ کی خبر دے سکے۔

رمضان کا روزہ

روزہ کا مہینہ روحانی تزکیہ کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ خدا سے قریب ہونے کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ ان صفات کی تربیت کا خصوصی مہینہ ہے جو کہ اسلام میں مطلوب ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں روزہ (فاسٹنگ) کے باب کے تحت درج ہے کہ اسلام میں رمضان کے مہینہ کو توبہ کے مہینہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور صبح سے شام تک مکمل فاقہ کیا جاتا ہے:

The month of Ramadan in Islam is observed as a period of penitence and total fasting from dawn to dusk. (IV/62)

توبہ بلاشبہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کو حدیث میں نبی التوبہ کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵ر۱۰۵) توبہ اسلام کے پورے نظام سے اتنا زیادہ جڑا ہوا ہے کہ روزہ سمیت، کوئی بھی اسلامی عمل اس کی روح سے خالی نہیں۔

تاہم قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو خاص حکمت بتائی گئی ہے، وہ شکر اور تقویٰ ہے۔ قرآن کے مطابق، رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شکر اور تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔ (البقرہ)

قرآن کا ابتدائی نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس بنا پر وہ اہل ایمان کے لئے شکر گزاری کا مہینہ قرار پایا۔ کیوں کہ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہے کہ اس نے قرآن کی شکل میں وہ ہدایت نامہ اتارا جو انسان کے لئے سچا رہنما بن سکے۔

تقویٰ سے مراد محتاط زندگی ہے۔ انسان کے لئے دونوں جہان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں ہمیشہ احتیاط والا طریقہ اختیار کرے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے، اور روزہ کے ذریعہ لوگوں کو اسی محتاط زندگی کی تربیت دی جاتی ہے۔

روزہ سلف ڈسپلن کی سالانہ مشق ہے۔ روزہ اختیار کے باوجود بے اختیاری کا ایک تجربہ ہے۔ اسی آدمی کا روزہ سچا روزہ ہے جو روزہ کے عمل سے اس قسم کی ذاتی تربیت پا کر نکلے۔ جس کا روزہ اس کو حقیقی معنی میں شاکر اور متقی بندہ بنا دے۔

بے حساب اجر

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ۱۰)

کہو کہ اے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کریں گے ان کے لیے نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع ہے۔ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے کہ کسی عمل پر بے حساب اجر دینے کا اعلان کیا جائے۔ قرآن میں اس قسم کا غیر معمولی اعلان صرف ایک عمل کے لیے کیا گیا ہے، اور وہ صبر کا عمل ہے۔

صبر کی اصل حبس ہے۔ یعنی روکنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: صبرتُ عن کذا (میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا۔ یا صبرتُ عما احبّ (جس چیز کو میں پسند کرتا ہوں اس سے میں نے اپنے آپ کو روکا)

عمل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے حد پر عمل کرنا۔ دوسرا ہے حد کے باہر جا کر عمل کرنا۔ ایک شخص آپ کے ساتھ حسن سلوک کرے اور آپ بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ یہ معمول کا کردار ہے۔ اس میں صبر و برداشت کا مرحلہ پیش نہیں آتا۔ یا آپ نے ایسے دین کو اختیار کر رکھا ہے جس میں آپ کے سب معاملات درست رہیں تو یہ گویا ایک حد پر رہ کر دین دار بننا ہے۔

عمل کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں مطلوب دینی رویہ پر قائم رہے، خواہ صورت حال اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ یہ صابرانہ عمل ہے۔

یعنی دوسرا آدمی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ اس سے معتدل انداز میں کلام کریں۔ حق پر قائم رہنے میں بظاہر آپ کا معاملہ بگڑتا ہو تب بھی آپ حق اور انصاف سے نہ ہٹیں، بظاہر بے اصولی اختیار کرنے میں فائدہ نظر آتا ہو تب بھی آپ پوری طرح با اصول بنے رہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں بے حساب انعام دیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے صبر کی قیمت پر دینی عمل کیا۔

۶ الرسالہ فروری ۱۹۹۶

حدیث کا مطالعہ

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِی بَکْرٍ قَالَتْ۔ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّی وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِی عَھْدِ قُرَیْشٍ۔ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اُمِّی قَدِمَتْ عَلَیَّ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ اَفَاَصِلُھَا۔ قَالَ نَعَمْ صِلِیْھَا (متفق علیہ)

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میری (رضاعی) ماں میرے پاس مدینہ آئیں۔ اس وقت وہ شرک پر تھیں اور وہ قریش کی حلیف تھیں۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، میری مشرک ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ مجھ سے کچھ چاہتی ہے۔ کیا میں انھیں صلہ رحمی کے طور پر کچھ دوں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، ان کو دو۔

یہ حدیث بظاہر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارہ میں ہے، خواہ وہ مشرک اور کافر ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث کی کتابوں میں وہ اسی طرح کے باب کے تحت لکھی ہوئی ملے گی۔ مگر کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے "ترجمۂ باب" کو دیکھنا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ حدیث کے متن پر گہرائی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی آدمی کے اوپر اس کے پورے معانی کھل سکتے ہیں۔

اس حدیث سے حقوق والدین کے مسئلہ کے علاوہ مزید یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان خاتمۂ جنگ کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مکہ کے مشرکین مدینہ آنے لگے اور مدینہ کے مسلمان مکہ جانے لگے۔

عقل عام یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اس آمد و رفت میں صرف "صلہ رحمی" کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ شرک اور توحید پر گفت گو ہونے لگی۔ آبائی مذہب اور پیغمبرانہ مذہب کا تقابل کیا جانے لگا۔ توہم پرستانہ مذہب اور الہامی مذہب کا فرق لوگوں پر واضح ہونے لگا۔

اس طرح یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کی تدبیر نے جنگی ماحول کو دعوتی ماحول میں تبدیل کر دیا۔ مکہ اور مدینہ میں جہاں اس سے پہلے تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی، وہ دعوت حق کی آوازوں سے گونجنے لگے، اور جب ایسا ہو جائے تو اسلام کی فتح اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنا کہ تاریکیوں کی دنیا میں سورج کے طلوع ہونے سے سورج کا فتح یاب ہونا۔

بہتر انسان

عن ابی ھریرۃ ، اَنَّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقفَ علیٰ ناسٍ جلوسٍ فقال: اَلا اُخبرکم بخیرکم مِن شرّکم۔ قال فسکتوا۔ فقال ذلک ثلاث مرات۔ فقال رجل بلیٰ یا رسولَ اللّٰہ اخبِرنا بخیرنا وشرّنا۔ قال: خیرُکم مَن یُرجیٰ خیرُہٗ ویؤمَن شرُّہٗ۔

(رواہ الترمذی، کتاب الفتن)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ایک مجلس کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا میں تم کو تمہارے اندر اچھے اور برے شخص کے بارہ میں نہ بتاؤں۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگ چپ رہے۔ تب آپ نے تین بار یہی بات کہی۔ پھر ایک شخص نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول، آپ ہم کو ہمارے اچھے اور برے کے بارہ میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: تم میں اچھا وہ شخص ہے جس سے اس کے خیر کی امید کی جائے اور جس کے شر سے لوگ سلامت ہوں۔

یہ حدیث نہایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اچھا آدمی کون ہے اور برا آدمی کون ہے۔ اچھا آدمی وہ ہے جس کے بارہ میں پیشگی طور پر یقین کیا جا سکے کہ جب بھی اس سے کسی کا سابقہ پیش آئے گا تو اس کو اس آدمی سے خیر ہی کا تحفہ ملے گا۔ اس سے جن لوگوں کو بھی تجربہ ہوگا درست قول اور نیک عمل ہی کا تجربہ ہوگا۔ کوئی بھی چیز اس کو اس پر آمادہ نہیں کرے گی کہ وہ لوگوں کے ساتھ خیر کے بجائے شر کا معاملہ کرنے لگے۔

ایسے آدمی کے اندر بلاشبہ شر بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کو بھی دوسروں کی طرح خلاف مزاج بات ناپسند ہوتی ہے۔ اشتعال انگیز بات پر اس کو بھی غصہ آتا ہے۔ اس کے اندر بھی نفرت اور عداوت کا طوفان جاگتا ہے۔ اس کو بھی نقصان اور زیادتی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ اپنی اصولی حیثیت پر قائم رہتا ہے۔

وہ نفسیاتی جھٹکوں کو اپنے اوپر سہتا ہے۔ وہ خود کڑوا گھونٹ پی کر دوسروں کو میٹھا گھونٹ پلاتا ہے۔ وہ زیادتی کے واقعات کو اللہ کے خانہ میں ڈال دیتا ہے تاکہ اس کا ذہنی سکون بھنگ نہ ہو، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مقصدِ اعلیٰ کے لیے اپنی سرگرمی کو جاری رکھ سکے۔

اعتدال کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر عمل بیچ کا عمل ہے (خیر الامور اوسطہا) حضرت علیؓ کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ تم درمیانی طریقہ اختیار کرو (علیکم بالنمط الاوسط) تفسیر قرطبی ۲/۱۵۴

بیچ کے عمل سے مراد اعتدال کا عمل ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن کی اس آیت میں ہے کہ خرچ کرنے کے معاملہ میں تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ (بنی اسرائیل ۲۹) اسی بات کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا کہ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (الفرقان ۶۷)

اس آیت کے مطابق، انفاق اوسط یہ ہے کہ نہ بہت زیادہ نہ بہت کم۔ بلکہ درمیانی مقدار جس کو آسانی کے ساتھ آدمی اختیار کر سکے —— اسی طرح نفل روزے، نفل نمازوں وغیرہ میں بھی یہ مطلوب ہے کہ آدمی بیچ کا راستہ اختیار کرے جس کو وہ دیر تک نباہ سکتا ہو۔

اس معتدل انداز کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر معاملہ میں آدمی کو افراط اور تفریط سے بچنا ہے۔ ہر معاملہ میں دو انتہاؤں کے درمیان بین بین والی صورت اختیار کرنا ہے۔ یہی طریقہ دینی مزاج کے مطابق ہے اور اسی میں کامیابی ہے۔

یہ درمیانی طریقہ دوسرے لفظوں میں غیر جذباتی طریقہ ہے۔ کوئی صورت حال پیش آنے پر جب آدمی بے قابو ہو جائے تو وہ اعتدال پر نہیں رہتا، بلکہ ایک انتہا یا دوسری انتہا کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی اپنے جذبات کو قابو میں رکھے تو وہ سوچ کر اپنی کارروائی کا رخ متعین کرے گا۔ اور سوچ سمجھ کر کیا ہوا عمل معتدل عمل ہی ہوتا ہے۔ غیر معتدل آدمی دوستی میں بھی حد سے گزر جائے گا اور دشمنی میں بھی حد سے باہر چلا جائے گا۔ وہ کبھی ضرورت سے زیادہ پر امید ہو جائے گا اور کبھی ضرورت سے زیادہ مایوس۔ وہ غیر ضروری طور پر کسی کو بہت اچھا سمجھ لے گا اور کسی کو بہت زیادہ برا —— لیکن قدرت کا فیصلہ ہے کہ اس دنیا میں معتدل آدمی کامیاب ہو اور غیر معتدل آدمی ہمیشہ ناکام۔

نماز باجماعت

عن عبدِ الله بن عمرَ أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلاة الجماعة تفضُلُ صلاةَ الفذِّ بسبع وعشرين درجةً

(موطا الامام مالک ۹۳)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. جماعت کے ساتھ نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ۲۷ درجہ افضل ہے۔

نماز کی مطلوب کیفیات جماعت کی نماز میں بڑھ جاتی ہیں. اس لئے اس کا ثواب بھی اللہ کے یہاں تنہا نماز کے مقابلہ میں زیادہ ہو جاتا ہے۔

جماعت کی نماز کے لئے آدمی کو پہلے سے سوچنا پڑتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے۔ اب مجھ کو مسجد چلنا چاہئے۔ اس طرح نمازی کا ذہن پیشگی طور پر عبادت کی سوچ میں لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ ہر قدم اس کو یاد دلاتا ہے کہ تم خدا کی عبادت کے لئے جا رہے ہو۔ اس طرح گویا وہ نماز سے پہلے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔

مسجد میں اس کو نماز کا پورا ماحول ملتا ہے. یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں اکیلا نمازی نہیں ہوں. بلکہ میں ایک وسیع نمازی برادری میں شامل ہوں۔ پہلے اس کی حیثیت اگر صرف نماز پڑھنے والے کی تھی تو اب اس کی حیثیت نماز قائم کرنے والے کی بن جاتی ہے۔

پھر جماعت کی نماز خود اپنے اندر عظیم ثواب رکھتی ہے۔ اکیلے کی نماز میں گویا کہ وہ اپنا امام آپ تھا۔ یہاں اس نے دوسرے کی امامت میں نماز ادا کر کے مزید تواضع اور خشوع کا ثبوت دیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اپنے انفرادی اسلام کا احساس تازہ کیا تھا۔ جماعت کی نماز میں اس نے دوسرے ہم مذہبوں کے ساتھ اجتماعی اسلام کا زندہ تجربہ کیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے ایک فرد کی سطح پر فیضان خداوندی کو پایا تھا، جماعت کی نماز میں وہ پورے مجموعہ پر اترنے والے فیضان خداوندی میں شریک ہو گیا۔

اسی کے ساتھ جماعت کی نماز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آدمی مسجد کے مقدس ماحول میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جڑ جاتا ہے۔ وہ ان سے سیکھتا بھی ہے اور ان کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ ان سے پاتا بھی ہے اور انھیں دیتا بھی ہے۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اگر صرف نماز ادا کی تھی تو جماعت کی نماز میں وہ پورے اسلام کو ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔

تہجد کی حقیقت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ : ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لك. یعنی رات کو تہجد پڑھو ، یہ نفل ہے تمہارے لئے (الاسراء ۷۹)

عربی زبان میں نافلہ کے معنی زائد کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ نافلۃ وہ ہے جو اصل سے زائد ہو (والنافلۃ ما کان زیادۃ علی الاصل) لسان العرب ۱۱/۶۷۱

اس اعتبار سے نافلۃ لک کا مطلب ہوگا زائدۃ لک۔ یعنی تہجد کی نماز تمہارے لئے پانچ نمازوں پر زائد ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے پانچ نمازوں کو اپنے بندوں کے اوپر فرض قرار دیا ہے (خمس صلوات فرضھن اللہ علی العباد) اور تہجد کی نماز کی حیثیت زائد نماز کی ہے۔

یہ انسان کی ایک فطری خواہش ہے کہ جس سے اس کو قلبی لگاؤ ہو اس کے معاملہ میں وہ مقرر فرائض سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا ہے۔ تہجد کی نماز بندہ کی اسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہے۔ عمومی طور پر اس صلاۃ زائد کا بہترین وقت رات کا آخری پہر ہے۔ اس وقت آدمی ایک نیند لیکر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ان پرسکون لمحات کو کچھ دیر کے لئے خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فجر سے پہلے چند رکعت نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

مگر بعض انسانوں کے احوال کے اعتبار سے اس صلاۃ زائد کے لئے دوسرے اوقات بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص رات کو دیر میں سویا۔ اس کی نیند دیر میں کھلی۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ اب وہ اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ ایسے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاۃ زائد کو اپنے ان پرسکون لمحات میں ادا کرے۔

زائد کا یہ اصول ہر معاملہ میں ہے۔ تجدید کلمہ گویا شہادت زائد ہے۔ تہجد اسی طرح صلاۃ زائد ہے۔ نفل روزہ صوم زائد ہے۔ انفاق عام کی حیثیت زکاۃ زائد کی ہے۔ عمرہ گویا حج زائد ہے۔ یہی معاملہ تمام اسلامی اخلاق اور اسلامی اعمال کا ہے۔

عمل زائد میں ایک خاص لذت ہے جو عمل زائد ہی میں ملتی ہے، کسی اور طرح اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

الرسالہ فروری ۱۹۹۶

مسجد سے مسجد

اسلام آباد سے شائع ہونے والے عربی مجلہ الدراسات الاسلامیہ (جولائی ۔ ستمبر ۱۹۹۵) میں فرانس میں اسلام کے بارہ میں ایک تفصیلی رپورٹ چھپی ہے ۔ اس ذیل میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کے ایک ممتاز شخص نے اسلام قبول کیا ۔ ان کا موجودہ نام دانیال یوسف لوکلیک Le Cleck ہے۔ قبول اسلام کے بعد وہ جماعت تبلیغ کے ساتھ وابستہ ہو گئے ۔ انھوں نے ان کی ایک جماعت کے ساتھ پیدل سفر کر کے حج کیا ۔

اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ انگلینڈ سے چل کر وہ یورپ کے مختلف ملکوں سے گزرے ۔ پھر وہ ترکی میں داخل ہوئے ۔ پھر اردن وغیرہ ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچے ۔ یہ لمبا سفر کس طرح طے ہوا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے رپورٹ میں یہ الفاظ ہیں کہ : مارّاً من مسجد الی مسجد (صفحہ ۱۳۶) یعنی وہ مسجدوں سے گزرتے رہے ، ایک مسجد سے دوسری مسجد ، دوسری سے تیسری مسجد ۔ اس طرح ایک کے بعد ایک مسجدوں میں ٹھہرتے ہوئے وہ مکہ پہنچ گئے ۔

یہ سادہ الفاظ ایک اہم حقیقت کو بتا رہے ہیں ۔ تبلیغی جماعت کی کامیابی کا ایک خاص راز یہ ہے کہ اس نے ملت کے اندر موجود ڈھانچہ کو استعمال کیا ۔ اگر وہ اپنے دینی کام کی یہ شرط رکھتے کہ پہلے دنیا کا سیاسی نظام ان کے موافق ہو جائے ، اس کے بعد وہ اپنا دینی مقصد پورا کر سکیں گے تو وہ نظام حاضر سے ٹکراؤ شروع کر دیتے ۔ اور اس طرح نامعلوم مدت تک کسی مثبت آغاز سے محروم رہتے ۔ مگر جب انھوں نے مسجد کے موجود ڈھانچہ میں اپنا کام شروع کیا تو پہلے ہی دن ان کو نقطۂ آغاز مل گیا ۔ کیوں کہ مسجدیں تو بے شمار تعداد میں ساری دنیا میں پہلے سے بنی بنائی موجود تھیں ۔

اس دنیا میں کام کے دو طریقے ہیں ۔ ایک ہے سیاسی طریقہ ، اور دوسرا ہے دعوتی طریقہ ۔ سیاسی طریقہ سب سے زیادہ سیاسی نظام کو بدلنے پر زور دیتا ہے ۔ کیونکہ اس کے نزدیک جب تک سیاسی طاقت قبضہ میں نہ آئے کوئی مثبت کام انجام نہیں دیا جا سکتا ۔

اس کے برعکس دعوتی کام موجودہ نظام کو توڑے بغیر اپنے لیے کام کا راستہ نکالتا ہے ۔ اس طرح اس کو اول دن ہی سے اپنے کام کا آغاز مل جاتا ہے ۔ اس کا ہر قدم آگے بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے ۔

دو طریقے

ایک قصہ ہے کہ ہوا میں اور سورج میں مقابلہ ہوا۔ ہو ا نے کہا کہ میں زیادہ طاقت ور ہوں۔ سورج نے کہا کہ میں زیادہ طاقت ور ہوں۔ یہ بحث ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر دونوں نے طے کیا کہ کسی معاملہ کو لے کر دونوں اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں۔ پھر دونوں میں سے جو جیتے وہ زیادہ طاقت ور مانا جائے۔

صبح کا وقت تھا۔ کھلے میدان میں ایک شخص کمل اوڑھے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ دونوں نے کہا کہ آؤ، اس آدمی پر ہم اپنی طاقت کو آزمائیں۔ جو اس آدمی کا کمل ہٹا دے وہ زیادہ طاقت ور تسلیم کیا جائے گا۔

پہلے ہوا میدان میں آئی۔ اس نے تیز جھکڑ چلایا، اس نے آندھی کا طوفان برپا کر دیا۔ مگر جب آدمی نے ہوا کا طوفان دیکھا تو اس کو ڈر ہوا کہ میرا کمل کہیں اڑ نہ جائے۔ اس نے اور زیادہ اپنے کمل کو لپیٹ لیا۔ ہوا اس میں ناکام ہو گئی کہ وہ کمل کو آدمی سے جدا کر دے۔

اس کے بعد سورج نے اپنا عمل شروع کیا۔ اس نے تیزی کے بجائے آہستگی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی کرنیں فضا میں پھیلانا شروع کیا۔ آدمی کو کسی قدر گرمی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنے کمل کو ڈھیلا کر لیا۔ یہاں تک کہ جب گرمی بڑھی تو اس نے کمل اپنے جسم سے ہٹایا اور اس کو لپیٹ کر اپنی گردن پر ڈال لیا۔

یہ تمثیلی قصہ نرمی اور سختی کے فرق کو بتاتا ہے۔ معاملات میں نرمی کا طریقہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور سختی کا طریقہ ناکامی کی طرف۔

نرمی سے آپ کسی آدمی کے دل کو جیتتے ہیں اور سختی سے اس کو دور کر دیتے ہیں۔ کسی کے برے سلوک کو معاف کر کے آپ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس کے برعکس برائی کے جواب میں برائی یا اینٹ کے جواب میں پتھر کا طریقہ اختیار کر کے اس کے اندر ضد اور انتقام کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا (ان اللہ یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف)

غسل اسلام میں

اسلام میں قلب و روح کی پاکی کے ساتھ جسم کی پاکی پر بھی بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پاکیزگی آدھا ایمان ہے (الطہور نصف الایمان) نماز اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ کوئی نماز جسمانی پاکی کے بغیر قبول نہیں کرتا (لا یقبل اللہ صلاۃً بغیر طہور) ہر نماز کے ساتھ وضو کو لازم قرار دیا گیا جو گویا کہ آدھا غسل ہے۔

جہاں تک مکمل جسمانی غسل کا تعلق ہے تو حدیث کی کتابوں میں طہارت کے ابواب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عام طور پر روزانہ غسل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں فجر سے پہلے غسل کا عام رواج تھا۔ اس واقعہ کو حدیث کے کسی بھی مجموعہ میں کتاب الطہارۃ کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ ہر دن ایک بار غسل کرتے تھے (کان عثمان یغتسل کل یوم مرۃً) ہر روز صبح کو غسل کرنا انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ یہ فطری تقاضا یقینی طور پر اسلام میں بھی شامل ہے جو کہ حقیقی معنوں میں فطرت کا دین ہے۔

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو ایک روایت سے اشتباہ پیش آیا ہے۔ صحیح البخاری میں روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ جمعہ کے دن لوگ دور دور سے چل کر مدینہ آتے تھے۔ چنانچہ وہ غبار آلود ہوتے تھے اور ان کے جسم سے پسینہ نکل رہا ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر ان کے ایک آدمی سے کہا: لو أنکم تطہّرتم لیومکم ھذا (فتح الباری ۲/۴۴۷) یعنی کاش تم اپنے آج کے دن اپنے آپ کو پاک کر لیتے۔

اس حدیث کا کوئی تعلق روزانہ غسل یا ہفتہ وار غسل سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ ہے کہ آج تم بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھو گے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو گے۔ ایسے اجتماعی موقع کا تمہیں لحاظ کرنا چاہیے اور نہائے بغیر اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ موقع کے اعتبار سے غسل کی خصوصی اہمیت کا بیان ہے نہ کہ غسل کے وقت اور میعاد کا تعین۔

شکر اور ناشکری

پانی کے ایک گلاس سے لیکر حکومتی اور سیاسی اقتدار تک جو کچھ اس دنیا میں کسی کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی کسی کو ملتا ہے وہ اللہ کے چاہنے سے ملتا ہے۔ اللہ نہ چاہے تو کچھ بھی کسی کو نہیں مل سکتا، خواہ وہ بطور خود اس کے لئے کتنا ہی زور مارے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن و حدیث سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہے۔

دوسری چیز جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خدائی عطیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خصوصی عطیہ۔ اور دوسرے عمومی عطیہ۔ خصوصی عطیہ کو آجکل کی زبان میں سیاسی اقتدار کہا جاسکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔ اور نہ وہ پولٹیکل تحریک یا گن گھپر چلا کر کسی کو حاصل ہوتا۔ اس کا تعلق براہ راست سنت اللہ سے ہے۔ اس سنت اللہ میں سے ایک یہ ہے کہ جو گروہ حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا ثبوت دے اس کے لئے سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے (النور ۵۵) گویا اقتدار مطلوب ہو تب بھی اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی تحریک چلانا ہے نہ کہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا معرکہ جاری کرنا۔

اس کے بعد خدا کا عمومی عطیہ وہ ہے جو کم و بیش ہر ایک کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ اصولی طور پر دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے ـــــ پر امن حالات اور حصول رزق کی آسانی۔ یہ بات قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتی ہے:

وضرب اللہ مثلا قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یاتیہا رزقہا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقہا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون (النحل ۱۱۲)	اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن اور اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔

اعتراف

سب سے بڑا عمل اعتراف ہے۔ اعتراف کی حیثیت جڑ والی صفت کی ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ ہو، اس کے اندر دوسری تمام خوبیاں بھی موجود ہوں گی۔ جو آدمی اعتراف سے خالی ہو، وہ یقینی طور پر تمام خوبیوں سے بھی خالی ہوگا۔

یہ اعتراف کا مادہ ہی ہے جو کسی آدمی کو ایمان کی طرف لے جاتا ہے جو کہ دین کی اصل بنیاد ہے۔ جس کو شریعت کی زبان میں ایمان کہا جاتا ہے، اسی کا نام فطرت کی زبان میں اعتراف ہے۔ اعتراف کی فطرت جب ایمان میں ڈھل جائے تو وہیں سے دینی یا اسلامی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اعتراف ہی کی عملی صورت کا نام عبادتِ خداوندی ہے۔

اعتراف کا مادہ ہی آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پیغمبر کی پیغمبری کو مانے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ پیغمبر اس کے لئے قابل اطاعت نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے اپنی پوری زندگی میں پیغمبر کے حکم کی پیروی کرنا چاہئے۔

قرآن کو خدا کی کتاب سمجھنا اور حدیث کو پیغمبرِ خدا کے کلام کا درجہ دینا بھی اسی جذبۂ اعتراف کی بنا پر ہوتا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کا جذبہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی اس حیثیت کو تسلیم کرے جو فی الواقع اسے حاصل ہے۔

اسی طرح انسانوں کے حقوق کی ادائگی کا معاملہ بھی اعتراف سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دراصل جذبۂ اعتراف ہی ہے جو آدمی سے یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا حق جو تمہارے اوپر آتا ہے اس کو تم پوری طرح ادا کرو۔ احترام، شفقت، امانت، صبر، شریفانہ اخلاق، وعدہ پورا کرنا، لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا، اس قسم کی جتنی بھی اعلیٰ انسانی خصوصیات ہیں، ان سب کا سرچشمہ اعتراف ہے

اسی طرح تمام بری صفات کا رشتہ بے اعترافی سے بندھا ہوا ہے۔ ایمان پر راضی نہ ہونا بے اعترافی ہے۔ کسی انسان کے ساتھ حسد اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اس کے فضل کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ آدمی خیانت اسی لئے کرتا ہے کہ وہ نہیں مانتا کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ دوسرے کی ہے۔

دعوہ ہاٹ لائن

"ہیلو، کیا کوئی صاحب وہاں ہیں جو میری بات کا جواب دیں۔ میں ایک امریکن یہودی ہوں، اور اسلام کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے امریکہ کی کئی مسجدوں میں ٹیلیفون کیا۔ مگر کہیں سے مجھے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ میں صرف اسلام کے بارہ میں معلومات چاہتا ہوں"

یہ ایک ٹیلیفون کال تھی جو اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کے دفتر واقع جمیکا میں موصول ہوئی۔ ٹیلیفون پر موجود شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق جواب دیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کی کالیں اکثر امریکہ کی مسجدوں میں موصول ہوتی ہیں۔ مگر بروقت مسجد میں کسی موزوں شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے کال کرنے والے کو صحیح اور موثر جواب نہیں مل پاتا۔ یا سرے سے وہاں کوئی شخص موجود نہیں ہوتا جو ٹیلیفون کرنے والے کو ضروری اطلاع دے۔

آخر کار یہ واقعہ مذکورہ اسلامک سنٹر (اکنا) کے دفتر میں ہاٹ لائن ٹیلیفون نصب کرنے کا محرک بن گیا۔ ۱۹۹۵ میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام دعوہ ہاٹ لائن ہوگا۔ اور اس کا نمبر اس طرح ہوگا: (1-800-662-ISLAM) اس لائن پر کوئی نہ کوئی تربیت یافتہ آدمی ہر وقت موجود رہے گا۔ اور پوچھنے والوں کو اسلام کے بارہ میں ضروری معلومات فراہم کرے گا۔ فی الحال اس مقصد کے لئے مذکورہ مرکز نے دو ہمہ وقتی کارکنوں کی خدمات حاصل کی ہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے اسلام کا اچھا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس منصوبہ کا ابتدائی خرچ ایک لاکھ ڈالر (۳۰ لاکھ روپیہ) ہے (دعوت، ۱۳ جولائی ۱۹۹۵)

قدیم زمانہ میں داعی کو مدعو کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اب موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ مدعو خود داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے شہری مراکز میں ایسے انتظامات کئے جائیں جہاں سے لوگ ٹیلیفون پر اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کر سکیں۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو غیر مسلموں کے اعلیٰ طبقہ میں اسلام کا پیغام پہنچنے لگے۔

ایک واقعہ

مسٹر عبد المجیط خاں (ریٹائرڈ جوائنٹ ڈائرکٹر) آجکل فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۹۵ کی ملاقات میں انھوں نے اپنی سروس کے زمانہ کے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ ان میں سے ایک تجربہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مسٹر اے ایم خان نے ۱۹۵۵ میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے الکٹریکل انجینئرنگ میں بی ای کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۳ میں چندولی (ضلع بنارس) کے پرائیویٹ پالی ٹکنیک میں ایک جگہ خالی ہوئی۔ یہ سینئر لکچرر کی جگہ تھی۔ اسی کے ساتھ کامیاب امیدوار کو الیکٹریکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا عہدہ بھی سنبھالنا تھا۔

اس کا انٹرویو بنارس کے کمشنر جے بی ٹنڈن کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ کمشنر صاحب چندولی پالی ٹکنیک میں بحیثیت عہدہ اس کی مینجنگ کمیٹی کے صدر بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی انٹرویو میں شریک تھے۔ انٹرویو بورڈ کے ایک رکن پروفیسر رام سرن تھے۔ دوسرے رکن پروفیسر گیرولا تھے۔ پروفیسر گیرولا بنارس ہندو یونیورسٹی میں مسٹر خان کے استاد رہ چکے تھے۔

پروفیسر رام سرن نے مسٹر خان سے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انسٹرومنٹ ٹرانسفارمر کیا ہوتا ہے:

Mr. Khan, do you know what is instrument transformer?

مسٹر خان نے ابھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ پروفیسر گیرولا نے کمشنر ٹنڈن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ سب سے بہتر امیدوار ہیں۔ ان کے لئے انٹرویو دینے کا کوئی سوال نہیں :

He is the best candidate. There is no question of interview.

اس کے بعد انھوں نے اے ایم خان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر خان، آپ جاسکتے ہیں:

Mr. Khan, you can go.

پروفیسر سرن جنھوں نے سوال کیا تھا وہ خاموش رہے۔ مسٹر خان اپنے کاغذات لے کر کمرہ سے باہر آگئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان کو حسب قاعدہ اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ وہ چندولی پالی ٹکنیک میں سنیئر لکچرر

مع ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ الکٹریکل انجنیرنگ مقرر ہوگئے۔ اس کے بعد ان کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ جوائنٹ ڈائرکٹر (ٹکنکل ایجوکیشن) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

آجکل اکثر نوجوان یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ روزگار نہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قابل روزگار افراد نہیں۔ مسٹر اے ایم خان کے ساتھ مذکورہ واقعہ اسی لئے پیش آیا کہ انھوں نے محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ تعلیم کے دوران ان کا کردار نہایت عمدہ رہا۔ پروفیسر گیروالا اور دوسرے متعلق لوگوں کے درمیان ان کی تصویر نہایت عمدہ بنی۔ اسی کی وہ قیمت تھی جو مذکورہ شاندار واقعہ کی صورت میں انھیں ملی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ادارہ اور ہر دفتر اچھے کارکنوں کو چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا کام درست طور پر نہیں چل سکتا۔ کوئی بھی آدمی اپنا دشمن نہیں، اس لئے کوئی بھی آدمی اچھے کارکن کو نظر انداز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھا اور قابل اعتماد کارکن دوسروں کی ضرورت ہے۔ آپ دوسروں کی ضرورت بن جائیے، اور پھر آپ کے لئے روزگار حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔

اس دنیا کا نظام دو طرفہ لین دین پر چل رہا ہے۔ یہاں شکایت اور احتجاج اور مطالبہ کی کوئی قیمت نہیں۔ اس دنیا کا سادہ اصول یہ ہے کہ —— جتنا دینا اتنا پانا۔ اگر آپ روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو دوسروں کے لئے مفید بنائیے۔ اپنے اندر وہ مہارت پیدا کیجئے جس کی دوسروں کو ضرورت ہے۔ اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے آپ کو روزگار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد روزگار خود آپ کو تلاش کرے گا۔ حتی کہ یہ حال ہو جائے گا کہ آپ آگے ہوں گے اور روزگار آپ کے پیچھے۔

استقلال میں کامیابی

"استقلال میں کامیابی ہے"۔ کسی کا یہ قول نہایت بامعنی طور پر کامیابی کی حقیقت کو بتاتا ہے۔ اور پوری تاریخ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ زندگی ہمیشہ ناہموار راستوں میں سے طے ہوتی ہے۔ یہاں ہر آدمی کو طرح طرح کے ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لئے زندگی میں ہمیشہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ ناموافق تجربات کے باوجود آدمی اپنا سفر برابر جاری رکھے۔ اسی کا نام استقلال ہے۔ اور جو آدمی استقلال کا ثبوت دے وہی اس دنیا میں کامیابی کی منزل کو پہنچتا ہے۔ جتنا استقلال اتنی ہی کامیابی۔

یہ فطرت کا قانون ہے اور اگر آدمی آنکھ کھول کر دیکھے تو ہر طرف اس کو ایسے نشانات نظر آئیں گے جو اس کو اس حقیقت کا پتہ دے رہے ہوں۔ جو اس کو اس حقیقت کی یاددہانی کرانے والے ہوں۔

ایک آدمی دریا کے کنارے ایک چٹان پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا تو اس کو نظر آیا کہ پانی کی موجوں کے مسلسل ٹکرانے سے چٹان کا پتھر گھس گیا ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو، چٹان ایک سخت چیز ہے اور پانی ایک نرم چیز ہے۔ لیکن اگر نرم چیز بھی استقلال کے ساتھ عمل کرے تو وہ چٹان جیسی سخت چیز کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں سمندروں کے کنارے بے شمار مقدار میں ریت کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ ساحلی چٹانوں کے ساتھ پانی کے اسی ٹکراؤ کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی ایک ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے بہت سی اصلاحی نظمیں لکھی ہیں۔ استقلال کی اس اہمیت کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے :

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل   تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی سل

اس معاملہ کی ایک تازہ مثال ڈاکٹر سبرامنیم چندرشیکھر (۱۹۹۵ - ۱۹۱۰) کا واقعہ ہے۔ وہ بچپن سے ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر ریسرچ شروع کی کہ ستارے کس طرح وجود میں آتے ہیں۔ اور کس طرح فنا ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تحقیقات کے

ابتدائی نتیجہ کو ایک مقالہ کی صورت میں مرتب کیا اور پہلی بار ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ کو لندن میں ہونے والی ایسٹرو فیزیکل سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں یہ مقالہ پیش کیا۔ اس میٹنگ میں برطانیہ کے بڑے بڑے سائنس داں موجود تھے۔ ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر جب اپنا مقالہ پیش کر چکے تو اس وقت کے ایک ممتاز برطانی سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن اٹھے۔ انھوں نے نوجوان چندر شیکھر کا مذاق اڑایا اور ان کا مقالہ سب کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔

اس کے بعد چندر شیکھر نے چاہا کہ اپنا یہ مقالہ لندن کے ایسٹرو فیزیکل جرنل میں چھپوائیں۔ مگر اس سائنسی جرنل نے بھی ان کا مقالہ چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر چندر شیکھر برطانیہ میں پیش آنے والے اس حوصلہ شکن تجربہ سے بد دل ہو کر اپنے وطن ہندستان واپس آئے اور یہاں یونیورسٹیوں میں ملازمت کی تلاش کی مگر یہاں اپنے وطن میں بھی انھیں کسی یونیورسٹی میں ملازمت نہ مل سکی۔ وطن کے باہر بھی انھیں ٹھکرا دیا گیا اور وطن کے اندر بھی۔

لیکن چندر شیکھر مایوس نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ شکاگو (امریکہ) چلے گئے۔ وہاں انھیں حالات سازگار ملے۔ مگر وہ اپنی تحقیقات میں از سر نو مشغول ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کا نظریہ مقبول ہونے لگا۔ ان کے مقالات بڑے بڑے سائنسی مجلات میں چھپنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا نظریہ چندر شیکھر لمٹ (Chandra Shekhar Limit) کے نام سے سائنسی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں جب کہ ڈاکٹر چندر شیکھر کی عمر ۷۳ سال ہو چکی تھی ان کو سائنس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

اس طرح کے سبق آموز واقعات سے انسانی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل کی ہے اسی استقلال اور مسلسل عمل کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں۔

کسی مفکر کا قول ہے کہ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر انتظار کی طاقت پیدا کرو۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کامیابی ہمیشہ لمبے انتظار کے بعد ملتی ہے۔ اور انتظار کی ضرورت اسی لئے ہے کہ کوشش کے دوران ہر بار ایسی رکاوٹیں پیش آتی ہیں جو بظاہر منزل کو دور کر دیتی ہیں۔ اس لئے آدمی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ وہ صبر و برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنی کوشش میں لگا رہے۔ وہ انتظار کی مدت کو کبھی ختم نہ ہونے دے۔

یہ معاملہ اتنا قطعی ہے کہ اس میں ہمارے لئے کوئی دوسرا انتخاب نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ فطرت کے اس فیصلہ کو مانیں۔ ہم فطرت کے نظام سے مطابقت کرتے ہوئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ فطرت کے مقرر نظام کو بدلنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی نہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع کرے۔ اور نہ مایوس اور پست ہمت ہو۔ وہ حقیقت پسندی کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنا عمل مسلسل جاری رکھے۔ اس کے بعد کامیابی اس کے لئے اتنی ہی یقینی ہو جائے گی جتنا کہ شام کو سورج ڈوبنے کے بعد اگلی صبح کو دوبارہ روشن سورج کا نکلنا۔ مسلسل عمل لازمی طور پر آدمی کو اس کے مطلوب نتیجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

قدرت کو ککڑی کا درخت اگانے کے لئے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ مگر جب چنار کا درخت اگانا ہو تو اس میں خود قدرت کو بھی سو سال کا وقت لگ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا معاملہ اس سے مستثنیٰ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اگر آپ لمبی محنت کے اصول کو نہ مانیں تو پھر آپ کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ کیوں کہ لمبی مدت تک مستقل محنت ہی کسی بڑی کامیابی کی لازمی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو اس کو اپنے لئے کسی بڑی کامیابی کی امید بھی نہ کرنا چاہئے۔ (نوٹ: یہ تقریر ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی)

۲۸ ستمبر کو وگن سے برمنگھم کے لئے روانگی ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب ہماری گاڑی برمنگھم میں داخل ہوئی تو سڑک کے عین کنارے مسجد کا منظر دکھائی دیا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ یہ یہاں کی گرینڈ ماسک ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بیرونی سمت میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری طرف جلی حرفوں میں انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: قرآن پڑھئے، آخری عہد نامہ:

Read AL-QURAN THE LAST TESTAMENT

برمنگھم میں میرا قیام جناب شمشاد خاں صاحب کے یہاں تھا۔ وہ مکمل طور پر دعوتی مزاج کے آدمی ہیں۔ اپنی پوری زندگی دعوہ ورک کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ وہ دعوت کے کام کا موقع نکال لیتے ہیں۔ برمنگھم میں وہ اپنا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ مختلف قسم کے کاریگر اس میں لگے ہوئے تھے جو سب کے سب مسیحی تھے۔ ایک روز انھوں نے ان مسیحی کاریگروں سے کہا: دیکھو، تمہاری کلرجی نے تم کو کیسا بیوقوف بنا رکھا ہے۔ اس براہ راست جملہ پر وہ لوگ چونکے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں ایک قتل کروں اور اس کی سزا تم کو دی جائے تو کیا یہ انصاف کی بات ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ پھر دیکھو، تمہاری کلرجی کا کہنا ہے کہ مسیح کو گناہ کے کفارہ کے لئے صلیب پر چڑھا یا گیا۔ یعنی گناہ تو دوسرے انسانوں نے کیا اور اس کی سزا حضرت مسیح کے اوپر ڈال دی گئی۔ کیا یہ انصاف ہے اور کیا ایسا کہہ کر کلرجی تم کو بے وقوف نہیں بنا رہی ہے۔ ان لوگوں نے فوراً کہا، مسٹر خاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں (Mr. Khan, you are right.)

چند سو سال پہلے مذہبی موضوعات پر اس طرح آزادانہ گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ جدید فکری انقلاب کا کرشمہ ہے جس نے اس طرح آزادانہ انداز میں مذہب پر تبادلۂ خیال کا موقع دے دیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں قومی جھگڑوں کی جو سیاست چلا رکھی ہے وہ اس فضا کو درہم و برہم کر رہی ہے۔

برمنگھم کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کچھ لوگ میرے بارہ میں یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی کا احساس ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں۔ حالاں کہ یہ سراسر الٹی

بات ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنا زیادہ عاجز سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنا وجود بالکل بے معنی نظر آتا ہے۔ شعر و شاعری مجھے پسند نہیں۔ مگر اپنی تنہائیوں میں اکثر فارسی کا یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے:

نہ گلے نہ برگ سبزے نہ شجر نہ سایہ دارم   در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

برمنگھم کے اردو ماہنامہ "صراط مستقیم" کے شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۳ میں ایک رپورٹ دیکھی۔ یہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے بارہ میں تھی۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ تھا:

"یہاں شادیوں کے لئے بڑے بڑے ہال بک کرائے جاتے ہیں، چھ ماہ پہلے ہی بُک کرانے کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ شادی کے دن عورتیں، بڑے زرق برق لباس پہن کر آتی ہیں۔ آدمی خوب اپنی عورتوں، بہنوں اور بچیوں کو ہار سنگار کرا کر میک اپ لگا کر لاتے ہیں، جیسے انھیں کسی منڈی میں لے جا رہے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوب بن ٹھن کر آتے ہیں۔ مختلف ٹولیوں میں ایک دوسرے کی تصاویر کھینچتے ہیں اور مختلف پوز بناتے ہیں۔ ویڈیو فلمیں بھی خوب بنائی جاتی ہیں۔ جہاں نوجوان فیشن پرست لڑکیاں دیکھیں ان پر کیمرے خوب چلتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یاد کے لئے رکھتے ہیں۔ حقیقت میں بے حیائی اور بے غیرتی کو تحفظ دینا مقصود ہوتا ہے۔ گھر کے اندر نوجوان بیٹھ کر شادی کی فلمیں دیکھتے ہیں، پھر لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں، ان سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں"۔

برمنگھم میں ان دنوں کافی سردی تھی۔ یہاں کے موسم کے مطابق اکثر ہلکی بارش ہوتی رہتی تھی۔ رات کو میں اپنے بستر پر لیٹا تو جناب شمشاد محمد خاں صاحب نے گرم پانی کی تھیلی (Hotwater bottle) لاکر دی اور کہا کہ اس کو بستر میں رکھ لیں۔ پہلے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید موجودہ لحاف کے ساتھ مجھے ایک کمبل کا اضافہ کرنا پڑے۔ لیکن گرم پانی کی تھیلی بالکل کافی ہو گئی اور بستر اچھی طرح گرم ہو گیا۔

یہ طریقہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مگر اس تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سخت سردیوں میں بستر کو گرم کرنے کا نہایت آسان اور سستا طریقہ ہے۔ کشمیر کے لوگ رات کو بستر میں کانگڑی رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گرم پانی کی تھیلی اس کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے اور بے ضرر بھی۔

کراچی سے ایک اردو ماہنامہ الفاروق شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ محرم۔ صفر ۱۴۱۴ھ دیکھا۔ اس میں ایک مسلمان مقیم برطانیہ (برسٹل) کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: برطانیہ کی روز افزوں تباہی کے دو اہم اسباب، سودی قرض اور کتوں کی کثرت۔ برطانیہ کے نفرت انگیز تعارف کے بعد آخر میں مضمون اس جملہ پر ختم ہوا تھا: اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ اللّٰہم حفظنا منہ، آمین (صفحہ ۲۸)

میں نے برطانیہ کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ میں نے پایا کہ یہاں بھی مسلمان اسی طرح "کافروں اور مشرکوں" اور یہود و نصاریٰ کے خلاف بد دعا کرنے میں مشغول ہیں جس طرح ہندستان میں دکھائی دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں اس سے نہ تو ان کو وطنی محبت ہے اور نہ ان ممالک کے باشندوں کے حق میں ان کی زبان سے دعائیہ کلمات نکلتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف اپنی قوم کے لئے دعائیں ہیں۔ انھیں شاید معلوم نہیں کہ جو لوگ دوسروں کے حق میں نیک دعائیں نہ کر سکیں ان کی نیک دعائیں خود اپنے حق میں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

مذکورہ رسالہ میں "تبلیغی جماعت" کے بارہ میں ایک مضمون تھا۔ اس کے آخر میں امت کو دعوت کی محنت پر ڈالنے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ دعا کی گئی تھی: اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے دین کے لئے قبول فرمائے (صفحہ ۸) رسالہ کی اشاعت کے نویں سال پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ ہمیں امت مسلمہ کی مزید خدمت کی توفیق نصیب فرمائے، آمین (صفحہ ۳)

اس قسم کی باتوں کو جب میں سنتا ہوں یا پڑھتا ہوں تو میرے دل سے ایک آہ نکلتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ مسلمانوں نے اسلام کو اپنا قومی افتخار بنالیا ہے۔ اور جو مذہب قومی افتخار بن جائے وہ نہ خدا کو مطلوب ہوتا ہے اور نہ خلق کو۔

مسٹر پرویز عالم (علیگ) بی بی سی میں ہندی سکشن کے پروڈیوسر ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے برٹش سوسائٹی کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔

انھوں نے کہا کہ سلمان رشدی کے خلاف جب مسلم دنیا میں تحریک چل رہی تھی تو

یہاں کے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف جلوس نکالا۔ اس کو تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا۔ اس میں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان لکڑی میں باندھ کر سلمان رشدی کی کتاب اٹھائے ہیں۔ اس میں آگ لگاتے ہیں پھر اس کو زمین پر گرا کر اس کو پیروں کے نیچے روندتے ہیں۔ چیختے چلاتے اور نعرہ لگاتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس قسم کے مناظر تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا تو لوگوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگے کہ یہ کوئی وحشیانہ مذہب ہے۔ اب بھی جب کوئی اسلام یا مسلمان کی بات آتی ہے تو اس کے ساتھ بار بار وہ مناظر سامنے لائے جاتے ہیں۔ کبھی انگریز دیکھتا ہے کہ مسلمان اچھل اچھل کر جلتی ہوئی کتاب کو پیروں کے نیچے روند رہے ہیں۔ کبھی لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک داڑھی والا مسلمان قصائی ہاتھ میں چھری لئے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے:
میں تم کو مار ڈالوں گا (I will kill him.)

میں نے یہاں کے ایک مسلمان سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ کچھ مسلمانوں نے کیا تھا نہ کہ سارے مسلمانوں نے۔ میں نے کہا کہ بقیہ مسلمانوں نے اس کے خلاف مذمتی بیان کیوں نہیں دیا۔ اور جب بقیہ مسلمانوں نے اس کی مذمت نہیں کی تو اسلام کی رو سے وہ بھی اس مجرمانہ فعل میں شریک ہیں۔ حدیث کی زبان میں وہ گونگے شیطان ہیں۔

ناگپور کے ایک ادارہ انڈیا پیس سنٹر (India Peace Centre) نے گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) اور انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کے تعاون سے نومبر ۱۹۹۳ میں ایک چھ روزہ اسٹڈی کیمپ منعقد کیا۔ اس اسٹڈی کیمپ میں ملک کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی تھیم تھی ــــــ قومی دھارا اور اقلیت:

Minorities in India and the national mainstream.

اس کے منتظمین کی طرف سے مجھے دعوت نامہ ملا تھا کہ میں ۶ نومبر کو اس کے آخری اجلاس میں اختتامی خطاب (Valedictory address) پیش کروں۔ اس کے لئے مجھے ایک گھنٹہ کا وقت دیا گیا تھا۔ سفر سے پہلے دہلی میں میں نے ایک پیپر لکھنا شروع کیا۔ مگر محسوس ہوا کہ یہ موضوع بے حد مشکل ہے۔ کوشش کے باوجود پیپر تیار نہ ہو سکا۔ برمنگھم میں جب کہ میں جناب شمشاد محمد خاں صاحب

کے مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک ایک روز صبح کو محسوس ہوا کہ پورا مضمون بیک وقت ذہن میں اتر آیا ہے۔ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھا اور اسی وقت اس کو لکھ ڈالا۔ یہ مضمون برمنگھم میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی شام کو مکمل ہوا۔ یہ مقالہ الرسالہ اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔

احمدیہ مووومنٹ (قائم شدہ ۱۸۸۹) کا ایک انگریزی ماہنامہ لندن سے نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے: (The Review of Religions) اس ماہنامہ کے شمارہ جولائی ۱۹۹۳ میں پادری جوناتھن ڈریپر (Rev. Dr. Jonathan Draper) کی ایک تقریر چھپی تھی جو انھوں نے لندن مسجد (London Mosque) میں یکم مئی ۱۹۹۳ کو کی تھی۔

اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ کھلا پن (Openness) اینگلیکن ٹریڈیشن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ آپ لوگ یہاں عیسائیت کے بارہ میں میری تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے چرچ میں آئیں اور ہم کو اسلام کے سمجھنے میں مدد دیں:

> But in the same way that you are now spending time learning about Christianity in its various forms, I hope that one day soon some of you will come to my church to help us learn something of Islam. (p. 18)

یہ زمانہ آزادانہ طور پر سننے اور سنانے کا زمانہ ہے۔ اس کو ہمیں پوری طرح استعمال کرنا چاہئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم دوسروں کے اجتماعات میں شریک ہو کر سنجیدگی کے ساتھ ان کی بات سنیں۔ اس طرح تعلق بڑھانے کی صورت میں اپنے آپ مختلف صورتوں میں یہ مواقع نکلیں گے کہ ہم اسلام کی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ حتی کہ دوسرے لوگ خود اپنے اجتماعات میں ہمیں بلائیں گے کہ آئیے اور ہمیں بتائیے کہ اسلام کیا ہے۔ جیسا کہ اسی سفر میں میرے ساتھ اٹلی میں پیش آیا۔ مگر اس جدید امکان کو استعمال کرنے کے لئے دو چیزوں کی لازمی ضرورت ہے ——— صبر اور حکمت۔

ریاض عبد السلام احمد ایک عرب نوجوان ہیں جو انگلستان میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلیجی جنگ کے بعد ۱۹۹۱ میں لندن میں مصر کے شیخ عمر عبد الرحمن آئے۔ ان کا ایک

ویڈیو ٹیپ میں نے دیکھا۔ اس کے مطابق، مجلس میں انھوں نے کہا کہ کافروں کے ساتھ ہمارا تعلق صرف قتل اور جنگ کا ہے۔ ایک مسیحی نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا شیخ، آپ کیوں صرف قتال کی آیتیں قرآن سے لیتے ہیں اور عفو اور نرمی اور محبت کی آیتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن تردد میں پڑ گئے اور کہا کہ کافروں کے ساتھ معاملہ کے لئے ہمارا طریقہ یہی ہے:

قال الشیخ عمر عبد الرحمٰن: علاقاتنا مع الکافرین القتل وغیرھا من اسالیب العنف۔ فقام رجل مسیحی وقال یا شیخ انا ممن تعدونھم کافرین ولکن یا شیخ، لما تذھب الی آیات القتال و تعرض عن آیات العفو والتسامح والحب۔ فارتبک الشیخ وقال۔ ھٰذا منھجنا فی التعامل مع الکافرین۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم دانشور اس اعلان میں مشغول ہیں کہ موجودہ زمانہ ایک اسلام دشمن زمانہ ہے۔ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے، اسی لئے وہ اسرائیل کی سرپرستی کر رہا ہے۔ برطانیہ اسلام کا پشتینی دشمن ہے، اسی لئے وہ سلمان رشدی کو پناہ دئے ہوئے ہے۔ مگر عین اسی وقت مسلمان بہت بڑی تعداد میں ان ملکوں میں آکر آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں چھ ملین مسلمان آباد ہیں اور برطانیہ میں دو ملین مسلمان۔

ذاتی معاملہ اور ملی معاملہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمان اپنی ذات کے لئے مواقع کو دیکھتے ہیں اور اسلام کے لئے مسائل کو۔ ذات کے معاملہ میں وہ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو کی پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور جب اسلام کا معاملہ ہو تو فوراً مسائل کو لے کر دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات کے معاملہ میں وہ مسٹر نو پرابلم بنے ہوئے ہیں اور اسلام کا معاملہ ہو تو وہ فوراً مسٹر پرابلم بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہی تضاد موجودہ زمانہ میں تمام ملی مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ ذات کے معاملہ میں انھوں نے فطرت کے اصول کو اختیار کیا اس لئے ذات کے معاملہ میں وہ کامیاب ہیں۔ اسلام کے معاملہ میں وہ فطرت کے اصول کو اختیار نہ کر سکے اس لئے انفرادی ترقی کے باوجود بحیثیت ملت انھیں ترقی حاصل نہ ہو سکی۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بنو آدم کو زمین پر بسانے کا ارادہ کیا تو فرشتوں نے کہا : اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کو آزاد مخلوق کی حیثیت سے زمین پر بسایا جانے والا تھا۔ اور فرشتے جانتے تھے کہ آزاد مخلوق لازماً اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گی اور زمین پر فساد برپا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس شبہہ کی تردید نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا شبہہ درست تھا اور بعد کی تاریخ میں وہ عملی طور پر درست ثابت ہو گیا۔

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اس بات کو قبول نہیں کیا کہ نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اضطراری حامد اور اضطراری مسبح تھے۔ اب خدا کو ایسی مخلوق درکار تھی جو اختیاری حامد اور اختیاری مسبح ہو۔ پوری تاریخ اگر فسادیوں سے بھر جائے اور صرف تھوڑے سے مطلوب انسان مل سکیں تب بھی وہ اس قابل تھا کہ تاریخ بشری کا یہ عظیم ہنگامہ وجود میں لایا جائے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ ان میں سے زیادہ تر پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ترک اور عرب ہیں۔ تقریباً دس ہزار وہ انگریز ہیں، جنھوں نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔

۳۵ سال پہلے برطانیہ میں صرف دس مسجدیں تھیں۔ مگر آج یہاں ۴۱۵ مسجدیں موجود ہیں۔ برطانیہ کی پہلی مسجدووکنگ میں ۱۸۹۰ میں بنائی گئی تھی۔ لندن کی پہلی مسجد غالباً ۱۹۳۴ میں بنی۔ اس کے علاوہ پورے برطانیہ میں ۲۰۰ کی تعداد میں اسلامی مرکز قائم کئے جا چکے ہیں۔ حتی کہ یہاں روایتی انداز کا دار العلوم بھی قائم ہے۔ جس میں طلبہ کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ مجموعی طور پر برطانیہ میں ایک درجن کی تعداد میں بڑے مدرسے قائم ہو چکے ہیں۔ لندن کا مرکز سب سے بڑا اسلامی مرکز ہے، یہاں مختلف قسم کی اسلامی سرگرمیاں سال بھر جاری رہتی ہیں۔ اس کی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اس کے مطالعہ کے ہال میں بیک وقت ایک ہزار آدمی بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق، ہر سال تقریباً ۲۰ ہزار انگریز طلبہ

المرکز الثقافی الاسلامی میں اسلام کے بارہ میں جاننے کے لئے آتے ہیں۔

آپ دنیا کے جس حصہ میں بھی جائیں ہر جگہ ایک چیز ضرور دکھائی دے گی۔ اور وہ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلموں کے ظلم کی داستان ہے۔ برطانیہ میں قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب ملی۔ اس میں برما کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان بتائی گئی تھی۔ اس کا نام تھا — مسلمو بورما: حملات ابادہ۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برما کی حکومت وہاں کے مسلمانوں کو فنا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر یہ واقعہ کا نصف ثانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ برما کے ایک حصہ میں مسلمانوں نے علیحدگی کی تحریک چلائی۔ اس کے نتیجہ میں وہ وہاں معتوب ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ برما میں امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔

ایک عرب نوجوان نے ایک رپورٹ پڑھنے کے لئے دی۔ اس کا عنوان تھا: بریطانیا — مشکلات المسلمین۔ اس کے مطابق برطانیہ کا کیس مسلمانوں کے لئے گویا مشکلات کا کیس تھا۔ اس میں برطانی مسلمانوں کی مشکلات کے ذیل میں بغض، سیکولر تعلیمی نظام، نسل پرستی اور تشدد کو شمار کیا گیا تھا اس کے بعد کہا گیا تھا کہ برطانیہ کے مسلمان اگر ان مشکلات کو حل کر لیں تو یہاں اسلام کے لئے عظیم مستقبل ہے (ان الاسلام فی بریطانیا سیکون له مستقبل عظیم اذا تمکنوا من حل المشکلات السابقة) صفحہ ۴۹۲

اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ ان الفاظ میں موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی سب سے بڑی غلطی کا راز چھپا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر کا آغاز مشکلات کو ختم کرنے سے ہوتا ہے حالاں کہ مستقبل کی تعمیر کا صحیح آغاز یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے:

زعماء المسلمین یعتقدون ان بناء المستقبل یبدأ من حل المشاکل۔ والصحیح ان بناء المستقبل یبدأ من الاعراض عن المشاکل و استغلال الفرص۔

۲۹ ستمبر کو فجر کی نماز برمنگھم کی سنٹرل مسجد (مرکزی مسجد) میں پڑھی۔ اس میں بیک وقت تین ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جا رہی ہے جس میں پانچ ہزار آدمیوں کے لئے گنجائش ہوگی۔

نمازیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نماز ختم ہوئی تو چھ آدمی حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ وہ روزانہ اجتماعی

طور پر قرآن پڑھتے ہیں۔ سب کے سب زیادہ عمر کے تھے جن کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ یہ غالباً وہ لوگ ہیں جو اپنے بیٹے یا رشتہ داروں کے ساتھ یہاں مقیم ہیں۔ ان میں کوئی بھی نوجوان موجود نہ تھا۔ مجھے بار بیڈوز کے ایک نوجوان کا قصہ یاد ہے جس کا باپ اس کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آیا۔ وہ ایک کنارے اشارخ کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا کہ: me not

مسجد میں مذکورہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ کچھ بوڑھے اور ریٹائرڈ لوگ تو قرآن میں دلچسپی لے رہے ہوں اور نوجوان نسل کہہ رہی ہو کہ: یہ میرے لئے نہیں۔

نماز کے بعد ایک مجلس میں میں نے کہا کہ فجر کی نماز کے بارہ میں ایک بڑی عجیب حدیث ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ (جس نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ خدا کی ذمہ داری میں آگیا۔) گویا فجر کی نماز اللہ کی طرف سے حفاظت کی گارنٹی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی پر اسرار بات نہیں بلکہ ایک ایسی بات ہے جو غور وفکر سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز آدمی کے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جس کے بعد آدمی لوگوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔ مثلاً نماز کی چند باتوں کو لیجئے۔ آپ بستر سے اٹھ کر سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ وضو گویا ایک علامتی فعل کے ذریعہ اس بات کا عزم ہے کہ آپ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے پاک رہیں گے۔ پھر نماز میں بار بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ آپ اللہ کی بڑائی کے احساس میں جیئیں گے اور تواضع کی روش اختیار کریں گے۔ پھر آپ ہر رکعت میں الحمد للہ رب العالمین کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کا شکر کریں گے۔ جو بھی اللہ نے دیا ہے اس پر قانع رہیں گے۔ آخر میں آپ دونوں طرف رخ کر کے کہتے ہیں کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گویا کہ آپ اہل عالم کو یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے لئے آپ کے دل میں صرف رحمت اور سلامتی کا جذبہ ہوگا۔

صبح کی نماز میں جو لوگ اس قسم کے اخلاق کی تربیت پا کر نکلیں ان کا یہ اعلیٰ انسانی اخلاق خود ہی ان کی محبوبیت اور حفاظت کی ضمانت بن جائے گا۔

برمنگھم میں میں اپنی رہائش گاہ کے حمام میں گیا تو وہاں جو صابن تھا اس کا نام عنبر تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: الصابون الحلال خال من الدھن الحیوانی:

Halal soap, without animal fat

صابن کے کاغذی ڈبہ پر عربی اور فرنچ اور انگلش میں الرجاء الانتباہ کے تحت لکھا ہوا تھا کہ اکثر صابون کا سٹک سوڈا اور حیوانی چربی کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔ مگر عنبر صابون حلال اسلامی صابن ہے جو خالص نباتی تیل کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کے انگریزی الفاظ کسی قدر فرق کے ساتھ یہ تھے:

Most soaps are produced by using caustic soda and animal fat Animal fat is not desirable due to religious objections Amber Soap is specially for molated using pure vegetable oil to satisfy the religious objections and contains no animal fat.

یہ گویا صابن کا اسلامائزیشن تھا۔ یہ اسلامی صابن ایک برٹش فرم نے بنایا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہ واضح کر سکیں کہ اسلامی اصول تمہارے لئے مفید اصول ہیں تو دنیا تمام تعصبات کو چھوڑ کر اسلامی اصول کو اختیار کر لے گی۔

جو لوگ مغربی ملکوں میں ہیں وہ مسلم ملکوں کے مقابلہ میں اپنے بچوں کے دین کے لئے زیادہ چوکنا رہتے ہیں۔ شمشاد صاحب کے گھر میں ایک بار میں حمام سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف چلا تو دوسرے کمرے سے آواز آئی۔ مسز شمشاد اپنے صاحبزادے سے کہہ رہی تھیں:

جھوٹ بولنے سے کیا ملا، گناہ ملا نہ، لکھ گیا اوپر۔

برمنگھم کی ایک تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ مغربی ملکوں میں ہمارے بچے یہاں کے کلچر سے بہت تیزی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس سے حفاظت کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے مذکورہ واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہی ماحول ہر گھر میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بچہ کے دل میں بچپن سے یہ ڈال دیں کہ تمہارا قول و فعل اوپر لکھا جا رہا ہے تو وہ ساری زندگی کے لئے اس کا چیک بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں ہم کو حقیقت پسند بننا چاہئے۔ مثلاً اگر آپ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں کہ ہمیں سی این این اور بی بی سی کو اسلامائز کرنا ہے تو بظاہر وہ بہت شاندار معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا مطالبہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اس لئے ہمیں وہ کرنا ہے جو ممکن ہے اور ہمارے

بس میں ہے۔ اور ممکن اور بس کی چیز یہی ہے کہ ہر گھر کو تربیت گاہ اور دینی مدرسہ بنا دیا جائے۔

ایک عراقی تاجر ابراہیم تہامس نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ حدیث جبریل میں قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ لونڈی اپنا آقا جنے گی (وان تلد الامة ربتها) اس پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد غالباً (surrogate mother)، کا ظاہرہ ہے جو موجودہ زمانہ میں وجود میں آیا ہے۔

جدید مغربی سماج میں دولت مند خاندان کی عورتیں جو بچہ کے حمل کی مصیبت اٹھانا نہیں چاہتیں اور اسی کے ساتھ یہ چاہتی ہیں کہ ان کے پیٹ کی شیپ خراب نہ ہو وہ اس قسم کی تدبیر اختیار کر رہی ہیں۔ خاص طور پر امریکہ میں اس کا رواج دولت مند لوگوں کے یہاں بڑھ رہا ہے۔ اس طریقہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ مرد کا اسپرم اور عورت کا ایگ لے کر لیبورٹری میں فرٹائل کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو عورت کے رحم womb میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ عورت کے رحم میں پرورش پا کر اپنے وقت پر پیدا ہو جاتا ہے۔ دولت مند عورتیں اپنی ملازمہ عورت سے یا کسی غریب عورت کو کچھ رقم دے کر ایسا کرتی ہیں۔

اس تشریح کی صورت میں مذکورہ حدیث بالکل لفظی طور پر صادق آتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ماں کی حیثیت فی الواقع لونڈی کی ہوتی ہے اور اس کے پیٹ سے جو بچہ نکلتا ہے وہ فی الواقع اس کا آقا ہوتا ہے۔

۲۰ سال پہلے تک سروگیٹ مدر کا تصور موجود نہ تھا۔ ایسی حالت میں ۱۴ سو سال پہلے عرب کے ایک شخص کی زبان سے یہ جملہ نکلنا اس کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ شخص خدا کا پیغمبر تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

یہاں کے ایک شخص مسٹر فریڈ نے جناب شمشاد خاں صاحب سے سوال کیا کہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ گناہ کرنا اگر گناہ ہے تو گناہ کی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ خدا جب کہتا ہے کہ فلاں کام گناہ ہے اس کو مت کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خود بھی گناہ کیا۔ کیوں کہ گناہ کا خیال ذہن میں لائے بغیر گناہ نہیں کیا جا سکتا۔

شمشاد خاں صاحب نے جواب دیا کہ ایک مینوفیکچرر ایک سامان بناتا ہے اور اس کے ساتھ

ایک گائڈ بک رکھ دیتا ہے کہ اس سامان کو اس طرح استعمال کرو اگر اس کے خلاف کروگے تو سامان خراب ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں کیا مینوفیکچرر مجرم ہے۔ نہیں۔ کیوں کہ مینوفیکچرر نے جو کچھ کیا تمہارے فائدے کے لئے کیا۔ ایسی گائڈ دینے کی بنا پر خود اس کو جرم میں شریک نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس مثال سے تم خدا کے معاملے کو سمجھ سکتے ہو۔ خدا نے جب انسان کو بنایا تو انسان کے لئے جو مفید ترین ہدایات تھیں وہ بھی اس کو پیغمبروں کے ذریعہ بتا دیں۔ پھر جب تم مینوفیکچرر کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر مجرم نہیں مانتے تو خدا کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر کیوں ایسا کہہ رہے ہو۔

شمشاد خاں صاحب کے اندر دعوہ ورک کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ ان کا اگرچہ مستقل بزنس ہے مگر ان کی دل چسپی سب سے زیادہ دعوت کے کام سے ہے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ایک خوب صورت مرکز (اسلامک پروپگیشن سنٹر) برمنگھم میں قائم کیا ہے۔ ان کے ذریعہ اب تک تقریباً ۵۰۰ لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ وہ ایک زبردست کام کر رہے ہیں جس کا نام ہے: گھر گھر اسلام کا تعارف نامہ پہنچانا:

door to door leaflet drop

گویا کہ یہ وہ کام ہے جس کو حدیث میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ انگریزی الرسالہ کی بھی مختلف چیزیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً انگریزی الرسالہ (مارچ ۱۹۹۲) میں تین صفحہ کا وہ مضمون جس کا عنوان تھا :

From denial to belief

دعوتی کام کے سلسلہ میں انھوں نے کئی عجیب قصے بتائے۔ مثلاً ایک انگریز جس کا قدیم نام ڈیوڈ مورس Dawid Morris تھا۔ ان سے شمشاد خاں صاحب کا ربط قائم ہوا۔ ایک عرصہ تک گفتگو اور مطالعہ کے بعد آخر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اب نام کا مسئلہ تھا۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ نام بدلنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں ہپوکریٹ (منافق) بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے اپنا نام بھی بدلنا ہے۔ اس کے

کچھ دنوں بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی مسجد میں داخل ہو کر وضو کر رہے ہیں۔ اتنے میں عربی لباس میں ایک بزرگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز کے لئے جماعت تیار ہے، آجاؤ۔ یہ بزرگ ان کو ڈیوڈ موریس نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو محمد اسلام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس خواب سے وہ نہایت خوش ہوئے اور اپنا نام محمد اسلام رکھ لیا۔ وہ نیوکیسل میں رہتے ہیں اور ایک بڑی سروس میں ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ایک صاحب روزگار کی تلاش میں سعودی عرب گئے۔ وہاں عرصہ تک وہ پریشان رہے کیوں کہ کوئی کام نہیں ملا۔ اس وقت مکہ میں ایک ہندستانی بزرگ رہتے تھے۔ وہ ان سے دعا کے لئے ملے اور ان کو تحفہ کے طور پر دال روٹی پیش کیا۔ بزرگ نے اس کو خوشی سے قبول کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا کام بن گیا۔ تم دال لائے ہو۔ اس کے شروع میں د کا حرف ہے۔ اسی طرح دین، دولت، دنیا، سب کے شروع میں د ہے۔ تم کو تینوں چیزیں مل گئیں۔

اس کے بعد مذکورہ صاحب کو ایک اچھی سروس مل گئی۔ انھوں نے کافی ترقی کی۔ اس طرح کے واقعات میں بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ لوگ ان کو بزرگ کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ محض اتفاق ہے۔

شہشاد خاں صاحب تعلیمی لحاظ سے انجنیئر ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر یہ خاص ملکہ ہے کہ کسی بات کو نہایت درست الفاظ اور انداز میں بیان کر سکیں۔ ایک روز ان سے منافقت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے کچھ تجربات بتائے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اگر ایک جملہ میں منافق کی تعریف کرنا ہو تو آپ کیا کہیں گے۔ انھوں نے ان الفاظ میں منافق کی تعریف کی:

One, who, for some ulterior motives, makes pretences, continuously.

میں نے کہا کہ واقعی یہ منافق انسان کی بہت صحیح اور جامع تشریح ہے۔

پاکستانی روزنامہ جنگ کے لندن اڈیشن (۲۹ ستمبر ۱۹۹۳) میں "لندن نامہ" کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

"برطانیہ اور یورپ میں آباد پاکستانیوں اور کشمیریوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے

کہ جس معاشرہ میں وہ رہتے ہیں، یہ نہ تو پاکستانی معاشرہ ہے اور نہ ہی اسلامی معاشرہ۔ اس لئے زندگی گزارنے کے لئے ہمیں بہرحال مقامی معاشرہ کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ ہماری مجبوری ہے (صفحہ ۳)

باہر کے ملکوں میں ہر جگہ مسلمان اس "مجبوری" کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے ملک میں وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ تاہم میں کہوں گا کہ کم از کم ہندستان کی حد تک یہ مجبوری کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ یہاں مسلمانوں کو صرف یہ جاننا ہے کہ زندگی کا سب سے اہم اصول ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اس اصول کی ضرورت ہندستان میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی اور دوسرے تمام ملکوں میں بھی۔

روزنامہ جنگ (۲۸ ستمبر) کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ پاکستان کی ایم کیو ایم میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ حتی کہ انھوں نے اپنا نام بدل دیا ہے۔ ایم کیو ایم کا لفظ بدستور باقی رہے گا۔ مگر پہلے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا مہاجر قومی موومنٹ۔ اور اب اس کا مطلب ہوگا متحدہ قومی موومنٹ۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین جو آجکل لندن میں مقیم ہیں ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو پشاور کے ایک جلسہ سے لندن سے ٹیلیفون پر خطاب کریں گے۔ اس تحریک کے لیڈر پہلے مہاجر قومیت ہونے کو اپنی شناخت بنائے ہوئے تھے۔ مگر یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ اب وہ پاکستانی قومیت کو اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ جنگ (۲۹ ستمبر) میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ "بالآخر ایم کیو ایم نے مہاجر قومی موومنٹ سے متحدہ قومی موومنٹ کی شکل اختیار کرلی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں میں بھی ایک اعتبار سے یہی عمل جاری ہے۔ اب تک وہ ہندستان کی عمومی قومیت سے الگ اپنی انفرادی قومیت پر اصرار کرتے رہے تھے۔ مگر ۱۹۹۲ کے بعد ان کی سوچ میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ علیحدہ قومیت کے بجائے اب وہ ہندستانی قومیت کو اپنی شناخت بنانے کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ یہ ایک صحت مند نقطۂ نظر ہے۔ جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی ؒ نے کہا تھا: قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے۔

شمشاد خاں صاحب کے یہاں ایک کرسچین خاتون ہفتہ وار صفائی کے لئے آتی تھی۔

اس کا نام پرل تھا۔ وہ اپنی ذاتی کار پر آتی تھی۔ میں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ گھروں میں صفائی کرنے والے لوگ جاہل ہوتے ہیں یا پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ خاتون جو ہمارے یہاں آتی ہے وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ ہے اور اس سے پہلے وہ ایک آفس میں سکریٹری تھی۔ اس نے کسی وجہ سے سروس چھوڑ دی۔ اب وہ گھروں میں صفائی کا کام کر رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ لوگ کام میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ آپ ایک شخص کو دیکھیں گے کہ وہ صفائی کا کام یا اور کوئی بظاہر چھوٹا کام کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوگا۔ اس کے پاس کار اور ذاتی مکان ہوگا۔

یہ بات انڈیا جیسے ملک کے لئے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہاں ایسی حیثیت کا کوئی آدمی صفائی کا کام کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس قصہ پر مجھے اقبال احمد سہیل مرحوم کی ایک نظم یاد آئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے اسلاف کس طرح کام کو عار نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

تھے امام بوحنیفہ کون اک بزاز تھے   اور فریدالدین سا شیخ اجل عطار تھا

۲۸ ستمبر کی شام کو برمنگھم میں پہلا خطاب تھا۔ یہ اینڈرٹن روڈ (Anderton Road) پر اسپارک بروک سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ مقامی مسلمانوں کے علاوہ باہر سے بھی کچھ افراد اس میں شریک ہوئے۔ چھ روزہ قیام کے دوران یہاں اس نوعیت کے چھ خطاب رکھے گئے ہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں۔ مگر مشکلات زندگی کا حصہ ہیں۔ وہ کسی ایک یا دوسری صورت میں ہمیشہ دنیا میں باقی رہتی ھیں۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قانون فطرت کے تحت یہاں عسر کے ساتھ یسر بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے کسی بھی حال میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ آخر میں سوال وجواب کا پروگرام تھا۔

اسی کے ساتھ اسلامی مرکز کی انگریزی کتابوں اور انگریزی الرسالہ کا اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے یہاں سے کتابیں حاصل کیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج ہر جگہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلم نسلوں کو اسلام سے بیگانہ

کر دیا جائے اس کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ کوئی بھی طاقت اس پر قادر نہیں کہ وہ فطرت کو بلڈوز کر سکے۔ ترکی اور روس کی مثالیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

۲۹ ستمبر کی شام کو والسل (Walsall) کے اسلامک کلچر سنٹر میں دوسرا خطاب ہوا۔ یہاں میں نے اتحاد کے موضوع پر خطاب کیا۔ میں نے کہا کہ آج ساری دنیا میں مسلمان ایک بلین کی تعداد میں ہیں۔ حالات نے ان کو دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا دیا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل ہمیشہ سے زیادہ موجود ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان جدید دور میں عزت کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ لوگ کوئی ایک یا دوسری شکایت لے کر باہم لڑنے لگتے ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد اس وقت ہوگا جب سرے سے شکایت کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ پھر میں نے صحابہ کے بہت سے واقعات بتائے کہ کس طرح وہ شکایتوں کے باوجود متحد رہتے تھے۔ مثلاً حضرت خالد کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا، مگر اس کے باوجود وہ بدستور مل کر جہاد کرتے رہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر عہدہ پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ثواب پر ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ عہدہ نہیں تو اس سے کیا فرق پڑا۔ ثواب تو ان شاء اللہ مجھے حاصل ہے۔ آج لوگوں کی نظر ثواب کے بجائے عہدوں پر ہو گئی ہے۔ اس لئے ان میں اتحاد نہیں ہونے پاتا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو دار العلوم (Coventry Road) میں خطاب تھا۔ اس کا موضوع تھا اسلام میں علم کی اہمیت۔ میں نے کہا کہ عرب کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک عرب عالم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمان طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ایسی حالت میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل کا آغاز کہاں سے کریں۔ (من این نبدأ)

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی اتری تو عرب میں بہت سے مسائل تھے۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت، رومیوں اور ایرانیوں کا تدخل

یہود و نصاریٰ کی عرب میں موجودگی۔ سماج میں مختلف قسم کے جرائم۔ مگر قرآن میں جو پہلی آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ — طهر الكعبة من الاصنام يا قاتل الفرس و الرومان يا اخرج اليهود و النصارىٰ من جزيرة العرب يا نفذ حدود الله على المجرمين۔ اس کے بجائے قرآن کی پہلی آیت یہ تھی کہ پڑھ (اقرأ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں مگر عمل کا آغاز علم سے کرنا چاہئے۔ یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا گیا اور یہی طریقہ آج بھی اختیار کرنا ہے۔

ایک مسلمان تاجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے یہاں بڑی تجارتی کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ اعلیٰ معیار کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا: اللہ نے ان کو بہت نوازا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ سوچ قرآنی سوچ نہیں۔ کیا آپ مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا سکتے ہیں جس میں دنیوی ترقی کو "نوازش" کہا گیا ہو۔ وہ کوئی ایسی آیت نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ دنیا میں زیادہ ملنا نہ تو نوازش ہے اور نہ کم ملنا غیر نوازش۔ قرآن کے مطابق دونوں حالتیں ابتلاء کی حالتیں ہیں۔ اقتصادی تنگی کو اہانت سمجھنا بھی غلط ہے اور اقتصادی خوش حالی کو اکرام سمجھنا بھی غلط (الفجر ۱۵ - ۱۶)

حدیث میں ہے کہ لكل امة فتنة وفتنة امتى المال۔ اس حدیث میں اس آنے والے دور کی پیشین گوئی ہے جب کہ لوگوں کے لئے سب سے بڑی چیز مال بن جائے گا۔ آج وہی زمانہ ہے۔ تمام لوگ مال کو اپنی دلچسپی بنائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے۔ اس ظاہری فرق کے ساتھ کہ کچھ مسلمان دولت پرستی کے ساتھ "دین داری" کا ضمیمہ بھی اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس ضمیمہ کے بغیر دولت پرستی کے کام میں مشغول ہیں۔

ٹائمس (The Times) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ بوسنیا ہرزے گووینا میں ۱۷ مہینے کی جنگ کے بعد اس کا ۹۰ فیصد حصہ سرب اور کروٹ کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ موجودہ پیس پلان میں قدیم یوگوسلاویہ تین نسلی حصوں میں بٹ جائے گا۔ ۔ ۔ سرب، کروٹ اور مسلمان، مسلم لیڈرشپ تقسیم پر راضی ہوگئی ہے۔ مگر وہ

چاہتی ہے کہ سرب فوج نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اس کو وہ خالی کرے اور سمندری ساحل کا چار فیصد حصہ اس کو دیا جائے۔ مگر سرب فوج اس پر راضی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جہاں بھی اس قسم کی تحریک اٹھائی ہے، ہر جگہ ان کو پسپائی اختیار کرنی پڑی ہے۔ اراکان (برما) میں، فلپائن میں، فلسطین میں، بوسنیا میں۔ ہر جگہ یہی ہوا ہے کہ مسلم لیڈروں نے زیادہ کی طرف چھلانگ لگائی اور آخر میں صرف کم ہی ان کے حصہ میں آیا۔ یہی اب کشمیر میں ہونے والا ہے۔

مسلمان اس کو اقدام کی سیاست سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام اقدام کی سیاست ہو تو پسپائی کی سیاست آخر کس چیز کا نام ہوگا۔

برطانیہ کے مسلمانوں میں اکثریت پاکستان (بشمول بنگلہ دیش) کی ہے۔ اسلامی مملکت میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی ایک ساتھ مل کر نہ رہ سکے۔ لیکن انگریز مملکت میں دونوں نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے پیچھے ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ ذہن تھا کہ :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

برصغیر کے مسلمانوں نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ایک علاحدہ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور دوسرے لوگوں نے اس کی زبردست وکالت کی۔ یہاں تک کہ پاکستان کی صورت میں ایک مسلم ہوم لینڈ بن گیا۔ مگر مسلم ہوم لینڈ بننے کے بعد مسلمانوں نے اس کو صرف زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اور ہر شخص جس کو موقع ملا وہ پرواز کرکے دوبارہ 'اقوام مغرب' کی دنیا میں پہنچ گیا۔

یہ بلاشبہ ایک جرم تھا جو اسلام کے نام پر کیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیڈر اور عوام دونوں شریک ہیں۔ اس جرم کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ صاف لفظوں میں اس کا اقرار کرکے اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی کی دعا کی جائے۔

برطانیہ میں مقیم ایک عرب کو کچھ سفید فام نوجوانوں نے وحشیانہ طور پر قتل کر دیا۔ ان نوجوانوں

سے انٹرویو لیا گیا جس کو باقاعدہ ٹی وی پر دکھایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ تم نے اس کو کیوں قتل کر دیا۔ نوجوانوں نے صاف کہا کہ ان ایشیائیوں کو ہمیں اپنے ملک سے نکالنا ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے لئے مسئلہ بن گئے ہیں۔ وہ جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں ورنہ بزور انھیں نکلنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

برطانیہ میں ایک پارٹی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ہے —— برٹش نیشنل پارٹی (BNP) یہ نسل پرست لوگوں کی تنظیم ہے۔ وہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو ایشیائی (Asians) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا مقصد ان ایشیائی لوگوں کو برطانیہ سے نکالنا ہے کیوں کہ وہ ہماری اقتصادیات پر بوجھ بن چکے ہیں۔ یہ لوگ اکثر ایشیائیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ جائیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کو اپنی اقتصادی مشین چلانے کے لئے لیبر کی سخت ضرورت تھی۔ انھوں نے ایشیائیوں کی آمد کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ایشیائی ملکوں کے لوگ یہاں آگئے۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا کی تھی۔ مگر اب خودکاری (automation) کا دور آگیا اور اس کے نتیجہ میں انھیں بیرونی کارکنوں کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ یہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ان کی نظر میں غیر مطلوب (unwanted) بن گئے۔

یہ زبردست خطرہ ہے جو ایشیائیوں کے سر پر منڈلا رہا ہے اور جو سب سے زیادہ مسلمانوں کے حصہ میں آنے والا ہے۔ اس کے جواب میں یہاں کے مسلمانوں میں احتجاج کا ذہن ابھر رہا ہے۔ مگر احتجاج اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ مسلمانوں کو یہاں داعی بن کر رہنا ہوگا۔ اگر انھوں نے احتجاجی سیاست کا طریقہ اختیار کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ان کا وہی حال نہ ہو جائے جو بوسنیا میں مسلمانوں کا ہوا۔

یکم اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ آج برمنگھم کی مرکزی مسجد (central mosque) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اسی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ خطبہ سے پہلے آدھ گھنٹہ نماز کے موضوع پر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے مطابق، نماز صرف ایک ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اسپرٹ کا نام ہے۔ ظاہری اعمال کا پیمانہ یہی روحانی اور اخلاقی اسپرٹ ہے۔ اگر نماز سے یہ اسپرٹ پیدا

ہورہی ہو تو وہ مطلوب نماز ہے اور اگر یہ اسپرٹ پیدا نہ ہو تو حدیث کی زبان میں اس سے کہا جائے گا : ارجع فصلّ فانك لم تصلّ۔

نماز سے فراغت کے بعد کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب ملے۔ انھوں نے کہا کہ میرا ایک سوال ہے۔ میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے ترجمہ میں ایک جگہ "شیطان کی اولاد" پڑھا ہے، تو کیا شیطان میں بھی شادی بیاہ کا سلسلہ ہے۔

پوچھنے والوں کو یہ پوچھنا چاہئے کہ شیطان کی تلبیسات کیا ہیں اور ان سے بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ مگر لوگ عجیب وغریب طور پر یہ پوچھ رہے ہیں کہ شیطان کے یہاں کیا شادی بیاہ اور اولاد کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں نہ صحیح دینی فہم پیدا ہوا اور نہ صحیح علمی مزاج۔

جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو نماز جنازہ کا اعلان ہوا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد دو اسٹول لاکر اگلی صف کے آگے بچھائے گئے۔ پھر کچھ آدمی خوبصورت قسم کا ایک لمبا بکس لائے اور اس کو اسٹول کے اوپر رکھ دیا۔ یہ عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تابوت تھا۔ اس کے اندر میت تھی اور اس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ پیک کر دیا گیا تھا۔ تمام لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کے قانون کے مطابق، جس طرح عیسائی لوگ اپنی میت کو تابوت میں دفن کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی میت کو تابوت میں رکھ کر دفن کریں۔ یہ قانون شعبۂ ماحولیات (environmental department) کی طرف سے بنایا گیا ہے۔ یہ تابوت مخصوص کارخانوں میں اہتمام کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ اور وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ یعنی ہندستانی روپیہ کے لحاظ سے ۲۵ ہزار روپیہ سے لے کر پچاس ہزار روپیہ تک۔

انڈیا کی حکومت اگر ماحولیاتی تحفظ کے نام پر اس قسم کے تابوت کو ضروری قرار دے تو ہندستان کے نام نہاد رہنما اس کو "شریعت میں مداخلت" قرار دے کر فوراً اس کے خلاف احتجاجی تحریک چلا دیں گے۔ مگر برطانیہ کے دو ملین مسلمان اس کو بلا احتجاج قبول کئے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایڈجسٹمنٹ ایک ملک میں جائز ہے اور دوسرے ملک میں ناجائز۔

سمجھ کی کمی

بابری مسجد (اجودھیا) کے نام پر جو پرشور تحریک چلائی گئی اس میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ یہ کہتا تھا کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت سی مسجدوں میں سے صرف ایک مسجد نہیں ہے بلکہ وہ ہندستان میں ملت مسلمہ کے وجود کی علامت ہے۔ بابری مسجد کے ساتھ پوری ملت کی قسمت بندھی ہوئی ہے۔ بابری مسجد اگر باقی رہتی ہے تو مسلمان بھی باقی رہیں گے۔ بابری مسجد اگر نہ رہے تو اس کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے وجود کی بھی کوئی ضمانت نہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد مکمل طور پر ڈھادی گئی۔ حتی کہ اس کی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس واقعہ پر اب تین سال گزر چکے ہیں۔ مگر ہندستان کی ملت مسلمہ پوری شان کے ساتھ بدستور موجود ہے۔ اس کی تمام دینی اور ملی سرگرمیاں مزید اضافہ کے ساتھ یہاں جاری ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مذکورہ علامتی نظریہ سراسر بے بنیاد تھا۔ یہ کچھ سطحی ذہنوں کی خود ساختہ پیداوار تھی۔ اس کا کوئی بھی تعلق نہ تاریخ سے تھا اور نہ دین اسلام سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مسائل بے علمی اور کم فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک معاملہ پیش آتا ہے۔ اب جو لوگ اس کو گہرائی کے ساتھ سمجھ نہیں پاتے وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو ہماری غیرت کے لیے چیلنج ہے ہم کیسے اس پر خاموش رہ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ضمیر کا سوال ہے، ہم کیوں کر اس پر سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے وقار کا مسئلہ ہے پھر کیسے ہم اس کو برداشت کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے تمام احساسات صرف کم فہمی کا ثبوت ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر واقعات کو صرف ایک پہلو سے دیکھ پاتے ہیں۔ وہ اس کے دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے۔

ایسے لوگوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ نازک مسائل پر چپ رہیں۔ اپنے قصور فہم کے باوجود اگر وہ بولیں گے تو وہ جرم کریں گے اور یقینی طور پر خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے۔ خواہ اپنے خیال کے تحت وہ حق کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔

لیڈری نے تباہ کیا

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ - ۱۸۷۰) کی ایک کتاب ہے جس کا نام "چند ہم عصر" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی کچھ ہم زمانہ شخصیتوں پر اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ ایک مضمون میں وہ مولانا محمد علی جوہر کے بارہ میں لکھتے ہیں :

" محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اس کے سامنے پودنے تھے۔ مگر افسوس اُسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ اس کے ایک دوست جو اسے بچپن سے جانتے تھے، اور جنھوں نے زندگی کی ہر منزل میں اُسے دیکھا اور اس کا ساتھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا۔ بشرطیکہ اسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں پرہیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ہر معاملے میں جوش کے وقت اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا تھا۔ محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شئی کے لئے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں نا تربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں، ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں اس کے لئے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔"

ڈاکٹر عبدالحق نے مولانا محمد علی کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہی موجودہ زمانہ کی تقریباً تمام مسلم شخصیتوں پر صادق آتا ہے۔ ہر ایک کو لیڈری نے تباہ کیا۔ ہر ایک کی بہترین صلاحیتیں چند دن کے شور و ہنگامہ کے بعد ختم ہوگئیں۔ ان کی صلاحیت نہ خود صاحب شخصیت کے کام آئی اور نہ ملت کو ان سے کوئی حقیقی فائدہ پہنچا۔

اس دوہرا ناکامی کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ان کا صبر کی صفت سے خالی ہونا۔ قرآن میں ہے کہ ——— اور ہم نے ان میں امام (قائد) بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انھوں نے صبر کیا (السجدہ ۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیادت کا کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کے اندر صبر کی صفت ہو۔ صبر و تحمل کے بغیر کوئی شخص قوموں کا رہنما نہیں بن سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قائد تنہائی میں نہیں ہوتا۔ اس کو لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ اس کو موافق اور مخالف دونوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس کا معاملہ ان لوگوں سے بھی پڑتا ہے جو اس کی تعریف کریں اور ان سے بھی جو اس پر تنقید کریں۔ وہ کبھی تلخ حالات سے گزرتا ہے اور کبھی نرم حالات سے۔ کبھی کوئی شخص اس کو سہارا دیتا ہے اور کبھی کوئی اس کو دھکا دے کر گرانے کی کوشش کرتا ہے۔

ان مختلف احوال سے نباہ کرنے کا واحد ذریعہ صبر ہے۔ اگر قائد کے اندر صبر کی صفت نہ ہو تو وہ بار بار بھڑک اٹھے گا۔ حقیقت پسندانہ انداز سے رائے قائم کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کی منصوبہ بندی اس کی عقل کے بجائے اس کے جذبات کے تابع ہوجائے گی۔ وہ اپنی بے صبری کے نتیجہ میں غیر ضروری چھلانگ لگائے گا اور قیمتی مواقع کو برباد کردے گا۔

بدقسمتی سے یہی موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام لیڈروں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مگر اس طرح کی چھلانگوں سے قائد تو بنتے ہیں مگر قوم نہیں بنتی۔

زندگی مسلسل چیلنج کا نام ہے۔ زندگی کبھی مسائل سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے جب بھی کوئی لیڈر اٹھتا ہے، اس وقت قوم کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار ہوتی ہے کسی نہ کسی معاملہ پر ناراضگی کا احساس اس کے اندر موجود رہتا ہے۔ اب ایک لیڈر وہ ہے جو قوم کی ناراضگی کو لے کر تقریریں شروع کردے اور لوگوں کو بھڑکا کر انھیں مفروضہ دشمن کے خلاف ٹکرا دے۔

دوسرا لیڈر وہ ہے جو حالات کا گہرا جائزہ لے۔ وہ مسائل کی نوعیت کو سمجھے اور قوم کی طاقت کا اندازہ لگائے۔ اور پھر منصوبہ بند انداز میں مسئلہ کے حل کی تدبیر کرے۔ پہلا شخص مسئلہ کے نام پر لیڈری کرنے والا ہے، اور دوسرا شخص مسئلہ کو حل کرنے والا۔

۱ آل انڈیا ریڈیو (شعبہ ہندی) نئی دہلی کے نمائندہ مسٹر آر پی شری دھر نے ۲۱ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جو نفرت اور کٹرپن ہے کیا مذہبی تعلیم اس کی ذمہ دار ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہرگز نہیں، اس کی ذمہ داری صرف اس سطحی قسم کی سیاست پر ہے جو آزادی کے بعد ہمارے یہاں چل پڑی۔

۲ ساون کرپال روحانی مشن کے تحت کرپال آشرم (دہلی) میں ۱۴-۲۱ ستمبر ۱۹۹۵ کو مسٹزم پر ایک گلوبل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر ۲۰ ستمبر کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۳ ایک سفر کے ذیل میں صدر اسلامی مرکز نے ۲۳-۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ کو بمبئی میں قیام کیا۔ وہاں مختلف لوگوں سے ملاقات اور گفت گو ہوئی۔ ایک اسٹوڈیو نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی ویڈیو ریکارڈنگ کی۔ اس تقریر کا موضوع "اسلامی اتحاد" تھا۔

۴ نوراتری وکھیان مالا کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے برہان پور (مدھیہ پردیش) کا سفر کیا۔ وہاں ۲۵ ستمبر ۱۹۹۵ کو ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اس میں بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان موجود تھے۔ خطاب کا موضوع تھا: ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت اور مشترک کلچر۔ خطاب کے علاوہ دونوں فرقہ کے لوگوں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔

۵ امریکی میگزین ٹائم کے بیورو چیف مسٹر تھامسن (Dick Thompson) نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو نئی دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوال وجواب کا خلاصہ مقابل کے صفحہ پر دیا جارہا ہے۔

۶ بی اے جی فلمس لیمٹڈ (نئی دہلی) کی ویڈیو ٹیم ۲۹ ستمبر ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور زی ٹی وی کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کچھ نام نہاد لیڈر مسلمانوں کو بھڑکا کر ٹکراؤ کے راستہ پر ڈالتے تھے۔ مگر اب مسلمان ان لیڈروں کو سمجھ گئے ہیں۔ انھوں نے جان لیا ہے کہ ترقی

Questions and Answers

Q. Why Islam is so strongly associated with terrorism?

A. This is true that some Muslims are engaged in terrorist activities in the name of Isla But their terrorism has nothing to do with Islam. It is Islam's misuse, not proper u You will have to differentiate between Muslims and Islam.

Basic reason for present Muslims' engagement in violence is to be traced in th backwardness in modern education. Due to this lacking they are not consciously aw of the modern democratic method. Educational backwardness has rendered them i a case of anachronism.

So far Islam is concerned, it is entirely a peaceful religion. The Qur'an clearly sta that 'God calls you to the home of peace' (10:25). Terrorism is totally unlawful Islam. One of the attributes of a believer finds expression in these words in the Qur' 'they enjoin on each other truth, and enjoin on each other patience (103:3). This me that the task of religion is to be performed by adhering to patience in full.

In fact Islamic activism is peaceful activism, or non-violent activism in the full se of the word, violent activism is in no way permitted in Islam.

Fighting is allowed in Islam in particular circumstances alone, i.e. when one has b left with no option but to fight in defence. The Qur'an states: "Fight for the sake God those that fight against you, but do not be aggressive. God does not love aggressors" (2:190).

Moreover, the permission to enter into a war is only for the State and not for individuals. However, even the State is not permitted to wage a war in aggressi Besides even when another nation initiates hostilities on the Muslim State, it will f of all opt for all possible ways to avoid taking up arms. As Qur'an says: Reconciliat is the best policy (4:128). War in Islam is allowed only in unavoidable circumstanc it is never allowed in normal conditions.

Q. If terrorism is against the teachings of Islam why it is that Islamic scholars and Musl leaders do not openly condemn it.

A. Just out of fear. If they dare to condemn it openly they will find their names amc the hit list of the terrorists. Some do not take stand against the terrorists for fear losing popularity among the masses, while others out of fear for being enlisted amc the hit list.

Q. Are you worried for figuring on the hit list?

A. Absolutely not. I have a sound sleep daily. You know, the greatest joy to be fou in this world is to have the conviction that one stands on truth. And I am in possess of this joy, by the grace of God. Then why do I need to worry.

Q. To the present day Muslims who opt for terrorism to achieve their goals, w alternative Islam offers them to achieve their goals.

A. According to Islam, the alternative to them is to completely shun political confrontat and violence, and then whatever opportunities are still available to them, must availed through peaceful means. In this regards the Qur'an states: With every difficu there is relief (94:5). That is to say, opportunities always exist side by side w problems. Hence the formula of Islam is: Ignore the problems, avail the opportuniti

November 1, 1995

ہمیشہ ملاپ سے ہوتی ہے نہ کہ ٹکراؤ سے۔

۷ مسٹر ڈی کے شرما اور ان کی ٹیم ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق سورج گرہن کے مسئلہ سے تھا جو ۲۴ اکتوبر کو پڑنے والا ہے۔ انھیں حدیث رسول کی روشنی میں اس کی حقیقت بتائی گئی۔

۸ بھارتیہ ودیا بھون اور حکومت مہاراشٹر کے تعاون سے ۲ اکتوبر ۱۹۹۵ کو بمبئی میں مہاتما گاندھی کی ۱۲۵ ویں جینتی بڑے پیمانہ پر منائی گئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا: گاندھی اینڈ نان وائلنٹ ایکٹوزم۔

۹ سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر ہریش لوٹیال نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹیلیفون پر انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق سورج گرہن سے تھا جو ۲۴ اکتوبر کو پڑنے والا تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ پیغمبر اسلام نے گرہن کو "خدا کی نشانی" بتایا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام پہلا دین ہے جس نے اس معاملہ میں انسان کو توہماتی عقائد سے باہر نکالا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۵ کو اینگلو عربک نرسری اینڈ پرائمری اسکول (دہلی) میں پانچواں انٹر اسکول کامپٹیشن ہوا۔ موضوع سیرۃ النبیؐ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور اسلام میں تعلیم کی اہمیت پر تقریر کی۔

۱۱ ۲۲ - ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ کو فلارنس میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے یورپ کا ایک سفر کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: استقلال کی اہمیت۔ اس میں بتایا گیا کہ کامیابی ہمیشہ اس طرح ملتی ہے کہ آدمی پست ہمت نہ ہو اور مسلسل اپنا عمل جاری رکھے۔

۱۳ انٹرنیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ۴ نومبر ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سمپوزیم

ہوا۔ اس کا عنوان تھا:

Message of Sufis for peaceful co-existence.

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تصوف آدمی کے اندر روحانی بلندی پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ منفی احساسات سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان مثبت اخلاقیات کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔

۱۴ مسٹر جمشید عادل نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو روزنامہ عوام (دہلی) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق اس سوال سے تھا کہ آنے والے الکشن میں مسلمانوں کی انتخابی پالیسی کیا ہونا چاہئے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی کوئی واحد ملکی پالیسی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ انھیں اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے مقامی پالیسی بنانا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ کسی ایک سیٹ پر کئی مسلم نمائندے ہرگز کھڑے نہیں کرنا چاہئے۔

۱۵ اکھل بھارتیہ ہندی اردو پتریکا سمنوے سمیتی کی طرف سے ۷ نومبر ۱۹۹۵ کو غالب اکیڈمی (دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کے پچھڑے پن کا ذمہ دار کون۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس میں چیف گیسٹ کے طور پر شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے تھا کہ مسلمانوں کا پچھڑا پن اب پرانی بات ہو چکی ہے۔ مسلمان اب جاگ چکا ہے اور وہ ہر میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔

۱۶ مز کپنا نے ۹ نومبر ۱۹۹۵ کو دینک ہندستان (ہندی روزنامہ، دہلی) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کشمیر کو اٹانومی دینے سے کیا ایسا نہیں ہوگا کہ ملک کی دوسری ریاستیں بھی اس طرح اٹانومی مانگنے لگیں۔ جواب دیا گیا کہ یہ اٹانومی عین وہی ہے جو دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ نے کشمیر کو دستوری طور پر دے رکھی ہے۔ کشمیر کو اٹانومی دینا دستور کی تعمیل ہے۔ جب کہ دوسری ریاستیں اگر اس کی مانگ کریں تو وہ ان کے لئے ایک ایسی چیز کا مطالبہ کرنا

ہوگا جس کا انھیں دستوری طور پر حق ہی نہیں۔

۱۷ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر منوہر موج اور مسٹر وکاس موہن نے ۹ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ بعض پارٹیاں مانگ کر رہی ہیں کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کو دستور سے حذف کر دیا جائے۔ جواب میں کہا گیا کہ اگر ایسا کیا جائے تو دستور اور قانون کا احترام ختم ہو جائے گا۔ اور لوگوں میں لاقانونیت کا مزاج بنے گا۔ اس طرح دستور کی ایک دفعہ حذف کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا دستور بلکہ پورا قانونی نظام عملاً حذف ہو کر رہ جائے گا۔

۱۸ مدرسہ قادریہ مسروالا (ہماچل پردیش) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ہماچل پردیش کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں علاقہ کے اندر مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

مولانا وحید الدین خاں

Al-Risala Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128 Fax 91-11-4697333

First published in 1996

خاتون جنّت

قرآن میں وہ تمام بنیادی صفات بتائی گئی ہیں جو جنتی خاتون میں ہونا ضروری ہیں۔ یہ صفتیں کسی عورت کو مغفرت اور اجر عظیم کا مستحق بناتی ہیں۔ وہ اس کے لیے آخرت کے عذاب سے نجات کو یقینی بنانے والی ہیں۔ سورہ الاحزاب ۳۵، اور التحریم ۵ کے مطابق، وہ صفات حسب ذیل ہیں :

ایمان، اسلام، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، صوم، حفظ فروج، ذکر اللہ، توبہ، عبادت، سیاحت۔

۱۔ ایمان سے مراد معرفت رب ہے۔ یعنی اپنے خالق و مالک کو اس طرح شعوری طور پر دریافت کرنا کہ وہ آپ کی سوچ پر چھا جائے۔ وہ آپ کے دل کے اندر سما جائے۔ آپ کی پوری شخصیت خدا کے نور سے نہا اٹھے۔

۲۔ اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں۔ اس سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے تابع بنانا ہے۔ یعنی آپ کا نفس اللہ کی اطاعت پر پوری طرح قائم ہو جائے۔ آپ اللہ کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگیں۔ آپ کی مرضی کا ہر قولی یا عملی اظہار عین اس کے مطابق ہو جس کا اللہ نے حکم فرمایا ہے۔

۳۔ قنوت کا مطلب مخلصانہ فرماں برداری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کر لیا جائے جو خدا اور رسولؐ نے بتایا ہے۔ تعمیل حکم میں جب قلب کا جھکاؤ اور خضوع شامل ہو جائے تو اسی کو قنوت کہا جاتا ہے۔

۴۔ صدق کے معنی سچائی کے ہیں۔ اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے، یعنی وہی کہنا جو آپ کو کرنا ہے اور وہی کرنا جو آپ نے اپنی زبان سے کہا ہے۔ لوگوں کے درمیان آپ ایک صاحب کردار خاتون کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔

۵۔ صبر ایک بہادرانہ صفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام پر چلنے کے لیے اگر تکلیف اٹھانا پڑے تب بھی اس سے نہ ہٹنا۔ نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر جمے رہنا۔ مخالفانہ محرکات کے باوجود خدائی راستہ کو نہ چھوڑنا۔

۶۔ خشوع سے مراد تواضع اور خاکساری ہے۔ خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور

سے کسی کے اندر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کو خشوع کہا جاتا ہے۔ یہ احساس مومن اور مومنہ کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے۔ خدا کے خوف سے ان کے دل لرز اٹھتے ہیں اور ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۷۔ صدقہ کا مطلب خیرات ہے۔ یعنی آپ اپنے مال میں سے دوسرے ضرورت مندوں کا حق نکالیں۔ جس طرح اپنی ضرورت کا احساس آپ کو اپنے اوپر خرچ کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے اسی طرح دوسرے حاجت مندوں کی امداد سے بھی بے پروا نہ رہیں۔

۸۔ صوم کا مطلب اللہ کے لیے روزہ رکھنا ہے۔ روزہ شکر کی تربیت ہے۔ روزہ رکھنا گویا اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جانا ہے جبکہ آپ خدا کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تجربہ کریں۔ اور پھر آپ کے اندر اس رزق کے اوپر خدا کے شکر کا جذبہ بیدار ہو جو اس نے اپنے خزانۂ رحمت سے آپ کو عطا کیا ہے۔

۹۔ حفظ فروج کا لفظی مطلب شرمگاہوں کی حفاظت ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں عفت اور پاک دامنی کا طریقہ اختیار کرنا اور بے حیائی والے اعمال سے بچنا۔ حیا کا فطری پردہ جو خدا نے پیدا کیا ہے اس کا پورا لحاظ رکھنا۔

۱۰۔ ذکر اللہ کا مطلب اللہ کی یاد ہے۔ خدا کو بہت زیادہ یاد کرنا خدا کی معرفت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو کوئی خدا کو حقیقی طور پر پالیتا ہے اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ہر موقع پر اس کو خدا کی یاد آتی ہے۔ اس کی روح خدا کے تصور سے اس طرح سرشار ہو جاتی ہے کہ بار بار اس کو خدا کی یاد آتی رہے۔

۱۱۔ توبہ کے لفظی معنی ہیں پلٹنا۔ یعنی غلطی کرنے کے بعد پھر صحیح روش کی طرف لوٹ آنا۔ یہ کسی مومنہ کی خاص صفت ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں ہر ایک سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر یہ ہونا چاہیے کہ نفس کے غلبہ سے جب وقتی طور پر کسی سے غلطی ہو جائے تو اس کے بعد خدا کی پکڑ کا احساس اس پر طاری ہو اور وہ فوراً پلٹ کر خدا سے معافی مانگنے لگے۔

۱۲۔ عبادت سے مراد پرستش ہے۔ یعنی وہ خاشعانہ عمل جو خدا کی عظمت اور برتری کو مان کر اس کے سامنے کیا جائے۔ اس قسم کی پرستش اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ جنّتی خاتون کی پہچان یہ ہے کہ وہ صرف ایک خدا کی پرستار بن گئی ہو۔

۱۳۔ سیاحت سے مراد روزہ جیسے ریاضتی اعمال ہیں۔ اس کی روح زہد ہے۔ کسی مومنہ پر جب آخرت کی فکر اتنی زیادہ غالب آجائے کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہو جائے اور دنیا کی چیزوں میں اس کا شوق باقی نہ رہے تو اس وقت اس کی جو زاہدانہ زندگی بنتی ہے اسی کو یہاں سیاحت کہا گیا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر چیز کو جوڑے جوڑے کی صورت میں بنایا ہے
(ومن کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون) الذاریات ۴۹

اسی اصول فطرت کے مطابق انسان کو بھی دو حصوں کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے، اس کا ایک حصہ مرد ہے اور اس کا دوسرا حصہ عورت۔ یہ خود خالق فطرت کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ ہر مرد اور عورت پر لازم ہے کہ وہ اس منصوبہ کو تسلیم کرے۔ اس کو رد کر کے زندگی کا کوئی اور نقشہ بنانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس فطری منصوبہ کو ماننے ہی کا نام کامیابی ہے اور اس کو نہ ماننے کا نام ناکامی۔

زوجین کی اس تقسیم کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر فریق اپنی حیثیت کو اور اپنے کار منصبی کو جانے۔ مرد کو یہ جاننا ہے کہ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اسی طرح عورت کو یہ جاننا ہے کہ اس کے حدود کار کیا ہیں۔ زندگی کے نظام میں خالق فطرت نے اس کو کیا درجہ عطا فرمایا ہے۔

ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ مرد باہر کا منتظم کار ہے اور عورت گھر کی سردار ہے۔ اصولی تقسیم کے مطابق، مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ باہر کے معاملات کو سنبھالے، اور عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کے امور کو سنوارے اور ان کو درست کرے۔

تاہم اس تقسیم کار کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نزاکتوں کو سمجھیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کامل تعاون کریں۔

مثلاً مرد جو ماہانہ رقم کماتا ہے، عورت اگر گھر کے اخراجات کا بجٹ اس سے زیادہ بنائے تو گھر کے نظام کا خوش اسلوبی کے ساتھ چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی طرح مرد اپنے جن رشتہ داروں کو عزیز رکھتا ہے، عورت ان کے ساتھ رقابت قائم کر لے۔ مرد جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہتا ہے، عورت ان کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ مرد سماج کے اندر جن تعلقات کو نبھانا چاہتا ہے، عورت ان کو توڑنے کے درپے ہو جائے۔ مرد وسیع تر مفاد کی خاطر جن لوگوں کو دوست رکھنا چاہتا ہے، عورت ان سے قطع تعلق کی وکیل بن جائے۔

اس قسم کی تمام باتیں فطرت کے نظام میں خلل ڈالنے کے ہم معنی ہیں۔ جب بھی کوئی عورت

ایسا کرے گی تو وہ صرف ایک مرد سے عدم موافقت کرنے والی نہیں ہوگی بلکہ وہ خود نظام فطرت سے عدم موافقت کی مجرم قرار پائے گی۔

عورت پر لازم ہے کہ وہ صرف اپنے جذبات کو رہنما نہ بنائے بلکہ خالق فطرت کے منصوبہ پر نظر رکھے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ وہ انسانیت کے وجود کا نصف ہے نہ کہ کل۔ اس کو اپنے جذبات کے ساتھ نظام فطرت کو بھی دیکھنا ہے، اور جہاں اس کے ذاتی احساسات اور فطرت میں ٹکراؤ ہو وہاں اپنے احساسات کو دبانا ہے اور فطرت کے نظام کو خوشدلی کے ساتھ اختیار کر لینا ہے۔

کائنات کا نظام اسی موافقتِ باہمی کے اصول پر چل رہا ہے۔ کائنات کا ہر جزء پورے جذبہ اطاعت کے ساتھ دوسرے اجزاء کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنا وظیفہ ادا کر رہا ہے۔ یہی معاملہ گھر کے نظام میں بھی مطلوب ہے۔ یہاں بھی عورت کو گھر کے مجموعی نظام سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کا نقشہ بنانا ہے۔ اسی ہم آہنگی میں اس کے لیے ہر قسم کی سعادت اور ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

گھر کے نظام کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے عورت کو اپنے ساتھ دوسروں کے جذبات کی رعایت کرنا ہے۔ اس کو اپنے حقوق کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہونا ہے۔ اس کو اپنے خونی رشتوں کے احترام کے ساتھ اپنے غیر خونی رشتوں کا بھی پورا لحاظ رکھنا ہے۔ اور یہ سب کچھ یہ سمجھ کر کرنا ہے کہ وہ کسی مرد یا کسی عورت کے سامنے نہیں جھک رہی ہے بلکہ خالق فطرت کے آگے جھک رہی ہے، کیوں کہ خالق فطرت کی مرضی یہی ہے۔

زوجین کے اصول کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ مرد کے ساتھ عورت ہے اور عورت کے ساتھ مرد۔ مگر وسیع تر معنی میں وہ پوری زندگی کو سموئے ہوئے ہے۔ وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مرد اور عورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ زندگی عالمی انسانی اشتراک کا ایک نظام ہے۔ کوئی مرد یا کوئی عورت اس عمومی زنجیر کی صرف ایک کڑی ہے۔ ایک کڑی کے ٹوٹنے سے پوری زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس لیے ہر کڑی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سالمیت کو آخری حد تک باقی رکھے تاکہ فطرت کا قائم کردہ نظام حیات شکست و ریخت کا شکار نہ ہونے پائے۔

تقسیم کار

ابن ماجہ کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی صالح بیوی سے بہتر نہیں (لیس من متاع الدنیا شیئ افضل من المرأة الصالحة) عورت کی اس خصوصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ صالح عورت اپنی مخصوص حیثیت کی بنا پر مرد کی بہترین ساتھی اور بہترین مشیر ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں اس نوعیت کے دو واقعے نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی مکہ کے قریب غار حرا میں اتری۔ یہ آپ کے لیے ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔ آپ غار سے نکل کر اپنے گھر میں واپس آئے تو روایات کے مطابق آپ کانپ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھاؤ۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ سے وہ پورا قصہ بیان کیا جو غار حرا کی تنہائی میں آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس وقت یہ الفاظ کہے :

کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الکلّ وتکسب المعدوم وتُقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

ہرگز نہیں، خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، گمنام لوگوں کو کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور قدرتی آفتوں کے شکار لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دینے کے لیے جو کلمات کہے وہ بلاشبہ اپنے موقع کے لحاظ سے بہترین کلمات تھے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ حضرت خدیجہ کے لیے کیسے یہ ممکن ہوا کہ اس نازک موقع پر ایسے پر اعتماد الفاظ کہہ سکیں۔ اس کی خاص وجہ آپ کا مذکورہ طوفان خیز تجربہ سے الگ رہنا ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں میں بار بار ایسے گمبھیر مسائل آتے ہیں جن میں بعض اوقات وہ شخص غیر متاثر رائے قائم نہیں کر پاتا جو خود مسئلہ کے اندر گھرا ہوا ہو۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس ایک

ایسا مشیر ہو جو خود مسئلہ سے متعلق نہ ہو تاکہ اس کی بابت وہ غیر متاثر ذہن کے تحت رائے قائم کر سکے۔ حضرت خدیجہ کا مذکورہ قول اسی کی ایک مثال ہے۔

اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا اصول رکھا ہے، اس تقسیم سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے۔ عورت اپنے شعبہ میں مصروف ہوتی ہے اور مرد اپنے شعبہ میں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے معاملات سے براہ راست طور پر غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر فریق اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کے معاملہ میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچے۔ اور اپنے بے لاگ مشورہ سے اس کی مدد کر سکے۔ اس تقسیم کار کے نتیجہ میں عورت اور مرد دونوں کو ایسے قابل اعتماد ساتھی مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن سکیں۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، تو صحابہ میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ معاملہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔ لوگوں میں اس قدر غم وغصہ تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، یہیں ذبح کر دو اور سر منڈالو تو ایک شخص بھی اس کے لیے نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی سب لوگ خاموش رہے۔ آپ رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ موجود تھیں۔ انھوں نے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔

ام سلمہؓ نے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ۔ اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور سر منڈالیں۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈایا۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو سب نے اٹھ کر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی طرح ام سلمہؓ کو اس نازک مواقع پر جو قیمتی بات سوجھی وہ اس لیے سوجھی کہ وہ اصل معاملہ سے الگ تھیں۔ اور اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں تھیں کہ غیر متاثر ذہن کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کر سکیں۔ بصورتِ دیگر ان کے لیے ایسا کرنا شاید ممکن نہ ہوتا۔

بہترین خزانہ

قرآن میں ہے کہ : اے ایمان والو، اہل کتاب کے اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ اس دن اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی ــــــ یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کیا تھا۔ پس اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے (التوبہ ۳۴ - ۳۵)

یہ آیت قرآن میں اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بُرا ہو سونے کا اور بُرا ہو چاندی کا۔ یہ بات صحابہ پر بہت شاق گزری۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ پھر اور کون سا مال ہم اپنے پاس رکھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں رسول اللہ ؐ کے پاس جا کر اس کی بابت دریافت کروں۔ لوگوں نے کہا کہ ضرور۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب پر یہ بات بہت شاق ہو رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ پھر ہم کون سا مال اکٹھا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : نعم، فلیتخذ احدکم لساناً ذاکراً وقلباً شاکراً و زوجۃً تعین احدکم علیٰ ایمانہ (ہاں، تم میں سے جس شخص کو اپنانا ہے وہ خدا کو یاد کرنے والی زبان کو اپنائے، وہ شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایک ایسی بیوی کو اپنائے جو اس کے دین میں، اس کی آخرت کے معاملہ میں اس کی مدد کرے۔ (تفسیر طبری ۱۰/ ۲۱-۱۲۰)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بہترین خزانہ کیا ہے جس کو آدمی اپنے لیے جمع کرے۔ بہترین خزانہ وہ صالح عورت ہے کہ جب مرد اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب وہ اس سے کوئی بات کہے تو وہ اس کی تعمیل کرے۔ اور جب وہ گھر میں موجود نہ ہو تو نفس اور مال میں اس کی حفاظت کرے (الا اخبرك بخير ما یکنز المرء۔ المرأۃ الصالحۃ التی اذا نظر الیھا سرتہ واذا امرھا

(طاعته و اذا غاب عنها حفظته فی نفسها و ماله) تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۵۱

اس حدیث میں عورت کو کسی مرد کے لیے سب سے اچھا خزانہ کہا گیا ہے۔ اور یہ بات صدفی صد درست ہے۔ سونا اور چاندی یا مال صرف مادی ضرورت پورا کرتے ہیں۔ مگر ایک صالح خاتون گھر کو اور خاندان کو خوشی اور سکون اور محبت کا گہوارہ بناتی ہے۔

ایک صالح خاتون اپنے میٹھے بول سے گھر میں مٹھاس بکھیرتی ہے۔ وہ اپنے اچھے اخلاق سے پورے ماحول کو انسانیت کا ماحول بناتی ہے۔ اس کا شریفانہ برتاؤ ہر ایک کو شرافت کی تربیت دینے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کی پیدائشی نرمی اس کو نرم گفتار اور نرم کردار بناتی ہے، اور پھر گھر کی پوری فضا اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

عورت اپنی فطری صلاحیت اور اپنے فطری حالات کے اعتبار سے گھر کی انچارج ہے۔ گھر کے نظام میں اس کو مرکزی شخصیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے گھر کے بننے یا بگڑنے میں اس کا رول بے حد اہم ہے۔ ایک عورت کے بننے سے گھر بنتا ہے اور ایک عورت کے بگڑنے سے گھر بگڑ جاتا ہے۔ اسی لیے عورت کو بہترین خزانہ کہا گیا ہے۔

عورت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ گھر کو مسرتوں کا باغ بنائے۔ اس کے شوہر کو اور گھر کے دوسرے افراد کو اس سے خوشی کا تحفہ مل رہا ہو۔ ہر ایک کے لیے اس کا وجود نفع بخشی اور فیض رسانی کا ذریعہ بن گیا ہو۔ شوہر کو اور گھر کے افراد کو یہ یقین ہو کہ خواہ وہ موجود ہوں یا غیر موجود ہوں۔ ہمیشہ گھر کے اندر ان کا ذکر خیر خواہی کے ساتھ کیا جائے گا۔ ہمیشہ ان کو وہ سلوک ملے گا جو ان کی دنیا و آخرت کے لیے سب سے بہتر ہو۔

عورت گھر کا خزانہ ہے، بلکہ سب سے اچھا خزانہ۔ عورت گھر کے باغ کا پھول ہے، بلکہ سب سے اچھا پھول۔ عورت گھر کی دنیا کی روشنی ہے، بلکہ سب سے اچھی روشنی۔ مگر کوئی عورت اپنا یہ فطری کردار اسی وقت ادا کر سکتی ہے جب کہ وہ باشعور ہو، جب کہ وہ اپنے احساسات کے ساتھ دوسروں کے احساسات کو بھی جانے۔ جب کہ اس کے اندر یہ عزم ہو کہ وہ بہر حال اس انسانی کردار کو ادا کرے گی جو خالق نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، خواہ اس کے لیے اسے صبر و برداشت کی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

خیر کثیر

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ایک مقام پر مردوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ عورت کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر ظلم و زیادتی کریں۔ اس سلسلہ میں ضروری احکام دینے کے بعد ایک اصولی اور جامع تعلیم دی گئی ہے جو یہ ہے :

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (النساء ۱۹)	اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔

اس آیت کا ابتدائی خطاب مردوں سے ہے۔ مگر وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ اس میں دونوں ہی کے لیے یکساں رہنمائی موجود ہے۔ نکاح کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نباہ کرنا جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح وہ عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

مرد اگر محسوس کرے کہ اس کی ہونے والی بیوی میں کوئی جسمانی یا مزاجی کمزوری ہے تو اس کی بنا پر اسے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو برداشت کرتے ہوئے عورت کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی اپنی دوسری خصوصیات کو بروئے کار لائے اور اس طرح گھر کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرے۔ شوہر کو چاہیے کہ وہ ظاہری ناپسندیدگی کو بھلا کر باہمی تعلق کو نبھائے۔

یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ عورت کے ساتھ بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ نکاح کے بعد اس کو احساس ہو کہ اس کے شوہر میں فلاں کمزوری ہے۔ وہ سمجھے کہ میری قسمت خراب ہوگئی۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کو جاننا چاہیے کہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی عورت ایسا کامل مرد پالے جس میں اس کے نقطۂ نظر سے کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو۔ اس لیے عورت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ نباہ کے اصول کو اختیار کرے۔ جب وہ ایسا کرے گی تو وہ پائے گی کہ اس کے شوہر میں اگر ایک اعتبار سے کمی تھی تو دوسرے اعتبار سے اس کے اندر ایسی خوبیاں تھیں جن کے ہوتے ہوئے کمی کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایسا کرنا کسی عورت یا کسی مرد سے موافقت کرنا نہیں ہے بلکہ وہ خود فطرت کے نظام سے موافقت کرنا ہے۔ اور جب معاملہ کسی عورت یا کسی مرد کا نہ ہو بلکہ فطرت کا ہو تو آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی خاندان اور اسی طرح کسی معاشرہ کی ترقی و استحکام کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کی کمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کو ظہور میں آنے کا موقع دیں۔ جو لوگ اللہ کی خاطر موجودہ دنیا میں اس صبر کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی جنتوں میں داخلہ کا پروانہ حاصل کریں گے۔

مذکورہ اصول اس سورہ میں اگرچہ شوہر اور بیوی کے تعلق کے بارہ میں آیا ہے۔ مگر اس کے اندر ایک عمومی تعلیم بھی موجود ہے۔ قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ ایک متعین معاملہ کا حکم دیتے ہوئے اس کے درمیان ایسی کلی ہدایت دے دی جاتی ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہو۔

دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے مل جل کر رہنا بالکل ضروری ہے۔ کوئی عورت یا مرد دوسروں سے الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتے۔ اب چونکہ لوگوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں۔ ہر ایک کی طبیعت الگ الگ ہے اس لیے جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں گے تو ان کے درمیان لازماً اختلاف اور شکایت والی باتیں پیدا ہوں گی، ایسی حالت میں زندگی گزارنے کی قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ شکایتوں کو نظر انداز کیا جائے۔ اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے ساتھی کی ایک کمی یا خرابی دوسرے کے سامنے آتی ہے۔ وہ فوراً اس سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور بس اسی کو لے کر اپنے ساتھی سے روٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ سوچے تو وہ پائے گا کہ ہر ناموافق صورت حال میں ایک یا ایک سے زیادہ موافق پہلو موجود ہے۔

مثلاً کسی عورت یا مرد میں اگر ظاہری کشش کم ہو تو اس کے اندر عملی صلاحیت زیادہ ہوگی۔ اگر اس کے مزاج میں کوئی پہلو ناپسندیدہ ہو تو عین ممکن ہے کہ اس کے اندر ذہنی اعتبار سے اعلیٰ صلاحیت موجود ہوں۔ اگر کوئی شخص ابتدائی مرحلہ میں کم پیسہ والا ہے تو اس کے اندر یہ استعداد ہو سکتی ہے کہ وہ محنت کر کے آئندہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر لے۔

یہ فطرت کا نظام ہے، اور فطرت کے نظام میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اخلاق نسواں

اخلاق اس اجتماعی سلوک کا نام ہے جو دوسروں سے معاملات اور تعلقات کے دوران کوئی مرد یا عورت انجام دیتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ ایسے ہر موقع پر لوگوں کے ساتھ اچھا اخلاقی سلوک کیا جائے۔ یہ حکم عورت سے بھی اتنا ہی متعلق ہے جتنا کہ وہ مرد سے متعلق ہے۔

آپ کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ جب آپ اپنی زبان کھولیں تو جھوٹ کے لیے نہ کھولیں بلکہ سچ کے لیے کھولیں۔ ہمیشہ انصاف کی بات بولیں۔ کسی کے خلاف الزام تراشی نہ کریں۔ بلکہ وہ بات کہیں جس میں دوسروں کے لیے خیر خواہی پائی جاتی ہو۔ آپ کا بولنا سچائی کے اظہار کے لیے ہو نہ کہ سچائی کو چھپانے کے لیے۔ جب کوئی حق آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو فوراً اس کا اعتراف کرلیں، آپ کی زبان سے کبھی پست بات نہ نکلے بلکہ جب بھی نکلے تو اعلیٰ انسانیت کی بات نکلے۔ آپ کا کلام تواضع، شرافت، شکرگزاری، خیر پسندی اور اعتراف حق کے احساسات سے بھرا ہوا ہو۔

قرآن میں ہے کہ جو کوئی نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ہم اس کو جلائیں گے اچھا جلانا (مَن عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ) النحل ۹۷

اس سے معلوم ہوا کہ صالح اعمال یا اچھے اخلاق کا تعلق صرف دوسروں سے نہیں ہے، جو لوگ ایسا کریں خود ان کی ذات کو اس کا یقینی فائدہ سب سے پہلے پہنچتا ہے

جب آپ سچ بولیں تو اس سے آپ کو ایک خاص قسم کا روحانی سکون ملتا ہے۔ آپ کے اندر ایک بے تضاد شخصیت پرورش پانے لگتی ہے۔ جب خاندان کے ایک فرد سے آپ کو تکلیف پہنچے اور آپ اللہ کی خاطر اس کو بھلا دیں اور اس کے حق میں نیک دعا کریں تو آپ کے اندر انسانی خیر خواہی کا ایک چشمہ ابل پڑتا ہے جس کی ٹھنڈک آپ کے دل و دماغ تک پہنچتی ہے۔ اگر آپ کے لڑکے اور کسی دوسرے لڑکے کے درمیان تکرار ہوتی ہے، اس وقت آپ کا رویہ بیٹے کی طرف داری کا نہیں ہوتا بلکہ حق کی طرف داری کا ہوتا ہے تو ایسی روش سے آپ کو ایک ایسا ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے جو بھاری قیمت دے کر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

اوپر کی آیت میں جس چیز کو حیات طیبہ (اچھی زندگی) کہا گیا ہے۔ وہی دنیا میں ضمیر کے اطمینان

اور دل کے سکون کا ذریعہ ہے۔ اور یہی حیات طیبہ کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ آخرت میں اس کے لیے جنت کے ابدی دروازے کھولے جائیں۔

جنت کس کو ملے گی، اس عورت یا مرد کو جسے یہاں حیات طیبہ ملی۔ جس کا دماغ نورالٰہی سے روشن ہوا۔ جس کے دل میں ربانی کیفیات کے چشمے پھوٹے۔ جس کا سینہ یادِ خداوندی کے طوفان سے آشنا ہوا۔ جس کی آنکھوں نے خدائی منظر کے سوا ہر دوسرے منظر کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ جس کے ہاتھ اٹھے تو خدا کے لیے اٹھے۔ جس کے قدم متحرک ہوئے تو خدا کے لیے متحرک ہوئے۔ جس کی زبان گویا ہوئی تو لوگوں کو اس سے خدائی محبت اور انسانی خیر خواہی کی باتیں سننے کو ملیں۔

حدیث میں ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو سلوک اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ یہ اصول مومن عورت کے لیے بھی ہے اور مومن مرد کے لیے بھی۔ یہ نہایت سادہ کسوٹی ہے جس سے کوئی عورت یا مرد ہر لمحہ جان سکتا ہے کہ اس کو دوسروں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ بدگوئی اسے پسند نہیں، اس لیے وہ دوسروں کے خلاف بھی بدگوئی نہ کرے اور ہمیشہ میٹھے کلام سے دوسروں کا استقبال کرے۔ اسی طرح ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے تو اس کو پسند آئے گا، اب اس کو چاہیے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی برتے، کسی کے ساتھ بھی بدخواہی کا معاملہ نہ کرے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کوئی اس کو نفع پہنچائے تو اس کو خوشی ہوتی ہے۔ اب ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے، وہ اپنی ذات سے کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ بنے تو ایسی روش اس کو ناپسند ہوتی ہے، اب اس کو سخت احتیاط کرنا چاہیے کہ اس کی کوئی روش کسی کی راہ روکنے کے ہم معنی بن جائے۔

برے اخلاق کی جڑ عام طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں ——— حرص اور غصہ۔ حرص کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے واجبی حق سے زیادہ کا خواہش مند بن جائے۔ جب بھی کوئی مرد یا عورت اس طرح حرص کا شکار ہو جائیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے تکلیف کا سبب بن جاتے ہیں۔ غصہ یہ ہے آدمی اپنے مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ بہت برا مزاج ہے۔ اس کی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے، اور وہ خدا کی رحمت سے محرومی ہے۔

روزمرہ کی زندگی

عورت کی زندگی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کیسی ہونی چاہیے۔ اس کا نقشہ شریعت میں مکمل طور پر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا کام صبح کو سویرے اٹھنا ہے۔ جو خواتین صبح کو سویرے نہیں اٹھتیں وہ ہر دن کم از کم اپنا بہترین دو گھنٹہ ضائع کرتی ہیں۔ یہ ضائع شدہ وقت ایک دن میں صرف دو گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی طرح ۱۰ سال ہوتا رہے تو ضائع شدہ گھنٹوں کی مقدار سات ہزار گھنٹوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ یہ خاندان کے صرف ایک ممبر کے ضائع شدہ گھنٹے ہیں۔ اسی طرح تمام افرادِ خاندان کے ضائع شدہ گھنٹوں کا شمار کیا جائے تو وہ کتنا زیادہ ہو جائے گا۔

گھر کی خاتون جب سویرے اٹھیں تو دوسرے لوگ بھی سویرے اٹھیں گے۔ پھر سب لوگ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کریں گے۔ اس طرح سویرے اٹھنا ایک طرف جسم کو اور دوسری طرف روح کو پاک کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسی طرح صبح کو سویرے اٹھنے کے نتیجہ میں دن بھر کے سارے پروگرام اپنے وقت پر انجام پائیں گے، کیوں کہ جب آغاز درست ہو تو انجام بھی یقیناً درست رہتا ہے۔

صبح کو سویرے اٹھنے کی صورت میں دن بھر کے تمام پروگرام ٹھیک وقت پر انجام پائیں گے۔ بچے تیار ہو کر وقت پر اسکول پہنچیں گے۔ مرد تیار ہو کر وقت پر اپنے معاشی کام میں لگ جائے گا۔ صبح سویرے گھر کی صفائی ہو جائے گی۔ باورچی خانہ سے لے کر مارکٹ تک ہر چیز کا نظام ٹھیک طور پر انجام پائے گا۔ گھر کے پورے ماحول میں چستی، باقاعدگی اور ذمہ داری کی فضا دکھائی دے گی۔ پانچ وقت کی نماز جو ہر مومن اور مومنہ پر فرض ہے، وہ صحیح وقت پر انجام دی جاتی رہے گی۔

مزید آپ کو جاننا چاہیے کہ گھر کا انتظام اور نماز، یہ دونوں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اقم الصلاۃ لذکری (طٰہٰ ۱۴) یعنی میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پانچ وقت کی نماز دراصل ہر وقت کی نماز کی یاد دہانی ہے۔ یہ ہر وقت کی نماز کیا ہے۔ وہ ذکر ہے، یعنی اللہ کی یاد۔ آپ کو یہ کرنا ہے کہ دن بھر کی تمام سرگرمیوں میں اللہ کو یاد کرتے رہیں۔

صبح کو آپ سو کر اٹھیں تو اس احساس کے ساتھ اٹھیں کہ نیند کیسی عجیب نعمت ہے۔ اس نے کل دن بھر کی میری تھکن دور کر دی۔ اس نے نیا دن شروع کرنے کے لیے مجھے دوبارہ تازہ دم کر دیا۔ یہ احساس آپ کی زبان سے شکر کے کلمات کی صورت میں نکل پڑے۔

اسی طرح دن بھر آپ جو کام کریں وہ سب آپ کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے۔ مثلاً آپ اپنے بچہ کو اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی ہیں، اس وقت بچے کو دیکھ کر اگر آپ یہ کہہ اٹھیں کہ ایک انسانی بچہ کیسا عجیب معجزہ ہے، کیسا عجیب رحمت اور عظمت والا ہے وہ خدا جس نے انسانی بچّہ جیسی عجیب چیز کی تخلیق کی۔ آپ کا بچہ اگر آپ کے اندر اس قسم کے تصورات جگانے کا ذریعہ بن جائے تو یہ سونے اور چاندی کے تمام ڈھیر سے زیادہ قیمتی ہے۔

آپ باورچی خانہ میں روٹی اور سالن پکا رہی ہیں۔ آپ کو یاد آیا کہ یہ گیہوں، یہ چاول، یہ سبزی قدرت کے کیسے عجیب نمونے ہیں۔ خدا نے کروروں سال کے عمل کے دوران زمین کی اوپری تہہ کو زرخیز بنایا۔ اس نے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹموں کو ملا کر حیرت انگیز طور پر پانی جیسی نعمت پیدا کی۔ اس طرح کے بے شمار اسباب کو وجود دینے کے بعد یہ ممکن ہوا کہ زمین میں کسی چیز کا بیج ڈالا جائے اور وہ پودے اور درخت کی صورت اختیار کر کے انسان کے لیے غذا کی فراہمی کا ذریعہ بن جائے۔ جب آپ اس طرح سوچیں گی تو آپ کا باورچی خانہ اور پورا گھر آپ کے لیے عبادت خانہ بن جائے گا۔ آپ کی نماز صرف پانچ وقت کی نماز نہیں ہوگی بلکہ وہ ذکر کی صورت میں سارے دن اور ساری رات جاری رہے گی۔

اس طرح دن گزارتے ہوئے ظہر کا وقت آتا ہے اور گھر کے تمام افراد نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ عصر، مغرب اور عشار کی نمازیں اپنے اپنے وقت پر پڑھتی ہیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ اس نے کائناتی انتظام کے تحت آپ کے لیے پانی اور کھانے کا انتظام کیا۔

عشار کی نماز اور گھر کے ضروری کاموں کی تکمیل کے بعد وہ وقت آجاتا ہے جب کہ آپ سو جائیں۔ اب آپ معوذتین (قرآن کی آخری دو سورتیں) پڑھ کر اپنے بستر پر سو جائیے۔ جب آپ نے سارا دن پاک خیالات میں گزارا ہے تو اب آپ کو نہایت سکون کی نیند آئے گی۔ رات گزار کر صبح کو اٹھنا آپ کے لیے ایسا بن جائے گا جیسے دوبارہ نئی اور تروتازہ زندگی حاصل کر لینا۔

حسن معاشرت

قرآن کی سورہ نمبر۴۹ میں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایک جامع ہدایت دی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کراؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسروں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے (الحجرات ۱۰-۱۲)

ان قرآنی آیتوں کا خطاب مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں سے ہے۔ دونوں ہی کی فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ان آیتوں میں بتایا گیا ہے۔

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں کس طرح رہیں، اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ اس طرح رہیں جس طرح بھائی اور بہن آپس میں رہتے ہیں۔ بھائی اور بہن خونی رشتہ کی بنا پر باہم محبت کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح دینی بھائیوں اور دینی بہنوں کو بھی محبت اور خیر خواہی کے ساتھ باہم مل کر رہنا چاہیے۔

کوئی عورت یا مرد دوسرے کا مذاق کیوں اڑاتا ہے، اس لیے کہ وہ دوسرے کی بڑائی کو ماننا نہیں چاہتا۔ ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر بڑا بننے کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عورت یا مرد کو جب کسی دوسرے کی کوئی نازک بات مل جائے تو وہ اس کو خوب نمایاں کرتا ہے تاکہ اس طرح دوسرے کو چھوٹا ثابت کرے اور اپنی بڑائی کی تسکین حاصل کر سکے۔

ایسے عورت اور مرد دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ دوسروں پر عیب لگاتے ہیں، وہ

دوسروں کو برے نام سے یاد کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے اس جذبہ کی تسکین حاصل کریں کہ وہ دوسروں سے بڑے ہیں۔

مگر اچھا اور برا، یا بڑا اور چھوٹا ہونے کا معیار وہ نہیں ہے جو کوئی عورت یا مرد بطور خود مقرر کرلے۔ اچھا دراصل وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا ہو، اور برا وہ ہے جو خدا کی نظر میں برا ٹھہرے۔

اگر کسی عورت یا کسی مرد کے اندر فی الواقع اس کا احساس پیدا ہوجائے تو اس کے بعد اس سے بڑائی کا جذبہ چھن جائے گا۔ دوسروں کا مذاق اڑانا، دوسروں کو طعنہ دینا، دوسروں پر عیب لگانا، دوسروں کو برے لقب سے یاد کرنا، اس قسم کی تمام چیزیں ان کو بے معنی معلوم ہونے لگیں گی۔ کیوں کہ وہ جانیں گے کہ لوگوں کے درجہ اور مرتبہ کا اصل فیصلہ خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کسی کو حقیر سمجھوں اور آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ باعزت قرار پائے تو میرا اس کو حقیر سمجھنا کس قدر بے معنی ہوگا۔

ایک عورت یا مرد کو کسی کے خلاف بدگمانی ہوجائے تو اس کی ہر بات اس کو غلط معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بارہ میں اس کا ذہن منفی رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اس کی خوبیوں سے زیادہ اس کے نقائص تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کی برائیوں کو بیان کرکے اسے بے عزت کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے، یہ طریقہ انتہائی حد تک ایمان اور تقویٰ کے خلاف ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر معاشرتی خرابیوں کی جڑ بدگمانی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک اس معاملہ میں چوکنا رہے، وہ کسی بھی حال میں بدگمانی کو اپنے ذہن میں داخل نہ ہونے دے۔

آپ کو کسی کے بارہ میں الٹی خبر ملے تو اس کی تحقیق کیجیے۔ آپ کو کسی سے بدگمانی ہوجائے تو اس سے مل کر اس کے بارہ میں اس سے گفتگو کیجیے۔ یہ سخت غیر اسلامی اور غیر اخلاقی بات ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہا جائے جب کہ وہ اپنی صفائی دینے کے لیے وہاں موجود نہ ہو۔ وقتی طور پر کبھی کسی عورت یا مرد سے اس قسم کی ایک غلطی ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں تو وہ اپنی غلطی پر ڈھیٹ نہ ہوں گے۔ ان کا خوفِ خدا ان کو فوراً اپنی غلطی پر متنبہ کردے گا۔ پھر وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ دیں گے اور اللہ سے معافی کے طالب بن جائیں گے۔

مومن کا گھر

قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں ازواج مطہرات (پیغمبرؐ کی بیویوں) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ : اور تم لوگ اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور سابقہ جاہلیت کا سا انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کردے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کو یاد رکھو۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے (الاحزاب ۳۳-۳۴)

ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ازواج رسولؐ کو اپنے گھروں میں کس طرح رہنا چاہیے۔ انھیں جاہلی نمائش کا طریقہ چھوڑ کر متانت کے ساتھ گھر میں قیام کرنا چاہیے۔ ان کے گھر کو ذکر و نماز اور زکوٰۃ و صدقات کی ادائگی کا مرکز ہونا چاہیے۔ معاملات زندگی میں ان کی روش خدا و رسول کی اطاعت پر مبنی ہونا چاہیے۔ ان کے گھر میں قرآن کی تعلیمات کا چرچا ہونا چاہیے۔ ان کے گھر میں حکمت اور معرفت کی باتوں کا ماحول دکھائی دینا چاہیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جس طرح تمام مسلمانوں کی زندگی کے لیے نمونہ تھی، اسی طرح آپ کا گھر بھی تمام گھروں کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیامت تک تمام مسلم مردوں اور تمام مسلم عورتوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھروں کو اسی خاص نمونہ پر ڈھالیں جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں قائم فرمایا ہے۔

۱۔ مسلم خواتین کو اپنے گھروں کو اپنے عمل کا مرکز بنانا چاہیے۔ گھر گویا سماجی زندگی کی ابتدائی اکائی ہے، اور عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اس اکائی کو درست کرے۔ کیوں کہ مختلف اکائیوں کا درست ہونا آخر کار پورے سماج کا درست ہونا ہے۔

۲۔ مسلم خاتون کے گھر کے ماحول کو سادہ اور بے تکلف ہونا چاہیے نہ کہ زرق برق اور چمک دمک والا۔ زرق برق گھر میں مادی فضا ہوتی ہے اور سادہ گھر میں روحانی فضا۔ زرق برق گھر دنیا کی یاد دلاتا ہے اور سادہ گھر آخرت کی یاد دلاتا ہے۔ زرق برق گھر میں مادی ذہن پرورش پاتا ہے اور سادہ گھر میں دعوتی اور مقصدی ذہن۔ زرق برق گھر میں ادنیٰ شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے اور سادہ گھر میں اعلیٰ

شخصیت پروان چڑھتی ہے۔

۳۔ مومن خاتون کا گھر عبادت کا گھر ہوتا ہے ——— پانچ وقت کی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی ادائگی، اللہ اور رسولؐ کا چرچا، فضول چیزوں میں مشغولیت کے بجائے دین میں مشغولیت، یہ وہ چیزیں ہیں جو مومنہ و مسلمہ کے گھر میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

۴۔ اہل اسلام کے گھر میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا چرچا ہوتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم کیا ہے، اور رسول خدا کی سنت کیا ہے۔ صحابہ کی زندگی میں کیا نمونہ ملتا ہے۔ اس طرح خدائی احکام اور رسولؐ اور اصحاب رسول کے نمونہ سے ہدایت لیتے ہوئے گھر کو ایمان و اسلام کا گھر بنا دیا جاتا ہے۔

۵۔ مومن کا گھر پاکیزگی کا گھر ہوتا ہے۔ جس طرح غسل خانہ میں آدمی نہاتا ہے اور اس سے اس کا مادی جسم پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مومن کا گھر روح کی پاکیزگی کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں شرافت، انسانیت، سنجیدگی، اصول پسندی اور اعتراف حق کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے۔ جو لوگ اس ماحول میں رہتے ہیں، ان کی شخصیت مسلسل نکھرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکلتے ہیں تو وہ ایک ربانی انسان بن چکے ہوتے ہیں۔

لوگ اپنے گھر کو اس لحاظ سے بناتے ہیں کہ دیکھنے والے لوگ اس کو اچھا سمجھیں۔ مومن عورت اور مومن مرد کو اپنا گھر اس لحاظ سے بناتا ہے کہ وہ اللہ کی پسند کے مطابق ہو اور اللہ کے فرشتے وہاں آکر اس کو برکت دیں اور اس کو دنیا و آخرت کی سعادت سے بھر دیں۔

یہاں ازواج رسولؐ کو خطاب کرتے ہوئے مسلم عورتوں کو یہ عام ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں کس طرح رہیں۔ اور اپنے گھروں کو کس نمونہ پر ڈھالیں۔ مسلم خاتون کو عام حالات میں اپنے گھر کے دائرہ میں رہنا چاہیے۔ دنیا دار عورتوں کی طرح زیب و زینت کی نمائش کا طریقہ انھیں اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی توجہ کا مرکز یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی عبادت گزار بن جائیں۔ وہ اپنے اثاثہ کو اللہ کے لیے خرچ کریں۔ زندگی کے معاملات میں اللہ اور رسولؐ کا جو حکم ملے اس کو فوراً اختیار کر لیں۔ وہ اللہ اور رسولؐ کی باتوں کو سننے اور سمجھنے میں اپنا وقت گزاریں۔ یہ طرز زندگی وہ ہے جو بندوں کو پاکباز بناتا ہے، اور پاک باز بندے ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

تربیت اولاد

الترمذی نے اپنی سنن میں اور البیہقی نے شعب الایمان میں ایوب بن موسیٰ کی ایک روایت نقل کی ہے جس کو انھوں نے اپنے والد سے سنا اور والد نے اپنے دادا سے سنا۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کی طرف سے اپنے بیٹے کے لیے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں کہ وہ اس کو اچھے آداب سکھائے (ما نَحَلَ والدٌ ولدَہ مِن نُحلٍ افضلَ مِن ادبٍ حسنٍ (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۳۸۹)

اس حدیث میں بظاہر صرف والد کا ذکر ہے مگر تبعاً اس سے مراد والد اور والدہ دونوں ہیں۔ نیز ادب کا لفظ یہاں تعلیم و تربیت کے تمام پہلوؤں کے لیے جامع ہے، خواہ وہ مذہبی نوعیت کی چیزیں ہوں یا دنیاوی نوعیت کی چیزیں۔

عورت اور مرد کو فطری طور پر اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا کہ اس محبت کا بہتر بن استعمال کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔ وہ استعمال یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آداب زندگی سکھائیں۔ وہ اپنے بچوں کو بہتر انسان بنا کر دنیا کے کارزار میں داخل کریں۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی محبت کا استعمال زیادہ تر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ جو چاہے وہ اس کے لیے حاضر کر دیا جائے، یہی بچہ کے لیے محبت کا سب سے زیادہ بڑا استعمال ہے، مگر یہ بچوں کے حق میں خیر خواہی نہیں۔

چھوٹا بچہ اپنی خواہشوں کے سوا کچھ اور نہیں جانتا۔ اس کی سوچ بس یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں جو خواہش آئے وہ فوراً پوری ہو جائے۔ مگر یہ طفلانہ سوچ ہے۔ کیونکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچہ ایک دن بڑا ہوگا۔ وہ بڑا ہو کر دنیا کے میدان میں داخل ہوگا۔ زندگی کے اس اگلے مرحلہ میں کامیاب ہونے کے لیے بچہ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ آداب حیات سے مسلح ہو کر وہاں پہنچا ہو۔

بچہ جب بالکل چھوٹا ہو اسی وقت سے اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے تاکہ یہ چیزیں عادت بن کر اس کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ زندگی کے ان آداب کے تین خاص پہلو ہیں ——— دین، اخلاق، ڈسپلن۔

دین کے اعتبار سے، بچہ کی تربیت کا آغاز پیدائش کے فوراً بعد ہو جاتا ہے جب کہ اس کے کان میں اذان کی آواز داخل کی جاتی ہے۔ یہ علامتی انداز میں اس بات کا اظہار ہے کہ بچہ کو دین دار بنانے کا عمل آغاز عمر ہی سے شروع کر دینا ہے۔ یہ کام ماں اور باپ دونوں کو کرنا ہے۔

والدین کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بچہ کے اندر توحید اور اسلامی عقائد خوب پختہ ہو جائیں۔ ذکر اور عبادت اس کی زندگی کے لازمی اجزا بن کر اس کی شخصیت میں شامل ہو جائیں۔ وہ نماز، روزہ کا پابند ہو۔ صدقہ اور خیرات کا شوق اس کے اندر پیدا ہو جائے۔ قرآن اور حدیث سے اس کو اس قدر شغف ہو جائے کہ وہ روزانہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ مطالعہ کرنے لگے۔ اس کو دیکھ کر ہر آدمی یہ کہہ دے کہ یہ بچہ ایک دین دار بچہ ہے۔

اخلاق کی تربیت کی صورت یہ ہے کہ ہر موقع پر بچہ کو سکھایا جائے۔ اگر وہ غلطی کرے تو اس کو ٹوکا جائے۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت ہو تو اس کی تنبیہ کی جائے۔ بھائی بہنوں میں لڑائی ہو تو فوراً سمجھایا جائے۔ اگر کبھی بچہ جھوٹ بولے یا کسی کو گالی دے۔ یا کسی کی چیز چرا لے تو نہایت سختی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا جائے۔ اور یہ سب بالکل بچپن سے کیا جائے تاکہ بچہ کی زندگی میں یہ چیزیں مستقل کردار کے طور پر شامل ہو جائیں۔

یہی طریقہ ڈسپلن کے بارہ میں اختیار کرنا ہے۔ بچہ کو اوقات کی پابندی سکھائی جائے۔ چیزوں کو صحیح جگہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھانا پینا باقاعدہ وقت کے ساتھ ہو۔ اگر وہ کوئی کاغذ یا تھیلی سڑک پر پھینک دے تو فوراً اسی سے اس کو اٹھوایا جائے۔ شور کرنے سے روکا جائے۔ ہر ایسی چیز سے بچنے کی تلقین کی جائے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو۔

بچہ کی حقیقی تربیت کے لیے خود ماں باپ کو اپنا طرز زندگی اس کے مطابق بنانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے بچہ سے کہیں کہ جھوٹ نہ بولو، اسی کے ساتھ آپ یہ کریں کہ جب کوئی شخص دروازہ پر دستک دے تو کہلوا دیں کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں تو ایسی حالت میں بچہ کو جھوٹ سے روکنا بے معنی ہوگا۔ اگر آپ سگرٹ پیتے ہوں تو بچہ کے سامنے اسموکنگ کے خلاف تقریر کرنا بے معنی ہے۔ اگر آپ وعدہ پورا نہ کرتے ہوں اور بچہ سے کہیں کہ بیٹے، ہمیشہ وعدہ پورا کرو، تو بچہ کبھی ایسی نصیحت کو نہیں پکڑے گا۔

بچہ اپنے والدین کو ماڈل کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اسی طرح بڑا بچہ چھوٹے بچوں کے لیے ماڈل ہوتا ہے۔ اگر والدین اور بڑا بچہ ٹھیک ہو تو بقیہ بچے اپنے آپ سدھرتے چلے جائیں گے۔

صلح بہتر ہے

عورت اور مرد کے درمیان مختلف قسم کے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جھگڑا ختم ہونے والا ہی نہیں۔ اس طرح کے معاملات میں دونوں کیا کریں، اس کے بارہ میں قرآن میں مختلف قسم کی ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک جگہ نہایت اصولی رہنمائی دی گئی ہے جو اس قسم کے ہر معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے۔ وہ ہدایت یہ ہے:

وإن امرأة خافت من بعلها نشوزاً او اعراضاً فلا جناح عليهما ان يصلحا بينهما صلحاً والصلح خير واُحضرت الانفس الشح وإن تحسنوا وتتقوا فان الله كان بما تعملون خبيرا۔ (النساء ۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں، اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے۔

گھریلو زندگی میں یا رشتہ داروں کے درمیان ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی یہ نزاع صرف جذباتی نوعیت کی ہوتی ہے اور کبھی کسی واقعی معاملہ کے بارہ میں ہوتی ہے۔ کبھی عورت سمجھتی ہے کہ مرد کی زیادتی ہے، اور کبھی مرد کا خیال ہوتا ہے کہ زیادتی کرنے والی عورت ہے۔

ایسے مواقع پر ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک، قرآن کے الفاظ میں، شح (حرص) کا طریقہ ہے، اور دوسرا صلح کا طریقہ۔ دونوں طریقوں کی نفسیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ ایک طریقہ کا رخ صرف اپنی طرف ہوتا ہے اور دوسرے طریقہ کا رخ دونوں کی طرف۔

جس عورت یا مرد کے اوپر حرص کی سوچ غالب ہو وہ معاملہ کو صرف اپنی نسبت سے دیکھے گا۔ اپنے جذبات کی رعایت، اپنے مفاد کا تحفظ، اپنے وقار کی بحالی، اپنی ضد کو پورا کرنے پر اصرار، بس انھیں دائروں میں اس کا ذہن چلے گا۔ ایسے لوگ اپنے کو جانیں گے مگر وہ دوسرے کے نقطۂ نظر سے بے خبر رہیں گے۔ اس قسم کا مزاج ہمیشہ صرف جھگڑے کو بڑھاتا ہے، وہ کبھی جھگڑے کو ختم کرنے والا ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ صلح کا طریقہ ہے۔ یعنی دونوں فریقوں کی رعایت کرتے ہوئے تصفیہ کی کوشش کرنا۔ یا کچھ لے کر اور کچھ دے کر معاملہ کو ختم کرنا۔ اس طریقہ میں سنجیدگی ہے۔ اس میں انصاف ہے۔ پہلا طریقہ اگر خود پسندی کا طریقہ ہے تو یہ دوسرا طریقہ انسانیت دوستی کا طریقہ۔

اس دنیا میں صلح کا طریقہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ نزاعات کا خاتمہ اگر ممکن ہوتا ہے تو اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جہاں تک حرص کے طریقہ کا معاملہ ہے، وہ صرف نزاع کو بڑھانے میں مددگار ہے۔ یہ طریقہ نزاع کو بڑھا کر اس کو ایسا فساد بنا دیتا ہے جہاں حریص اپنے ملتے ہوئے فائدے سے بھی محروم ہو کر رہ جائے۔

حرص اور صلح کے طریقوں کا تعلق صرف بیوی اور شوہر کے مخصوص معاملات سے نہیں ہے، اس کا تعلق تمام نزاعات سے ہے، خواہ وہ گھر کے محدود ماحول میں پیدا ہوں یا باہر کے وسیع تر ماحول میں۔ اور ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی معاملہ کبھی حرص کے اصول پر حل کر نہیں ہوتا۔ یہاں جب بھی کوئی معاملہ حل ہوتا ہے تو وہ صلح کے اصول کو اختیار کر کے ہی حل ہوتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب آپ یک طرفہ طور پر صرف اپنی خواہشات کو جانیں اور صرف اپنے حق پر اصرار کریں تو یہی مزاج فریق ثانی کے اندر بھی پیدا ہوگا۔ ایک ضد کے بعد جوابی ضد پیدا ہو کر معاملہ کو مزید پیچیدہ بنا دے گی، لیکن اگر آپ دوطرفہ انداز میں سوچیں۔ آپ دوسرے سے کہیں کہ میں صلح اور امن چاہتا ہوں۔ آؤ ہم دونوں ضد کو چھوڑ دیں اور مفاہمت کے اصول پر چلتے ہوئے اِدھر یا اُدھر معاملہ کو ختم کر دیں۔ جب آپ اس قسم کا مصالحانہ رویہ ظاہر کریں گے تو فریق ثانی کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ وہ بھی اپنی ضد کو چھوڑ دے گا اور رقم سے کم پر راضی ہوتے ہوئے آپ سے صلح کر لے گا، جب کہ اس سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

خواہ گھر کا معاملہ ہو یا وسیع تر دائرہ میں سماج کا معاملہ، جب بھی کچھ مرد اور کچھ عورتیں مل جل کر رہیں تو لازماً ان میں نزاع کی صورتیں پیدا ہوں گی۔ ایسے مواقع پر آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق، احسان اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہوئے اسے جلد از جلد ختم کر دیں۔

حرص انسانی روح کو گندہ کرتی ہے، اور صلح کا طریقہ انسان کو غیر حقیقی جھگڑوں سے اوپر اٹھا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ افکار میں جی سکے۔ حرص دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی ہے، اس کے برعکس صلح دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی۔

انتظار کیجئے

قرآن کی سورہ نمبر ۶۵ میں طلاق اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا ذکر ہے۔ اس ذیل میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ باہمی معاملات کو ہمدردی اور فراخ دلی کے ساتھ طے کرو۔ جب دو آدمیوں میں تفریق ہوتی ہے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ چیز اپنے لیے سمیٹے۔ کیوں کہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جو میرے پاس ہے وہی میرا ہے، اور جو دوسرے کے پاس چلا گیا وہ میرا نہیں رہا۔ اس لیے اپنے فائدہ کو محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے کے ساتھ وہ تنگ نظری کا معاملہ کرنے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں دونوں فریقوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وأتمروا بینکم بمعروف (اور تم آپس میں ایک دوسرے کو نیکی سکھاؤ) اس روش میں بظاہر اپنے لیے گھاٹے کی صورت دکھائی دے رہی تھی، چنانچہ فرمایا کہ حوصلہ سے کام لو، اللہ تمہارے لیے مشکل کے بعد آسانی پیدا فرمائے گا (سیجعل اللہ بعد عسرٍ یسراً) الطلاق ۷

اس ہدایت کا تعلق صرف طلاق کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام نزاعی معاملات سے ہے۔ جب بھی کسی مرد اور کسی عورت کے درمیان لین دین پر جھگڑا پیدا ہو تو ہر ایسے معاملہ میں لینے کے ساتھ دینے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اس روش کے نتیجہ میں اگر کچھ نقصان دکھائی دے تو اس کو وقتی سمجھ کر اس پر راضی ہوجانا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ مستقبل میں اضافہ کے ساتھ اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انتظار بھی ایک مستقل پالیسی ہے۔ دنیا کا نظام جس قانون الٰہی کی بنیاد پر چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں لازماً ہر شام کے بعد نئی صبح نمودار ہو۔ لوگ شر پھیلائیں تب بھی اس میں سے خیر برآمد ہو۔ کسی کو نقصان کا تجربہ ہو تب بھی زمانہ کی گردش دوبارہ اس کے لیے نفع کی صورتیں پیدا کر دے۔

اس دنیا میں انتظار سادہ طور پر محض انتظار نہیں ہے، وہ شام کے بعد صبح کے انتظار کے ہم معنی ہے۔ وہ خدائی نظام سے اس چیز کو پانے کی امید کرنا ہے جس کو آدمی اپنی طاقت سے حاصل

نہیں کرسکا تھا۔ انتظار بے عملی نہیں، انتظار خود ایک عمل ہے۔ اگرچہ یہ ذہنی عمل زیادہ تر سوچ کی سطح پر انجام پاتا ہے۔

صبح کو کوئی کھینچ کر نہیں لاتا۔ وہ کسی کو صرف انتظار کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ کھیت اور باغ کی فصل جو ایک کسان کو ملتی ہے وہ بھی انتظار کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ کسان صرف یہ کرتا ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد ہزاروں ہزار ضروری عمل ہیں جن کو فطرت بطور خود انجام دیتی ہے۔ کسان گویا زرخیز زمین میں بیج ڈال کر انتظار کرتا ہے کہ کب وہ وقت آئے جب زمین و آسمان کا نظام اپنے عمل کو مکمل کرے اور قیمتی فصل اگا کر اس کے دامن میں ڈال دے۔

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ قرآن کا یہ ارشاد کہ اللہ مشکل کے بعد آسانی پیدا فرمائے گا۔ ایک عام قانون فطرت کا اعلان ہے، ایک ایسا قانون فطرت جو ہمیشہ اپنا کام کرتا ہے، جس میں کبھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

فطرت کے اس نظام پر آدمی کو اگر یقین ہو تو اس کے اندر جھنجلاہٹ اور مایوسی کا مکمل خاتمہ ہو جائے، وہ سراپا امید اور یقین میں جینے لگے۔

اگر آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے تو آپ کو کسی کی ضد کے مقابلہ میں اپنا فائدہ چھوڑنا گھاٹے کا سودا معلوم نہیں ہوگا، کیوں کہ آپ جانیں گے کہ اس کی حسن تلافی عنقریب خدا کی طرف سے کی جانے والی ہے۔

وقار کی قربانی آپ کو قربانی معلوم نہیں ہوگی، کیوں کہ آپ کو یقین ہوگا کہ بہت جلد اس کا معاوضہ اضافہ کے ساتھ ملنے والا ہے۔ کسی کی اشتعال انگیزی پر صبر کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں رہے گا۔ کیوں کہ آپ کو دکھائی دے گا کہ اس صبر کے پیچھے خدا کی عظیم نصرت میری طرف چلی آرہی ہے۔

انتظار بے عملی نہیں، انتظار خدا کی اس دنیا میں ایک مثبت پالیسی ہے۔ انتظار ہمت ہارنا نہیں ہے، انتظار اس بلند ہمتی کا ثبوت دینا ہے کہ آپ وقتی ہیجان سے اوپر اٹھ گئے ہیں اور مستقبل بینی کی بصیرت کے حامل ہیں۔ انتظار فریق ثانی کے مقابلہ میں ہتھیار نہیں ہے۔ انتظار یہ ہے کہ فریق ثانی سے مقابلہ کے لیے آپ نے اپنی ذات کو ہٹا دیا اور خداوند عالم کو اپنی جگہ کے اوپر کھڑا کر دیا۔

پیغمبرانہ نصیحت

صحیح مسلم (باب الوصیۃ بالنساء) میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مومن کسی مومنہ سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی خصلت اس کو ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی (لا یفرک مؤمن مؤمنۃ إن کرہ منھا خُلُقاً رضی منھا آخر) صحیح مسلم بشرح النووی ۱۰/۵۸

یہ حدیث بظاہر عورت کے بارہ میں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ خود مرد کے بارہ میں بھی ہے۔ یہ ایک فطری اصول ہے جس کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ مرد کو بھی عورت کے ساتھ اسی اصول کے مطابق معاملہ کرنا ہے اور عورت کو بھی مرد کے معاملہ میں اسی اصول کو اختیار کرنا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے کہ کسی بھی مرد یا عورت کو ہر صفت نہیں دی جاتی۔ اس دنیا میں نہ کوئی ہر اعتبار سے بے صلاحیت پیدا ہوتا اور نہ کوئی ہر اعتبار سے کامل۔ کسی کے اندر اگر ایک خصوصیت پائی جارہی ہے تو اس کے اندر دوسری صفت مفقود ہوگی۔ ایسی حالت میں کوئی اگر ایسی چیز چاہے جو فطرت کے نظام میں موجود نہیں ہے تو اس کا ایسا چاہنا بے معنی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک ایسی چیز کا طالب ہے جو یہاں قابل حصول ہی نہیں۔

ایک شخص کو اگر ایسی بیوی ملے جس میں ظاہری کشش کم ہو تو اس کو ایسی خاتون سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یقینی ہے کہ اس کے اندر عملی خصوصیات بہت زیادہ ہوں گی۔ کوئی خاتون اگر جلد غصہ میں آجاتی ہوں تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جس کے اندر غصہ زیادہ ہوتا ہے اس کے اندر اصول پسندی، اخلاص اور دیانت داری کی صلاحیت بڑی مقدار میں موجود ہوتی ہے۔

اگر آدمی بیزار ہونے کے بجائے قدر دانی کی نگاہ سے دیکھے تو وہ پائے گا کہ اس کی رفیقۂ حیات میں کچھ ایسی خصوصیات موجود ہیں جو غیر موجود خصوصیت کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ اپنی بیوی میں سطحی صفت دیکھنا چاہتا تھا، جب کہ قدرت نے اس کے اندر گہری صفت پیدا کر رکھی تھی۔ وہ اس کے اندر تفریحی پہلو کی تلاش کر رہا تھا، جب کہ اللہ تعالے نے اس کے ایسے پہلو رکھ دیے تھے جو

زندگی کو بنانے اور گھر کو آباد کرنے کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کو شوق تھا کہ اس کی بیوی ظاہر کے اعتبار سے پرکشش ہو، مگر خداوند عالم نے اس کے لیے ایسی بیوی مقدر کر دی جو باطن کے اعتبار سے پرکشش تھی، اور اول الذکر کے مقابلہ میں ثانی الذکر یقیناً زیادہ اہم ہے۔

یہی معاملہ دوسری صورت میں عورت کے لیے بھی ہے۔ عورت کی بھی مختلف خواہشیں ہوتی ہیں وہ چاہتی ہے کہ میرا رفیق ایسا ہو اور ویسا نہ ہو۔ مگر اس کو بھی تقدیر کے اوپر راضی ہونا ہے۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ جو شخصیت اسے ملی ہے وہ اس سے زیادہ قیمتی ہو جس کو وہ چاہتی تھی۔

مثلاً ایک عورت کی خواہش تھی کہ اس کا شوہر دولت مند ہو، مگر تقدیر نے اس کو دولت مند شوہر نہیں دیا۔ مگر اس پر غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ایک شخص کے پاس اگر زیادہ دولت نہ ہو تو کچھ اور چیزیں اس کے پاس دولت مندوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً سنجیدگی، حساسیت، تواضع، ہمدردی، جد و جہد کا جذبہ، وغیرہ۔ اور یہ دوسری چیزیں یقینی طور پر دولت سے زیادہ قیمتی ہیں۔

اسی طرح مثلاً ایک عورت کو ایسا خاوند ملا ہے جو نسب کے اعتبار سے زیادہ اونچا نہیں ہے۔ جب کہ عورت کی خواہش تھی کہ اس کو عالی نسب خاوند ملے۔ اس فرق کی بنا پر عورت اگر اپنے خاوند کو کم سمجھنے لگے تو وہ بہت بڑی نادانی کرے گی۔ کیوں کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ عالی نسب ہوتے ہیں وہ اخلاق اور انسانیت میں زیادہ اونچے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے اونچا سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا یہ احساس ان کے اندر طرح طرح کی برائیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اس فخر سے خالی ہو کہ وہ اعلیٰ حسب و نسب والا ہے، وہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند اور فرض شناس اور دوسروں کی رعایت کرنے والا ہوتا ہے۔

اس دنیا میں کوئی بھی اچھی چیز خرابیوں سے پاک نہیں، اسی طرح کوئی بھی معمولی چیز خوبیوں سے خالی نہیں۔ اس لیے عورت اور مرد کو چاہیے کہ اپنی ملی ہوئی چیز ہی میں خوبیاں تلاش کریں، نہ کہ اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کی طرف دوڑنا شروع کر دیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو کبھی مایوسی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیوں کہ ہر بظاہر مایوسی کے واقعہ میں اللہ نے امید کا ایک پہلو چھپا دیا ہے۔

جنت کا استحقاق

دنیا امتحان گاہ ہے۔ یہاں مرد بھی امتحان کی حالت میں ہے اور عورت بھی امتحان کی حالت میں۔ کسی عورت یا مرد کو جو کچھ اس دنیا میں ملتا ہے وہ سب اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ اور ہر ایک کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے ٹھیس پہنچنے کے باوجود وہ لوگوں کے درمیان محبت کے ساتھ رہ سکے۔

عورت کے امتحان کا سب سے زیادہ اہم پرچہ اس کی سسرال ہے۔ عورت جب میکے میں ہوتی ہے تو وہاں وہ خونی رشتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، ہر ایک اس کے لیے خونی رشتہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ایک کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔ اس لیے جب کوئی ناخوشگواری کی بات پیش آتی ہے تو وہ سنگین بات بننے نہیں پاتی۔

میکہ میں بھی بار بار ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ عورت کو گھر والوں سے کسی ناخوش گوار بات کا تجربہ ہو۔ شکایت اور تلخی اجتماعی زندگی کا حصہ ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آتی ہے۔ لیکن میکہ میں جب عورت کو گھر کے کسی فرد سے اس قسم کا ناموافق تجربہ ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ کیونکہ خون کا تعلق غالب آکر تلخی کے احساس کو ختم کر دیتا ہے۔

لیکن عورت کی جب شادی ہو جاتی ہے اور وہ رخصت ہو کر سسرال میں آتی ہے تو یہاں کی فضا بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں ہر رشتہ دار غیر خونی رشتہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں جب کوئی تلخی یا شکایت کی بات ہوتی ہے تو اگرچہ وہ عام فطری قانون کے تحت ہوتی ہے۔ مگر چونکہ میکہ کی طرح سسرال میں خون کا تعلق اس پر غالب آنے کے لیے موجود نہیں ہوتا، اس لیے یہاں ہر بات اس کے لیے سنگین بات بن جاتی ہے۔ جو بات میکہ میں بھول کے خانہ میں چلی جاتی تھی وہ سسرال میں یاد کے خانہ میں مسلسل زندہ رہتی ہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو عورت اپنے میکہ میں بے مسئلہ خاتون بن کر رہتی تھی، وہ سسرال میں مسائل کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی عورت کے امتحان کا پرچہ ہے۔ وہ سسرال میں بھی اسی طرح رہے جس طرح وہ میکہ میں رہتی تھی۔ جس طرح میکہ میں شکایت کے باوجود وہ افراد خاندان سے حسن تعلق باقی رکھتی تھی۔ اسی طرح

وہ سسرال میں بھی شکایت کے باوجود خاندان کے افراد سے خوش گوار تعلقات کو باقی رکھے۔ وہی عورت، آخرت کی جنت کی مستحق ہے جو اپنے حسن عمل سے اپنے شوہر کے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے۔

اس دنیا میں کوئی عورت یا مرد جب اپنے امتحان میں ناکام ہوتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قریبی ماحول کے افراد سے وہ کسی نہ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی پیچیدگی بعض اوقات اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتی ہے کہ اس سے اوپر اٹھنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ نفسیاتی پیچیدگی کے اس طوفان میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ عورت اور مرد دونوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اس نزاکت کا شعوری ادراک کرے اور اس سے غیر متاثر رہ کر اپنا مفوضہ کردار ادا کر سکے۔

ایک عورت کو ایک پورے ماحول میں رہنا پڑتا ہے جہاں اس کا سابقہ بار بار بہت سے مردوں اور عورتوں سے پیش آتا ہے۔ اس عمل کے دوران کبھی کسی کی بات پر اس کو غصہ آجاتا ہے۔ کبھی کسی کی بات اس کو اپنے حق میں توہین آمیز معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کسی کی ترقی کو دیکھ کر اس کے اندر جلن اور حسد کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ کبھی اس کو یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ فلاں کی موجودگی میں میں ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ کبھی اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فلاں مرد یا عورت خواہ مخواہ میرے راستہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ کبھی اپنے بچوں کی بے جا محبت اور حمایت اس کو طرح طرح کی نادانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یہ تمام چیزیں عورت کی دنیا اور آخرت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ عورت کو ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرنا ہے، اس کو ان تمام جذبات سے اوپر اٹھنا ہے، ورنہ عورت اپنا وہ عظیم کردار ادا کرنے میں ناکام رہے گی جس کا سنہری موقع نظام فطرت نے اس کے لیے مہیا کیا ہے۔

تاریخ میں بہت سی ایسی خواتین گزری ہیں جنھوں نے نہایت اعلیٰ کارنامے انجام دیے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ مگر یہ تمام وہی خواتین تھیں جن کے اندر بلند نظری کی صفت تھی۔ جو اپنے آپ کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

شکایت کی باتوں میں الجھنا آپ کی ترقی کے سفر کو روکتا ہے۔ اور شکایت کو نظر انداز کر کے لوگوں سے اچھا معاملہ کرنا آپ کو اعلیٰ درجات تک پہنچا دیتا ہے۔

سب سے زیادہ

صحیح بخاری میں ایک حدیث آئی ہے۔ مؤلف کتاب نے اپنے طریقہ کے مطابق اس کو کئی ابواب میں نقل کیا ہے۔ کتاب الکسوف میں جو روایت آتی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

ورأیتُ النارَ فلم أرَ منظراً کالیوم قطُّ أفظع۔ ورأیتُ اکثر اھلھا النساءَ۔ قالوا بمَ یارسول اللہ۔ قال بکفرھنَّ۔ قیل یکفرن باللہ۔ قال: یکفرن العشیر ویکفرن الاحسانَ لو احسنتَ الیٰ احداھنّ الدھر کلہ ثم رأت منک شیئاً قالت: ما رأیتُ منک خیراً قطُّ۔

(فتح الباری ۲/۶۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو جہنم دکھائی گئی تو میں نے اس سے زیادہ قبیح منظر کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیوں اے خدا کے رسولؐ۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے کفر کی وجہ سے۔ پوچھا گیا کہ کیا وہ اللہ کا کفر کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے شوہر (قریبی فرد) کا انکار کرتی ہیں۔ وہ احسان کا انکار کرتی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی سے زمانہ بھر احسان کرو، پھر وہ تم سے کچھ دیکھے تو وہ کہہ دے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی خیر نہیں دیکھا۔

عورت کی یہ کمزوری دراصل اس کی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ عورت فطری طور پر زیادہ جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ایسا ہے کہ اس کو جب کسی سے کوئی خلاف مزاج بات پہنچتی ہے تو وہ بہت جلد بے قابو ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ پچھلی تمام اچھی باتوں کو بھلا بیٹھتی ہے اور ایسے سخت کلمات بولنے لگتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کبھی خیر یا مہربانی کا معاملہ ہی نہیں کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو دو الگ الگ کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد دنیا کے کاروبار کو سنبھالنے کے لیے ہے۔ اور عورت بچوں کی پرورش اور تربیت کے لیے۔ اسی کے مطابق دونوں کی سرشت بنائی گئی ہے۔ چنانچہ مرد میں عزم کی خصوصی صلاحیت ہے۔ تاکہ وہ باہر کے طوفانی حالات کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ اور عورت کے اندر جذبہ یا عاطفہ زیادہ رکھا گیا ہے، تاکہ بچوں کو

سنبھالنے کا نازک کام اس کے لیے آسان ہو جائے۔

مرد اور عورت دونوں اس دنیا میں حالت امتحان ہیں۔ البتہ دونوں کے لیے امتحان کے پرچے کسی قدر الگ الگ ہیں۔ اس اعتبار سے مرد اور عورت دونوں میں انحراف پیدا ہوتا ہے مگر دونوں کے انحراف کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مرد کا انحراف انانیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور عورت کا انحراف، مذکورہ حدیث کے مطابق، بے اعترافی کی صورت میں، انانیت بھی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال ہے اور بے اعترافی بھی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال۔

یہ حدیث عورت کو متنبہ کر رہی ہے کہ وہ کون سا مقام ہے جہاں عورت سب سے زیادہ نازک پوزیشن میں ہے اور کس معاملہ میں اس کو سب سے زیادہ چوکنا رہنا چاہیے۔ یہ مقام وہ ہے جب کہ اس کا شوہر (یا اس کے خاندان کا کوئی قریبی فرد) کوئی ایسی چیز کرے یا کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے عورت کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ ایسے موقع پر عورت کے اندر شدید جذبات ابھر آتے ہیں، حتی کہ وہ بھول جاتی ہے کہ اس سے پہلے ہزاروں بار اسی شوہر (یا اسی فرد خاندان) سے اس کو بھلائی اور مہربانی ملی ہے۔

ایسے جذباتی موقع پر عورت جنت اور جہنم کے عین درمیان پہنچ جاتی ہے۔ اگر وہ جذبات کے وقتی جھٹکے کو برداشت کر لے اور وہ بات کہے جو انصاف کا تقاضا ہے تو اس کی یہ صابرانہ روش اس کے لیے جنت میں داخلہ کا ٹکٹ بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ جذبات اس کے اوپر غالب آجائیں، وہ احسان فراموشی کے کلمات بولنے لگے یا قطع تعلق کر بیٹھے تو ایسی روش اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرنے کا سبب بن جائے گی۔

اس دنیا میں ہر عورت اور ہر مرد امتحان کی حالت میں ہے۔ یہاں ہر ایک کو سب سے زیادہ اس بات کے لیے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے لیے امتحان کا لمحہ آئے اور وہ اس امتحانی لمحہ پر فیل ہو جائے، وہ اپنی کامیابی کا ثبوت نہ دے سکے۔

اس امتحان کا سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہے جب کہ کسی عورت یا مرد پر جذبات کا غلبہ ہو جائے اور وہ جذبات کے زیر اثر صحیح روش پر قائم رہنے میں ناکام رہے۔

غلط فہمی

صحیح مسلم کتاب الصلاۃ (باب مایقال فی الرکوع والسجود) میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ عائشہؓ نے بتایا کہ ایک رات کو میں نے رسول اللہ کو اپنے پاس نہ پایا۔ میں نے گمان کیا کہ آپ اپنی کسی اور بیوی کے پاس گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے آپ کو ڈھونڈا۔ پھر میں لوٹی تو آپ رکوع یا سجدہ میں تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ خدایا، تو پاک ہے اور تیری ہی تعریف ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، میں کس خیال میں تھی اور آپ کسی اور حال میں ہیں:

عن عائشۃ، قالت افتقدتُ النبی صلے اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃٍ فظننتُ أنہ ذھب الیٰ بعض نسائہٖ فتحسّستُ ثم رجعتُ فاذا ھو راکعٌ او ساجدٌ یقولُ سبحانک وبحمدک لا الٰہ الا انت۔ فقلت بأبی انت وأمّی، إنی لفی شأن وإنک لفی آخر (صحیح مسلم بشرح النووی ۴/۲۰۳)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ غلط فہمی کتنی خطرناک چیز ہے۔ حضرت عائشہ ہر لحاظ سے ایک افضل خاتون تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت پیغمبر اعظم کی تھی، اس کے باوجود حضرت عائشہؓ کو آپ کے بارہ میں ایک ایسی غلط فہمی ہوگئی جس کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔

حضرت عائشہؓ نے رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حجرہ میں نہیں پایا تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ آپ کسی اور بیوی کے یہاں چلے گئے ہیں، حالاں کہ آپ اس وقت مسجد میں تھے۔ چوں کہ یہ رات کا وقت تھا، حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ کی غیر موجودگی سے یہ قیاس کیا کہ آپ کو اپنی کسی زوجہ کی یاد آئی اور آپ وہاں چلے گئے۔ حالاں کہ اصل بات یہ تھی کہ آپ کو خدا کی یاد آئی تھی اور آپ خدا کے آگے رکوع وسجود کے لیے مسجد میں چلے گئے تھے۔

غلط فہمی ہمیشہ کسی ظاہری مشابہت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ بظاہر مشابہت کے باوجود، غلط فہمی کتنی زیادہ بے اصل ہو سکتی ہے۔

گھریلو زندگی میں جو بگاڑ پیدا ہوتے ہیں اور جو کبھی کبھی اتنا بڑھتے ہیں کہ پورا خاندانی نظام منتشر

ہو جاتا ہے، ان کا سبب بیشتر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ غلط فہمی پیدا ہونے کے بعد اگر سنجیدگی کے ساتھ اس کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ محض بے بنیاد تھی۔ اس طرح پہلے ہی مرحلہ میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اکثر لوگ غلط فہمی کی تحقیق نہیں کرتے۔ اس طرح ایک بے بنیاد چیز بڑھ کر بگاڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مذکورہ واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے لیے ایک چشم کشا واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مقدس خاتون جب غلط فہمی میں پڑ سکتی ہے تو عام عورت اور عام مرد کیوں غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے۔ اس لیے جب بھی کسی کے خلاف کوئی برا خیال ذہن میں آئے تو کبھی اس کو دل میں بٹھانا نہیں چاہیے۔ بلکہ اس کی تحقیق کرنا چاہیے۔ اور تحقیق کے بعد جو بات سامنے آئے اس کو فوراً مان لینا چاہیے۔ اس طرح گھر کی زندگی بگاڑ اور انتشار سے بچی رہے گی۔

غلط فہمی کا صرف یہی نقصان نہیں ہے کہ وہ گھر کے نظام کو بگاڑنے والی ہے، اسی کے ساتھ وہ ایک سخت گناہ بھی ہے۔ کسی کے بارہ میں ایسا گمان کر لینا جو فی الواقع درست نہ ہو، وہ اللہ کو بیحد ناپسند ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں عورت یا مرد کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں۔

غلط فہمی کو ماننے کا مزاج آدمی کی شخصیت کو بھی سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ جو عورت یا جو مرد اس کمزوری کا شکار ہوں کہ وہ آسانی سے کسی کے بارہ میں غلط فہمی میں پڑ جائیں اور پھر اپنے ذہن کی صفائی نہ کریں وہ دھیرے دھیرے نہایت سطحی ہو جائیں گے۔ انسانوں کے لیے ان کے دل میں خیر خواہی نہیں ہو گی۔ وہ ایک غیر حقیقی دنیا میں جینے لگیں گے۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

غلط فہمی انسانی تعلقات کے لیے قاتل ہے۔ غلط فہمی سے دشمنیاں پیدا ہوتی ہے۔ غلط فہمی دو گروہوں کو لڑا دیتی ہے۔ غلط فہمی عظیم بربادیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ تاہم اس ہولناک برائی کا علاج نہایت آسان ہے۔ اور وہ تحقیق ہے۔ جب بھی آپ کو کسی کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہو تو آپ فوراً اس کو مان نہ لیں بلکہ براہ راست ذرائع سے اس کی تحقیق کریں۔ اس کے بعد یقینی ہے کہ آپ کی غلط فہمی رفع ہو جائے گی اور آپ کی حفاظت گناہ سے بھی ہو جائے گی اور غلط اقدام سے بھی۔

غیبت نہیں

یاایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظّن ان بعض الظّن اثم ولا تجسّسوا ولا یغتب بعضکم بعضا۔ أیحبُّ احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتاً فکرھتمُوہ۔ واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ توابٌ رحیم۔

(الحجرات ۱۲)

اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

غیبت کا مطلب ہے، کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہنا۔ مذکورہ آیت میں غیبت کو مرے ہوئے انسان کا گوشت کھانے کے برابر بتایا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فعل اللہ کے نزدیک کتنا زیادہ برا اور کتنا زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

موطأ الامام مالک (کتاب الجامع) میں باب ماجاء فی الغیبۃ کے تحت ایک روایت آئی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا، یہ کہ تم کسی آدمی کا ذکر اس طرح کرو جس کو وہ ناپسند کرے اگر وہ سنے۔ اس نے دوبارہ پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، اگرچہ بری بات واقعہ کے مطابق ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہاری بات واقعہ کے خلاف ہو تو وہ بہتان ہے (ان رجلاً سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الغیبۃ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان تذکُرَ من المرء مایکرَہُ ان یسمَعَ۔ قال یارسول اللہ وإن کان حقاً۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا قلتَ باطلاً فذلک البھتان (صفحہ ۶۹۸)

موجودہ زمانہ میں خواتین میں اور گھروں میں جو برائی سب سے زیادہ عام ہے وہ یہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں چند عورتیں اکٹھا ہوں گی وہ فوراً دوسروں کی شکایت کرنا شروع کر دیں گی، اس قسم کی شکایتوں ہی کا نام غیبت ہے، کسی کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف اس کی برائی بیان کرنا، جب کہ وہ خود اس کی صفائی کرنے کے لیے موجود نہ ہو، یہی غیبت ہے اور یہ غیبت خواتین میں اتنا

زیادہ پھیلی ہوئی ہے کہ بہت ہی کم ایسی خواتین ہوں گی جو اس برائی سے بچی ہوئی ہوں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: اختلاف و تفریق باہمی کے بڑھانے میں اِن امور کو خصوصیت سے دخل ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق سے ایسا بدگمان ہوجاتا ہے کہ حسن ظن کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ مخالف کی کوئی بات ہو تو اس کا محمل اپنے خلاف نکال لیتا ہے۔ اس کی بات میں ہزارہا احتمال بھلائی کے ہوں اور صرف ایک پہلو برائی کا نکلتا ہو تو ہمیشہ اس کی طبیعت برے پہلو کی طرف چلے گی۔ اور وہ اسی برے اور رکز در پہلو کو قطعی اور یقینی قرار دے کر فریق مقابل پر تہمتیں اور الزام لگانا شروع کر دے گا۔ پھر نہ صرف یہ کہ ایک بات اتفاق سے پہنچ گئی تو بدگمانی سے اس کو غلط معنی پہنا دیے گئے۔ نہیں، وہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ دوسری طرف کے اندرونی بھید معلوم ہوں جس پر ہم خوب حاشیے چڑھائیں اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کریں۔ ان تمام خرافات سے قرآن منع کرتا ہے۔ اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو جو اختلافات بدقسمتی سے پیش آجاتے ہیں وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا ضرر بہت محدود ہو جائے۔ بلکہ چند روز میں نفسانی اختلافات کا نام و نشان باقی نہ رہے (صفحہ ۶۷۱)

سورہ احزاب کی اس آیت کا خطاب عورتوں اور مردوں دونوں سے ہے کہ وہ گمان کی بنیاد پر ہرگز کسی کے بارہ میں کوئی بری رائے قائم نہ کریں۔ کسی کے بارہ میں اچھی رائے قائم کرنے میں اگر آپ غلطی کر جائیں تو اس سے خاندان یا سماج میں کوئی برائی پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر کسی کے بارہ میں، بری رائے قائم کر لی جائے تو وہ عظیم شر کا سبب بن سکتی ہے۔

اسی طرح غیبت اور شکایت کا نقصان بہت زیادہ ہے۔ جس گھر یا جس سماج میں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنی مجلسوں میں دوسروں کی برائی بیان کرتے ہوں وہاں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوں گے۔ باہمی خیر خواہی کا ماحول وہاں باقی نہیں رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اپنی ذات کی نجات کے لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کی زبان غیبت اور شکایت اور برائی جیسے تذکروں سے پاک ہو۔ جو انسان مُردار گوشت کو اپنی غذا بنائے اس کا جسم فاسد جسم بن جائے گا۔ اسی طرح جو عورت یا مرد اپنی زبان کو بار بار غیبت سے آلودہ کریں ان کے اندر گندی شخصیت پرورش پائے گی۔ ان کا وجود انسانی خوشبو سے محروم ہو کر رہ جائے گا۔

ہاجرہؓ — ام اسماعیلؑ

زندگی کے نظام میں عورت کی حیثیت بظاہر نصف حصہ کی ہے۔ مگر عملی اعتبار سے عورت کلیدی کردار کی حامل ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہر بڑے آغاز کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے :

There is a woman at the beginning of all great things.

قدیم تاریخ میں اس کی ایک شاندار مثال وہ خاتون ہیں جن کو ہاجرہ (Hagar) کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ بیسویں صدی قبل مسیح ہے۔ ان کی غیر معمولی قربانی سے عرب کے صحرا میں ایک اعلیٰ درجہ کی نسل تیار ہوئی۔ اس نسل نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کر کے وہ جد و جہد کی جس کے نتیجہ میں تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا ہوا۔

حج کے ارکان میں سے ایک رکن وہ ہے جس کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کہا جاتا ہے۔ یہ دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان تقریباً ۳۹۵ میٹر کا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز دنیا بھر سے عمرہ کرنے والے عمرہ کرنے کے لیے مکہ پہنچتے ہیں اور وہ بھی طواف کعبہ کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ اس طرح صفا و مروہ کے درمیان سعی کا یہ سلسلہ سارے سال جاری رہتا ہے۔

یہ سعی کیا ہے جس کو تمام مسلمان، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پوری وفاداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ یہ اسی عظیم خاتون ہاجرہ کے نقش کی پیروی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ کو ان کے چھوٹے بچہ کے ساتھ مکہ کے پاس صحرا میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس صرف ایک مشک پانی تھا۔ مشک جب خالی ہو گئی تو پانی کی تلاش میں وہ اِس پہاڑی سے اُس پہاڑی تک سات بار دوڑی تھیں۔ ان کی یہ دوڑ ان کی عظیم قربانی کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قربانی اتنا زیادہ پسند آئی کہ اس کو حج کے ارکان میں شامل کر دیا گیا اور دنیا بھر کے تمام مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ وہ جب حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئیں تو اس خاتون کی تقلید میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں۔

حضرت ہاجرہ کی قربانی سے ایک تاریخ کا آغاز ہوا۔ انھوں نے تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب کی ابتدائی بنیاد رکھی۔ گویا کہ انسانی تاریخ میں ان کی حیثیت بانیِ انقلاب کی ہے۔ ان کی اسی قربانی کی بنا پر تمام انسانوں کو ان کے نقش قدم کی پیروی کا حکم دے دیا گیا۔

دور قدیم میں شرک کا رواج اتنا زیادہ بڑھا کہ وہ تہذیب انسانی میں شامل ہوگیا۔ تمام لوگوں کی سوچ مشرکانہ سوچ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کے بعد ایک ہزاروں پیغمبر آئے جنھوں نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر انسانیت کا قافلہ اپنا راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں آخری تجربہ حضرت ابراہیم کا تھا، انھوں نے قدیم عراق میں توحید کی دعوت دی۔ مگر لوگ فکری کنڈیشننگ کی وجہ سے شرک کے خلاف سوچنے کے لیے تیار نہ ہوسکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فکری مرحلہ میں باقی رہی، وہ انقلاب کے مرحلہ تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ موحدانہ انقلاب برپا کرنے کے لیے انسانوں کی ایک ٹیم مطلوب تھی، اور لوگوں کے عدم ایمان کی وجہ سے ٹیم بننے کی نوبت نہیں آئی۔

اب حضرت ابراہیم نے، وحی الٰہی کے مطابق، ایک نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ کسی غیر آباد علاقہ میں ایک نسل تیار کی جائے۔ یہ نسل مشرکانہ تہذیب سے دور خالص فطرت کے ماحول میں پرورش پائے۔ تاکہ اس کی فطرت اپنی اصل حالت میں باقی رہے۔ اور پھر اس کے اندر توحید کی دعوت دے کر اس میں سے افراد کار تیار کیے جائیں جو توحید کی بنیاد پر عالمی انقلاب برپا کریں۔

اسی خاص منصوبہ کے تحت چار ہزار سال پہلے حضرت ہاجرہ کو ان کے شیرخوار بچہ اسماعیل کے ساتھ عرب کے صحرا میں بسایا گیا۔ اسماعیل جب بڑے ہوئے تو انھوں نے ایک مناسب لڑکی تلاش کرکے اس سے نکاح کیا۔ پھر ان کی اولاد کے ذریعہ یہاں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ توالد و تناسل کی صورت میں یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اس طرح صحرا کے فطری ماحول میں جو انسانی نسل تیار ہوئی اسی کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے وقت پر ان کے درمیان محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ آپ نے ان لوگوں سے ایک طاقت ور ٹیم تیار کی جس نے جدوجہد کرکے توحید کو فکری مرحلہ سے نکال کر انقلاب کے مرحلہ تک پہنچا دیا۔

اس عظیم منصوبہ کی ابتدا ایک مومنہ کی قربانی سے ہوتی ہے۔ حضرت ہاجرہؓ نے اپنے بچہ کے ساتھ مکہ کے صحرا میں آباد ہوکر اس خدائی منصوبہ کو واقعہ بنایا۔ حضرت ہاجرہؓ کے اسی عظیم رول کی بنا پر ایسا ہے کہ حج اور عمرہ میں تمام دنیا کے مسلمان اس عظیم خاتون کے نقش قدم پر چل کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا عمل انجام دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اگر عزم کرلے تو وہ کتنا بڑا رول ادا کرسکتی ہے۔

حضرت خدیجہ رضؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجموعی طور پر گیارہ خواتین سے نکاح کیا۔ان کو امہات المومنین کہا جاتا ہے۔آپ کی پہلی اہلیہ حضرت خدیجہ بنت خویلد تھیں۔حضرت خدیجہ آپ کی پہلی بیوی بھی ہیں اور اسی کے ساتھ پہلی مسلمان بھی۔

حضرت خدیجہ ایک مالدار خاتون تھیں۔وہ مکہ میں بیوہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھیں۔اسی اثنا میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مال تجارت دے کر شام بھیجا۔یہ معاملہ قدیم رواج کے مطابق، کچھ معاوضہ کی بنیاد پر ہوا تھا۔آپ سفر سے واپس آئے تو آپ نے دوسروں سے زیادہ نفع کا حساب دیا۔حضرت خدیجہ نہایت شریف خاتون تھیں، ان کے اندر اعتراف کا غیر معمولی مادہ تھا، چنانچہ وہ دوسروں کو ایک اونٹ معاوضہ دیتی تھیں اور آپ کو انھوں نے دو اونٹ معاوضہ میں پیش کیا۔

اس تجربہ کے بعد وہ آنحضرتؐ کی طرف راغب ہوگئیں۔انھوں نے مکہ کی ایک بوڑھی خاتون کے ذریعہ آپ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔اس وقت آپ کے چچا ابوطالب آپ کے سرپرست تھے، آپ نے ان سے مشورہ کے بعد اس پیغام کو قبول کرلیا۔ابوطالب نے خاندانی افراد کی موجودگی میں آپ کا نکاح خدیجہ سے کردیا۔نکاح کے وقت خدیجہ کی عمر چالیس سال اور آپؐ کی عمر ۲۵ سال تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال ہوئی تو غار حرا میں فرشتہ جبریل آئے اور پہلی وحی آپ تک پہنچائی اور بتایا کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر فرمایا ہے۔واپس آکر آپ نے اپنے اس تجربہ کو سب سے پہلے حضرت خدیجہ سے بیان فرمایا۔حضرت خدیجہ بے حد ذہین اور نہایت نیک بخت خاتون تھیں۔ان کی سوچ میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ تھی۔انھوں نے فوراً آپ کے بیان کی تصدیق کی۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ اٹھیں۔اپنے اوپر ایک چادر ڈالی اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ورقہ نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا اور تورات اور انجیل کا مطالعہ کیا تھا۔حضرت خدیجہ نے جب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا کا قصہ بتایا تو ورقہ نے فوراً کہا: اے خدیجہ، اگر تونے سچ کہا تو یہ آنے والا وہی ناموس اکبر تھا جو اس سے پہلے موسیٰ کے پاس آیا تھا۔بیشک محمدؐ اس امت کے پیغمبر ہیں۔

خدیجہ اب تک صرف آپ کی بیوی تھیں۔ اب وہ نبوت کے کام میں آپ کی ساتھی بن گئیں۔ انھوں نے ہر طرح آپ کی مدد کی۔ اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر دی۔ آپ کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کیں۔ شعب ابی طالب میں آپ کے ساتھ تین سال گزارے جو ناقابل بیان حد تک تکلیف دہ تھے۔ مگر ان سب کے باوجود کبھی ایک بار بھی اف کا کلمہ آپ کی زبان سے نہیں نکلا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں ایک دن حضرت جبریلؑ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ خدیجہ آپ کے پاس آرہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک برتن ہے جس میں کچھ کھانا ہے۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو ان کو ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچا دیجئے اور میری طرف سے بھی۔ اور ان کو جنت میں ایک ایسے گھر کی بشارت دیجئے جو موتی کا بنا ہوا ہوگا۔ اس میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف (بشّرها ببيتٍ في الجنةِ مِن قَصَبٍ لاصَخَبَ فيه ولا نَصَبَ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۶۶/۷

اس بشارت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت مکہ میں قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کے ساتھ حضرت خدیجہ کو سخت پریشان کر رکھا تھا، آپ کے مکان کے پاس آکر شور کرتے۔ آپ کے راستہ میں کانٹا ڈالتے۔ آپ کو مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچاتے۔ اس کے نتیجہ میں حضرت خدیجہ کی پرسکون اور پرمسرت زندگی بالکل برباد ہو گئی تھی۔ رسول اللہؐ سے نکاح ان کے لیے سادہ طور پر نکاح نہیں تھا بلکہ اپنے آپ کو مصیبتوں کے طوفان میں ڈال دینے کے ہم معنی تھا۔

اس وقت آپ کو مذکورہ بشارت دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست آپ کو یہ خوش خبری دی گئی کہ دنیا میں لوگ اگر تم کو پریشان کر رہے ہیں تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخرت کی ابدی زندگی میں ہم نے تمہارے لیے ایسا پر راحت محل تیار کر رکھا ہے جو موتیوں اور جواہرات سے بنایا گیا ہوگا اور اس میں ہمیشہ کے لیے ایک ایسی پرسکون زندگی حاصل ہوگی جہاں نہ کسی کا شور داخل ہوگا اور نہ کوئی تکلیف دینے والا کبھی تم کو کوئی تکلیف پہنچا سکے گا۔

حضرت خدیجہ کو یہ انعام اس لیے دیا گیا کہ انھوں نے آنحضورؐ کے ساتھ اس طرح وفادارانہ زندگی گزاری کہ کبھی کسی چیز کے لیے شکایت نہیں کی۔ آپ نے نبوت کا اعلان کیا تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فوراً آپ کی تصدیق کی۔ آپ کے مشن میں آخر وقت تک وہ آپ کی ساتھی بنی رہیں۔

حضرت عائشہؓ

حضرت عائشہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ ہجرت سے آٹھ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ ۶۶ سال کی عمر میں ۵۸ھ میں انتقال کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آپ کی طرف سے حضرت ابوبکر کو نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اس سے پہلے مطعم بن عدی اپنے بیٹے جُبیر سے عائشہ کے نکاح کا پیغام دے چکے ہیں۔ اس کو میں نے منظور بھی کر لیا ہے۔ اور خدا کی قسم ابوبکر نے کبھی کسی وعدہ کے خلاف نہیں کیا (واللہِ ما اخلفَ ابو بکرٍ وعداً قطّ)

حضرت ابوبکر صدیق اس کے بعد مطعم کے یہاں جا کر اس سے ملے۔ اس سے پوچھا کہ عائشہ سے اپنے بیٹے کے نکاح کی بابت تمہارا کیا خیال ہے۔ مطعم نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس معاملہ میں تم کیا کہتی ہو۔ بیوی نے حضرت ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم سے رشتہ کرنے میں مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہیں میرا لڑکا صابی (بے دین) ہو جائے اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر تمہارے مذہب (اسلام) میں داخل ہو جائے۔ ابوبکر دوبارہ مطعم بن عدی سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اے مطعم، تم کیا کہتے ہو۔ مطعم نے جواب دیا کہ میری بیوی نے جو کچھ کہا وہ آپ نے سن لیا۔

اس طرح مطعم اور اس کی بیوی دونوں نے رشتہ سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے سمجھ لیا کہ وعدہ کی ذمہ داری ان کے اوپر نہیں ہے۔ اب حضرت ابوبکر نے خولہ سے کہہ دیا کہ تمہارا پیغام مجھے منظور ہے۔ اس کے بعد مقررہ وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے، وہاں عائشہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ مہر چار سو درہم مقرر ہوا۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ معاشرتی معاملات میں اگر کبھی کوئی بات ٹوٹ جائے تو اس سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد کوئی نیا خیر نکلنے والا ہو۔ چنانچہ سردار مکہ کے لڑکے سے عائشہ کا رشتہ ٹوٹا، مگر اس کے بعد انھیں پیغمبر اعظم کی بیوی بننے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت عائشہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بہت چھوٹی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ تقریباً ۵۰ سال تک زندہ رہیں۔ اس نامساوی نکاح کی مصلحت یہ تھی کہ عائشہؓ بے حد ذہین تھیں۔ ان کے اندر اخذ (grasp) کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس نکاح نے ان کی خداداد صلاحیت

کو سارے عالم کے لیے مفید بنا دیا۔

حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقریباً دس سال رہیں۔ اس مدت میں انھوں نے رات دن آپ کو دیکھا اور آپ کی تمام باتیں سنیں۔ اس طرح علم دین اور حکمت اسلام کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے دماغ میں جمع ہوگیا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد انھوں نے اس علم نبوی کو امت تک پہنچایا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک زندہ ٹیپ ریکارڈر بنی رہیں۔

حافظ ابن حجر ان کی بابت لکھتے ہیں کہ عائشہ کی پیدائش ہجرت سے تقریباً آٹھ سال پہلے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ تقریباً ۱۸ سال کی تھیں۔ انھوں نے آپ سے بہت سی باتیں یاد رکھیں اور آپ کے بعد تقریباً ۵۰ سال تک زندہ رہیں۔ لوگوں نے ان سے بہت زیادہ باتیں اخذ کیں۔ اور احکام و آداب میں سے بہت سی چیزیں ان سے نقل کیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ احکام شریعت کا چوتھائی حصہ ان سے نقل کیا گیا ہے۔ ان کی وفات امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں ۵۸ھ میں ہوئی (فتح الباری ۱۴۴/۷)

حضرت عائشہؓ سے اقوالِ رسولؐ بہت زیادہ منقول نہیں ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو نہایت غور سے سنا۔ آپ کے ہر عمل کو نہایت توجہ سے دیکھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے اس کی حکمتیں معلوم کیں۔ ان کا کلام اسلامی حکمت اور معرفت کا خزانہ ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے تھے۔ ان کے اس ایک قول میں معانی کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنی ذہانت کو خالص اسلام کے لیے استعمال کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے زہد کو اپنا شعار بنایا۔ بعد کے زمانہ میں آپ کے پاس کثرت سے مال آتا تھا۔ مگر آپ سارا مال لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتی تھیں اور خود نہایت سادہ زندگی گزارتی تھیں۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن زبیر نے ان کے پاس ایک لاکھ ۸۰ ہزار درہم بھیجے۔ آپ نے سارا درہم شام تک خیرات کر دیا۔ جبکہ اس دن آپ روزہ سے تھیں اور گھر میں روٹی اور زیتون کے تیل کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔ خادمہ نے کہا کہ آپ کچھ درہم بچا کر گوشت منگالیتیں تو اچھا ہوتا۔ فرمایا کہ تم نے پہلے یاد دلایا ہوتا تو منگالیتی۔

یہ زہد ہی حکمت کا دروازہ ہے۔ جو یہ چاہتا ہو کہ خدائی معرفت اور اسلامی حکمت کا چشمہ ان کے ذہن میں جاری ہو اس کو اس دنیا میں مادی چیزوں سے بے رغبت ہو کر رہنا ہوگا۔

ایمان کی طاقت

شیخ حمید الدین ابوحاکم قریشی (۷۳۷ - ۷۰۵ ھ) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ اپنے والد سلطان بہاء الدین کے انتقال کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۲۱ سال تک شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔

"ذکر کرام" میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین کے ساتھ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور "سلطان کے بجائے ان کو "شیخ" بنا دیا۔

شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی نونیت نامی ایک مسلم خادمہ کے سپرد تھی۔ اس مسلم خادمہ کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر روز وقت پر وہ بستر بچھا دے تاکہ شیخ حمید الدین آکر اس پر آرام کر سکیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا تو اس کو بستر بہت اچھا لگا۔ وہ اس پر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھی نہیں تھی کہ اس کو نیند آگئی۔ شیخ حمید الدین جب معمول کے مطابق آرام کرنے کے لیے محل پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نونیت بستر پر پڑی سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سویا ہوا دیکھ کر انھیں غصہ آگیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور خادمہ کو کوڑے مارے جانے لگے۔ مگر یہ عام قسم کی خادمہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ مومنہ اور مسلمہ تھی۔ چنانچہ شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خادمہ آہ و واویلا نہیں کر رہی ہے، بلکہ ہر کوڑے پر ہنس پڑتی ہے۔ انھوں نے سزا کو روک کر خادمہ کو بلایا اور اس سے خلاف معمول ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

> "مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم بستر پر ایک بے اختیارانہ نیند کی یہ سزا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس نرم بستر پر آرام کرتے ہیں"

خادمہ کے اس جواب کا سلطان حمید الدین پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ سلطان کے بجائے شیخ بن گئے۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں تک کہ درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطنت چھوڑ کر شیخ حمید الدین لاہور آئے۔ یہاں حضرت سید احمد توختہ (جو اُن کے نانا بھی ہوتے تھے) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد

ان کی خلافت حاصل کی۔ شیخ حمید الدین نے ۱۷۰ سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ وارشاد کا کام کرتے رہے۔ اس علاقہ میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے (تذکرۂ صوفیا، پنجاب از اعجاز الحق قدوسی)

ایک عورت اگر صحیح معنوں میں ایمان اور اسلام پر ہو تو وہ خادمہ ہو کر بھی مالک سے زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک جملہ بادشاہ کو تڑپانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسی خواتین بہت ہیں جنھوں نے اپنے ایک مومنانہ کلمہ سے بڑے بڑے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں۔

بنو عباس کے آخری زمانہ میں تاتاریوں نے مسلم دنیا کو پامال کر ڈالا۔ ایک مؤرخ کے الفاظ میں: اسلام کی تاریخ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس کا مقابلہ دہشت انگیزی اور غارت گری میں تاتاری حملہ سے کیا جا سکے۔ جس طرح کسی پہاڑ سے بہت بڑا تودہ کسی بستی پر آگرے اسی طرح تاتاریوں کے وحشی لشکر اسلامی تہذیب وتمدن کے مرکزوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنے پیچھے ویران صحرا اور بھیانک کھنڈر کے سوا کچھ اور نہیں چھوڑا۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ المناک حادثہ دوبارہ اس طرح بدلا کہ وحشی تاتاری اسلام قبول کرکے اسلام کے حامی اور پاسباں بن گئے۔ یہ انقلابی واقعہ جن لوگوں کے ذریعہ انجام پایا ان میں بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔ تاتاریوں نے مسلم دنیا کو تاراج کرنے کے بعد مردوں کو قتل کیا اور عورتوں کو لونڈی بنالیا۔ یہ خواتین جو تاتاری گھروں میں زبردستی داخل کی گئی تھیں، انھوں نے خاموشی کے ساتھ تاتاریوں پر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت کو اسلام میں داخل کر دیا۔ The Preaching of Islam, pp. 226-234

تاتاریوں (مغلوں) کا پہلا فرماں روا جس نے اسلام قبول کیا وہ برکہ خان تھا۔ اس نے ۱۲۵۶ء سے لے کر ۱۲۶۷ء تک حکومت کی۔ برکہ خان کی ماں ایک مسلمان تھی۔ اس نے بچپن سے اس کی تربیت اسلامی انداز پر کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ بڑا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح غازان خان کا بھائی الجائتو اپنی مسلمان بیوی کی ترغیب سے اسلام لے آیا۔ وغیرہ۔

اسلامی خواتین کی تاریخ اس قسم کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔

ایک گواہی

امریکہ کے سفر میں مجھے ایک امریکی خاتون کا حال معلوم ہوا جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اب وہ ایک پاکستانی مسلمان نصیر احمد مرزا سے نکاح کرکے اوٹا (Utah) میں رہتی ہیں۔ ان کا نام جے عائشہ مرزا (Jeanine Aisha Mirza) ہے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے پڑھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم بیویاں زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ تو محض ایک تقسیم ہے۔ گھر کے باہر میرا شوہر باس ہے۔ لیکن گھر کے اندر میں باس ہوں :

While most Americans are under the impression that Muslim wives are opressed. Mirza said, she hasn't found that to be true. "It's just a different division. Outside the home, my husband's the boss. But in my house, I'm the boss."

اس طرح کے متعدد واقعات میرے علم میں آئے۔ امریکہ کی لڑکیاں سفید فام نسل کے لڑکوں سے شادی کرنے میں متردد رہتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں ہر وقت طلاق کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس بنا پر اکثر سنجیدہ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ لڑکے وہ ہیں جو تعلیم کے مقصد سے امریکہ آتے ہیں۔ اس طرح کی شادیاں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بھی بن رہی ہیں۔ کیوں کہ اخبار کے لوگ ان امریکی لڑکیوں سے سوالات کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت عمدہ انداز میں اسلام کی طرف سے دفاع کرتی ہیں، جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی۔

مذکورہ امریکی خاتون نے اپنے تجربہ کی روشنی میں اسلام کے اصول کی نہایت درست ترجمانی کی ہے۔ اسلام میں عورت کے درجہ کو مرد کے مقابلہ میں گرایا نہیں گیا ہے۔ بلکہ برابری کے اصول پر دونوں کے درمیان تقسیم کار کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اسلام نے زندگی کے معاملات کو دو بڑے حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک بیرونی حصہ، دوسرا اندرونی حصہ۔ اسلام کے مطابق، بیرونی حصۂ حیات کا انچارج مرد ہے اور اندرونی حصۂ حیات کی انچارج عورت۔

یہ تقسیم کار دونوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس طرح زندگی کے ایک شعبہ میں مرد اپنی پوری طاقت لگانے کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عورت زندگی کے دوسرے شعبہ میں آزاد

ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو استعمال کرتے ہوئے اس کو بخوبی طور پر منظم کرے۔

یہ تقسیم ایک اعتبار سے آزادانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے اس کی حیثیت
رانہ دار پہیہ (cog wheel) جیسی ہے۔ دندانہ دار پہیہ میں ہر پہیہ کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے۔
ں کے باوجود دونوں پوری طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کا عمل
سرے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی درست کارکردگی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ دونوں پوری
ح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں۔

عورت کو اپنے نقشۂ حیات میں اسی احساس کے ساتھ رہنا ہے۔ اس کو یہ سمجھنا ہے کہ وہ
ہانہ دار پہیہ کے دو برابر کے پرزوں میں سے ایک پرزہ ہے۔ اس کے مل کر چلنے سے پورا پہیہ
ے گا، اور اس کے نہ چلنے سے پورا پہیہ رک جائے گا اور اسی کے ساتھ زندگی کا پورا نظام بھی۔

تقسیم کار کے معاملہ کا تعلق صرف عورت اور مرد سے نہیں ہے۔ وہ ایک عام اصول ہے
، پر فطرت کا پورا نظام قائم ہے۔

آپ ایک بزنس ہاؤس قائم کریں جہاں بہت سے لوگ کام کر رہے ہوں۔ آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ
وگوں کو آفس میں بٹھائیں اور کچھ لوگوں کو فیلڈ میں متحرک کریں۔ یہ تقسیم ہر کاروبار کو کامیابی
ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے۔ کسی کاروبار یا کسی آرگنائزیشن کے کارکن اگر اس تقسیم عمل پر
ی نہ ہوں تو ایسے کاروبار یا آرگنائزیشن کا ناکام ہو جانا یقینی ہے۔

یہی معاملہ کاروبارِ حیات کا ہے۔ زندگی کے لیے خدا نے یہ طریقہ بنایا ہے کہ عورت اور
دونوں مل کر اسے چلائیں۔ پھر ان دونوں کے لیے بنیادی دائرہ کار مقرر کر دیا ہے اور ہر ایک
اندر مخصوص طور پر وہی صلاحیتیں رکھ دی ہیں جو اس کو اپنے دائرہ کے کام کو بخوبی طور پر انجام
ینے کے لیے ضروری ہیں۔

اب عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ ہر جنس اپنے اپنے دائرہ عمل پر راضی رہ
پنے حصہ کا کام پوری توجہ کے ساتھ انجام دے۔ نہ مرد عورت بننے کی کوشش کرے اور نہ عورت
، نقل کرے۔ جو عورت اور مرد خدا کے اس بندوبست پر راضی ہوں وہ خدا کی مدد سے دنیا
می کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی کامیاب۔

تین مرحلے

ایک عورت کو اپنی زندگی میں تین بڑے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک لڑکی کی صورت میں اپنے صبح و شام بسر کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کا نکاح ہوتا ہے اور وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر منتقل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے یہاں بچے پیدا ہوتے ہیں اور اس کی حیثیت ماں کی بن جاتی ہے۔

یہ تینوں مرحلے تقریباً ہر عورت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے تقاضے الگ الگ ہیں اور ہر دور میں عورت کو اس کے لحاظ سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے تاکہ اس کی ترقی جاری رہے اور وہ آخری کامیابی کی منزل تک پہنچ سکے۔ ان تینوں مرحلوں میں عورت کو جو کام کرنا ہے اس کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے ...... تعلیم، خانہ آبادی، تربیت نسل۔

پہلے مرحلہ میں جب کہ عورت کی حیثیت ایک لڑکی کی ہوتی ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری تعلیم کا حصول ہے۔ زندگی کا یہی وہ تعمیری دور ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ علم کا حصول ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت پر فرض ہے (طلب العلم فریضۃ علی کل مومن و مومنۃ)

تعلیم زندگی کی تعمیر ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ انسان حقیقی معنوں میں انسان بنتا ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ ذہن اس ارتقائی حالت تک پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو سمجھے۔ وہ دنیا اور آخرت سے سچی واقفیت حاصل کرے۔ وہ مراحل حیات میں کھلی آنکھ اور کھلے ذہن کے ساتھ داخل ہو اور صحیح طور پر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

ایک عورت جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی حیثیت ایک خام مادہ کی ہوتی ہے۔ اس کے اندر تمام فطری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں مگر یہ صلاحیتیں خام حالت میں ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو جلا دینے کا کام تعلیم کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ تعلیم گویا لوہے کو اسٹیل بناتی ہے، وہ فطری امکانات کو واقعہ کے روپ میں تشکیل دیتی ہے۔

تعلیم عورت کی شخصیت کو مکمل کرتی ہے۔ ہر عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے، عورت جتنی زیادہ صاحب علم ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے گی۔

تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ ایک کو سیکولر تعلیم اور دوسرے کو دینی تعلیم کہہ سکتے ہیں۔ عورت کے لیے دونوں ہی ضروری ہیں، اگرچہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہے۔ سیکولر تعلیم اگر ضرورت حیات کے درجہ میں مطلوب ہے تو دینی تعلیم مقصد حیات کے درجہ میں درکار ہے۔

سیکولر تعلیم عورت کو زندگی کا شعور عطا کرتی ہے۔ وہ اس کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کا طریقہ بتاتی ہے۔ انسانی نفسیات کیا ہے۔ زمانہ کے تقاضے کیا ہیں۔ قوم اور ملک کی تاریخ کیا ہے۔ وہ انسانی حالات کیا ہیں جن کے درمیان اس کو زندگی کا امتحان دینا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کو سیکولر تعلیم یا دنیوی تعلیم کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس تعلیم کو حاصل کرنا عورت کے لیے انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر وہ اپنے فرائض حیات کو کامیابی کے ساتھ ادا نہیں کرسکتی۔

دینی تعلیم کی حیثیت مقصدی ہے۔ ہر عورت پر لازم ہے کہ وہ ضروری حد تک قرآن اور حدیث کا علم حاصل کرے۔ وہ صحابہ اور صحابیات کی زندگیوں کو جانے۔ وہ اسلام کی تاریخ سے بقدر ضرورت واقف ہو۔ وہ جانے کہ انسان کے لیے اسلام کا عطیہ کیا ہے۔

عورت اگر عربی زبان سیکھ سکے تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ اپنی مادری زبان میں اس کو قرآن کا ترجمہ پڑھنا چاہیے اور بار بار اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن کی حیثیت دین میں اساس کی ہے۔ قرآن کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر دین کا فہم وادراک ممکن نہیں۔

اس کے بعد عورت کو احادیث کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ عربی زبان جانے اور عربی میں پڑھ سکے تو زیادہ بہتر ہے، ورنہ آج ہر زبان میں حدیث اور سیرت پر کتابیں موجود ہیں۔ اس کو چاہیے کہ اپنی زبان میں اس موضوع پر کتابیں حاصل کرے اور اہتمام کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے۔

اس کے بعد صحابہ کے حالات اور دوسری دینی شخصیتوں کے حالات کا معاملہ ہے۔ ان پر بھی ہر زبان میں کثرت سے کتابیں موجود ہیں۔ ہر عورت کے لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو اپنے حالات کے اعتبار سے پڑھے اور اس میں پوری آگہی حاصل کرے۔

عورت کی زندگی کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جب کہ اس کا نکاح ہوتا ہے اور وہ کسی مرد کی بیوی بن کر نئے گھر میں منتقل ہوتی ہے۔ اس دوسرے دورِ حیات میں اس کی جو ذمہ داریاں ہیں اس کو ایک لفظ

میں خانہ آبادی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ اب عورت محض ایک فرد نہیں رہی ، وہ سماج کا ایک ایسا جز ء بن جاتی ہے جس کے بغیر نہ وہ خود مکمل ہے اور نہ سماج ۔

خانہ آبادی کے اس دور میں عورت کو جس طرح رہنا ہے ، اس کو ایک لفظ میں حسن معاشرت کہا جا سکتا ہے ۔ قرآن میں مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو (عاشروهن بالمعروف) اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو (النساء ۱۹)

یہ بات جو مردوں سے کہی گئی وہی عورتوں سے متعلق بھی ہے ۔ عورت کو بھی اسی ذہن کے ساتھ اپنا گھر بسانا ہے کہ خانہ آبادی میں اصل اہمیت ذاتی پسند ناپسند کی نہیں ہے بلکہ مجموعی انسانی فلاح کی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ذاتی اعتبار سے ایک چیز آپ کو پسند نہ آتی ہو مگر مجموعی انسانیت کے اعتبار سے اس میں خیر ہو ۔ اس لیے گھر کے اندر ناموافق باتوں کو نباہتے ہوئے ہنسی خوشی زندگی گزارنا ہے ۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جب کہ عورت ماں بن جاتی ہے ۔ اب اس کی ذمہ داریوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ۔ یعنی اگلی نسل کی تیاری میں اپنا حصہ ادا کرنا ۔ ہر گھر یا خاندان گویا کہ وسیع تر انسانیت کی ایک اکائی ہے ۔ اکائیوں کی درستگی سے مجموعہ درست ہوتا ہے ۔ اب عورت کو یہ کرنا ہے کہ اپنی اکائی کو درست کرنے میں لگ جائے تاکہ وسیع تر انسانی معاشرہ درست معاشرہ بن سکے ۔

عورت کو اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دینا ہے ۔ اس کو اعلیٰ انسانی اخلاق سکھانا ہے ۔ اس کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے گھر میں اور اپنے سماج میں ایک شریف اور دیانت دار انسان کی حیثیت سے رہ سکے ۔ عورت کو اپنی اولاد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ دنیا میں انسانوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں ، اور آخرت میں خدا کی رضا کے مستحق قرار پائیں ۔

عربی کا مقولہ ہے : التعليم في الصغر كالنقش في الحجر ۔ یعنی کم عمری کی تعلیم پتھر میں نقش کی مانند ہے (فتح الباری ۸/ ۷۰۲) بچہ میں یہ حجری نقش بنانا ماں ہی کا کام ہے ۔ اگر عورت اس امکان کو پوری طرح استعمال کرے تو اس کی آغوش میں پلا ہوا بچہ ایک ایسا انسان بن کر ابھرے گا جو انسانی دنیا کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہو نہ کہ کوئی بوجھ ۔

وہی عورت کامل عورت ہے جو ان تینوں ذمہ داریوں میں پوری اترے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۶، شمارہ ۲۲۳

AL-RISALA (Urdu)
1. Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press Delhi

مسجد اور نماز

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں گے مگر اس کو (ذکر و نماز سے) بہت کم آباد کریں گے (یأتی علی امتی زمان یتباھون بالمساجد ثم لا یعمرونها الا قلیلا) فتح الباری ۱/۶۴۲

حضرت انسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں پر فخر کرنے لگیں (لا تقوم الساعة حتی یتباھی الناس فی المساجد) سنن ابی داؤد ۱/۱۳۰

اس طرح کی روایتیں دراصل دور زوال کے مظاہر کو بتاتی ہیں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ روح ختم ہو جاتی ہے، اور ظاہری چیزوں کی دھوم بڑھ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں لوگ مسجدوں کی کثرت کا پرجوش طور پر چرچا کرتے ہیں۔ وہ مسجد کی شاندار تعمیرات پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنی قومی عظمت کو مساجد کے در و دیوار میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں لوگ صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اس لیے ان کے پاس عمارتی عظمت کے سوا کوئی اور عظمت نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے کو برتر محسوس کر سکیں۔

مگر جب لوگوں میں دین کی روح زندہ ہو تو ان کی نظر میں در و دیوار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ معمولی طور پر بنی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھ کر ان کو اور زیادہ سکون ملتا ہے۔ ان کو ایسی مسجدیں پسند آتی ہیں جہاں روشنیوں کا انتظام نہ ہو، کیوں کہ وہاں توجہ الی اللہ میں ان کے لیے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی۔ نرم قالینوں پر سجدہ کرنے کے بجائے انھیں مٹی کے فرش پر اپنی پیشانی رکھنا زیادہ محبوب ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ان کے عاجزانہ سجدہ کے زیادہ حسب حال ہوتا ہے۔

در و دیوار کی عظمتیں ان لوگوں کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونے لگتی ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی میں کچھ لمحات گزارنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اور ان کے رب کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اس لیے وہ سادہ مسجدوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں نہ کہ چمک دمک والی مسجدوں کو۔

عبادت اور اخلاق

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ مَنْ لَا یَشْکُرُ النَّاسَ (سنن ابی داؤد ۴/۲۵۶) یعنی وہ آدمی جو انسان کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں الٰہیات اور انسانیات دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اسلام میں الٰہی عبادت کا تعلق بھی انسانی اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس آدمی کی نماز اس کے لیے وبال ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ لوگوں کو چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں بھی بخیل ہو (الماعون ۷)۔ حدیث میں ہے کہ اس آدمی کا روزہ روزہ نہیں جو بظاہر روزہ رکھے مگر وہ قولی اور عملی جھوٹ کو نہ چھوڑے (صحیح البخاری)۔ قرآن میں ہے کہ مومن اس طرح صدقہ دیتا ہے کہ وہ لینے والے سے کوئی بدلہ یا شکرگزاری نہیں چاہتا (الدھر ۹)۔ حج کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ حج میں نہ بیہودہ گوئی کرنا چاہیے اور نہ بے حکمی اور نہ لڑائی جھگڑا (البقرہ ۱۹۷)۔

عبادت اور اخلاق کا ایک دوسرے سے جڑا ہونا فطرت کا عین تقاضا ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کی نفسیات کے تحت ہوتا ہے۔ اور نفسیات میں تقسیم ممکن نہیں۔ آدمی کے اندر اگر صحیح معنوں میں عبادت کی نفسیات پیدا ہو جائے تو اس کے بعد اخلاق کی نفسیات بھی ضرور اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ کسی کے اندر اگر خدا پرستی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر انسان دوستی بھی لازماً موجود ہوگی۔

عبادت کوئی رسمی اور وقتی چیز نہیں۔ عبادت ایک گہرا روحانی عمل ہے۔ جس آدمی کے اندر عبادت کی روح آجائے اس کی پوری شخصیت میں تواضع، احتیاط، خیرخواہی اور فضولیات سے پرہیز کا مزاج پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی کیفیات اخلاق کی اصل ہیں۔ یہ لطیف کیفیات جب سماجی تعلقات میں ظاہر ہوں تو اسی کا دوسرا نام انسانی اخلاق ہے۔

ایک عبادت گزار لازمی طور پر انسانی خدمت گار بھی ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق و عادات اور گفتار و کردار میں شرافت اور انسانیت کی روح بسی ہوئی ہوتی ہے۔

اگر ایک آدمی سچا خدا پرست ہو تو لازماً وہ سچا انسان دوست بھی ہوگا۔ یہ دونوں صفتیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

حکومتی منصب

سفیان بن سعید بن مسروق الثوری ۹۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۶۱ھ میں بصرہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی کتابوں میں الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر بہت مشہور ہیں (الاعلام ۳/۱۰۴)

المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں القعقاع بن حکیم کے حوالہ سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ المہدی کے پاس تھا۔ اس وقت سفیان الثوری وہاں لائے گئے۔ جب وہ آئے تو خلیفہ کو انھوں نے عام انداز کا سلام کیا، دربار خلافت والا سلام نہیں کیا۔

المہدی کا وزیر الربیع اس کے پاس تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ المہدی نے سفیان ثوری کو دیکھ کر کہا کہ تم ہم سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم تمہارے اوپر قابو نہیں پاسکتے۔ مگر اب تم ہمارے اختیار میں ہو کیا تم اس سے نہیں ڈرتے کہ ہم تمہارے اوپر جو فیصلہ چاہیں کریں۔ سفیان ثوری نے کہا کہ اگر تم میرے معاملہ میں کوئی غلط فیصلہ کروگے تو قادر مطلق خدا تمہارے اوپر فیصلہ کرے گا اور وہ حق اور باطل کو الگ الگ کردے گا۔ وزیر ربیع نے کہا کہ اے امیر المومنین کیا اس جاہل کے لئے سزاوار ہے کہ وہ آپ سے اس طرح خطاب کرے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن ماردوں۔

المہدی نے ربیع سے کہا کہ چپ رہو، تمہارا برا ہو۔ وہ اور اس قسم کے لوگ یہی تو چاہتے ہیں کہ ہم انھیں قتل کر دیں اور ان کو سعید ثابت کرکے اپنے کو شقی بنالیں۔ کاغذ لاؤ اور ان کے لئے لکھو کہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وزیر ربیع نے اس کو لکھ کر انھیں دیدیا۔ سفیان ثوری کاغذ لے کر باہر نکلے۔ اس کو دجلہ میں پھینک دیا اور بھاگ گئے۔ اس کے بعد ان کو ہر شہر میں تلاش کیا گیا لیکن وہ نہیں ملے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔

سفیان الثوری نے جب کوفہ کے قاضی کا عہدہ قبول نہیں کیا تو اس کے بعد خلیفہ نے کوفہ کے ایک اور عالم کو یہ عہدہ دے دیا۔ ان کا نام شریک بن عبداللہ بن الحارث النخعی (۱۷۷) تھا۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو ایک عربی شاعر نے اس پر یہ شعر کہا کہ سفیان

بچ گئے اور اپنے دین کے ساتھ بھاگ گئے۔ اور شریک درہم کے پیچھے دوڑ پڑے:

تحرز سفیان وفرّ بدینہ و امسی شُریک مُرصداً للدراھم

شریک النخعی الکوفی بھی سفیان ثوری ہی کی طرح ایک بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ ان کے متعلق صاحب تذکرۃ الحفاظ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں میں نہایت عادل تھے (وکان عادلاً فی قضائہ) ان کے عادل ہونے کا ایک واقعاتی ثبوت یہ ہے کہ خلیفہ المنصور العباسی نے ان کو ۱۵۳ھ میں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مگر ان کے غیر مصالحانہ رویہ کی وجہ سے اس نے انھیں معزول کر دیا۔ اس کے بعد المہدی نے دوبارہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا۔ مگر اس کے بعد موسیٰ الہادی کو دوبارہ انھیں معزول کرنا پڑا۔
(الاعلام ۱۶۳/۳)

اس حقیقت کے باوجود شاعر نے مذکورہ شعر کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانہ میں تقویٰ کا ایک غلط معیار رائج ہوگیا۔ وہ یہ کہ جو شخص عہدہ قبول نہ کرے وہ متقی ہے اور جو شخص عہدہ قبول کرلے وہ غیر متقی۔ حالاں کہ اسلام میں اعمال کا مدار نیت پر ہے نہ کہ محض ظاہر پر۔ یہ سراسر ایک اضافی چیز ہے کہ کس نے حکومتی عہدہ قبول کیا اور کس نے قبول نہیں کیا۔ دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ عہدہ قبول کرنے کے بعد وہ اپنی نیت اور اپنے کردار کے اعتبار سے کیسا رہا۔

اہل علم اور اہل خیر کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں۔ اس کی ایک انتہائی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ آپ خدا کے پیغمبر تھے اور آپ نے مصر کے مشرک بادشاہ کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ قبول فرمایا۔ مگر بعد کے زمانہ میں علماء اسلام غیر ضروری طور پر حکومتی عہدوں کو برا سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہا گیا کہ یہ حضرت یوسف کے لئے خاص تھا۔ اب ہمارے لئے وہ جائز نہیں (ان ھٰذا کان لیوسف خاصۃ، وھٰذا الیوم غیر جائز)
الجامع لاحکام القرآن ۲۱۵/۹

لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا عین جائز ہے اور اس میں اسلام اور ملت کے لئے کثیر فائدے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو اور کسی بھی قسم کا دنیوی مفاد مقصود نہ ہو۔ اسلام میں ساری اہمیت صرف نیت یا اسپرٹ کی ہے، ظاہر کی اہمیت تمام تر اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔

دعوتی عمل

یہ بات تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ضروری ہے تاکہ اس کا پیغام ہر دور میں تمام نسلوں تک پہنچ سکے۔ یہ کام کیسے ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس کے بارہ میں مختلف نقطۂ نظر ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام کے طور پر قائم و نافذ کیا جائے تاکہ لوگ اس کی برکتوں کا عملی تجربہ کریں۔ اس طرح وہ اسلام کے کمالات کے قائل ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ دوسرے گروہ کا ذہن یہ ہے کہ ہر ہر مسلمان کے اندر اسلامی عمل اور اسلامی کردار پیدا کیا جائے۔ جب دوسری قومیں مسلمانوں کو چلتے پھرتے دیکھیں گی تو وہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیں گی۔

ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اشاعت اسلام کا عمل تو پچھلے ہزار سال کے دوران مسلسل جاری تھا، وہ صرف بیسویں صدی میں پہنچ کر منقطع ہوا ہے۔ حالانکہ ابتدائی دور کے بعد پھر اس انداز کی دعوتی جد و جہد دوبارہ کبھی نہیں کی گئی۔ ایسی حالت میں اس کا سبب کیا تھا۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اب ایک محمود اور مستحکم اور محفوظ دین ہے۔ اس کی یہ حیثیت عالمی سطح پر بالفعل قائم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس کے پھیلنے کے لیے اب نہ براہ راست تبلیغ کی شرط ہے اور نہ عملی نظام کی موجودگی یا اصلاح یافتہ مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اب وہ اپنے آپ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا نہ پائی جائے۔

قدیم زمانہ میں کبھی نفرت کی فضا موجود نہ تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل اسلام کی اشاعت کا عمل جاری رہا۔ موجودہ زمانہ میں نااہل لیڈروں نے ساری دنیا میں یہ کیا کہ انھوں نے اسلام کے نام پر ٹکراؤ کی سیاست چلائی اور جدید میڈیا نے اس کو خوب مشتہر کیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا قائم ہو گئی۔ یہی نفرت کی فضا اسلام کے اشاعتی عمل کو جاری رکھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

اسلام کے نام پر ٹکراؤ اور احتجاج کی سیاست نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے عمل کو روک دیا ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ اس لایعنی سیاست کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا، جیسا کہ وہ ماضی میں مسلسل اپنے آپ ہر جگہ جاری تھا۔

سکون کا راز

عن ابی ھریرۃ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انظروا الیٰ من اسفل منکم ولا تنظروا الیٰ من ھو فوقکم فھو اجدر ان لا تزدروا نعمۃ اللہ علیکم (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۸/ ۹۷)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے اور اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے۔ کیوں کہ اس رویہ سے اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ تم اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔

یہ زندگی کا ایک نہایت قیمتی اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں خود فطرت کے نظام کے تحت ایسا ہے کہ کسی کے پاس کم سامان ہوتا ہے اور کسی کے پاس زیادہ سامان۔ فرق کی یہ صورت حال کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ایسی حالت میں پرسکون زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے اور دوسروں کے درمیان غلط تقابل نہ کرے۔

اگر وہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر حسد اور بے چینی پیدا ہوگی۔ وہ سکونِ قلب سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا اور اسی کے ساتھ اس کو روحانی سکون بھی حاصل ہوگا۔ اس کا دن چین کے ساتھ گزرے گا اور رات کے وقت اس کو اچھی نیند کی نعمت حاصل ہوگی۔

اس بات کو مشہور انگریز افسانہ نگار شیکسپیر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) نے اپنے لفظوں میں اس طرح کہا ہے کہ یہ دراصل تقابل ہے جس کی وجہ سے لوگ پریشان رہتے ہیں:

It is by comparison that you suffer.

ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کا یہ نظام خود فطرت کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں گہری مصلحت ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان چیلنج کی صورت حال قائم رہتی ہے۔ یہی چیلنج تمام ترقیوں کا زینہ ہے۔ انسانی سماج میں اگر چیلنج ختم ہو جائے تو اس کی ترقیاتی سرگرمیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ آدمی کو چاہیے کہ جب وہ اپنے سے کم والے کو دیکھے تو شکر ادا کرے۔ اور جب اپنے سے اوپر والے کو دیکھے تو مسابقت کے جذبہ کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

شکایت کے باوجود

فتح مکہ کا واقعہ رمضان ۸ھ میں پیش آیا۔ اس کے جلد ہی بعد شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین ہوا۔ مکہ کی طرف اقدام سے کچھ ہی پہلے خالد بن الولید نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مہموں میں حضرت خالد کو مسلم لشکر کا سردار بنا دیا۔

یہ بات انصار کے اوپر شاق تھی۔ کیوں کہ انصار کے لوگ بہت پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لاکر جاں نثاری کر رہے تھے۔ جب کہ حضرت خالد ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آج کل کی زبان میں یہ گویا سینیر کے اوپر جونیر کو ترجیح دینے کا معاملہ تھا۔ تاہم اس شکایت کے باوجود تمام انصار رسول اللہ کے ساتھ رہے، انھوں نے آپ کے ہر حکم کی اطاعت کی۔

خاتمۂ جنگ کے بعد عرب رواج کے مطابق شعراء نے اس کے بارہ میں اشعار کہے۔ انصار کے ایک شاعر عباس بن مرداس نے بھی اس موقع پر کچھ اشعار کہے۔ اس میں ایک طرف اس شکایت کا بھی تذکرہ تھا کہ آپ نے ہمارے اوپر خالد کو ترجیح دی اور ان کو قوم کے اوپر امیر بنا دیا (فإن تك قد أمّرتَ في القوم خالداً) مگر اسی کے ساتھ شاعر نے کہا:

وقالَ نبيُّ المؤمنين تقدّموا فحُبَّ إلينا أن نكونَ المُقدَّما

اور مسلمانوں کے نبی نے کہا کہ تم لوگ آگے بڑھو، تو ہمارے لیے یہ محبوب بن گیا کہ ہم آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے والے ہوں (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۱۱)

انصار کو اگرچہ ظاہر حالات کے مطابق شکایت تھی۔ مگر اس شکایت کو انھوں نے اپنے عمل پر اثر انداز ہونے نہیں دیا۔ شکایت کے باوجود وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ پوری طرح جڑے رہے۔ شکایت کے باوجود وہ اسلام کے محاذ پر متحدہ طاقت بن کر کھڑے ہو گئے۔

موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ باہم شکایتیں پیدا نہ ہوں۔ صحیح یا غلط اسباب کے تحت بہر حال ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے، حتیٰ کہ رسول اور اصحاب رسول سے بھی۔ مگر مومن شکایتوں سے بلند ہوتا ہے، وہ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرتا ہے۔ اسی لیے مومنین کی جماعت میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ شکایت اور اختلاف ان کے اتحاد کو درہم وبرہم کر دے۔

ایک فرق

۱۵ اگست ۱۹۹۵ کو دہلی میں ایک میٹنگ میں مسٹر راج موہن گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاتما گاندھی کے پوتے ہیں اور اب ان کی عمر ۶۰ سال ہو چکی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ جاپان کی ایک کانفرنس میں شریک تھے۔ وہاں ایک جاپانی ڈیلی گیٹ نے ان سے کہا کہ میں پچھلے پندرہ سال سے مختلف مقامات پر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک رہا ہوں۔ میں نے پایا کہ کسی انٹرنیشنل کانفرنس میں، جہاں جاپانی اور ہندستانی دونوں شرکت کر رہے ہوں، وہاں صدر کو ہمیشہ دو مشکل پیش آتی ہے۔ ایک، شرمیلے جاپانی کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ بولے۔ دوسرے، ہندستانی ڈیلی گیٹ کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ اپنی تقریر کو تمام کرے:

Chairperson of international seminars has two difficulties
(1) To persuade the shy Japanese to speak
(2) To persuade the Indian delegate to complete his speech

ایک انسان وہ ہے جس کے مزاج میں سنجیدگی ہو۔ جو سیکھنا چاہتا ہو اور جس کے اندر کام کرنے کا شوق ہو۔ اس کا حال وہی ہوگا جو مذکورہ قول میں جاپانی کا حال بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان بولنے سے زیادہ سننا چاہے گا۔ کیوں کہ سننا اس کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کا دھیان اپنی عملی ذمہ داریوں پر ہوگا۔ اور جس آدمی کا ذہن اپنی عملی ذمہ داریوں پر لگا ہوا ہو، اس کا بولنا کم ہو جاتا ہے۔ عمل کا مزاج اپنے آپ قول کو گھٹا دیتا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو سنجیدگی سے خالی ہو۔ جس کے اندر یہ شوق نہ ہو کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔ جو محنت سے دور بھاگتا ہو۔ ایسے آدمی کا حال وہ ہوتا ہے جو مذکورہ قول میں ہندستانی کا بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان سب سے زیادہ بولنے میں دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ کچھ اور باتیں ہیں جن کو اسے جاننا چاہئے۔ وہ بے تکان بولے گا۔ کیونکہ اس کا احساس ہوگا کہ زیادہ بول کر وہ اپنے کم کام کی تلافی کر سکتا ہے۔

زیادہ بولنا اور کم کرنا غیر سنجیدہ انسان کی علامت ہے، اور کم بولنا اور زیادہ کرنا سنجیدہ انسان کی علامت۔

مظلوم کے لیے خوش خبری

فورٹ وین جرنل گزٹ (Fort Wayne Journal-Gazette) امریکی ریاست انڈیانا کا ایک علاقائی اخبار ہے۔ اس نے ایک مقامی ریسٹوراں کے بارے میں ایک خبر چھاپی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ انسپکٹر نے ریسٹوراں کی جانچ کی تو اس نے اس کے ایک کمرے میں چوہے کی بیٹ (rat droppings) پائیں۔ اخبار کے ہیڈلائن رائٹر نے اس خبر کی سرخی یہ لگا دی کہ جانچ کرنے والے نے ہوٹل میں چوہے پائے۔ یعنی ریسٹوراں میں صرف چوہے کی کچھ بیٹ ملی تھی مگر سرخی میں یہ لکھ دیا کہ ریسٹوراں میں زندہ چوہے پائے گئے۔

یہ ۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ مذکورہ اخبار نے اگرچہ اگلے دن اس کی معذرت چھاپ دی تھی مگر ریسٹوراں کا مالک اس معاملہ کو عدالت میں لے گیا۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اس غلط سرخی (inaccurate headline) کی وجہ سے میرے ہوٹل کی بدنامی ہوئی اور مجھے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ لمبی سماعت کے بعد عدالت نے ریسٹوراں کے دعوی کو قبول کرتے ہوئے اخبار کے اوپر تقریباً تین کرور روپیہ ($ 985,000) کا جرمانہ عائد کیا جو اس کو ریسٹوراں کے مالک کو ادا کرنا ہوگا۔ (دی پائنیر ۲۴ جون ۱۹۹۴)

ہندستان جیسے ملکوں میں تو اس طرح کی زیادتیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ حال ہے کہ اگر ایک آدمی کسی کے خلاف ایسی زیادتی کر بیٹھے تو مظلوم آدمی خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ عدالت سے رجوع کرکے وہ اس کا بھرپور معاوضہ حاصل کرسکتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عقیدہ کی رو سے اس وقت خوش ہونا چاہیے جب کہ کوئی شخص ان کے خلاف ظلم و زیادتی کا کوئی واقعہ کرے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو جانی و مالی نقصان پہنچائے، اس کی جائداد غصب کرلے، اس کے اوپر خلاف واقعہ الزام لگائے، اس کی کردارکشی کرے تو آخرت کی عدالت میں ظالم کو بلایا جائے گا اور اس کی نیکیاں اس سے لے کر مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ اور اگر اس کے پاس نیکیوں کی مقدار کم ہو تو مظلوم کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ مظلوم ہلکا پھلکا ہوکر جنت میں جائے گا اور ظالم اپنے ساتھ دوسروں کے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا جہنم میں داخل ہوگا۔

حقیقت پسندی

اگر آپ میدان میں ہوں اور بارش آجائے تو آپ بھاگ کر سایہ کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہ پسپائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ اسی طرح اگر زلزلہ آجائے تو آپ گھر سے نکل کر کھلے میدان میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی پسپائی نہیں ہے بلکہ ایک فطری حقیقت کا اعتراف ہے۔ جہاں انسان کا اور فطرت کا معاملہ ہو وہاں مسئلہ کا حل صرف اعتراف ہوتا ہے نہ کہ ٹکراؤ۔

بارش اور زلزلہ کا نظام جو خالق فطرت نے دنیا میں رکھ دیا ہے۔ انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچانے کی تدبیر کرے۔ اور اس کے نقصان سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اعراض کا اصول اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی زد سے ہٹا دیا جائے۔ اسی لیے آپ بارش کے وقت سایہ میں آجاتے ہیں اور زلزلہ کے وقت میدان میں۔

ٹھیک یہی معاملہ صبر اور اعراض کے اصول کا بھی ہے۔ صبر و اعراض کا رویہ کسی قسم کی بزدلی یا پسپائی نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر صرف حقیقت پسندی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ خالق فطرت نے انسان کو امتحان کی غرض سے آزادی عطا کی ہے۔ انسان اپنی آزادی کا استعمال کبھی صحیح کرتا ہے اور کبھی غلط۔ اب آپ کیا کریں۔ اگر آپ ہر انسان سے لڑنے لگیں تو لوگوں سے آپ ان کی آزادی چھین نہیں سکتے۔ کیوں کہ یہ آزادی ان کو خود مالک کائنات نے دے رکھی ہے، لوگوں کی آزادی چھیننے کی بے فائدہ کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آپ اپنے راستہ کو کھوٹا کرلیں گے۔

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن رویہ ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کی طرف سے اگر کبھی تلخی اور ناگواری پیش آجائے تو اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر حیات جاری رکھا جائے۔

صبر و اعراض دوسروں کا مسئلہ نہیں، وہ خود اپنا مسئلہ ہے۔ بے صبری آدمی کے سفر کو روک دیتی ہے، اور صبر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ آدمی کی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

غلط فہمی

صحیح البخاری (کتاب النکاح ، باب عرض الانسان ابنتہ او اختہ علی اہل الخیر) میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا جب ان کی صاحبزادی حفصہ بیوہ ہوگئیں جن کا نکاح خنیس بن حذافہ السہمی سے ہوا تھا۔ اور وہ مدینہ میں وفات پا گئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر میں عثمان بن عفان کے پاس آیا اور میں نے ان کو حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ چند دن کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس وقت میں نکاح نہیں کر سکوں گا۔

حضرت عمر کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر صدیق سے ملا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی حفصہ کا نکاح آپ سے کر دوں۔ ابوبکر خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا (فصمت ابوبکر فلم یرجع الیّ شیأ)

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابوبکر پر مجھے عثمان سے بھی زیادہ غصہ آیا (وکنت اوجدَ علیہ منی علی عثمان ، وفی روایۃ : فغضب علی ابی بکر وقال فیہا ، کنت اشدّ غضبا حین سکت منی علی عثمان)

پھر میں کچھ دن تک ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ کے ساتھ میں نے حفصہ کا نکاح کر دیا۔ اس کے بعد میری ملاقات ابوبکر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ شاید تم مجھ پر غصہ ہوئے ہو گے جب کہ تم نے مجھ سے حفصہ کا پیغام دیا تھا۔ اور میں نے تم کو کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ اس معاملہ میں جواب سے مجھے صرف اس چیز نے روکا تھا کہ میں جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا ذکر کیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں رسول اللہ کا راز کھول دوں۔ اگر آپ ان کو چھوڑ دیتے تو میں ضرور انھیں قبول کر لیتا (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۸۱ - ۸۳)

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ اس کے باوجود

ایسا ہوتا ہے کہ ایک صحابی دوسرے صحابی کے رویہ کو اتنا زیادہ غلط سمجھ لیتا ہے کہ اس پر اس کو غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ یہ در اصل غلط فہمی کا معاملہ تھا نہ کہ غلط کاری کا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر ابتدائی مرحلہ میں مذکورہ واقعہ کو محض ظاہر کے اعتبار سے لے رہے تھے۔ ظاہر کے اعتبار انھیں دکھائی دیا کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان نے نامناسب رویہ اختیار کیا۔ مگر جب معاملہ کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کا رویہ بالکل درست تھا۔ اس میں غصہ ہونے کی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

ایک صحابی کو جب دوسرے صحابی کے معاملہ میں غلط فہمی ہو سکتی ہے تو عام مسلمان کو دوسرے مسلمان کے معاملہ میں بھی یقیناً غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنے میں وہ انتہائی محتاط ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعض ظاہری چیزوں کو دیکھ کر وہ بری رائے قائم کر رہا ہو۔ حالاں کہ زیادہ گہرے اسباب بتا رہے ہوں کہ یہ سراسر غلط فہمی کی بات ہے، کیونکہ وہاں سرے سے کوئی غلط فعل پایا نہیں جا رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں باہمی تعلقات میں بگاڑ کا سبب اکثر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ حتی کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر حالات کے اعتبار سے غلط فہمی بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

یہ غلط فہمی دو مخلص افراد یا دو بے قصور گروہوں کے درمیان بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب بھی غلط فہمی کی صورت پیدا ہو تو ایسا نہ کرے کہ اس پر یقین کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ متعلق افراد سے مل کر اس کی تحقیق کرے۔ کامل تحقیق کے بغیر ہرگز وہ اس کو تسلیم نہ کرے۔ تحقیق کا طریقہ غلط فہمی سے پیدا ہونے والی برائیوں کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیق کے بعد جب غلط فہمی بے بنیاد ثابت ہو تو فوراً اپنے دل و دماغ سے اس کو نکال دے۔ اپنے آپ کو دوبارہ اسی طرح معتدل بنالے جس طرح وہ غلط فہمی کی صورت پیدا ہونے سے پہلے تھا۔

تحقیق کو اپنا اصول بنا لیجئے۔ اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

۱۵ الرسالہ اپریل ۱۹۹۶

حق کا اعتراف

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں عراق فتح ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال تھا کہ دجلہ وفرات کے علاقہ کی زرخیز زمینیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہیں، ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ سابق رواج کے مطابق، فوجی سرداروں کی رائے یہ تھی کہ اس مفتوحہ زمین کا بڑا حصہ فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ زمین کو سرکاری بیت المال کے زیر تصرف رہنا چاہئے تاکہ آئندہ نسلوں تک اس کا فائدہ تمام لوگوں کو مل سکے۔

اس مسئلہ پر سخت اختلاف ہوا اور کئی دن تک بحث جاری رہی۔ خاص طور پر خالد بن الولید، عبد الرحمٰن بن عوف اور بلال بن رباح نے اتنی زیادہ حجت کی کہ حضرت عمر فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکل آئے کہ: اَللّٰھُمَّ اکفنی بلالاً۔ یعنی اے اللہ، تو مجھ کو بلال سے نجات دے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا جس میں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ جیسے لوگ تھے۔ اس کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

کئی دن کی بحث کے بعد آخر کار حضرت عمر کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ (غنیمت میں) ان مہاجروں کے لئے حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے دار الاسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے (والذین جاؤا من بعدھم) الحشر ۸-۱۰

حضرت عمر فاروق نے لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی اور کہا کہ اس آیت میں غنیمت

اور فئی کا حکم بیان کرتے ہوئے والذین جاؤ امن بعدھم (اور جو ان کے بعد آئے) کا لفظ ہے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فتوحات کے ذریعہ جو اموال ملیں وہ صرف حال کے لوگوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر ان مفتوحہ زمینوں کو میں موجودہ فاتحین کے درمیان بانٹ دوں تو ہماری آئندہ نسلوں کو اس میں حصہ نہیں مل سکے گا۔ اور یہ قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا۔ حضرت عمر کے اس استدلال کو تمام لوگوں نے مان لیا اور ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہی کی رائے درست ہے۔

اس کے بعد یہ اصول قائم ہوگیا کہ فتوحات کے ذریعہ جو زمینیں اسلامی مملکت میں داخل ہوں وہ حکومت اسلامی کی ملکیت قرار پائیں نہ یہ کہ فوج کے افراد میں تقسیم ہو کر ان کی انفرادی ملکیت میں چلی جائیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت نے لوگوں کے ہونٹ سی دئے اور اب ان کے لئے کچھ بولنے کا موقع باقی نہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قبولیت حق کا مادہ تھا۔ ان کی بحث نہ سمجھنے کی وجہ سے تھی نہ کہ محض سرکشی کی بنا پر۔ اس لئے جب قرآن کی آیت نے حقیقت کھول دی تو اس کے بعد ان کے لئے سمجھنا کچھ دشوار نہ رہا۔

اس دنیا میں بولنے کی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ آدمی ہر دلیل کے جواب میں اس کے خلاف بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ اب جو لوگ غیر سنجیدہ ہیں وہ اسی طرح ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کر کے اسے رد کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ سنجیدہ ہوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات کسی بات کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر جب اس بات کو زیادہ واضح دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اصل بات کو ماننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

غلط کار وہ نہیں ہے جو غلطی کرے۔ غلط کار وہ ہے جو صحیح اور غلط واضح ہو جانے کے بعد بھی غلط روش پر قائم رہے۔ غلطی کسی بھی شخص سے ہو سکتی ہے۔ مگر جب دلیل سامنے آجائے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ غلط روش کو ترک کر کے صحیح روش کو اختیار کر لے۔ یہی مومن کا اور یہی سچے انسان کا طریقہ ہے۔

فائدہ اتحاد

نبوت سے پہلے جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ابھی ۳۵ سال تھی، مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ کعبہ کی تعمیر نو کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ کی جو تعمیر کی تھی، وہ زمانہ گزرنے کی وجہ سے بوسیدہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ قریش کو خیال ہوا کہ اس کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔

پہلا مسئلہ قدیم دیوار کو توڑنے کا تھا۔ اب تمام لوگ ڈر گئے۔ ہر ایک اس اندیشہ میں تھا کہ اگر اس نے اس مقدس عمارت پر پھاوڑا چلایا تو کہیں اس کے اوپر کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ آخر کار ولید بن مغیرہ نے ہمت کی۔ وہ کعبہ کے سامنے پھاوڑا لے کر کھڑا ہوا اور کہا: اللّٰہم لم نزغ، اللّٰہم إنّا لا نرید إلّا الخیر (اے اللہ، ہم نے ٹیڑھی راہ اختیار نہیں کی۔ اے اللہ، ہم بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔)

اس کے بعد سب نے مل کر دیوار توڑی۔ مگر قدیم بنیاد کو باقی رکھا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کھدائی میں ان کو ایک پتھر ملا۔ اس پر یہ کلمات لکھے ہوئے تھے:

مَنْ یَزْرَعْ خَیْراً یَحْصِدْ غِبْطَةً۔ ومن یَزْرَعْ شَرّاً یَحْصِدْ نَدَامَةً۔ تعملون السیأت وتُجْزَون الحسنات۔ اجل، کما لا یُجْتَنیٰ مِنَ الشَّوْكِ العنب (سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۱۳)

جو آدمی نیکی بوئے گا وہ قابل رشک فصل کاٹے گا۔ اور جو آدمی برائی بوئے گا وہ ندامت کی فصل کاٹے گا۔ کیا تم لوگ برائی کرو گے اور اچھا بدلہ پاؤ گے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کانٹے کے پیڑ سے انگور نہیں توڑے جا سکتے۔

قریش کے ہر قبیلہ نے کعبہ کی تعمیر نو کے لئے پتھر جمع کئے۔ پھر اس کی تعمیر شروع کی۔ جب تعمیر اس مقام پر پہنچی جہاں حجر اسود کو دوبارہ لا کر نصب کرنا تھا تو قبائل کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہ ایک شرف کی بات تھی، چنانچہ ہر قبیلہ یہ چاہنے لگا کہ وہی حجر اسود کو اٹھائے اور وہی اس کو اس کے سابقہ مقام پر لا کر رکھے۔ اختلاف بڑھا۔ لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ بنو عبد الدار خون سے بھرا ہوا ایک کٹورا لائے اور اس میں اپنی انگلیاں ڈال کر آخر وقت تک لڑائی کرنے کا عہد کیا۔

اسی تکرار میں چار یا پانچ دن گزر گئے ۔ آخر ان کو ہوش آیا۔ سب کے سب مسجد کے اندر اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور انصاف پر راضی ہو گئے (ثم انہم اجتمعوا فی المسجد وتشاوروا وتناصفوا) صفحہ ۲۱۳)

ابو امیہ بن المغیرہ اس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اے قریش کے لوگو، تم لوگ اپنے اختلاف کا فیصلہ اس طرح کرو کہ کل صبح کو جو پہلا آدمی مسجد کے دروازہ سے داخل ہو اس سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرالو۔ سب نے یہ رائے مان لی۔

اگلے دن جو شخص سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے جب آپ کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو الامین ہیں۔ ہم ان پر راضی ہیں، یہ تو محمد ہیں (ھٰذا الامین، رضینا، ھٰذا محمد) اس کے بعد لوگوں نے اپنا مسئلہ آپ کے سامنے رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ تم ایک کپڑا لاؤ۔ چنانچہ کپڑا لاکر آپ کو دیا گیا۔ آپ نے کپڑے کو زمین پر پھیلایا اور پھر حجر اسود کو اٹھا کر اس کپڑے پر رکھ دیا۔ آپ نے کہا کہ اب ہر قبیلہ اس کا ایک ایک کونا پکڑ لے پھر سب مل کر ایک ساتھ اس کو اٹھائیں۔

انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب وہ اس کو لے کر اصل مقام پر پہنچے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں وہاں رکھ دیا جہاں اس کو نصب کرنا تھا۔ اس کے بعد کعبہ کی تعمیر مکمل کی گئی۔ اختلاف اور لڑائی کا معاملہ پرامن طور پر حل ہو گیا۔

اس واقعہ سے اتحاد کے دو اصول ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ قائد جو مرکز اتحاد کے طور پر کام کرے، اس کو اخلاقی اعتبار سے لوگوں کا معتمد علیہ ہونا چاہئے۔ لوگ اس کو سچے اور امانت دار کی نگاہ سے دیکھیں۔ لوگ اس کو اپنے سے کچھ اوپر محسوس کریں۔ جب تک ایسا ایک شخص درمیان میں نہ ہو، لوگوں کے درمیان اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ قائد اتحاد دوسروں کا لحاظ کرنے والا ہو۔ ثمرۂ اتحاد میں وہ تمام لوگوں کو حصہ دار بنائے۔ اتحادی عمل میں وہ ہر ایک کو شریک کرے۔ کامیاب قائد دوسروں کے درمیان انھیں کی طرح رہتا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا سلوک کرتا ہے۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ وہ قائد ہو کر بھی اپنے آپ کو دوسروں کے برابر رکھتا ہے۔ یہی سچا قائد ہے۔

جب زوال آتا ہے

قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (الحدید ۱۶)

امت پر جب وہ لمحہ آتا ہے کہ طول امد کے نتیجہ میں اس کے افراد کے اندر قساوت اور بے حسی پیدا ہو جائے، تو اس وقت ایسا نہیں ہوتا کہ دین کا نام و نشان بالکل مٹ گیا ہو۔ اس وقت جو خرابی پیش آتی ہے وہ یہ کہ دین کے ظواہر تو باقی رہیں مگر دین کی روح کا خاتمہ ہو جائے۔

جب یہ حالت آتی ہے تو لوگوں کے درمیان دین کی دھوم خوب دکھائی دیتی ہے، مگر دین کی اندرونی اسپرٹ کہیں موجود نہیں ہوتی۔ پھل کا چھلکا باقی رہتا ہے مگر اس کا مغز باقی نہیں رہتا۔ حدیث میں اس حالت کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ بل انتم کغثاء (بلکہ تم جھاگ کی مانند ہو گے) سیلاب کا جھاگ بظاہر بہت نمایاں ہوتا ہے، مگر اس کے اندر سیلاب والی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو اس کے افراد میں ایمان بس تلفظ کلمہ کی سطح پر رہتا ہے، مگر معرفت کی سطح پر وہ کلمہ کی حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ذکر کی تکرار تو ہوتی ہے مگر خدا کی سچی یاد ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہ قرآن کو تلاوت کی کتاب کی حیثیت سے تو جانتے ہیں مگر وہ اس قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں جو دلوں کو تڑپا دے اور آنکھوں کو اشک بار کر دے۔ وہ انسانوں کی بڑائی میں گم ہوتے ہیں مگر خدا کی بڑائی میں جینا انھیں نصیب نہیں ہوتا۔

وہ اپنے نعروں کے ذریعہ فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں مگر وہ اس تقویٰ سے ناآشنا ہوتے ہیں جو ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ جذباتی تقریریں سن کر مجمع عام میں انھیں روتے دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اس گریہ کو نہیں جانتے جس کے بارہ میں حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ: رجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ (آدمی نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ پڑیں)

ایسے لوگ اسلامی قانون نافذ کرو کے ہنگامے برپا کرتے ہیں مگر ان کا سینہ خضوع اور تواضع کی کیفیت سے خالی ہوتا ہے۔ وہ دعوت کے نام پر سرگرمیاں دکھاتے ہیں مگر انسانوں سے محبت کرنا کیا ہے، اس کو وہ نہیں جانتے۔ وہ قوموں کے خلاف جہاد چھیڑتے ہیں مگر قوموں کے لئے شفقت سے ان کا اندرون بالکل خالی ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر گن کلچر کو فروغ دیتے ہیں، حالاں کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رحمت کلچر کو فروغ دیا جائے۔

ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی کے اوپر تنقید کرتے ہیں تو عیب جوئی اور الزام پر اتر آتے ہیں۔ ان پر کسی کا حق آتا ہو تو وہ حق کی ادائگی کے لئے حساس نہیں ہوتے۔ کسی سے ان کا اختلاف ہو جائے تو فوراً وہ اس کے معاملہ میں بے انصافی پر اتر آتے ہیں۔ وہ اپنے حزب کی حمایت کو جانتے ہیں۔ مگر وہ حق کی حمایت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے کرتے نہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کو بولتے نہیں۔ ان کی غلطی کو خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے مگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بے ضرر دینداری ان کو بہت پسند ہوتی ہے۔ مگر جس دین سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہو اس دین سے انھیں دل چسپی نہیں ہوتی۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو اسلام کا چمپین سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے کام کا کریڈٹ لینے کے لئے بے تاب رہتے ہیں جس کو انھوں نے انجام نہیں دیا۔ اسلام کو داخلی طور پر اپنانے کی انھیں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ مگر خارجی دنیا میں اسلام کا نمائندہ بننا انھیں بہت مرغوب ہوتا ہے۔

القرطبی نے سورہ حدید کی مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ فضیل بن عباس ایک غلط کام کی طرف مائل ہو گئے۔ اس وقت کسی نے یہ آیت پڑھ دی: الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید ۱۶) وہ فوراً اس کام سے رک گئے اور کہا کہ بلی و اللہ قد آن (ہاں اے اللہ، اس کا وقت آگیا) جلد ۱۷، صفحہ ۲۵۱

یہی مومن کا مزاج ہے۔ مومن پر کبھی غفلت طاری ہوتی ہے اور وہ غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا احساس اس قدر زندہ ہوتا ہے کہ جب اس کو توجہ دلائی جاتی ہے تو وہ فوراً پلٹ آتا ہے۔ مومن غلطی سے توبہ کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ غلطی میں پڑا رہنے والا۔

صبر و تحمل

امریکی مثل ہے کہ صبر کی جیت ہوتی ہے (patience conquers) صبر کی فاتحانہ صفت کے بارہ میں یہ ایک عالمی تجربہ ہے جو مختلف الفاظ میں ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل کی ہے، اس نے بلاشبہ صبر و تحمل کے ذریعہ اس کو حاصل کیا ہے۔

دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صبر کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا بے شمار ناموافق اسباب سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں کا ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے ایک رکاوٹ ہے۔ دنیا کی مثال ایک ایسے باغ کی ہے جہاں نہایت خوشنما پھول ہیں۔ مگر ان پھولوں کا راستہ بے شمار کانٹوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ کانٹوں سے نباہ کئے بغیر پھولوں تک پہنچنا ممکن نہیں۔

زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جو ہر آدمی کے لئے صبر و تحمل کو ضروری قرار دیدیتا ہے۔ اس دنیا میں جو آدمی صبر کرنے پر راضی نہ ہو، وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ کیوں کہ اپنی بے صبری کی بنا پر جگہ جگہ وہ انسانوں سے الجھ جائے گا۔ اور پھر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا اس کے لئے ممکن نہ ہو سکے گا۔

کوئی بھی انسان اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف چیزوں کا بالکل خاتمہ کر دے۔ یا اپنے مخالف انسانوں پر بل ڈوزر چلا دے۔ ایسی حالت میں ہر شخص کے لئے کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے —— وہ ناموافق چیزوں پر صبر کرے۔ اور حکمت کا طریقہ اختیار کرکے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

مشکلات کو ہم صبر ہی کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں۔ ناپسندیدہ اشخاص سے ہم درگذر کرکے ہی نپٹ سکتے ہیں۔ مخالفین کی سازشوں کو ہم تحمل کرکے ہی ناکام بنا سکتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے سفر میں رکاوٹ بنیں، ان سے اعراض کرکے ہی ہم اپنا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں صبر ہی کرنا ہے، کیوں کہ اس دنیا کے سوا کوئی اور دنیا بنانے پر ہم قادر نہیں۔

صبر بے عملی یا بزدلی نہیں۔ صبر زندگی کا ایک اعلیٰ اصول ہے۔ وہ آدمی جو پختہ عقل کا مالک ہو وہ صبر کی روش اختیار کرنے والا بھی ضرور ہوگا۔

ایک اسلامی حکم

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ـــــ اور کسی قوم کی دشمنی کہ اس نے تم کو
سجد حرام سے روکا، تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے
ی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب
دینے والا ہے (المائدہ ۲)

سنہ ھ میں مکہ کے مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اس سے روک
یا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوں اور عمرہ کی عبادت ادا کریں۔ اس موقع پر انھوں نے سخت قسم کی اشتعال انگیزی
اظاہرہ کیا اور مسلمانوں کے اوپر زیادتیاں کیں۔ اس بنا پر مسلمانوں میں مشرکین کے خلاف غصہ تھا۔ وہ چاہتے
تھے کہ وہ بھی مشرک قبائل کے قافلوں کو روکیں اور ان کے خلاف انتقامی کارروائی کریں۔

مذکورہ آیت میں انھیں اس سے روک دیا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ دشمنی میں بے قابو نہ ہو اور ہر حال
ں امن اور اعتدال کی روش پر قائم رہو۔

اس ذیل میں مزید یہ حکم دیا گیا کہ "نیکی اور تقویٰ پر آپس میں تعاون کرو، گناہ اور زیادتی پر ایک
وسرے کا تعاون نہ کرو" اس موقع پر اس حکم کا مطلب کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا
بیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اگر کوئی شخص بالفرض جوش انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت
سلام اس کے ظلم و عدوان کی اعانت نہ کرے بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کریں۔ اور اشخاص
زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں (صفحہ ۱۳۷)

کسی گروہ میں ایک ایک آدمی سنجیدہ نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جذباتی ہوتے
ہ اور وہ فریق مخالف کی اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھیں۔ ایسے موقع پر جماعت کے بقیہ، لوگوں کا
ض ہے کہ وہ اپنے جذباتی لوگوں کو روکیں، وہ چپ رہنے کے بجائے بولیں۔ وہ ان کی حمایت کرنے
کے بجائے ان کی مذمت کریں۔ اگر بقیہ لوگ ایسا نہ کریں گے تو قرآن کے الفاظ میں، وہ تعاون علی الاثم
لعدوان کے مجرم قرار پائیں گے۔

وقت کا استعمال

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے (افضل العبادۃ انتظار الفرج) یہ ایک حکیمانہ بات ہے جو خدا کے پیغمبر نے ہمیں بتائی۔ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے الجھے ہوئے معاملات میں اکثر کسی مسئلہ کا سادہ حل یہ ہوتا ہے کہ اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

خدا نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں سارے اسباب ہمیشہ اصلاح اور تعمیر کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ راستہ میں کوئی گندگی ڈال دیں تو فوراً لاکھوں کی تعداد میں بیکٹیریا وہاں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ اس کو تحلیل (decompose) کرکے اس کو مفید گیس میں تبدیل کر سکیں۔ یہی فطرت کے پورے نظام کا حال ہے۔ اس لئے انتظار کی پالیسی اس دنیا میں کوئی بے عملی کی پالیسی نہیں۔ وہ عین عمل کی پالیسی ہے کیوں کہ انسان کا انتظار کرنا گویا فطرت کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ حرکت میں آکر اس کے مسئلہ کو زیادہ بہتر طور پر حل کر دے۔ اسی بات کو شاعر نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک بار میں ایک بڑے شہر میں گیا۔ وہاں میری ملاقات ایک تاجر سے ہوئی۔ وہ سخت پریشان تھے۔ حتی کہ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک تجارتی سامان تیار کیا۔ مگر جب وہ اس کو مارکیٹ میں لائے تو انھیں بروقت خریدار نہ مل سکے۔ ان کا سامان گودام میں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی دعا یا عمل بتائیے جس سے میں اس تجارتی بحران سے نکل سکوں۔

میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک نصیحت لکھی اور اس کاغذ کو ایک لفافہ میں بند کرکے انھیں دے دیا۔ میں نے کہا کہ اس لفافہ کو آپ دس دن کے بعد کھولئے گا۔ اس لفافہ کے اندر جو کاغذ بند تھا اس پر میں نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں ایک مختصر جملہ ان الفاظ میں لکھا تھا: اپنے معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

ڈیڑھ سال کے بعد مذکورہ تاجر کی طرف سے ایک خط میرے پاس آیا۔ اس میں انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ کے مشورہ کے مطابق میں نے انتظار کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ اللہ کے فضل سے میرا سارا مال نفع کے ساتھ فروخت ہو گیا۔ میرا پھنسا ہوا روپیہ خالی ہو گیا ہے اور اب میں ایک نیا کاروبار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ اخلاقی عمل کا عظیم قانون خدا کے بعد یہ ہے کہ وقت کا احترام کیا جائے :

The great rule of moral conduct is, next to God, to respect time

خدا کا حق انسان پر یہ ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرے۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ وہ انسان کا خالق اور مالک ہے۔ وہی سب کچھ دینے والا ہے۔ اس لئے وہی اس کا حقدار ہے کہ سب سے زیادہ اس کی تعظیم کی جائے۔ اسی کا نام پرستش یا عبادت ہے۔

وقت موجودہ دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں سب کا سب وقت کے دائرہ میں کرتے ہیں۔ جہاں وقت ختم ہو جائے وہاں انسان کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اس لئے انسان کو سب سے زیادہ وقت کا پاس و لحاظ کرنا چاہئے۔ وقت کو ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس جو سب سے بڑی دولت تھی اس کو اس نے ضائع کر دیا۔ وقت کو اگر آپ استعمال نہ کریں تو وہ آپ کے پاس ٹھہرا نہیں رہے گا بلکہ چلا جائے گا۔ اور پھر کبھی لوٹ کر آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ وقت کا جو لمحہ کھویا گیا وہ ابدی طور پر کھو گیا۔ اسی کو شاعر نے سادہ طور پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

شیکسپیر جو مشہور انگریزی ادیب اور شاعر ہے، اس کا ایک قول یہ ہے کہ — میں نے وقت کو برباد کیا تھا اب وقت مجھ کو برباد کر رہا ہے :

I wasted time and now doth time waste me.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو وقت مجھے ملا تھا وہ میرے لئے عمل کا یا ترقی کی طرف بڑھنے کا ایک لمحہ تھا۔ جب میں نے اس ملے ہوئے وقت کو استعمال نہیں کیا تو اس کے بعد یہ ہوا کہ میں ترقی کی طرف اپنا

سفر بھی جاری نہ کرسکا جس کا نتیجہ ابدی محرومی تھا۔ اس طرح اب میں محرومی کی صورت میں اپنے ضیاع وقت کی قیمت ادا کر رہا ہوں۔

گول برن (Goulburn) کا ایک قول اس قابل ہے کہ ہر آدمی اس کو یاد کرلے۔ وہ اس کو اس طرح محفوظ کرلے کہ وہ ہمیشہ اس کے دماغ میں مستحضر رہے۔ وہ قول یہ ہے کہ زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جس کے ضائع کرنے کا ہم تحمل کر سکیں :

There is not a single moment in life that we can afford to lose

وقت کو کھونا عمل کے مواقع کو کھونا ہے۔ جس نے عمل کے مواقع کو کھو دیا اس نے گویا کہ اپنا سب کچھ کھو دیا۔ وقت کو کھونے کے بعد کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی جس کو پانے کے لئے کوئی شخص جدوجہد کرے۔

وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے زندگی میں انضباط (ڈسپلن) پیدا کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کی چند ضروری تدبیریں یہ ہیں۔

۱. صبح کو سویرے اٹھنا۔ رات آرام کرنے کے لیے ہے اور دن کام کرنے کے لئے۔ آدمی جتنا زیادہ سویرے اٹھے گا اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دن کو مفید طور پر استعمال کرسکے گا۔ اگر آپ اپنے ملے ہوئے وقت کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو صبح کو سویرے اٹھنے کی عادت ڈالئے۔

۲. اپنا احتساب کرنا۔ شام کو جب آپ سونے کے لئے بستر پر لیٹتے ہیں تو یہ سوچئے کہ آج کا دن آپ نے کیسا گزارا۔ آپ نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کون سا کام آپ کا صحیح تھا اور کون سا کام غلط۔ اپنے آج کے دن کو آپ اور زیادہ بہتر کس طرح بنا سکتے تھے۔ حال کا یہ احتساب آپ کے مستقبل کو زیادہ بہتر بنانے میں مدد کرے گا۔

۳. ڈائری کا استعمال۔ ہمیشہ اپنے پاس ایک پاکٹ ڈائری رکھئے۔ اس میں ہر روز کے مشاہدات اور تجربات کو مختصر طور پر لکھتے رہئے۔ یہ ڈائری آپ کے لئے نہ صرف ایک یادداشت ہوگی بلکہ وہ آپ کے لئے ایک ریگولیٹر بھی بن جائے گی۔ وہ آپ کی زندگی کی بہترین گائڈ ثابت ہوگی۔

نوٹ : آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو نشر کیا گیا۔

حبِ شدید

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جائز حدود میں آدمی کسی بھی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ مگر
ٖب شدید صرف ایک اللہ سے ہونا چاہیے۔ صرف اللہ کو یہ حق ہے کہ انسان اپنے جذباتِ محبت کو
ب سے زیادہ اس سے وابستہ کرے، اس کی قلبی شیفتگی کا سب سے بڑا مرجع خداوند ذوالجلال
۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

ِن النّاس مَن یّتخذ من دُونِ اللّٰه ۔۔۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں
دادًا یُحِبّونهم کحُبّ اللّٰه والذین آمنوا ۔۔۔ کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت
د حبًّا لِلّٰه (البقرہ ۱۶۵) ۔۔۔ رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہیے۔

غیر اللہ کے ساتھ حب شدید کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً پتھر کے بتوں کے ساتھ بڑھا ہوا قلبی
اؤ۔ اپنے اکابر سے بہت زیادہ عقیدت، قوم کے ساتھ غیر معمولی محبت، وغیرہ۔ آدمی کو جس چیز سے
ب شدید ہو اسی کی یاد میں وہ جینے لگتا ہے، اسی کا تذکرہ اس کے لیے سب سے زیادہ محبوب بن
تا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری چیزیں رسمی تعلق کے خانہ میں چلی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ان کے اندر اللہ کے لیے حب
شدید نہیں۔ ذاتی مفاد، سیاسی اقتدار، قومی عزت، تاریخی عظمت، اس قسم کی چیزیں ان کے
لیے حب شدید کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ خدا ان کے حب شدید کا موضوع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
ٖلورہ قسم کی چیزوں پر ان کے درمیان بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر محبت خداوندی کی بنیاد پر کوئی
ریک ان کے درمیان نہیں اٹھی۔

موجودہ زمانہ میں جو علوم انسانی ظاہر ہوئے ان میں خدا کے وجود کو یکسر حذف کر دیا گیا مگر مسلم دنیا میں
ئی بھی شخص نظر نہیں آتا جو اس پر تڑپے اور علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کرکے خدا کے وجود کو علمی
ثیت سے ثابت شدہ بنانے کے لیے محنت کرے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اقوام عالم کے اوپر
ا کے دین کی شہادت دی جائے، مگر ساری مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں جو اس کے لیے
بے چین ہو اور عمل شہادت کو جاری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

یکم اکتوبر کو پہلی بار برطانی اخبارات میں انڈیا کے بارہ میں نمایاں خبر پڑھی۔ یہ بھونچال کی خبر تھی۔ مہاراشٹر کے اضلاع لاتور اور عثمان آباد میں شدید بھونچال کے نتیجہ میں ۲۰ دیہات میں زبردست تباہی آئی۔ چھ دیہات کا وجود مٹ گیا۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

زلزلہ کا سبب زمین کی قدرتی بناوٹ ہے۔ زمین اوپر سے بظاہر ٹھوس دکھائی دیتی ہے مگر اس کے نیچے بہت بڑی مقدار میں پگھلا ہوا مادہ ہے۔ زمین کی پرت پلیٹوں کی مانند اندر کی نرم تہ پر پھسلتی رہتی ہے۔ جب یہ پلیٹیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں تو زمین میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اس وقت زمین کی تہوں کے سرکنے سے زلزلہ آتا ہے۔

زلزلہ کی تباہی سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ جو کچھ ممکن ہے وہ صرف یہ کہ مکانات کی تعمیر اس طرح لچکدار انداز میں کی جائے جو زلزلہ کے جھٹکے کو سہار سکے۔ اور ہل کر اپنی جگہ کھڑی رہے جس طرح آندھی کے مقابلہ میں گھاس کرتی ہے۔ کیلی فورنیا (امریکہ) میں زلزلے عام ہیں۔ مگر اسی طرز تعمیر کی بنا پر آجکل وہاں جانی نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ زلزلوں کا شکار اب زیادہ تر وہ قومیں ہوتی ہیں جہاں منصوبہ بند تعمیر کا فقدان ہے۔

محمود صاحب ایک پاکستانی میکانیکل انجنیر ہیں۔ وہ ٹریننگ کے تحت تین سال کے لئے اوساکا (جاپان) میں رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک کارخانہ میں وہ تربیت کے لئے جاتے تھے۔ وہاں وہ دیکھتے تھے کہ روزانہ ایک بوڑھا آدمی آتا ہے۔ وہ خالی بیگ سمیٹ کر جمع کرتا ہے اور ان کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی لوور گریڈ کا ملازم ہے جو اسی کام کے لئے مقرر ہے۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھیں کسی ضرورت سے کارخانہ کے چیف انجنیر کے یہاں جانا پڑا۔ انھوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی چیف انجنیر کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے جس کو وہ کارخانہ میں صفائی کرتے دیکھا کرتے تھے۔ محمود صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں جب آفس آتا ہوں تو لوگوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میرے پاس وقت رہتا ہے۔ اس وقت کارخانہ چلا جاتا ہوں اور وہاں لوگوں کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ اس کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ مجھے ہر چیز کی فرسٹ ہینڈ معلومات ہو جاتی ہے جو بحیثیت چیف انجنیر مجھے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کام آتی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار کارخانہ کے ورکروں نے ہڑتال کر دی۔ چھ گھنٹہ تک جاری رہنے کے بعد ہڑتال ختم ہوگئی۔ اگلے دن وہ کارخانہ آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لنچ کے وقت ورکروں نے چھٹی نہیں کی۔ وہ لگاتار کام کرتے چلے جارہے ہیں۔ انھوں نے ایک ورکر سے پوچھا کہ آج تم لوگوں نے لنچ کا وقفہ کیوں نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ کل کی ہڑتال کی کمی پوری کرنے کے لئے۔ محمود صاحب نے کہا کہ اس ہڑتال میں تو مینجمنٹ کی غلطی تھی۔ ورکر نے کہا کہ غلطی جس کی بھی ہو جب کام کم ہوگا تو نیشنل آوٹ پٹ کم ہوگا۔ اور پھر پوری قوم کو اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔

یکم اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کی مسلم خواتین کا اجتماع تھا۔ اس اجتماع کا انتظام جناب شمشاد خاں صاحب کے مکان پر کیا گیا تھا۔ خواتین مکان کے ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوگئیں۔ ایک اور کمرہ میں مائک کا انتظام تھا۔ یہاں سے میں نے مائک پر اپنی تقریر کی۔ کچھ اعلی تعلیم یافتہ مرد بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے عورت کا درجہ گھٹایا ہے۔ مگر یہ ایک لغوبات ہے۔ میں نے کہا کہ ایک چیز ہے عورت کا احترام اور اس کے حقوق۔ دوسری چیز ہے ورک پلیس کا مسئلہ۔ اسلام میں عورت اتنی ہی محترم اور معزز ہے جتنا کہ مرد۔ البتہ ورک پلیس کے معاملہ میں دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ دونوں کا حیاتیاتی فرق ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مغرب میں کہا جاتا ہے کہ (Ladies first) مگر اس اصول کو اسلام میں زیادہ بڑے پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلمان جو حج کے لئے مکہ جاتے ہیں وہاں وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ یہ ایک خاتون کے نقش قدم کی پیروی ہے جن کا نام ہاجرہ تھا۔

حضرت ہاجرہ کو یہ عظیم مرتبہ کیوں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک نئی نسل بنانے کے لئے قربانی دی تھی۔ وہ اس مقولہ کی بہترین مثال تھیں کہ:

There is a woman at the beginning of all great things

میں نے کہا کہ آج مسلم خواتین کو حضرت ہاجرہ کے اسی رول کو دہرانا ہے۔ انھیں دوبارہ اپنے بچوں کو تربیت دے کر ایک نئی نسل تیار کرنی ہے جو دور جدید میں اسلام کی عظمت قائم کرسکے۔

۲ اکتوبر کی دوپہر کو یہاں احمد دیدات صاحب کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا۔ اس سے پہلے عرب امارات میں ایک بار ان کی تقریر سن چکا ہوں۔ آج جو کیسٹ دیکھا وہ لندن کے ابرٹ ہال کی تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا:

How Rushdie fooled the West.

اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات میں صرف اسلام کے ساتھ بے ہودگی نہیں کی ہے بلکہ خود مغرب کے ساتھ بھی بے ہودگی کی ہے جس نے اس کو انعام دیا اور جو اس کو پناہ دئے ہوئے ہیں۔ دیدات صاحب نے کہا کہ آپ خود کیوں اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ آپ تو مغرب کو رشدی کے سیاہ کارنامے بتائیے اور پھر ان کو اس سے نمٹنے دیجئے:

and let them do the job

مجھے یہ بات پسند آئی۔ ایک ایسا مسئلہ جو دوسروں کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حل کیا جا سکتا ہو اس کو اپنے ہاتھ میں لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس قسم کا غیر ضروری فعل وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوچے بغیر کوئی کام کریں۔ جن کے اعمال کا سرچشمہ ان کے جذبات ہوں نہ کہ ان کی عقل۔

عبد اللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جو سعودی عرب کی طرف سے بہت بڑی تعداد میں چھاپ کر پھیلایا گیا ہے۔ اس میں بہت سے اجزا، حذف کر دئے گئے ہیں۔ برمنگھم میں مجھ کو ابتدائی نسخہ ملا۔ اس کو میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ مجھے اس کے تفسیری حواشی بہت پسند ہیں۔

اس میں عبد اللہ یوسف علی کا ابتدائی دیباچہ (preface) شامل ہے۔ اس پر ۴ اپریل ۱۹۳۴ کی تاریخ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ اور تفسیر ان کے چالیس سالہ مطالعہ اور تفکیر کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے نہایت سخت حالات میں اس کو لندن میں مکمل کیا اور آنسوؤں کے ساتھ اس کو لکھا۔ چنانچہ دیباچہ میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کے مسودات آنسوؤں سے سینچے گئے:

...watered by tears.

اس دیباچہ میں انھوں نے قرآن کی بابت کئی باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن ہماری روحانی آنکھوں کو کھولتا ہے:

The Qur'an opens our spiritual eyes.

یہ قرآن کی نہایت عمدہ تشریح ہے۔ قرآن کا اصل مقصد انسان کی روحانی بصیرت کو زندہ کرنا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے جس کی روحانی بصیرت زندہ ہو جائے، وہی دراصل قرآن کا قاری ہے۔

۲ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کے مسلم کیمونٹی سنٹر اور جمعیۃ اہل حدیث مرکز (Green Lane) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ میں نے کہا کہ سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ میں انگریزوں سے لڑ کر شہید ہو گئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اس دو سو سالہ جنگ نے مسلمانوں کو تباہی کے سوا کچھ اور نہیں دیا۔

مسلمان آخر اس بے فائدہ لڑائی میں کیوں مشغول ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے رہنماؤں کی ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لئے دو ہی ممکن صورت ہے۔ سلطان ٹیپو کے الفاظ میں، یا تو شیر کی طرح لڑ کر مر جانا یا گیدڑ بن کر رہنا۔ دوسرے لفظوں میں جنگ یا بزدلی۔ چوں کہ بزدل بن کر رہنا انھیں پسند نہیں، اس لئے وہ بہادری کی موت مر رہے ہیں۔

مسلم رہنماؤں کو معلوم نہیں کہ یہاں ایک تیسرا انتخاب بھی ہے۔ اور وہ ہے ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے تیاری کرنا۔ مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے امکانات کو استعمال کرنا۔ یہ گویا "تھرڈ آپشن ہے" اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتاتی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آپ نے ہمیشہ اسی تھرڈ آپشن کو اختیار کیا ہے۔

تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ کا طریقہ جنگ کا طریقہ نہیں تھا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بار بار لڑوں اور بار بار شہید کیا جاؤں۔ میں نے کہا کہ مطالعہ کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ کو بار بار شہید ہونے کا موقع ملا۔ پھر کیوں آپ نے اس سے اعراض کیا۔ ابتدائی دور میں آپ مکہ

میں نماز باجماعت قائم کرتے تو وہ لوگ آپ کے قتل کے درپے ہوجاتے۔ کمزور مسلمانوں کو ستایا جارہا تھا۔ اگر آپ اس میں عملی مداخلت کرتے تو وہ آپ کے ساتھ وہی کرتے جو انھوں نے آل یاسر کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ہجرت، حدیبیہ، خندق، وغیرہ میں لڑکر شہید ہونے کے مواقع آئے، مگر کبھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جب تک دونوں پہلوؤں کو نہ دیکھا جائے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

مدرسہ قاسم العلوم (Washwood Heath Road) کی دعوت پر ۳ اکتوبر کی صبح کو وہاں جانا ہوا۔ وہاں اہل علم کی ایک مجلس کی صورت میں بات چیت ہوئی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک کام کا تعلق ہے وہ تو عملاً جاری ہے۔ ہمارے یہاں ادارے قائم ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی جماعتیں سرگرم ہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں ہیں جو اسلامی سنٹر کے طور پر چل رہی ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں کا بہت کم فائدہ ہم کو مل رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری عمل تو بہت ہے مگر اسپرٹ موجود نہیں۔ مثال کے طور پر لوگوں میں جلن کا جذبہ بہت بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر ایک کو اپنا کام زیادہ نظر آتا ہے اور دوسرے کا کام کم۔ اس مزاج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر لوگوں کے اندر جلن کے بجائے خیرخواہی بے اعترافی کے بجائے اعتراف کا مزاج پیدا ہوجائے تو موجودہ سرگرمیوں سے ہم کو چوگنا فائدہ ملنے لگے گا۔

الہجرہ اسکول (Hob Moor Road) میں ۳ اکتوبر کی سہ پہر کو خطاب کا پروگرام تھا۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں آگئے تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری قومیں اسلام کے خلاف سازشیں کررہی ہیں۔ مگر میرے نزدیک اسلام کا زیادہ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ اسلامی جدوجہد میں شریک نہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں اور اسلامی مرکز ہیں۔ مگر ان مسجدوں اور اسلامی اداروں سے زیادہ تر غیر ذہین طبقہ وابستہ ہے۔ ذہین طبقہ اس سے دور ہے۔

میں نے کہا کہ چند سال پہلے میں بار بیڈوز گیا۔ وہاں میری ایک تقریر تھی۔ ایک آدمی اپنے پندرہ سال کے لڑکے کو پکڑ دھکڑ کر لے آیا۔ وہ آیا تو حاضرین کے ساتھ نہیں بیٹھا بلکہ کنارے اپنا رخ الٹی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے پوچھا کہ تم اس طرح الگ تھلگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ می ناٹ (me not) یہی اس طبقہ کے بیشتر لوگوں کا حال ہے۔ وہ می ناٹ کلاس بنے ہوئے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو اب تک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے قابل فہم (understandable) نہ بنا سکے۔ روایتی انداز کی تقریریں اور مضامین اس طبقہ کو اسلام کی طرف نہیں لا سکتے۔ آج اسلام کی ری ڈسکوری کی ضرورت ہے۔ اسلام قدیم ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور آج کے ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر آج ایسے داعیوں کی ضرورت ہے جنھوں نے اسلام کو ری ڈسکور کیا ہو۔ اس سلسلہ میں میں نے کئی مثالیں دے کر اس معاملہ کو واضح کیا۔

برطانیہ میں جو مسلمان آباد ہیں ان میں شاید ہی آپ کو کوئی ایسا آدمی ملے جو سکون کی نیند سوتا ہو اور جس کو مسرت کی زندگی حاصل ہو۔ یہاں کی پوری زندگی سودی قرضوں پر قائم ہے۔ گھر، کار اور تمام قیمتی چیزیں قرضوں سے حاصل کی جاتی ہیں اور ساری زندگی آدمی کما کما کر ان کا قرض مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ دوسری طرف گورنمنٹ ٹیکسوں میں عام آدمی کی کمائی کا ۳۰ فیصد اور زیادہ کمائی والوں کا ۶۰ فیصد وصول کر لیتی ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی طرح یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ رشوت یا غلط حساب کے ذریعہ آدمی ٹیکس سے بچ جائے۔ یہاں کا نظام ایسا ہے کہ ہر آدمی کو بہر حال ٹیکس کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح تمام لوگ ایک قسم کے اقتصادی ٹریپ (trap) میں پھنس کر زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا بہت بڑا مسئلہ اولاد کا ہے۔ یہاں کی سوسائٹی کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی ہے۔ مطلق آزادی کو یہاں سب سے بڑی انسانی قدر سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی، اسکول اور پورے سماج سے وہ آزادی کا سبق حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ماں باپ کے لئے آزاد مخلوق بن جاتا ہے۔ ماں باپ اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہیں تو وہ فوراً جواب دے گا کہ تم اپنا کام کرو، تم

سے اس کا کوئی تعلق نہیں :

Mind your own business.
Its nothing to do with you.

ماں باپ اس طرح کے جواب سنتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ بچہ کے ساتھ سختی کریں تو بچہ کے ایک ٹیلیفون پر پولیس آئے گی اور ماں باپ کو پکڑ لے جائے گی۔

۱۹ اگست کی صبح کو ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے نکلے۔ سڑک پر آئے تو پہلا منظر یہ دکھائی دیا کہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ایک بھیڑیا نما کتے کو اپنے ساتھ لئے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں کتا زندگی کا جزر بن گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ آدمی جس طرح ایک بھیڑیا نما کتے کو لے کر بے خوف چلا جا رہا ہے۔ کیا اسی طرح وہ کسی بھیڑیے کو لے کر بھی چل سکتا ہے۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ اس کی وجہ دونوں کی فطرت کا فرق ہے۔ کتے کو خدا نے اپنے مالک کے لئے وفادار بنایا ہے جب کہ بھیڑیا صرف ایک خوں خوار جانور ہے۔ وہ ایک عام انسان کے لئے خونخوار ہے اور مالک کے لئے بھی غیر وفادار۔

اس دنیا میں بھیڑیا بھی ایک قابل پیشین گوئی کردار کا حامل ہے اور کتا بھی قابل پیشین گوئی کردار کا حامل۔

المرکز الاسلامی کے نام سے یہاں ایک سنٹر ہے جس کو عربوں نے قائم کیا ہے۔ ۱۹ اگست کو اسے دیکھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ ۱۹ اگست کو یہاں دو رکعت نماز ادا کی اور حسب توفیق دعائیں کیں۔ یہ مسجد ایک ہشت پہل ہال میں بنائی گئی ہے۔ جمعہ کے منبر کی جگہ لکڑی کی ایک چھوٹی سی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ پوری مسجد میں قالین کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس مسجد کا نام مسجد الرحمٰن ہے۔ پورے اٹلی میں غالباً صرف دو مسجد ہے۔ ایک میلان کی موجودہ مسجد اور دوسرے روم کی مسجد جو حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ اٹلی میں یہ سارا کام عربوں کے تعاون سے ہو رہا ہے۔

اس مسجد سے متصل ایک مرکز ہے۔ یہاں مسلم مرد اور مسلم عورتیں کثرت سے موجود تھیں معلوم ہوا کہ آج اطالوی مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ اس قسم کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ مرکز کے ڈاکٹر السید عبد الفتاح

و جانتے تھے اور میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ وہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ انھوں
د وپہر کے اجتماعی کھانے میں شریک کیا۔ اور اصرار کیا کہ اجتماع سے خطاب کروں۔ وقت
ت کم تھا کیوں کہ مجھ کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بیٹھنا تھا۔ میں نے اسی وقت بیٹھ کر
فل اسکیپ کاغذ پر ایک عربی تقریر لکھی اس کے بعد اسٹیج پر آیا۔ ابتداءً کچھ کلمات انگریزی
کہے اس کے بعد عربی میں لکھی ہوئی تقریر پیش کی۔ ایک عرب عالم نے فوری طور پر اس کا
لوی زبان میں ترجمہ کیا۔

ایک ایشیائی نے اہل مغرب کے تعصب کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کا میڈیا
ٹرن فریم ورک کے سوا کسی اور ڈھنگ پر کسی بات کو بتانا جانتا ہی نہیں :

There is a lot of reluctance in the media to explain anything outside the western framework.

نے کہا کہ ایشیائی ملکوں میں کونسا ملک ہے جہاں یہ مزاج موجود نہیں ہے۔ ہندستان
لے ہندستانی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو بیان کرتے ہیں۔ پاکستان والے پاکستانی نقطۂ نظر سے
عاملے کی تشریح کرتے ہیں۔ یہی تمام قوموں کا حال ہے۔ پھر اس کے لئے آپ اہل مغرب کی
ایت کیوں کر رہے ہیں۔

میرے ٹکٹ کا جو ریزرویشن تھا، اس میں اٹلی، انگلینڈ اور مالٹا شامل تھے۔ مگر
یان سفر میں بعض وجوہ سے میلان میں مالٹا کو حذف کرکے مجھ کو نیا ٹکٹ بنوانا پڑا۔ اس
سفر مزید جاری نہ رہ سکا۔

" مالٹا " کا لفظ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک تاریخی علامت کی حیثیت
تا ہے۔ ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی باقاعدہ جدوجہد کو اگر سلطان
سے مانا جائے تو وہ ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جبکہ سلطان انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے
ے گئے۔ اس کے بعد مسلسل یہ جنگ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں جاری رہی۔ مولانا محمود حسن
بندی اس ناکام شمشیری جنگ کی آخری کڑی تھے۔ اسی کے جرم میں ان کو تقریباً ساڑھے تین
ل تک مالٹا کے قلعہ میں قید کی زندگی گذارنا پڑا۔

مالٹا سے رہا ہوکر وہ ۸ جون ۱۹۲۰ کو دوبارہ بمبئی کے ساحل پر اترے۔ اس وقت مہاتما گاندھی ہندستان کی سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے جدوجہد آزادی کے طریق کار میں انقلابی تبدیلی پیدا کرکے اس کو تشدد کے بجائے عدم تشدد کے اصول پر قائم کر دیا تھا۔

اس وقت کے مسلم رہناؤں نے اس تبدیلی کو قبول کرلیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے تمام لوگوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت کو تسلیم کرلیا۔ اس طرح سوا سو سال کی ناکام قربانیوں کے بعد آزادی کی تحریک پر تشدد اصول کو ترک کرکے عدم تشدد کے اصول پر چلنے لگی اور آخر کار ۱۹۴۷ میں کامیابی کے مرحلہ تک پہنچی۔

اسی قسم کا معاملہ آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں وہ اکثریتی فرقہ کے تعصب اور زیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ مسلم لیڈروں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں ایک جوابی تحریک شروع کر دی۔ یہ مطالبہ، احتجاج، عوامی مظاہرہ کے اصول پر چلائی گئی۔ یہ پرشور جنگ پچاس سالہ قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہوگئی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے نقصان میں اضافہ تو ہوا مگر اس سے مسلمانوں کو کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

اب دوبارہ مسلم سیاست میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اپنی جدوجہد کو اصولِ احتجاج کے بجائے اصولِ تعمیر پر قائم کریں۔ اب وہ خارجی مطالبہ کے بجائے داخلی تعمیر پر محنت کریں۔ وہ مبنی بر غیر سیاست کو چھوڑ کر مبنی بر خویش سیاست کو اختیار کرلیں۔ لیبیا کے ایک صاحب کو میں نے گرہی لال جین کا یہ اقتباس دکھایا :

اب ہمارے لئے کیا راستہ ہے۔ کیا ہم اپنی پرانی دنیا کی طرف واپس چلے جائیں، مانوس فراریت کی دنیا کی طرف یا ہم کٹرپن سے ٹکراؤ کی طرف بڑھیں۔ یہ پہلا انتخاب نہیں جس کی ایک شخص تمنا کرسکتا ہے۔ اور تیسرا انتخاب افق پر موجود نہیں۔ الّا یہ کہ مایوسی کے عالم میں ہم یہ خیال کریں کہ آئندہ کبھی قذافی کی ہوا نکل جائے اور لیبیا دنیا میں ایک نئے آغاز کا نقیب بن جائے :

روم میں میں نے ایک پادری سے یہ بات کہی۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں، مگر پوپ نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر شادی شدہ رہ کر ایک پادری زیادہ اچھی طرح اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ پادری کی ذمہ داری مجرد رہ کر زیادہ بہتر طور پر ادا کی جاسکتی ہے:

But Pope has also added that being single is more suited to carrying out a priest's duties. The needs of the Priesthood are better served by celibacy.

اس سفر میں کئی ایسے تجربے ہوئے جن کے درمیان محسوس ہوا کہ یورپ میں عربوں کے ساتھ آج وی آئی پی جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ میں ترکی وغیرہ کا سفر کیا۔ اس سفر کی مفصل روداد "سفرنامہ روم ومصر وشام" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ بحری سفر کے ذریعہ وہ ۲۳ مئی ۱۸۹۲ کو قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں تین مہینہ قیام کیا۔ ایک روز قسطنطنیہ کے مکتب حربیہ کے سکریٹری ذکی پاشا سے ملنے گئے۔ موصوف پہلے سے مولانا شبلی سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ بوقت ملاقات ایک عجیب واقعہ گزرا جو مولانا شبلی کے الفاظ میں یہ تھا:

اتفاق سے ذکی پاشا باہر جاچکے تھے۔ آدمی نے کہا کہ ذرا ٹھیر جائیے، شاید جلد آجائیں۔ اسی اثنا میں وہ آپہنچے۔ گاڑی سے اترنے کے ساتھ انھوں نے ہماری طرف رخ کیا۔ شیخ علی طلیان اور میں دونوں عربی لباس میں تھے۔ اگرچہ میرے سر پر ریشمی عمامہ اور کمر میں سنہری پیٹی تھی لیکن قفطان اور عبا کی وجہ سے مجموعی صورت سے میں عرب معلوم ہوتا تھا۔ ذکی پاشا کو اس وقت نہایت جلدی تھی۔ سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ترکی سکہ) نکالیں۔ پہلے تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ پھر خیال آیا کہ نعوذ باللہ، انھوں نے ہم کو عام عربوں کی طرح گداگر سمجھا۔ اس خیال کے ساتھ مجھ کو نہایت رنج اور رنج کے ساتھ غصہ آیا۔ میں نے چلا کر کہا: ما جئنا لھٰذا، لسنا من الفقراء (ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں) پاشا موصوف اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چہرے کی ہیئت اور لہجۂ کلام سے سمجھے کہ یہ امر اس کو ناگوار گزرا۔ شیخ علی طلیان کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ غیظ میں کیوں ہیں۔ شیخ علی طلیان ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتے تھے۔ میرے آنے کی غرض بیان کی۔ پاشا موصوف نہایت شرمندہ ہوئے۔" (صفحہ ۴۴-۴۵)

Where then do we go from here? Back into our old, familiar escapism, or forward into confrontation with obscurantism. It is not a choice I for one would wish to make. And a third option is not on the horizon unless in our desperation we regard the deflation of Col Gaddafy in far away Libya as a harbinger of a new beginning in the world.
Girilal Jain, *The Times of India,* May 7, 1992, p. 8.

ایک مجلس میں میں نے یہ حدیث سنائی کہ من صمت نجا (جو آدمی چپ رہا اس نے نجات پائی) لوگ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کسی کا قول ہے کہ جب میں چپ ہوتا ہوں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں اور جب میں بولتا ہوں تو میں نہیں سوچتا:

While I am quiet I think,
while I talk, I do not.

سوچنا گویا بولنے کی تمہید ہے۔ سوچنا گویا بولنے کی تیاری ہے۔ اگر آپ نے سوچنے کا مرحلہ طے کیا ہے تو آپ نے اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کی ہے کہ آپ بولیں۔ سوچنا آپ کو بتاتا ہے کہ آپ کیا بولیں اور کس طرح بولیں۔ اگر آپ نہ سوچیں تو آپ یہ بھی نہیں جانیں گے کہ مسئلہ کیا ہے۔ اور جو آدمی مسئلہ کی حقیقت ہی سے واقف نہ ہو وہ بولنے کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے۔

بولنا آسان ہے مگر سوچنا بے حد مشکل ہے۔ بولنا جلد بازی کا عمل ہے اور سوچنا صبر کا عمل۔ ایک غیر سنجیدہ آدمی بھی بولنے کا کام کر سکتا ہے۔ مگر سوچنے کا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو سنجیدہ ہوں۔

رومن کیتھولک چرچ میں اب تک یہ قاعدہ تھا کہ پادری کے لئے مجرد رہنا ضروری تھا۔ مگر ایسے اسکینڈل کی تعداد بڑھنے لگی جب کہ پادریوں نے عورتوں سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ چرچ کے ذمہ دار اس کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۹۲ میں ویٹکن کے پوپ جان پال دوم نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں پادریوں کو نکاح کی اجازت دیدی گئی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال پہلے عربوں کی عام تصویر کیا تھی۔ غالباً ۱۹۴۱ کی بات ہے، اعظم گڈھ میں خود میرے یہاں اسی قسم کے ایک "عرب مسافر" آئے تھے اور ان کو میں نے ایک رات اور ایک دن اپنے مکان پر ٹھہرایا تھا۔ اور ان کی خدمت کی تھی۔ صبح کو جب میں ان کے کمرہ میں گیا اور پوچھا کہ رات کیسی گزری تو انھوں نے کہا: ماکان النوم معنا باللیل۔ معلوم ہوا کہ مچھر کی وجہ سے وہ رات کو ٹھیک سے نہ سو سکے۔

مگر آج عربوں کی تصویر اس سے سراسر مختلف ہے۔ "عرب شیخ" کا لفظ اب دولت کا نشان بن چکا ہے اور اسی کے ساتھ عزت و احترام کا بھی۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو واپسی ہوئی۔ صبح کو فجر سے کچھ پہلے برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ ہم کو لندن سے دہلی کے لئے جہاز لینا تھا۔ برمنگھم سے جناب شمشاد خاں صاحب کے ساتھ بذریعہ روڈ سفر کیا۔ راستہ میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا آگے فلاں سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تاحد نظر کاریں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ شمشاد خاں صاحب نے فوراً اپنی گاڑی موڑی اور نئے راستہ پر سفر کرتے ہوئے ایرپورٹ پہنچے

لندن ایرپورٹ پر جناب شمشاد خاں صاحب سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایرانڈیا کی فلائٹ ۳ گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہم کو ایرپورٹ پر مزید انتظار کرنا ہوگا۔ پھر مجھے ترکی کے صدر کا قصہ یاد آیا۔ وہ امپورٹڈ کار میں بیٹھ کر گھر سے دفتر کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ کار میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی تو ہم نے باہر سے خرید کر حاصل کر لی مگر پٹرول ڈالنا ہمارا کام تھا اور یہاں ہم فیل ہو گئے۔ یہی حال ایرانڈیا کا ہے۔ جہاز تو ہم نے باہر سے خرید کر منگا لئے۔ مگر اس کو صحیح طور پر چلانے کے لئے ہمیں اپنا حصہ ادا کرنا تھا۔ یہاں ہم فیل ہو گئے۔

لندن ایرپورٹ کی انتظار گاہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دیوار پر لگے ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ برٹش ایرویز کے چیف ایگزیکیٹو سر جان ایگن کی دستخط سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے

اپنے ایرپورٹ کی سروس پر ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک آپ مطمئن نہ ہوں:

"We won't be satisfied with the service at our airports until you are."

Sir John Egan
Chief Executive
BAA plc.

بہتر کارکردگی کا یہی واحد معیار ہے۔

لندن سے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۱۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ جہاز پورے پانچ گھنٹہ لیٹ تھا۔ لندن سے دہلی کی دوری ۶۷۵۳ کیلو میٹر ہے۔ یہ بڑا جہاز تھا۔ مگر اس کی تقریباً آدھی سیٹیں خالی تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایئر انڈیا کی سروس بہت بدنام ہوگئی ہے۔ اس کا ایک تجربہ مجھ کو آج کے سفر میں ہوا۔ لندن کے مقرر وقت سے یہ جہاز پانچ گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا۔

جہاز جب فضا میں بلند ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میں دہلی۔لندن۔دہلی کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنی آخری منزل کی طرف جا رہا ہوں۔

پرواز کے دوران ایک مسافر کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جہاز کے عملہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافروں میں اگر کوئی ڈاکٹر ہو تو وہ فوری مقام پر آجائیں۔ ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً تین آدمی اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہاں پہنچ گئے۔

۵ اکتوبر کو صبح چار بجے ہمارا جہاز دہلی ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کیوں کہ یہ میرے لئے غیر معمولی طور پر لمبا سفر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ اپنی دنیا میں دوبارہ واپسی ایک موہوم سی چیز نظر آتی تھی۔

لندن کے مضافات سے تعلق رکھنے والی زیادہ عمر کی ایک برٹش خاتون جلین رائٹ (Ms Gillian Wright) نے بتایا کہ پچاس سال پہلے برٹش سوسائٹی آج سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ اس وقت ہم اپنے گھروں میں تالا نہیں لگاتے تھے۔ سماجی تشدد کا نام ونشان نہیں تھا۔ جوان لڑکیاں رات کو اِدھر سے اُدھر جاتی تھیں مگر انھیں اس کا ڈر نہیں ہوتا تھا کہ کوئی انھیں چھیڑے گا۔ آج یہ سب ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ آج ہی رات کو کچھ لڑکوں نے میرے گھر پر پتھر پھینکے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے یہ

تبدیلی ہماری سوسائٹی میں آئی ہے۔

قدیم زمانہ میں جنگ شہروں سے باہر میدان جنگ میں صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ آج لڑائی ہوتی ہے تو پوری کی پوری آبادی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو عمومی ہنگامی حالت پیدا ہوتی ہے اس سے ساری روایتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں پیش آیا۔ جنگوں کے دوران ہر قسم کی کارروائی کرنی پڑی۔ اس سے قدیم اخلاقی روایتیں ٹوٹ گئیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر جگہ جہاد کے نام پر لڑائی کا مزاج بنا ہوا ہے۔ ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں لڑائی جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی روایتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ یہ لڑائیاں بالفرض فتح پر ختم ہوں تب بھی ان کا یہ نقصان یقینی ہے کہ اس کے بعد ہر جگہ ایک ایسا انسانی معاشرہ بنے گا جو تمام اعلیٰ روایتوں سے خالی ہوگا۔ یہاں تک کہ لوگ چیخ اٹھیں گے کہ اس اسلامی نظام سے تو قدیم غیر اسلامی نظام ہی اچھا تھا۔

سفر سے واپسی کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو میں نے جناب شمشاد محمد خاں صاحب (برمنگھم) کے نام ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس میں سفر کے کئی تجربات درج تھے۔ یہ خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"برمنگھم میں جو دن آپ لوگوں کے ساتھ گزرے وہ میری زندگی کے یادگار دن تھے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی کسی شخص سے ملا اور اس نے اس سے کچھ نہیں چکھا تو گویا وہ مردہ سے ملا۔ اس حدیث کے مطابق، آپ سے میری ملاقات ایک زندہ شخص سے ملاقات تھی۔ یقیناً میں نے آپ سے بہت سی باتیں جانیں، آپ سے بہت سی نئی نئی باتیں سیکھیں۔

ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے اب میری عمر ۷۱ سال ہو چکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوبارہ آپ سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔ بہر حال اگر دنیا میں دوبارہ ملاقات مقدر نہ ہو تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت میں جنت میں یکجا کر دے۔ اور وہاں ملاقات کا موقع نصیب فرمائے۔ کیونکہ جنت کی ملاقات ہی اصل ملاقات ہے۔

لندن ایرپورٹ پر آپ سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایر انڈیا کی فلائٹ پانچ گھنٹہ لیٹ ہے۔ یہ سارا وقت ایرپورٹ پر انتظار میں گزارنا پڑا۔ میں نے سوچا

کہ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو برمنگھم میں آپ حضرات کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارسکتا تھا۔ مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ کہہ دو کہ اگر میں غیب کو جانتا تو بہت نفع حاصل کرتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی (الاعراف ۱۸۸)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں سودسے بچنے اور خیر کو پانے کا تعلق تمام تر مستقبل بینی سے ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ جو شخص پیغمبر کی پیشگی خبر پر یقین کرکے اخروی مستقبل کو اپنا concern بنائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے وہی زندگی کے طویل تر مرحلہ میں کامیاب رہے گا۔

لندن ایئرپورٹ پر میں انتظارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا، دیکھا تو لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے فکری کے آثار تھے، میں نے سوچا کہ ان کی اس بے فکری کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی جیب میں پونڈ اور ڈالر موجود ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے وہ دنیا کی ہر وہ چیز حاصل کرسکتا ہے جس کو وہ چاہے۔

کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ عنقریب وہ ایک اور دنیا میں داخل کردئے جائیں گے جہاں پونڈ اور ڈالر کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی۔ وہاں کا سکہ بالکل دوسرا ہوگا۔ اور جس آدمی کے پاس وہاں کا سکہ نہ ہو وہ وہاں بالکل مفلس ہوکر رہ جائے گا۔ خواہ دنیا میں اس کا بینک بیلنس کتنا ہی زیادہ ہو۔

جہاز فضا میں اڑکر لندن سے دہلی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میرے پاس دہلی۔ لندن کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس کے مطابق اپنا سفر پورا کرکے میں اپنے وطن واپس جارہا ہوں۔ اسی طرح میرے پاس اور تمام انسانوں کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ ریٹرن ٹکٹ آخرت۔ دنیا۔ آخرت کے سفر کے لئے ہے۔ اس دوسرے ریٹرن ٹکٹ سے آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آیا۔ اور پھر دوبارہ وہ آخرت کی طرف لوٹ جائے گا۔ جس طرح میرے لئے دہلی کی طرف واپسی کی تاریخ مقرر تھی اسی طرح میری اور تمام انسانوں کی آخرت کی طرف واپسی کی تاریخ بھی مقرر ہے۔ جس دن یہ تاریخ آئے گی تو قرآن کے الفاظ میں، لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہوں گے اور نہ ایک گھڑی آگے (یونس ۴۹)

جہاز ابھی درمیان میں تھا کہ وہ صورت پیش آئی جس کو ہوا بازی کی اصطلاح میں updraft, downdraft کہا جاتا ہے۔ جہاز تیزی سے نیچے اور اوپر ہونے لگا۔ دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، خیریت کے ساتھ مجھ کو دہلی پہنچا۔ دنیا سے لے کر آخرت تک خیریت کا معاملہ فرما۔ ہر مرحلہ میں اور ہر پہلو سے میری مدد فرما۔

جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۵۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دہلی کی طرف جا رہا ہے۔ اس کو سن کر خیال آیا کہ عین اسی وقت ہر مسافر ایک اور سفر طے کر رہا ہے۔ یہ آخرت کا سفر ہے۔ زمین مزید تیزی کے ساتھ ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی علامتی طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت کا سفر اس سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔

میں نے سوچا کہ جس طرح جہاز کا کپتان اعلان کر کے لوگوں کو سفر دنیا کی حقیقت سے باخبر کر رہا ہے، کاش اسی طرح تمام انسانوں کو سفر آخرت کے بارے میں بتایا جا سکے۔ کاش ایسا ہو کہ اس دنیا کا کوئی کان نہ ہو جس نے اس اعلان کو نہیں سنا، اور کوئی آنکھ نہ ہو جس نے اس خبر کو نہیں پڑھا۔ پھر خیال آیا کہ لندن ایر پورٹ کی ایک دیوار پر میں نے برٹش ایرویز کے ایگزیکٹیو Sir John Egan کے دستخط سے ایک بورڈ پر یہ الفاظ پڑھے تھے:

We won't be satisfied with the service at our airport until you are

میں نے سوچا کہ دعوت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ دعوت صرف اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ مدعو اس بات کا اعتراف کر لے کہ مجھے پیغام پوری طرح پہنچا دیا گیا۔ دعوت کی تکمیل داعی کے دعویٰ کی بات نہیں ہے بلکہ مدعو کے اقرار کی بات ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ اور تاکہ لوگ کہہ دیں کہ تم نے پڑھ دیا (الانعام ۱۰۵)

راستہ میں لندن کے اخبار ڈیلی میل (۴ اکتوبر ۱۹۹۳) میں ایک سبق آموز رپورٹ پڑھی۔ اس کا عنوان تھا: (height of inhumanity) رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک برطانی خاتون کے بچہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت کچھ بڑا تھا، اس لئے اس کو بچوں کے خوبصورت قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس کا سات سالہ بچہ بڑوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ اگرچہ قانون کے مطابق تھا۔ مگر خاتون کو اس کا نہایت سخت صدمہ ہوا:

In death, as in his short life, Barrie Lockwood has been set apart from other children. His family were denied permission to bury the seven-year-old victim of cerebral palsy alongside other youngsters because his coffin was six inches too long. Officials of Harrogate council in North Yorkshire refused to bend the rules, which state that 4ft is the maximum for burial in the children's section of Ripon cemetery. Instead he was laid to rest 200 yards away among adult graves up to 100 years old, his teddy bear-shaped headstone surrounded by more formal monuments. At the time, in January, Barrie's mother Valeri, of Aismunder by Close, Ripon, was too distraught to argue following his death from a chest infection. But now she is campaigning on behalf of other bereaved parents for a change in the regulations. 'In times of great distress it can be a consolation to know your child rests with others of his generation, but my son has been denied even that,' she said. 'Because of his condition, his life didn't involve much contact with other children, so surely it wasn't asking too much to be buried next to those whose lives were also cut short? 'The children's cemetery is so pretty, as much more appropriate for a boy of seven than placing him among adults' graves dating back generations. (John Woodcock)

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک ماں کو یہ پسند نہیں کہ اس کا بچہ مرنے کے بعد ایک غیر pretty قبرستان میں دفن ہو۔ مگر عین اسی وقت بے شمار مائیں اس پر راضی ہیں کہ ان کا محبوب بچہ مرنے کے بعد آگ میں جلے اور جہنم کا گڑھا اس کا ابدی ٹھکانا ہو۔ شاید ہماری دنیا میں اس سے زیادہ عجیب تضاد کی کوئی اور مثال نہیں ملے گی۔

طویل سفر کے دوران کئی بار تھوڑی دیر کے لئے نیند آئی۔ ایک بار جھپکی کے ساتھ نیند آئی تو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں فضا کی بلندی میں سفر کر رہا ہوں۔ مگر یہ سفر ہوائی جہاز میں نہیں ہو رہا ہے بلکہ آپ کے ساتھ موٹر کار میں ہو رہا ہے۔ آپ اپنی کار چلا رہے ہیں۔ آپ کے پاس سامنے کی سیٹ پر ثانی اثنین ہیں۔ اور میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کار ہم کو لئے ہوئے ہوائی جہاز جیسی تیزی کے ساتھ فضا میں اڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

اس قسم کے مختلف احساسات کو لئے ہوئے میرا سفر جاری تھا۔ یہاں تک کہ ۵ اکتوبر کی صبح کو ۴ بجے ہمارا جہاز دہلی ایر پورٹ پر اتر گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی۔ وہ خیریت کے ساتھ مجھے دہلی سے لے گیا اور خیریت کے ساتھ دوبارہ دہلی

پہنچا دیا۔

دہلی ایرپورٹ پر کسٹم کی جانچ بہت سخت ہوتی ہے۔ میں نے ایک ٹرالی پر اپنا بیگ اور کتابوں کا ایک بنڈل رکھا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں تک کہ میں وہاں پہنچا جہاں راستہ کے دونوں طرف کسٹم کا عملہ تیز نگاہوں کے ساتھ ہر مسافر کو دیکھنے کے لئے موجود رہتا ہے۔ یہاں میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں کسٹم کا ایک کارندہ میری طرف بڑھا، اس نے روکنے کے انداز سے سوال کیا کہ یہ کیا چیز ہے بنڈل میں۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ قریب کھڑے ہوئے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: جاؤ بابا، تم جاؤ۔

میں نے کہا کہ خدایا، آخرت میں بھی میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرما۔ حشر کے میدان میں جب میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ نظریں جھکائے ہوئے آگے کی طرف بڑھوں اور روکنے والے مجھے روکنے کے لئے میری طرف متوجہ ہوں تو تیری طرف سے آواز آئے: میرے اس بندے کو جانے دو، اس کو جانچ کے لئے مت روکو۔

باہر نکلا تو ہمارے انتظار میں ایک صاحب وہاں موجود تھے۔ کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آسانی کے ساتھ ایرپورٹ سے روانہ ہو کر گھر آگیا۔ دوبارہ دل سے دعا نکلی کہ کاش اللہ کی رحمت سے ایسا ہو کہ جب میری زندگی کے جہاز کی واپسی کا وقت آئے اور وہ دنیا سے روانہ ہو کر آخرت کی زمین پر اتر جائے تو وہاں خدا کے فرشتے میری رہنمائی کے لئے موجود ہوں۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ یہاں تک کہ مجھے جنت کے اندر پہنچا دیں۔ بے شک اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ اپنے عاجز بندہ کے ساتھ اس قسم کا رحمت کا معاملہ فرمائے۔ میری یہی دعا اپنے لئے بھی ہے اور یہی دعا آپ لوگوں کے لئے بھی۔

یورپ کے اس طویل سفر میں مجھے بار بار جدید تمدن کے پر رونق مناظر دیکھنے کو ملے۔ ان کو دیکھ کر مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آتی تھی کہ اللہ آئندہ تم کو آخرت کی نشانیاں دکھائے گا تو تم اس کو پہچان لوگے (۲۷ : ۹۳) میں نے سوچا کہ صنعتی تمدن کی یہ رونقیں ایک اعتبار سے جنت کا تصویری تعارف ہیں۔ یہ تصویریں اس لئے تھیں کہ ان کو دیکھ کر انسان جنت کی پہچان حاصل کر لے۔ مگر انسان ان تصویروں ہی کو حقیقت سمجھ کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑا۔

دور اول کے اہل ایمان نے جنت کی تصویریں دیکھے بغیر جنت پر یقین کیا تھا۔ آج کے لوگ جنت کی تصویریں دیکھنے کے باوجود اس پر یقین کرنے میں ناکام ہیں۔ کیسی عجیب تھی پچھلے لوگوں کی کامیابی اور کیسی عجیب ہے موجودہ لوگوں کی نامرادی"

وحید الدین

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳

اعلان

الرسالہ کا شمارہ مئی ۱۹۹۶ "دین انسانیت" نمبر ہوگا۔ اس میں اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ الرسالہ میں اشاعت کے بعد ان شاء اللہ اس کو علاحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی "دین انسانیت" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ یہ مجموعہ مثبت انداز میں اس پروپگنڈے کی تردید ہے کہ اسلام تشدد اور جنگ کا مذہب ہے۔

مینجر الرسالہ

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطور خود اور مقامی اصحاب خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

مینجر ماہنامہ الرسالہ

۱ سنڈے میگزین کے نمائندہ مسٹر این وی سبرامنیم نے ۲۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے انڈیا میں زبردست سیاسی رول ادا کرنے کا موقع ہے۔ مگر سیاسی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک وہ ملک میں اپنا یہ کردار ادا نہ کر سکے۔

۲ نیٹ ورک کلچرس ایشیا کی طرف سے بنگلور میں ۲۷ - ۳۰ نومبر ۱۹۹۵ کو ایک ورکشاپ منعقد ہوئی۔ اس کا عنوان تھا:

Creating harmony amidst cultural conflict

صدر اسلامی مرکز کے نام اس کا دعوت نامہ آیا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے ایک ورکنگ پیپر بھی تیار کرایا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے سفر ممکن نہ ہوسکا۔ چنانچہ تیار شدہ پیپر کی ایک کاپی منتظمین کے پاس بھیج دی گئی۔

۳ ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ کو گول ڈاک خانہ (نئی دہلی) شنڈر یولڈ کاسٹ کرسچین کا ایک آل انڈیا جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور انسانیت اور مساوات کے موضوع پر ایک مختصر تقریر کی۔

۴ پانچ جنیہ کے نمائندہ مسٹر جاوید انور نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملک میں پھیلے ہوئے اسلامی مدارس سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ مدارس ایک نہایت مفید سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس کے تعلیمی نظام کو جدید اصطلاح میں اقدار پر مبنی تعلیم (ویلو بیسڈ ایجوکیشن) کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے تعلیمی نظام کے ذریعہ ملک کو اچھے شہری تیار کرکے دے رہے ہیں۔

۵ میڈیا اسٹار (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر ایم احمد کاظمی نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ سیکولرزم کا مستقبل ہندستان میں کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مشترک سماج میں سیکولرزم ہی واحد مفید اور قابل عمل نظام ہے۔ ایسے سماج میں سیکولر نظام کا قیام عقل کے مطابق بھی ہے اور اسلام کے مطابق بھی۔

۶ جاپان (ٹوکیو یونیورسٹی) کے ریسرچ اسکالر مسٹر متسوہیرو کوندو (Mitsuhiro Kondo) نے ۷ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے رول سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمان تقریباً ایک سو پارلیمنٹری حلقہ میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان میں صحت مند سیاسی شعور ہو تو وہ ملک کے سیاسی نظام کی تشکیل میں نہایت مثبت رول ادا کر سکتے ہیں۔

۷ ہندی روزنامہ دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر رام پرکاش ترپاٹھی نے ۸ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع "نئے حالات میں ہندستان کا بدلتا ہوا کلچر" تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ تمام اصلاحات کے لئے صحیح نقطۂ آغاز صرف ایک ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ جب تک ملک میں تعلیم نہیں بڑھے گی کوئی بھی مسئلہ حل ہونے والا نہیں

۸ یونین آف کیتھولک ایشین نیوز کے نمائندہ مسٹر اکرا اینٹوکرا (Akkra Antoakra) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق سپریم کورٹ آف انڈیا کے تازہ فیصلہ سے تھا جس میں الیکشن میں ہندتوا اور ہندوازم کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ فیصلہ خالص ٹکنکل گراؤنڈ پر دیا گیا ہے، وہ قانون اور دستور کی اسپرٹ کے مطابق نہیں۔

۹ یکساں سول کوڈ (مطبوعہ الرسالہ ستمبر ۱۹۹۵) ہر حلقہ میں غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ بہت سے اخبار اور رسالے نے اس کو شائع کیا۔ پمفلٹ کی صورت میں اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہوا۔ کئی اخباروں نے اس موضوع پر انٹرویو شائع کئے۔ اس کا مدلل انداز خدا کے فضل سے اس حد تک مؤثر ثابت ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے جو لوگ پہلے اس کی پرجوش حمایت کر رہے تھے، حتی کہ اس کو الکشن کا اشو بنانا چاہتے تھے، وہ سب سرد پڑ گئے۔ اس سلسلہ میں کثرت سے لوگوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اگلے صفحہ پر دو خط نقل کیا جا رہا ہے۔

نقل خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

فاضل گرامی و محب سامی مولانا وحید الدین خاں صاحب وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ "الرسالہ" بابت ستمبر ۱۹۹۵ء چند دن ہوئے ملا۔ اس میں آپ کا فاضلانہ مضمون" یکساں سول کوڈ" مطالعہ میں آیا۔ ہمارے علم میں یہ پہلا فاضلانہ و مبصرانہ مضمون ہے جس میں یونیفارم سول کوڈ کا عالمانہ، مبصرانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور تقابلی مطالعہ، ماہرین فن اور قانون سازوں کے بیانات و تجزیہ کی روشنی میں اس کی سطحیت اور عدم ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ آپ ہماری طرف سے اس پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اگر اس کو الگ رسالہ کی صورت میں شائع کر دیں اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو جائے تو بہت مفید ہوگا۔ انگریزی ترجمہ ماہرین قانون اور سپریم کورٹ کے ججوں کو بھیجا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ آپ سنجیدگی سے اس پر غور فرمائیں گے اور عجلت سے کام لیں گے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی قوت فکریہ، وسعت مطالعہ، اور ایسے مسائل کے جائزہ لینے کی صلاحیت اسی طرح کے موضوعات و مقاصد میں صرف ہوں اور ملت و ملک دونوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ ہم نے یہ نمبر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ایک مرجع اور مآخذ کی حیثیت سے کام دے گا۔ امید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوگا۔

والسلام، طالب دعا، ابوالحسن علی ندوی ۲۰ اگست ۱۹۹۵

نقل خط امیر جماعت اسلامی ہند

برادر محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ سے ۱۳ جون کی ملاقات کے بعد میں بھی کچھ ایسا مصروف ہوگیا کہ خواہش کے باوجود ملاقات کر سکا اور نہ ہی فون پر بات ہو سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔
" دعوت" اور " زندگی" پابندی سے مل رہے ہوں گے۔ آپ کے نام روانہ کرنے کی اور جاری کر دینے کی تاکید کر دی تھی اور درمیان میں معلوم بھی کرتا رہا ہوں تو یہی اطلاع ملی کہ آپ کے نام " دعوت" جاری ہو چکا ہے اور برابر جا رہا ہے۔
میں ۱۱ اگست کو ایران گیا تھا، ۱۹ اگو لوٹ آیا۔ ایران کے تاثرات ۱ ستمبر کے دعوت میں شائع

ہوئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ احتیاطاً ارستمبر کا شمارہ بھی بھیج رہا ہوں۔ ۳۰ اگست سے آج ۲ ستمبر تک چار قسطوں میں روزنامہ قومی آواز میں آپ کا مضمون یکساں سول کوڈ پر چھپتا رہا ہے۔ الحمدللہ نہایت مدلل، جامع اور مؤثر مضمون ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام تک بالخصوص برادران وطن تک پہنچایا جائے۔ یہ مضمون اگر کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا ہو تو براہ کرم اس کی پانچ دس کاپیاں میرے پاس بھجوا دیں اور اجازت دیں تو ملیالم، تمل، کنڑ، تلگو، مراٹھی، بنگالی اور گجراتی زبان میں ترجمہ کروا کر شائع کروا دیں۔ میں نے کل فون بھی کیا تھا۔ آپ کے مکان سے اطلاع ملی کہ آپ باہر تشریف لے گئے ہیں۔ ۴ ستمبر کو پہنچیں گے۔ آپ جب بھی پہنچ جائیں، براہ کرم فون سے ربط پیدا کریں۔ ہمارا صرف ایک فون کام کر رہا ہے ۶۸۲۰۹۷۵ دونوں خراب چل رہے ہیں۔

مدراس سے جمیل صاحب کا فون آیا تھا۔ فرما رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو خط بھی لکھا ہے۔ وہ ستمبر کے آخر میں دہلی آرہے ہیں۔ آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

والسلام، مخلص، سراج الحسن

۲ ستمبر ۱۹۹۵ء

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۵

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7. Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

غیر اثر پذیر

قران کی سورۃ نمبر ۴۸ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے یہ اصحاب رسول کی صفات ہیں۔ مگر وہ ایسی صفات ہیں جو آپ کے بعد بھی تبعاً تمام مسلمانوں سے مطلوب ہیں۔

ان صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ منکروں کے اوپر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں (اشداء علی الکفار رحماء بینھم) اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تعلقات میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں لیکن جب غیر قوموں کے ساتھ معاملہ پیش آئے تو وہ کڑے بن جائیں۔ ان کے معاملہ میں وہ متشددانہ سلوک اختیار کریں۔

اس آیت میں (شداء علی الکفار) اسی معنی میں ہے جس کے لیے دوسری جگہ قرآن میں (اعزۃ علی الکافرین (المائدہ ۵۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں : ھو عزیز علی۔ یعنی وہ شخص ایسا مضبوط ہے کہ اس پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہے۔ شدید کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ابن منظور کی لسان العرب (۳/ ۲۳۲-۲۳۵) میں ہے کہ شدت کے اصل معنی صلابت کے ہیں۔ کوئی پتھریلی زمین جو پانی کا اثر قبول نہ کرے اس کو صلب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں شدید کا لفظ غیر اثر پذیری کے معنی میں ہے۔ ابن منظور نے "شدید" کی تشریح کے تحت جاہلی دور کے شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ میں کسی کی سخت بات کے مقابلہ میں نرم نہیں پڑتا، خواہ اس کی بات لوہے سے زیادہ سخت کیوں نہ ہو :

فانّی لا الینُ لقول شدّی   ولو کانت اشدَّ من الحدید

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں اشداء کا لفظ داخلی معنی میں ہے نہ کہ خارجی معنی میں۔ یعنی اس میں اہل ایمان کی یہ داخلی صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے گہرے یقین کی بنا پر ایسے ہو جاتے ہیں کہ وہ خارجی ترغیبات کا اثر قبول نہ کر سکیں۔ غیر خدا پرست اشخاص یا غیر خدا پرستانہ تہذیب کا سیلاب بھی اگر ان کے اوپر سے گزر جائے تو وہ پتھر اور لوہے کی طرح اس کا اثر قبول کرنے سے محفوظ رہیں گے ــــــــ حق سے متاثر ہونے میں وہ انتہائی نرم ہوتے ہیں اور ناحق سے متاثر ہونے میں انتہائی سخت۔

اجنبی دین

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدأ الاسلام غریباً و سیعود کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء (صحیح مسلم بشرح النووی ۲/۱۷۶) یعنی اسلام جب شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ اور پہلے کی طرح دوبارہ وہ اجنبی ہو جائے گا۔ پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے۔

آغاز میں اسلام کس طرح اجنبی تھا۔ مکہ میں وہ امت ابراہیم میں ظاہر ہوا۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو پیغمبر ابراہیم سے منسوب تو کرتے تھے مگر عملاً وہ اپنے خود ساختہ بزرگوں کے دین پر قائم تھے۔ بظاہر وہ اپنے کو موحد سمجھتے تھے مگر انھوں نے وسیلہ اور شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے بڑے خدا کے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بنا لیے تھے۔ وہ خدا کی عبادت کے بھی مدعی تھے مگر خدا کی عبادت کے ساتھ انھوں نے بہت سی نئی نئی رسمیں بھی شامل کر لی تھیں۔ وغیرہ۔

ابتدائی دور کی اجنبیت کی اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعد کے دور کی اجنبیت کیسی ہوگی۔ وہ دوبارہ یہ ہوگی کہ لوگ اپنے دین کو خدا اور رسولؐ سے لینے کے بجائے اپنے مزعومہ اکابر سے لینے لگیں گے۔ ان کے یہاں دین کی روح ختم ہو جائے گی البتہ دین کی صورت کی دھوم مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہے گی۔ اسلام ان کی زندگی کا رہنما بننے کے بجائے ان کی قومی اور مادی زندگی کا ضمیمہ بن جائے گا۔ خدائی ہدایت کے الفاظ تو ان کے یہاں باقی رہیں گے مگر ہدایت الٰہی کی معنویت ان کے یہاں سے رخصت ہو جائے گی۔ خدا کا خوف اور آخرت کی تڑپ والا دین ان کے درمیان موجود نہ ہوگا، البتہ ظاہرداری والا دین خوب فروغ پائے گا۔

جب امت مسلمہ کا یہ حال ہوگا تو وہ سچے دین سے ناآشنا ہو جائے گی۔ اس کے سامنے جب دین کو اس کی اصل ابتدائی حالت میں پیش کیا جائے گا تو اس کو وہ ایک اجنبی دین معلوم ہوگا۔ وہ اسلام کے نام پر اسلام کا انکار کر دے گی۔ ایسے لوگ اپنے بنائے ہوئے دینی ڈھانچہ کو جانیں گے لیکن خدا اور رسولؐ کے دین کو پہچاننے کے لیے وہ عاجز ثابت ہوں گے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اجنبیت کے دور میں خدا کے دین کو پہچانیں۔

حسن تدبیر

تاجر لوگ ایسا نہیں کرتے کہ وہ اپنا تجارتی کام شروع کر کے بیٹھ جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ اب دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئیں اور ہمارے یہاں سے اپنی مرضی کا سامان خرید کر لے جائیں۔ بلکہ اس کے بعد وہ ایک اور کام کرتے ہیں جس کو تجارت کو فروغ دینا کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی تجارت کو ترقی اور فروغ دینے کے لیے مزید مختلف قسم کی کوششیں کرتے ہیں۔

انھیں میں سے ایک ہے ——— قیمت گھٹا کر سامان فروخت کرنا۔ مثلاً ایک شخص ایک پندرہ روزہ میگزین نکالے گا۔ اس کی اصل قیمت فی کاپی دس روپے ہوگی۔ مگر ایک مخصوص مدت تک وہ اس کی قیمت کم کر کے صرف دو روپیہ میں فروخت کرے گا۔ اس کمتر قیمت کو عام طور پر ترغیبی قیمت (invitation price) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص بازار میں ایک دکان کھولے گا۔ ابتدا میں وہ کچھ دنوں ایسا کرے گا کہ اس کا سامان جس کی اصل قیمت سو روپیہ ہے، اس کو وہ صرف ۷۵ روپیہ میں دے گا۔ اس کو افتتاحی رعایت (inaugural discount) کہا جاتا ہے۔

یہ طریقہ صرف تجارت کے لیے نہیں ہے۔ اس کا تعلق تمام اجتماعی معاملات سے ہے۔ جب بھی آپ کسی سے تعلقات بڑھانا چاہیں۔ کسی حلقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہیں۔ کسی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیں تو آپ کو یہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ دوسروں کو رعایت دے کر ہی اس دنیا میں دوسروں کے درمیان مقام حاصل ہوتا ہے۔

ہندستان میں بعض تاریخی یا غیر تاریخی اسباب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس کشیدگی کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کے درمیان تعلق کو معتدل بنانے کی عملی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اس معاملہ میں پہل کر کے وہی تدبیر اختیار کریں جس کو مذکورہ مثال میں ترغیبی قیمت یا افتتاحی رعایت کہا گیا ہے۔

یہ کوئی دبنے یا جھکنے کی بات نہیں۔ بلکہ وہ حسن تدبیر ہے۔ ذاتی معاملہ میں ہر آدمی اسی تدبیر کو اختیار کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملی معاملہ میں بھی اس کو اختیار کر لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر موجودہ حالت کو ختم کرنے والی نہیں۔

قانون فطرت

۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو سہارن پور (امبیٹھ) کے ڈاکٹر شاہد صابری سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 013292-5229) انھوں نے حکیم انور صاحب کے حوالے سے ایک واقعہ بتایا۔ حکیم انور صاحب کا مطب امبیٹھ میں ہے۔ ان کا تعلق گنگوہ سے بھی ہے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ اتر پردیش میں رتھ یاترا کی دھوم تھی۔ حکیم انور صاحب گنگوہ کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ اس سڑک کے کنارے ایک صوفی کا مزار ہے جو باپڑی والے پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی وقت ایک مقامی ہندو لالہ اشوک بھاردواج (نگر دلی روڈ، گنگوہ) وہاں سے گزرے۔ مزار کے پاس پہنچ کر وہ رکے۔ اپنے روایتی طریقہ کے مطابق، انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور دیر تک ادب و احترام کے ساتھ مزار کے سامنے کھڑے رہے۔

لالہ اشوک بھاردواج کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ حکیم انور صاحب کو یہ منظر دیکھ کر تعجب ہوا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے ان سے کہا کہ لالہ جی، عام مسلمانوں کے تو آپ دشمن ہیں۔ مگر اس قبر والے کے سامنے آپ ہاتھ جوڑ رہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان تھے۔ لالہ اشوک بھاردواج نے جواب دیا: آپ بھی اس قبر والے مسلمان جیسے بن جائیے، ہم آپ کے لیے بھی ہاتھ جوڑنے لگیں گے۔

ہندوؤں کا یہ احترام صرف گنگوہ کے مدفون بزرگ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام ہندستانی صوفیوں کے لیے ہے جس کا نمونہ جگہ جگہ ان کے مزاروں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ صوفیوں اور موجودہ مسلمانوں میں وہ کون سا خاص فرق ہے کہ ہندو موجودہ مسلمانوں سے بیزار ہے اور عین اسی وقت وہ مسلم صوفیوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے —— ان مسلم صوفیوں نے ہندو کے مقابلہ میں کبھی کوئی احتجاج یا مطالبہ نہیں کیا۔ جب کہ موجودہ مسلمان پچھلے پچاس سال سے اپنے نااہل لیڈروں کی رہنمائی میں ہندوؤں سے احتجاج اور مطالبہ کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔

بے نیازی اور قناعت کرنے والے کے آگے لوگ جھکتے ہیں اور شکایت اور مطالبہ کرنے والوں سے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثنا نہیں۔

نصرت کا قانون

قرآن میں ایک طرف توکل علی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے (الاحزاب ۳) اور دوسری طرف فرمایا کہ خذوا حذرکم (النساء ۷۱) پہلی آیت کو اگر مطلق معنوں میں لیا جائے تو مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائے۔ کیوں کہ جب اصل حقیقت یہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے کیے سے ہوتا ہے تو اس کے بعد انسان کی اپنی تدبیر ایک غیر ضروری چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ بلکہ وہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ آدمی کو خدا کی مدد پر پورا بھروسہ نہیں۔

اسی طرح دوسری آیت کو اگر اس کے لفظی اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو مومن کو بھی ٹھیک ویسے ہی اپنے بچاؤ کی یا اپنے معاملات کو درست کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے جیسے کہ عام دنیادار لوگ کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کو اگر اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو دوسری آیت غیر متعلق ہے۔ اور اگر دوسری آیت کو اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو پہلی آیت کی مطابقت دوسری آیت کے ساتھ ناقابل فہم نظر آنے لگتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ ایک ہی معاملہ کے دو پہلو ہیں۔ توکل علی اللہ کی آیت خدا کی نسبت سے ہے اور خذوا حذرکم کی آیت بندے کی نسبت سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی جو مدد آتی ہے، وہ ہمیشہ اسباب کے پردے میں آتی ہے۔ اسباب کا پردہ ہٹا کر براہ راست انداز میں خدا کی مدد کبھی نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اپنی استطاعت کے مطابق پوری تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ تدبیر نہ کرے تو گویا اس نے وہ حالات ہی فراہم نہیں کیے جس کے قالب میں اس کے لیے خدا کی مدد اترتی۔

یہ دو طرفہ عقیدہ آدمی کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ ایک طرف وہ تدبیر میں کمی نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی مدد جب بھی آئے گی تدبیر ہی کے اندر سے آئے گی۔ دوسری طرف اس کو اپنی کامیابی کا بے پناہ یقین ہوتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جب میں نے تدبیر کی شرط پوری کر دی تو خدا کی طرف سے آنے والی مدد بھی ضرور آکر رہے گی۔

مومن کوشش کے معاملہ میں مجاہد ہوتا ہے اور نتیجہ کے معاملہ میں متوکل۔

زاویۂ نظر کا فرق

سورہ البقرہ (رکوع ۳۲) میں بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد، اور حضرت داؤدؑ سے کچھ پہلے، ان کے ایک نبی شموئیل (۱۰۲۰ - ۱۱۰۰ ق م) تھے جو شام کے ایک شہر رامہ میں رہتے تھے۔ بنی اسرائیل اس وقت دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لیے ایک ملک (بادشاہ) مقرر کر دیجئے۔ شموئیل جو اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، انھوں نے کہا کہ اللہ نے طالوت (Saul) کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے (البقرہ ۲۴۷)

اس کے بعد قرآن میں ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے۔ حالاں کہ اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں، اور اس کو زیادہ دولت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اس کو چنا ہے اور علم اور جسم میں اس کو زیادتی دی ہے۔ اور اللہ اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے (البقرہ ۲۴۷)

سموئیل نبی نے جس آدمی کو بنی اسرائیل کے اوپر سردار مقرر کیا، اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ اونچے خاندان کا نہیں تھا اور اس کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں تھی۔ بنی اسرائیل نے جب اس کو اس اعتبار سے دیکھا تو وہ ان کے درمیان ایک کم تر انسان نظر آیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا ایک کم تر انسان ہمارے اوپر سردار کس طرح بن سکتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے ایک طاقت ور انسان تھا اور اسی کے ساتھ ذہین اور مدبّر تھا۔ اس دوسرے پہلو سے دیکھنے میں وہ سب سے زیادہ لائق تھا۔ کیوں کہ سرداری کے لیے اسی قسم کی صلاحیت والے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ زاویۂ نظر کے فرق کا معاملہ ہے۔ کسی چیز کو آپ ایک رخ سے دیکھیں تو وہ درست نظر آئے گی۔ اسی چیز کو دوسرے رخ سے دیکھئے تو وہ بالکل غلط معلوم ہونے لگے گی۔

یہی اس دنیا میں انسان کا امتحان ہے۔ یہاں صحیح زاویۂ نظر والا آدمی ہدایت پائے گا، اور غلط زاویۂ نظر والا آدمی بے راہ ہو کر رہ جائے گا۔

عورت، مرد

اسلام کے مطابق، عورت اور مرد یکساں درجہ میں عزت اور تکریم کے مستحق ہیں۔ قرآن (آل عمران ۱۹۵) میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا جز ہو (You are members, one of another)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرد کی طہارت کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے مسئلہ بیان کیا تو ایک عورت نے پوچھا: المرأة ترى ذلك أعليها غسل۔ یعنی عورت کے ساتھ بھی ایسا ہی پیش آئے تو کیا اس پر غسل ہے۔ آپ نے جواب دیا:

نعم، إنما النساء شقائق الرجال ہاں، عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں۔

(سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، صفحہ ۶۰)

شقیق یا شقیقہ کے معنی ہیں دو برابر کے حصوں میں بٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ اسی لیے بھائی کو شقیق اور بہن کو شقیقہ کہتے ہیں۔ اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت مرد کی شریک حیات ہے، اور اسی طرح مرد عورت کا شریک حیات۔ دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

کسی ایک فرد کے اندر تمام مطلوب صفات نہیں ہو سکتیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صفاتِ انسانی کو دو ہستیوں میں بانٹ دیا ہے۔ عورت کے اندر نرمی والی صفات رکھ دیں تاکہ وہ مرد کے لیے سکون کا باعث ہو (الروم ۲۱) اور دوسری طرف مرد کے اندر قوامیت والی صفات رکھ دیں تاکہ عورت اس سے اعتماد حاصل کر سکے (النساء ۳۴)

صفات کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر حالات میں دونوں کا میدان کار الگ الگ ہو جاتا ہے۔ اس علحدگی کا مزید فائدہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن جاتے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے ان میں کا ایک جن باتوں کے درمیان گھرا ہوا ہوتا ہے، دوسرا اس سے غیر متعلق رہ کر آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح دونوں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ جب ان میں کا ایک متاثر ذہن کے تحت سوچے تو ان میں کا دوسرا غیر متاثر ذہن کے تحت اس کی رہنمائی کر سکے۔

سوال وجواب

دکتور عبد الحلیم عویس (قاھرہ) کی طرف سے راقم الحروف کو ایک سوال نامہ موصول ہوا۔ سوالات کا تعلق موجودہ زمانہ میں اسلام کی معنویت اور اسلامی نظام کے قیام کے امکانات وغیرہ سے تھا۔
اصلاً یہ سوال نامہ تقریباً ۲۰ سال پہلے ایک مسیحی تنظیم نے تیار کیا اور عرب دنیا کے ان ادیبوں اور دانشوروں سے ان کے جوابات طلب کیے جو اپنے لادینی اور اشتراکی رجحانات کے لیے مشہور تھے۔
یہ جوابات، پیشگی اندازہ کے مطابق، اسلام کے خلاف تھے۔ چنانچہ ان کو شائع کر کے یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ اسلام خود مسلم اہل فکر کی نظر میں ایک تاریخی یادگار یا ایک شخصی عقیدہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب انسانیت کو مزید کچھ دینے کے لیے اسلام کے پاس کچھ نہیں۔ وہ دور قدیم کی ایک چیز بن چکا ہے وغیرہ۔
سوال نامہ کے ساتھ دکتور عبد الحلیم عویس نے مذکورہ جوابات کا خلاصہ بھی ارسال کیا تھا اور اپنے کورنگ لیٹر میں یہ گزارش کی تھی کہ ان سوالات کا جواب اتنے مفصل اور مدلل انداز میں تحریر کروں جس سے بالواسطہ طور پر اس گمراہ کن پروپگنڈہ کی موثر علمی تردید بھی ہو جائے۔ ذیل میں اصل سوالات اور ان کے جوابات کا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

الأسئلة:

١. هل يحافظ الإسلام حتى يومنا هذا على دعوته الشاملة؟
٢. هل يمكن لدولةٍ عصرية إعتماد الإسلام نظام حكمٍ؟
٣. هل النظام الإسلامي للحكم مرحلة حتمية على الشعوب العربية أن تمر بها في معرض تطورها؟
٤. هل تأخذ ظاهرة اليقظة الدينية التي برزت في السنوات العشر الماضية منحىً إيجابياً؟
٥. من هو العدو الأول للإسلام حالياً؟

سوالات کا ترجمہ

۱۔ کیا اسلام آج بھی اپنی ہمہ گیر دعوت کو بدستور برقرار رکھے ہوئے ہے؟
۲۔ کیا موجودہ زمانہ میں کوئی ملک اسلام کو ایک نظام حکومت کے طور پر قبول کر سکتا ہے؟
۳۔ کیا اسلامی نظام کوئی ایسا حتمی مرحلہ ہے جس سے عرب قوموں کو اپنے ارتقاء کے دوران گزرنا بالکل ناگزیر ہے؟

۴۔ کیا دینی بیداری کا یہ ظاہرہ جو گزشتہ دس برسوں میں سامنے آیا ہے کوئی مثبت رخ اختیار کرے گا؟

۵۔ اس وقت اسلام کا دشمن نمبر ایک کون ہے؟

جوابات

۱۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہاں۔ اسلام کی ہمہ گیر معنویت اور حیات انسانی کے ساتھ اس کی مطابقت (relevance) آج بھی اسی طرح باقی ہے جس طرح وہ ہزار سال پہلے کے دور میں پائی جاتی تھی۔ حتی کہ وہ دور جس کو دور جدید کہا جاتا ہے، وہ خود اسلام کا پیدا کردہ ہے، پھر اسلام خود اپنی پیدا کردہ دنیا کے لیے غیر مطابق کیسے ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی تمام اعلیٰ قدریں، مثلاً فکری آزادی، انسانی برابری، جمہوریت، جدید ٹکنالوجی، وغیرہ سب اسلام ہی کے انقلاب کے سیکولر نتائج ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب: "اسلام دور جدید کا خالق"

بعض امور جن میں اسلام کو عہد حاضر کے غیر مطابق بتایا گیا وہ خود بتانے والوں کی غلطی تھی۔ مثلاً عورت اور مرد کے ورک پلیس کو اسلام میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس تصور کو رد کر دیا گیا۔ مگر اسی صدی کے نصف آخر میں حیاتیات اور نفسیات کے گہرے مطالعہ نے ثابت کیا کہ عورت اور مرد کے درمیان فیصلہ کن قسم کا تخلیقی فرق ہے۔ اور جب دونوں میں خود تخلیق کے اعتبار سے فرق ہو تو دونوں کے ورک پلیس کا جدا جدا ہونا ہی مطابق فطرت ہے نہ کہ اس کا ایک ہونا۔ چوں کہ یہ ایک فطری حقیقت ہے، اس لیے خود مغربی سوسائٹی میں، کامل آزادی کے باوجود، ورک پلیس کی یہ تفریق آج بھی پوری طرح باقی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خاتون اسلام)

۲۔ اسلام کو بطور نظام حکومت اختیار کرنا بلاشبہ عین ممکن ہے۔ کوئی حقیقی نظریاتی رکاوٹ اس میں حائل نہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں جمہوریت کو معیاری حکومتی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس جمہوری نظام کو اسلام ہی نے تاریخ میں پہلی بار پیدا کیا۔ وہ اسلام میں شورائی نظام کے نام سے موجود ہے۔ ایسی حالت میں اسلام پر مبنی سیاسی نظام ناقابل عمل کیوں ہوگا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، صرف ایک چیز ہے جس کی بنا پر جدید مفکرین اسلام کے سیاسی نظام کو عہد حاضر کے لیے غیر صالح سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ، ان کے نزدیک، اسلام کلیت پسندانہ نظام (totalitarianism) کا حامی ہے۔ اس بنا پر وہ کسی مشترک سماج (plural society) کے لیے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے جو کچھ نا اہل نمائندگان اسلام کی غلط تشریح سے پیدا ہوئی ہے۔ ان حضرات نے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک دین کامل ہے جس کے اجزاء کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک اس نظام کو بیک وقت پوری صورت میں قائم ہونا چاہیے۔ اس کے حصے بخرے کرنا کسی حال میں ممکن نہیں۔

یہ ایک غلط تصور ہے۔ بطور عقیدہ بلاشبہ اسلام دین اور ریاست دونوں ہے۔ مگر عملی نفاذ کے اعتبار سے دونوں کا معاملہ الگ الگ ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے حج اور زکوٰۃ بطور عقیدہ فرض ہے۔ مگر ان پر عمل اس وقت کیا جائے گا جب کہ اس کی شرائط بھی پائی جا رہی ہوں۔

اس معاملہ میں ہمیں مدنی دور سے رہنمائی ملتی ہے۔ مدنی دور اسلام کا حکومتی دور ہے۔ مگر اس حکومت کے خود دو دور ہیں۔ مدنی دور کے نصف اول میں وہاں مشترک آبادی تھی۔ گویا وہی چیز جس کو موجودہ زمانہ میں پلورل سوسائٹی کہا جاتا ہے۔ اور مدنی دور کے نصف آخر میں وہاں وحدانی معاشرہ وجود میں آگیا۔

ان دونوں دوروں میں دو الگ الگ انداز اختیار کیا گیا۔ مدینہ جب ایک پلورل سوسائٹی تھا تو وہاں اسلامی اقتدار کے باوجود غیر مسلموں کو ان کے اپنے رواج پر چھوڑ دیا گیا:

كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم كتاباً (في المدينة) بين المهاجرين والانصار وادع فيه اليهود وعاهدهم واقرهم على دينهم واموالهم (البداية والنهاية ٣/٢٢٣)

کسی پلورل سوسائٹی کے لیے مدنی دور کے نصف اول میں مثال موجود ہے۔ یہ غیر مسلموں کے لیے تقریباً وہی چیز ہے جو موجودہ زمانہ میں سیکولر سسٹم میں اختیار کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پلورل سوسائٹی میں بھی اسلام اتنا ہی قابل عمل ہے جتنا کہ سیکولر نظام کو قابل عمل سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ میں سمجھتا ہوں کہ عرب ترقی کے لیے ایسا ہونا ضروری ہے۔ تاریخی طور پر عربوں کا جو مزاج بنا ہے اس میں کوئی دوسرا نظام ان کے یہاں معقول طور پر کام نہیں کر سکتا۔ جمہوری طور پر ان کے درمیان صرف اسلام کا نظام ہی قابل قبول ہو سکتا ہے۔ دوسرا کوئی نظام جب بھی ان کے درمیان قائم ہوگا وہ آمریت کے زور پر قائم ہوگا۔ اور آمریت ہمیشہ ترقی کے عمل کو روکنے کی قیمت پر قائم ہوتی ہے۔ ترقی کے لیے آزادی ضروری ہے۔ اور آمریت کا نظام اس کا متحمل نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو فکر و عمل کی آزادی عطا کرے۔

عرب دنیا میں بظاہر جس چیز نے اسلام کو ناقابل عمل بنایا وہ کچھ مسلم لیڈروں اور مسلم تحریکوں کا غیر جمہوری مزاج ہے۔ جمہوری مزاج یہ ہے کہ آزادانہ اور منصفانہ (free and fair) الکشن ہو۔ اور پھر جو جیتے اس کو مقررہ مدت تک کے لیے حکومت چلانے کا موقع دیا جائے۔ اور جو ہارے وہ اپنی ہار کو تسلیم کرلے۔

عرب ملکوں میں یہ مزاج موجود نہیں۔ یہاں الکشن میں ہارا ہوا گروپ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور جو جیتے وہ چاہتا ہے کہ حکومت ہمیشہ اسی کے پاس رہے۔ اگر اس مزاج کی اصلاح ہو جائے تو عرب ملکوں میں اسلام پوری طرح قابل عمل نظر آنے لگے گا۔

۴۔ وہ ظاہرہ جس کو موجودہ زمانہ میں دینی بیداری کہا جاتا ہے، وہ میرے نزدیک صرف قومی بیداری ہے۔ دینی بیداری وہ ہے جو معرفت خداوندی کی سطح پر ہونے والے ذہنی انقلاب سے ابھرے۔ موجودہ مسلم بیداری کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہ فلسطین اور اسی قسم کے دوسرے محاذوں پر مسلمانوں کی قومی شکست کی زمین سے ابھری ہے۔ وہ ایک قومی ردعمل ہے جس کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

دینی بیداری لوگوں کے اندر عجز پیدا کرتی ہے اور قومی بیداری احساس برتری کا جذبہ ابھارتی ہے۔ دینی بیداری سے دعوت کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور قومی بیداری سے مخاصمت کی نفسیات۔ دینی بیداری آدمی کو دوسروں کے تئیں محبت کرنے والا بناتی ہے اور قومی بیداری دوسروں کے تئیں نفرت کرنے والا۔ دینی بیداری میں لوگوں کی نظر اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے اور قومی بیداری میں لوگوں کی نظر اپنے حقوق پر۔ دینی بیداری سے آخرت رخی ذہن بنتا ہے اور قومی بیداری سے دنیا رخی ذہن۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی موجودہ بیداری میں وہی تمام علامتیں نظر آئیں گی جن کو ہم نے اوپر کی تقسیم میں قومی بیداری کے تحت بیان کیا ہے۔

۵۔ قرآن کی تصریح کے مطابق، اسلام کا دشمن نمبر ایک کبھی خارج میں نہیں ہو سکتا۔ اس کو یقینی طور پر داخل میں تلاش کرنا چاہیے (فلا تخشوهم واخشونِ) میرے نزدیک یہ داخلی دشمن وہ نام نہاد اسلام پسند (اسلامسٹ) ہیں جو موجودہ زمانہ میں "اسلامی نظام قائم کرو" کا نعرہ لے کر کھڑے

ہو گئے اور ہر جگہ ملکی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

اسلامی نظام ہمیشہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب اس کے لیے عوامی سطح پر موافق ماحول بنایا جاچکا ہو (ملاحظہ ہو حضرت عائشہؓ کی روایت، البخاری، باب تالیف القرآن) موجودہ اسلام پسند حالات کو سازگار بنائے بغیر اقتدار پر قبضہ کر کے اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسلام تو قائم نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ ہر جگہ ضد اور نفرت بھڑک رہی ہے۔ ہر جگہ اسلام سے بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: سأل رجل عليا رضي الله عنه ما بال المسلمين، اختلفوا عليك ولم يختلفوا على ابي بكر وعمر۔ فقال لأن ابا بكر وعمر كانا واليين على مثلي وانا اليوم وال على مثلك (صفحہ ۲۱۱)

خلیفہ چہارم کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک صحابیٔ رسولؐ حاکم ریاست ہو تب بھی اجتماعی نظام کو درست طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ امثال علیؓ کثرت سے معاشرہ کے اندر موجود ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو صحابی جیسے ایک شخص کے حاکم ہونے کے باوجود سارا نظام منتشر ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں جن مسلم ملکوں میں "اسلامی حکومت قائم کرو" کے نعرے لگائے جارہے ہیں وہاں نہ حکومت کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کوئی مثل عمرؓ موجود ہے اور نہ معاشرہ میں امثال علیؓ نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر سیاسی تبدیلی ہو بھی جائے تو کوئی صالح اسلامی نظام کیسے قائم ہوگا۔ جب کہ حضرت علیؓ کے زمانہ سے بھی زیادہ بگاڑ آج پیدا ہو چکا ہے۔

جو لوگ اس قسم کی غیر فطری اور غیر اسلامی تحریکیں چلا رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسلام کے دشمن ہیں کیوں کہ انھوں نے اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ لوگوں کو موقع دے رہے ہیں کہ وہ اسلام کو ناقابل عمل، غیر مہذب، تشدد پسند، رجعت پسند قرار دے دیں۔

سرسید فارمولا

سرسید احمد خاں برٹش دور حکومت میں ۱۸۱۷ میں پیدا ہوئے ، اور اسی زمانہ میں ۱۸۹۸ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے سو سال بعد چھپنے والی ایک انسائیکلو پیڈیا میں ان کے بارہ میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں۔ سرسید احمد خاں ، انیسویں صدی میں انڈیا کے سب سے بڑے مسلم لیڈر :

Sir Sayyid Ahmad Khan, India's greatest 19th century Muslim leader, (9/414)

آج مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سرسید احمد خاں کو پسند کیا جاتا ہے۔ باریش گروہ اور بے ریش گروہ دونوں ہی یکساں طور پر سرسید کے قصیدہ خواں ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تعلیم گاہ کو ملک میں حیات ملی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب ان کے کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کر رہے ہیں۔ کوئی ان کو سید والا گہر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کوئی ان کو معمار قوم کا لقب دے رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو مسلمان آج آزاد ہندستان کے ہریجن ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر انھیں سرسید کو اپنے زمانہ میں کافر ، ملت فروش اور دشمنان اسلام کا ایجنٹ کہا گیا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کا ساتھ دیا اور ان کے بارہ میں کتابیں لکھیں تو اکبر الٰہ آبادی نے دونوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا :

سید کی داستان کو حالی سے پوچھئے   غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

قدیم و جدید میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب سادہ طور پر یہ ہے کہ آج کے مداحین سرسید کو ان کے مستقبل میں دیکھتے ہیں۔ اور ماضی کے ناقدین سرسید کو ان کے حال میں دیکھ رہے تھے۔

ہر مصلح ہمیشہ اسی طرح دو طرفہ انجام سے دوچار ہوا ہے۔ ہر انقلابی مصلح کو اس کے معاصرین کی طرف سے سخت مخالفتوں کا سامنا پیش آیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اس کی اصلاحی

کوششوں کے نتائج سامنے آجاتے ہیں تو بعد کے لوگ اس کے قصیدہ خواں بن جاتے ہیں۔ ہر مصلح اس دنیا میں انسانوں کی اسی کوتاہ نظری کا شکار ہوا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ مظہر اتنا عام ہے کہ پیغمبر جیسی مقدس ہستیاں بھی اس عمومی انجام سے مستثنیٰ نہیں۔

حقیقی لیڈر کی تعریف یہ ہے کہ وہ حال میں مستقبل کو دیکھ سکے۔ ایسا لیڈر جو بات کہتا ہے وہ مستقبل کے لحاظ سے کہتا ہے۔ وہ ایسا منصوبہ پیش کرتا ہے جس کا مثبت انجام بہت بعد کو نکلنے والا ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی نظریں حال میں اٹکی ہوئی ہوتی ہیں، جو ظاہری مسائل کو جانتے ہیں مگر ان کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات سے با خبر نہیں ہوتے، ایسے لوگ صرف سطحی لیڈروں کو سمجھ پاتے ہیں جو انہیں سامنے کے مسائل میں الجھائیں۔ وہ ان سچے لیڈروں کی اہمیت کو جان نہیں پاتے جو مستقبل کی تعمیر کا گہرا نقشہ ان کے سامنے پیش کریں۔ یہی معاملہ سرسید احمد خاں کے ساتھ پیش آیا۔

سرسید احمد خاں کا زمانہ وہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے تمام اکابر اس زمانہ کو غلامی کا زمانہ کہتے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، غرض اس دور کے جتنے بھی رہنما تھے، سب کے سب نفرت کی حد تک انگریزوں کے مخالف بنے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک انگریزی حکومت کی موجودگی میں مسلمانوں کے لئے کسی ترقی یا کامیابی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مولانا محمد علی تو غلام ہندستان میں مرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اقبال نے اس سے آگے بڑھ کر کہا کہ غلامی ایسی بری چیز ہے کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہی کو ابدی طور پر لوگوں سے چھین لیتی ہے:

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مگر سرسید کا معاملہ یہ تھا کہ وہی انگریز جس کو تمام لوگ دشمن اسلام کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے، اسی انگریز میں انھوں نے دوستی کے پہلو تلاش کر لئے۔ وہی ہندستان جس کو لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کا پورا طبقہ صرف غلام ہندستان بتا رہا تھا، اسی غلام

ہندستان میں انھوں نے آزادی کے مواقع کی نشاندہی کی۔ سرسید کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں کہا:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

غلامی کے اندر آزادی کی اس نشاندہی کا مطلب کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان میں اگرچہ انگریزوں کی سیاسی محکومی کا مسئلہ ہے۔ مگر عین اسی وقت یہاں تعلیمی اور اقتصادی آزادی بھی موجود ہے۔ سیاسی مسئلہ کے باوجود اس ملک میں تمہارے لئے یہ موقع ہے کہ تم غیر سیاسی میدانوں میں محنت کرکے اپنے لئے ایک باعزت اور خوش حال زندگی بنا سکو۔

دوسرے لفظوں میں، سرسید کے مخالفین صرف مسئلۂ انگریز کو دیکھ رہے تھے، وہ اسی مسئلہ کو سب کچھ سمجھ کر اس سے لڑنے کی باتیں کرتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک جب تک انگریز کا سیاسی مسئلہ ختم نہ ہو کوئی ترقیاتی کام سرے سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن سرسید کی گہری نگاہ نے دیکھا کہ یہاں اگر مسائل ہیں تو اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت یہاں مواقع بھی موجود ہیں۔ قانون فطرت کی زبان میں انھوں نے لوگوں کو یہ فارمولا دیا کہ ——— مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔

سرسید کے زمانہ میں اس فارمولے کی حکمت آنکھ والوں کو بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر سو سال کے تجربہ کے بعد آج بے آنکھ والے بھی دیکھ رہے ہیں کہ سرسید کی نشاندہی نہایت درست تھی۔ اپنے حال میں بظاہر سرسید کا فارمولا بزدلی اور بے عملی نظر آتا تھا۔ مگر بعد کے نتیجہ نے بتایا کہ وہ عین حکمت اور سراپا عمل تھا۔ بلکہ وہ واحد ممکن تدبیر تھی۔ اور اگر اول مرحلہ میں اس تدبیر کو پوری طرح اختیار کر لیا جاتا تو یقیناً مسلمانوں کی حالت اس سے بہت زیادہ مختلف ہوتی جو آج ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔

مگر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ماضی سے بہت کم سبق لیتا ہے۔ چنانچہ آج دوبارہ ہر طرف اسی کوتاہ بینی کا دور دورہ ہے جو سرسید کے زمانہ میں یہاں پائی جاتی تھی۔ لوگ

ماضی کے سرسید کے قصیدہ خواں ہیں لیکن حال میں اگر کوئی خدا کا بندہ سرسید کے فارمولے کو منطبق کرنے والی بات کرے تو دوبارہ اسی طرح وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جس طرح ماضی میں وہ سرسید کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ وہ مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ اس مقابلہ اور مسابقت کے ماحول کی وجہ سے یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان زندگی کی دوڑ جاری رہتی ہے۔ کبھی کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ صورت حال ہابیل اور قابیل کے زمانہ سے ہے اور وہ قیامت تک اسی طرح جاری رہے گی۔ یہ نظام خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے، اور کسی بھی حال میں اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کبھی اور کسی کے لئے بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کے لئے سب کچھ اچھا ہو۔ اور کوئی ناخوشگوار چیز سرے سے یہاں موجود نہ ہو۔

تاہم اس دنیا کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں یہاں ایک نہ بدلنے والی صورت حال بھی ہمیشہ باقی رہے۔ وہ یہ کہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے دوران جب ایک گروہ کو پیچھے دھکیلا جائے تو عین اسی وقت خود حالات کے تقاضے کے تحت اس کے لئے نئے امکانات بھی ظاہر ہو جائیں۔ چھیننے والا جب اس سے ایک زینہ چھینے تو فطرت کا قانون اس کے لئے ایک اور راستہ کھول دے جس کے ذریعہ چل کر وہ دوبارہ آگے جا سکتا ہو۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ تب بھی یہاں یہی صورت حال قائم تھی، آج جب کہ یہاں "اکثریتی فرقہ" کا غلبہ ہے تب بھی یہی حالت یہاں موجود ہے۔ پچاس سال پہلے جب برصغیر ہند ایک تھا تب بھی یہی حالت تھی، آج جب کہ برصغیر کے تین ٹکڑے ہو گئے ہیں تب بھی تینوں جگہ یہی حال ہے۔ ہر جگہ کچھ نئے یا پرانے مسائل ہیں، اور اسی طرح ہر جگہ کچھ نئے یا پرانے مواقع بھی۔

آپ خواہ یورپ اور امریکہ جائیں یا عرب دیشوں اور مسلم دیشوں میں جائیں، ہر جگہ آپ کو ظاہری فرق کے ساتھ عین یہی صورت حال ملے گی۔ یہ فطرت کا قانون ہے،

اور فطرت کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس قانون میں نہ زمانہ کے فرق سے کوئی فرق واقع ہوتا اور نہ جگہ کے فرق سے کوئی فرق۔

ایسی حالت میں کرنے کا کام کیا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ حالات کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے حالات کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے۔ حالات کے خلاف ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے حالات کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سرسید کا مذکورہ بالا فارمولا دراصل اسی ہم آہنگی کے طریقہ کا دوسرا نام ہے۔

یہ دنیا جب مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے تو یقینی طور پر وہ کبھی مسائل سے خالی بھی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جس طرح دوسرے تمام زمانوں میں مسائل موجود تھے، اسی طرح آج بھی یہاں مسائل موجود ہیں۔ یہ مسائل نظام فطرت کی بنا پر ہیں نہ کہ کسی کے ظلم اور تعصب کی بنا پر۔ تاہم خود فطرت ہی کا بنایا ہوا نظام یہ بھی ہے کہ جب بھی دنیا میں مسائل ہوں تو عین اسی وقت وہاں مواقع بھی موجود ہوں۔ ایسی حالت میں عقل وحکمت کا تقاضا صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو دریافت کرکے انھیں استعمال کیا جائے :

Ignore the problems, avail the opportunities

اس دنیا میں کامیابی کا یہی واحد فارمولا ہے۔ جب بھی کسی شخص یا گروہ نے اس دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے تو اسی فارمولے پر چل کر کامیابی حاصل کی ہے۔ آئندہ بھی جو لوگ اس دنیا میں کوئی کامیابی حاصل کریں گے تو وہ بھی اسی فارمولے پر چل کر حاصل کریں گے۔ مسائل سے لڑنے والے لوگ اس دنیا میں ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔ اور مواقع کو استعمال کرنے والے لوگ ہمیشہ کامیاب۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کی کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں۔ نہ ہندستان میں اور نہ کسی دوسرے ملک میں۔ نہ آج اور نہ آج کے سیکڑوں سال بعد۔

ایک دن

۱۸ فروری ۱۹۹۶ کو رمضان ۱۴۱۶ھ کی ۲۸ تاریخ تھی۔ راقم الحروف کی دعوت پر آج دہلی کے تین اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو افطار میں ہمارے ساتھ شریک ہوئے۔ تینوں صاحبان تین مختلف میدان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک صاحب درجۂ اول کے صحافی ہیں۔ دوسرے صاحب کامیاب بزنس مین ہیں۔ اور تیسرے صاحب ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ تینوں دہلی کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

مسٹر ارن شوری (Tel. 6886644)

مسٹر پرمود کمار بترا (Tel. 4697971)

مسٹر مہیش چندر شرما (Tel. 2295212)

ہم سب لوگ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے جس کے ایک طرف سرسبز پارک دکھائی دیتا تھا اور دوسری طرف الماریوں میں رکھی ہوئی عربی اور انگریزی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ آج شام کو سوا چھ بجے افطار کا وقت تھا۔ سائرن کی آواز آئی تو کھجور اور پانی سے افطار کیا گیا۔ وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔

ایک صاحب نے کھجور کے بارے میں کہا کہ عرب میں چوں کہ کھجور ہی ملتی تھی اس لئے شاید روزہ افطار کرنے کے لئے کھجور مقرر کی گئی۔ میں نے کہا کہ یہ بات نہیں۔ کھجور کوئی روزہ افطار کا لازمی جزء نہیں ہے۔ وہ ایک رواج ہے نہ کہ مقدس شریعت۔ دوسری بات یہ ہے کہ کھجور کوئی کمتر درجہ کی چیز بھی نہیں۔ کھجور میں تمام اہم غذائی اجزاء ــــــ شکر، پروٹین، فیٹ، منرل وغیرہ موجود ہیں۔ اور وہ ایک مکمل خوراک ہے۔

سادہ افطار کے بعد اسی کمرہ میں ہم نے جماعت کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ وہ لوگ قریب بیٹھے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ ہماری نماز کو دیکھتے رہے۔

فراغت کے بعد جب میں دوبارہ دسترخوان پر آیا تو مسٹر ارن شوری نے پہلا سوال کیا کہ یہ نماز کیا ہے، اس کے بارے میں ہمیں بتائیے۔ ان کے سوال پر بقیہ تینوں صاحبان بھی

متوجہ ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ تینوں صاحبان نہایت سنجیدگی کے ساتھ نماز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ نماز خدا کی عبادت ہے۔ اس کی ظاہری صورت تو ابھی آپ نے دیکھ لی۔ اب میں آپ کو اس کی اسپرٹ کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ جس طرح ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور ایک اس کی اندرونی حقیقت ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز کا بھی ایک ظاہر ہے، اور اس کا دوسرا پہلو اس کی اندرونی حقیقت ہے۔

جب ہم نماز شروع کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں: اللہ اکبر، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ خدا بڑا ہے، میں بڑا نہیں ہوں۔ اس طرح نماز کا پہلا سبق تواضع (modesty) ہے۔

اس کے بعد ہم سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: الحمد للہ رب العالمین (ساری حمد اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا رب ہے) یہ شکر (thanksgiving) کا کلمہ ہے۔ اس طرح نمازی اس احساس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ دینے والا ہے، اس لئے ساری شکرگزاری بھی اسی کے لئے ہونا چاہئے۔

پھر نماز میں ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ رکوع کی صورت میں آدھا جھکتے ہیں۔ پھر سجدہ کی صورت میں پورا جھک جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں بار بار ایسے کلمات کہے جاتے ہیں جن میں اللہ کے سبوح اور قدوس ہونے کا اقرار ہوتا ہے۔ یہ نماز کا وہ پہلو ہے جس کو اطاعت (submission) کہا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ اطاعت کا معاملہ بے حد اہم معاملہ ہے۔ کیوں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات اور ساری مخلوقات سے یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۸۴ میں جب ہم نے انگریزی الرسالہ جاری کیا تو اس کے پہلے شمارہ کے ٹائٹل پر یہ جملہ تھا کہ انسان اور کائنات دونوں کا مذہب ایک ہے، اور وہ اطاعت ہے:

Submission is the only religion for both: man and the universe.

پھر نماز کے آخر میں دائیں اور بائیں سلام پھیر کر کہا جاتا ہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یعنی اے لوگو، تمہارے اوپر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ ہندستان میں ہم اتر دکھن رخ کرکے ایسا کہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں دوسری دوسری سمتوں کی طرف منھ پھیر کر یہی کلمات کہے جاتے ہیں۔ اس طرح روزانہ ہر نماز کے بعد مسلمان زمین کے چاروں طرف بسنے والے تمام لوگوں کی طرف اپنا رخ کرکے یہ دعا کرتے ہیں کہ تمہارے اوپر خدا کی رحمت اور سلامتی ہو۔ یہ نماز کا وہ پہلو ہے جس کو آپ امن (peace) کہہ سکتے ہیں۔

نماز کی اس تشریح کو سب لوگ بہت غور کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں مسٹر ارن شوری نے کہا کہ اب میں نماز کو سمجھنے کے لئے چار لفظ یاد رکھوں گا۔ ماڈسٹی، تھینکس گیونگ، سبمشن اور پیس:

Modesty, thanksgiving, submission, peace

اس کے بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے کہا کہ اب روزہ کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ میں نے کہا کہ روزہ کے لئے عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے لفظی معنی ہیں رک جانا (abstinence) روزہ کی بھی ایک ظاہری صورت ہے۔ اور دوسری چیز اس کی حقیقت ہے۔ روزہ کی ظاہری صورت تو آپ کو معلوم ہے۔ اس کی اسپرٹ یا اس کی حقیقت پرہیزگاری ہے۔ یہی مطلب ان لفظوں کا ہے جس کو ابھی ہم نے افطار کرتے ہوئے اپنی زبان سے ادا کیا۔ وہ الفاظ ہیں: اَللّٰھم لکَ صمت وعلیٰ رزقكَ افطرت۔ یعنی اے اللہ، میں نے تیرے کہنے سے روزہ رکھا، اور تیرے کہنے سے میں نے افطار کیا۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کو چاہئے کہ وہ خدا کا اطاعت گزار بنے مگر خدا جبری اطاعت کے بجائے آزادانہ اطاعت چاہتا ہے جو زیادہ اونچی صفت ہے۔ چنانچہ خدا نے ہم کو زمین پر پوری آزادی دیدی ہے۔ اب خدا چاہتا ہے کہ ہم کسی جبر کے بغیر خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے خدا کے حکموں کے پابند بن جائیں۔

یہ آزادی گویا انسان کی اخلاقی ترقی کا ایک کورس ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ انسان کے اندر خود انضباطی (self-discipline) کی صفت پیدا ہو۔ ہر انسان ایک بااصول انسان بن جائے۔ وہ فطرت کے مقرر اصول کے مطابق، خود اپنے ارادہ سے برائی کو چھوڑ دے،

اور خود اپنے ارادہ سے بھلائی کو اختیار کرے۔

روزہ میں آدمی خود اپنے فیصلہ کے تحت صبح کو کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، اور پھر شام کو خود اپنے فیصلہ کے تحت دوبارہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ یہ علامتی طور پر اسی آزادانہ اطاعت کی تربیت ہے۔ روزہ کا سبق یہ ہے کہ تم ایک بااصول زندگی گزارو، بغیر اس کے کہ خارج سے تمہارے اوپر کوئی جبر کیا گیا ہو۔ تم اپنے دل میں اچھے خیالات رکھو اور برے خیالات کو اپنے اندر سے نکال دو۔ تم اچھی بات بولو اور بری بات کے لئے اپنی زبان بند کر لو۔ تم اچھا عمل کرو اور برے عمل سے آپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے روک لو۔ اور یہ سب خود اپنے آزاد ارادہ کے تحت ہو نہ کہ کسی مجبوری کے تحت۔

آخر میں جب لوگ واپس جانے لگے تو ان کو جیبی سائز کی نہایت خوبصورت چھپی ہوئی کتاب بطور تحفہ دی گئی۔ یہ الرسالہ بک سنٹر سے چھپی ہوئی تازہ انگریزی کتاب تھی جس میں دو سو احادیث رسول کے انگریزی ترجمے آرٹ پیپر پر چھاپے گئے ہیں۔ اس کا نام یہ ہے:

Words of the Prophet Muhammad
Selections from the Hadith

۱۱۲ صفحہ کی اس کتاب کے آغاز میں ایک صفحہ کا دیباچہ (Foreword) ہے۔ اس کا آخری پیراگراف یہ ہے کہ ان حدیثوں میں وہ چند اصول بتائے گئے ہیں جن کی طرف پیغمبر نے اپنے ماننے والوں کو رہنمائی دی۔ یہ سب ابدی اصول ہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ساری انسانیت کے لئے اہمیت رکھتے ہیں:

The following are some of the principles by which the Prophet sought to guide his followers. Eternal in essence, they are of value not only to Muslims but to humanity at large

ایک انسانی کردار

قرآن (الاعراف ۱۷۶-۱۷۵) میں ایک انسانی کردار کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا (واتل علیهم نبأ الذی آتیناه آیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغاوین۔ ولو شئنا لرفعناه بها ولکنه اخلد الی الارض واتبع هواه)

اس آیت میں اس انسان کی مثال دی گئی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات فراہم کرے جس کے اندر رہ کر وہ ایک دینی زندگی گزارے اور آخرت میں خدا کا انعام حاصل کرے۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہو اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر ایک ایسی زندگی کی طرف بھاگ کھڑا ہو جس میں دنیا کی چمک دمک تو ہو مگر اس کی دینی اور اخروی زندگی اجڑ جائے۔ ایسے لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہی گھاٹا اٹھانے والے لوگ ہیں (فاولئك هم الخاسرون) الاعراف ۱۷۸

ایک شخص کو خدا یہ موقع دے کہ وہ بقدر ضرورت روزی پر قناعت کر کے دینی زندگی گزارے مگر وہ بقدر عیش حاصل کرنے کی خاطر یہ کرے کہ دینی زندگی کو چھوڑ کر دنیوی زندگی کی طرف دوڑ پڑے تو اس کا یہ فعل مذکورہ قرآنی آیت کا مصداق ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص کو مامور بن کر دین کا کام کرنے کا موقع ملے مگر وہ امیر بننے کے شوق میں اس کو استعمال نہ کر سکے۔ ایک شخص کو اقتدار سے باہر زبان و قلم کے ذریعہ دعوت دین کا کام کرنے کا موقع دیا جائے مگر وہ اقتدار کا منصب حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو اس سے محروم کر لے۔ ایک شخص کے لیے غیر مشہور حیثیت میں دین کی خدمت کرنے کے مواقع فراہم ہوں مگر اپنے آپ کو مشہور حیثیت میں دیکھنے کے پیچھے وہ تمام مواقع کو تباہ کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کی مثال اس انسان کی سی ہے جس کو خدا نے بلند حیثیت دینا چاہا مگر اس نے اپنے آپ کو پستی کی حالت میں گرا دیا۔

حرص دنیا کو چھوڑ کر ہی کوئی شخص دینی خدمت کا موقع اپنے لیے پا سکتا ہے۔

ایک سفر

لندن میں روحانی اتحاد (Festival of Spiritual Unity) کے نام سے ایک عمومی جلسہ ہوا۔ وہ ۳۰ جولائی سے ۷ اگست تک جاری رہا۔ اس کو لندن میں مقیم ہندستان کی ایک تجارتی فیملی مادھوانی پریوار (Madhvani Family) نے اسپانسر کیا تھا۔ اور اس کے آرگنائزر سوامی چید انند تھے۔ اس کی دعوت پر انگلینڈ کا سفر ہوا۔

اس سفر کا پہلا تجربہ ۱۲ جولائی کو پیش آیا۔ ویزا کے سلسلہ میں مجھے نئی دہلی کی برٹش ایمبیسی جانا پڑا۔ وہاں پہنچا تو ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہندستانیوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ وہاں لائن میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ لوگ برطانیہ میں پیسہ کمانے کے لئے جا رہے تھے۔ ایک صاحب کی بات سن کر میں نے اپنے دل میں کہا: آج کی دنیا میں ہر آدمی آئیڈیل کی بات کرتا ہے۔ مگر ہر آدمی اپنے مفاد کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا مفاد دولت ہے، کسی کا اقتدار اور کسی کا شہرت اور مقبولیت۔

آخری دن جب کہ میں دہلی میں اپنی روانگی کی تیاری کر رہا تھا، ایک صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں بزرگ صاحب اس وقت دہلی میں ہیں۔ بزرگ کے لئے لندن سے اسپانسرشپ کا کاغذ آیا ہے۔ حضرت دعوتی اور تربیتی نظام کے تحت لندن جانا چاہتے ہیں مگر ویزا کے لئے برٹش ایمبیسی جانا حضرت کے مزاج کے مطابق نہیں۔ اس لئے برٹش ایمبیسی میں ٹیلیفون کر کے کہیں کہ حضرت کو شخصی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ حالاں کہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ خدام جب ایسی تجویز پیش کریں تو حضرت یہ کہکر اسے رد کر دیں کہ نہیں، میں خود سفارت خانہ جاؤں گا تاکہ لوگوں سے میرا اختلاط ہو اور جس ملک میں میں جا رہا ہوں اس کے بارہ میں مجھے براہ راست معلومات حاصل ہوں۔ اسی دوری کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے بزرگ حالات حاضرہ سے بے خبر رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں حالات حاضرہ کا عرفان شامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سننے والے بھی ان کی باتوں کو صرف تبرک کے لئے سن لیتے ہیں اور بس۔ ایسے اسفار کو دعوتی اسفار کہنے کے بجائے برکتی اسفار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

۲۸ جولائی کی شام کو جب کہ میں روانگی کے لئے تیاری کر رہا تھا، اچانک خوفناک

گڑاہٹ کی آواز آئی۔ کھڑکیوں کے دروازے بجنے لگے۔ گھر ہلنے لگا۔ یہ زلزلہ تھا۔ گھر کے چھوٹے بڑے
ب ڈر گئے۔ ایک بچی رونے لگی۔ میرا ڈھائی سالہ پوتا عدنان بھی گھبرا اٹھا۔ وہ میرے پاس آیا اور
پوچھنے لگا کہ دادا، یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ زلزلہ۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا کہ دادا آپ زلزلہ
ڈنڈے سے مار دیجئے۔

گھر میں کبھی بلی آتی ہے تو عدنان کہتا ہے کہ دادا، بلی کو مار دیجئے۔ میں اپنی چھڑی سے اس کو بھگا
اہوں۔ اس پر قیاس کرکے اس نے سمجھا کہ دادا زلزلہ کو بھی مار سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ زلزلہ اللہ کی
ب سے آتا ہے اور وہی اس کو روک سکتا ہے۔ میں یا تم اس کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس
لہ کا مرکز اندر اگاندھی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے قریب تھا۔ اس کی وجہ سے کچھ معمولی نقصانات
ئے۔ دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں دو اونچے میناروں کے علاوہ کچھ چھوٹے مینارہیں۔ ایک
ٹے مینار کا اوپر کا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔

۲۸ جولائی کی شام کو ۰ابجے گھر سے ایئر پورٹ کے لئے روانگی تھی۔ روانگی سے پہلے سعودی
ت کے شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ العمار اور سعودی سفارت خانہ کے دو ذمہ دار ملاقات کے
آگئے۔ ان کے ساتھ مولانا عبد اللہ مدنی جھنڈا نگری بھی تھے۔ دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے
سے پوچھا کہ آپ نے اکثر ملکوں کا سفر کیا ہے۔ اسلام کے اعتبار سے کس ملک کو آپ نے زیادہ بہتر
انھوں نے کہا کہ یہ اضافی معاملہ ہے، کوئی کسی اعتبار سے بہتر ہے اور کوئی کسی اعتبار سے بہتر۔ مطلق طور
ا ایک ملک کو زیادہ بہتر نہیں کہا جاسکتا۔

انھوں نے ایک نئی بات یہ بتائی کہ فلپائن کا موجودہ شہر منیلا حقیقتۃً امان اللہ تھا۔ مسلم عہد
س کا یہی نام تھا۔ بعد کو جب اس علاقہ سے مسلمانوں کو نکالا گیا تو جہاں اور چیزیں بدل گئیں وہاں
کا نام بھی بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ تاریخ میں کتنی ہی چیزیں ہیں جن کے تشخص کو لوگوں نے بدل
ہے۔ آخرت میں جب ہر چیز اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نمایاں ہوگی تو وہی کیفیت
ا جس کو ایک شاعر نے اس طرح کہا ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے ۔۔۔ کہ تھی بات کیا ہم نے سمجھا تھا کیا

گھڑی میں گیارہ بج رہے ہیں۔ میں دہلی ایئر پورٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ انسانوں کا ہجوم

ہرطرف آتا اور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ بھاری بھاری بوجھ ہے۔ مگر ہر ایک مخصوص پہیہ دار گاڑی پر اپنا سامان رکھے ہوئے ہے۔ چکنے اور ہموار فرش پر اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ پہیہ دار گاڑی نہ ہو تو ان سامانوں کو لے کر چلنا سخت مشکل ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "سب سے بڑی ایجاد پہیہ ہے" یہ بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انسان نے پہلی بار پہیہ بنایا اس نے تاریخ انسانی کو ایک عظیم بڑھاو اعطا کیا۔ پہیہ کی ایجاد سے پہلے انسان کی تمدنی تاریخ ٹھہری ہوئی حالت میں تھی۔ پہیہ کی ایجاد نے اس کو ترقی کے سفر پر رواں دواں کر دیا۔

ایرپورٹ پر سوامی ویو گانند سرسوتی سے ملاقات ہوئی۔ وہ گنگوتری میں رہتے ہیں۔ ان کو سنیاس لئے ہوئے ۴۵ سال ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ سنیاس جیون میں تو بڑا آنند آتا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ گونگے کا گڑ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کو شبدوں میں نہیں کہا جا سکتا۔ "بہت کہا جاتا ہے، پر وہ کہنے میں نہیں آتا" انھوں نے جواب دیا۔

ان کی باتیں سننے کے بعد میں نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے لمبی تپسیا کی ہے۔ انھوں نے بہت نرمی سے جواب دیا: اور تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ جب ہوش آیا تو پتہ چلا کہ ہو رہا ہے، کیا کچھ نہیں ہے۔

دہلی سے لندن کے لئے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ روانگی کا مقرر وقت ساڑھے ۱۲ بجے تھا۔ گھڑی کی ایک سوئی بارہ پر تھی اور دوسری سوئی ۶ پر کہ جہاز میں حرکت شروع ہوئی۔ چند منٹ کے بعد ہم زمین سے بلند ہو کر فضا میں پہنچ چکے تھے۔ اسی کے ساتھ کیلنڈر میں تاریخ بھی بدل گئی تھی۔ ہم گھر سے نکلے تو جولائی کی ۲۸ تاریخ تھی، مگر اب ہم جولائی کی ۲۹ تاریخ میں داخل ہو چکے تھے۔

راستہ میں برٹش ایرویز کا میگزین ہائی لائف (High life) کا شمارہ جولائی ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون جدید کشتیوں کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا ڈریم بوٹس (Dream boats)۔ مضمون میں جدید طرز کی آرام دہ کشتیوں (Luxurious Yacht) کی خوشنما تصویریں تھیں اور ان کے بارہ میں ضروری تفصیلات درج تھیں۔ یہ کشتیاں افسانوی حد تک آرام دہ اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنا وہ ۶۰ سال پہلے کا زمانہ یاد آیا جب میں یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا جو ایک ندی کے

کنارے آباد تھا۔ اس زمانہ میں ہم لکڑی کی بنی ہوئی سادہ کشتی پر بیٹھا کرتے تھے جو لمبے بانس کے ذریعہ چلائی جاتی تھی۔ اس وقت دور دور تک بھی میرے تصور میں نہ تھا کہ موجودہ "ڈریم بوٹ" جیسی کشتیوں کا وجود بھی کہیں ہوگا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج کی دنیا کے مقابلہ میں کل کی دنیا کا بھی ہے۔

یہ کافی بڑا جہاز تھا۔ میں نے ایک ایئر ہوسٹس سے پوچھا کہ اس جہاز میں کتنی سیٹ ہے۔ اس نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ۴۰۵ سیٹیں ہوں گی۔ مگر مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ فلائٹ انجینئر سے پوچھا اس نے کہا کہ اس میں کل ۴۲۰ سیٹیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ باتوں کو کتنا کم جانتے ہیں۔

پورا جہاز بھرا ہوا نظر آیا۔ مسافروں میں زیادہ تر بنگلہ دیشی اور ہندستانی تھے۔ اتنے زیادہ ہندستانی کس لئے لندن جا رہے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ مزدوری کرنے کے لئے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں غیر ترقی یافتہ ملکوں کے جو لوگ ہیں، خواہ وہ کوئی عام آدمی ہو یا ڈاکٹر اور پروفیسر، سب ان ملکوں کے مزدور ہیں۔ وہ ان ملکوں کی اقتصادی مشین کو چلا رہے ہیں، صرف اس لئے کہ اپنے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں ان کو کچھ زیادہ اجرت مل جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کی محکومی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے حساب قربانیاں دیں، مگر یہ عظیم جدوجہد جب کامیابی کے مرحلہ کو پہنچی تو جو فرق ہوا وہ صرف یہ تھا کہ جو لوگ پہلے ہم کو سیاسی محکوم بنائے ہوئے تھے، اب انھوں نے ہم کو اپنا اقتصادی مزدور بنا لیا۔

یہ دہلی سے لندن کے لئے نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ جہاز بلندی پر پرواز کرتا ہوا تیزی سے منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پائلٹ کچھ کچھ دیر کے بعد اعلان کرتا ہے —— اب ہم پاکستان کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم ایران کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم ترکی کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم بلغاریہ کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم سوئزرلینڈ کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اس طرح بلند پروازی کے ساتھ سفر مسلسل جاری رہا۔

میں نے سوچا کہ سفر ہزاروں سال سے انسان کا ایک مسئلہ تھا۔ پیدل، گھوڑا اور کشتی جیسی چیزوں سے انسان سفر کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اہل مغرب نے ہوائی سفر کا طریقہ دریافت کیا۔ یہ گویا سفر کے مسئلہ کا ایک برتر حل (superior solution) تھا۔ اس دنیا میں وہی لوگ اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں جو کسی مسئلہ کا برتر حل دریافت کر سکیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب کسی قوم یا قوموں کا ظلم نہیں ہے، بلکہ خود مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ انسانی مسائل کا کوئی برتر حل دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکے۔

موجودہ مسلمان اس پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ جاپان کی طرح وہ صنعتی میدان میں کوئی برتر چیز انسان کو دے سکیں۔ البتہ مسلمانوں کے پاس ابدی طور پر ایک برتر حل ہے۔ یہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے۔ اسلام فکری اعتبار سے گویا ایک برتر آئیڈیالوجی ہے جو انسان کو اس کے فکری مسائل کا واحد صحیح جواب فراہم کرتا ہے۔ یہاں اسلام اور اہل اسلام کو دوسروں کے اوپر ابدی برتری حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اور رہنما ان کو احتجاج اور ٹکراؤ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو احتجاج اور ٹکراؤ کی دلدل سے نکال کر فکری اور نظریاتی میدان میں لایا جائے۔ یہاں اجارہ داری کی حد تک ان کے لئے اعلیٰ مواقع حیات حاصل ہیں۔ یہاں وہ قوموں کو دینے کی پوزیشن میں ہیں، جب کہ دوسرے پہلوؤں میں وہ صرف لینے والوں کی قطار میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ساڑھے نو گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم لندن ایرپورٹ پر اتر گئے۔ اس وقت دہلی کی گھڑیوں میں ساڑھے نو بجے کا وقت تھا مگر لندن کی گھڑیوں میں اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ سوامی ویوگانند سرسوتی نے کہا: یہاں آکر مجھ کو پہلا احساس یہ ہوا کہ ہم ساڑھے چار گھنٹے پیچھے ہو گئے۔

کانفرنس والوں نے بہت اچھا نظم کیا تھا۔ ہم تین آدمی ہوائی جہاز سے نکلے تو دروازہ پر ایک خاتون ہماری رہنمائی کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایرپورٹ کے تمام مراحل نہایت آسانی سے طے کرا دئے۔

ایرپورٹ پر کافی لوگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر تک ایرپورٹ پر ٹھہرا۔ اس کے بعد مسٹر سامی طیار کے ساتھ ایرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ مسٹر سامی طیارا ایک لبنانی مسلمان ہیں۔ ان کے والد ایک بڑے وکیل ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ مسٹر سامی لاس اینجلز (امریکہ) میں بزنس کرتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ الاسلام یتحدی کا ایک نسخہ لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ پچھلے سال لاس اینجلز کی سیرت کانفرنس میں جب میں نے سیرت پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا اس وقت بھی وہ اس اجلاس میں موجود تھے۔ مگر ان سے پہلی ملاقات لندن میں ہوئی۔ مسٹر سامی کانفرنس کے دوران میرے مساعد کے طور پر متعین کئے گئے تھے۔

لندن میں میرا قیام گرم ڈائک (Grim's Dyke) کے کمرہ نمبر ۳۰ میں تھا۔ یہ ایک تاریخی عمارت ہے جو لندن کے مضافات میں چالیس ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ اس کی تاریخ ۶۰۰ ق م تک جاتی ہے۔

موجودہ شکل میں اس کو ۱۸۷۰ میں بنایا گیا تھا۔ ۱۹۶۹ سے وہ ہوٹل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بے حد پرسکون جگہ ہے۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک گارڈن ہی گارڈن نظر آتے ہیں۔ اس میں تقریباً ۵۰ بیڈروم ہیں۔ وہ ہوٹل سے زیادہ رزورٹ معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کو ایک (his,orical country retreat) سمجھا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ خاندان کی شادیوں، خصوصی ڈنر اور کانفرنس کے لئے مشہور ہے:

Old Redding, Harrow Weald, London HA3 6SH.

۲۹ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز لندن کی سنٹرل مسجد میں پڑھی۔ ہوٹل سے مسجد تک کار سے آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ یہ سفر طے کرتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف کے مناظر ایک منظم شہر کی تصویر پیش کر رہے تھے۔ ہر چیز میں نظم اور سلیقہ نمایاں تھا۔ مثال کے طور پر راستہ میں ایک ٹرک نظر آیا جس پر پیال (دھان کا ڈنٹھل) بھاری مقدار میں لدا ہوا تھا۔ ہندستان میں جب بھی میں نے کسی ٹرک پر پیال لدا ہوا دیکھا ہے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی وحشت خیز کوڑا گاڑی سامنے سے گزر رہی ہو۔ مگر یہاں کا منظر مختلف تھا۔ یہ ایک عمدہ اور جدید ٹرک تھا۔ پیال کو مشینوں کے ذریعہ خوبصورت چوکور گانٹھوں کی صورت میں پیک کیا گیا تھا۔ یہ گانٹھیں ٹرک کے اوپر کامل نظم اور ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں جیسے کہ مرصع چوکور بنڈل اس کے اوپر سجا کر رکھ دئے گئے ہوں۔

سنٹرل مسجد میں ہم لوگ ایک بجے پہنچے۔ اس وقت لاؤڈ اسپیکر پر قرأت ہو رہی تھی۔ سوا بجے "الفاتحہ" کے ساتھ قرأت ختم ہوئی۔ اذان کے بعد ۱ منٹ کے اندر لوگوں نے سنتیں پڑھیں۔ اس کے بعد امام نے طویل خطبہ دیا۔ پہلا خطبہ عربی میں تھا اور دوسرے خطبہ کا بڑا حصہ انگریزی میں۔ نماز کے بعد امام نے سلام پھیرنے سے پہلے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بلند آواز سے کہا۔ اس کے بعد دائیں طرف منھ کرکے ایک بار صرف السلام علیکم کہا۔ البتہ مؤذن نے دونوں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔

وسیع مسجد اندر اور باہر، اوپر اور نیچے ہر طرف بھری ہوئی تھی۔ قرأت فاتحہ کے بعد آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ نمازیوں میں بڑی تعداد عربوں کی ہے۔ نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلے تو یہاں چندہ مانگنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی پوسٹر بانٹ رہا تھا۔ کوئی بلند آواز سے کوئی امدادی اعلان کر رہا تھا۔ ایک صاحب جو غالباً الجزائر کے لئے تعاون مانگ رہے تھے، وہ چیخ چیخ کر

کہہ رہے تھے: این حکام العرب من بوسنة، این حکام العرب من کشمیر۔ ایک صاحب بوسنیا کے لئے امداد کا بورڈ لگائے ہوئے تھے۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

Bosnia needs action not pity.

بورڈ پر بوسنیا کے لٹے ہوئے مکانات اور دوسرے تباہی کے مناظر تھے۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ اپنی زندگی کا مقابلہ ان سے کیجئے:

Compare your life to theirs.

میں نے کہا کہ یہ مقابلہ ادھورا ہے۔ انگلستان کے مسلمان ہم آہنگی کے اصول کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور بوسنیا کے مسلمانوں نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اب دونوں اپنی اپنی قیمت پا رہے ہیں۔ ورنہ ٹکراؤ چھیڑنے سے پہلے بوسنیا کے مسلمان بھی اسی طرح اچھی حالت میں تھے جیسے بقیہ یورپ کے مسلمان اچھی حالت میں رہ رہے ہیں۔

اس فیسٹول میں دلائی لاما، شنکراچاریہ، مدر ٹریسا وغیرہ کو بھی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر مختلف وجوہ سے وہ لوگ نہ آسکے۔ مدر ٹریسا نے اسپتال سے اپنا ایک پیغام بھجوایا تھا۔ اس پیغام کا ایک حصہ یہ تھا:

The fruit of prayer is faith,
The fruit of faith is love,
The fruit of love is service,
The fruit of service is peace

ایک سردار جی سے بات کرتے ہوئے میں نے اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا:
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا۔ انھوں نے فوراً کہا، اقبال نے تو گرونانک کو یہ بھی کہا ہے:

ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اس فیسٹول میں سب سے زیادہ حصہ مادھوانی پریوار نے لیا تھا۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں منو بھائی کی سرتا اور اڈّارتا کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ منو بھائی کو میں تاجر کے روپ میں نہیں بلکہ سنت کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ گھر گھر میں پوجا کا سنکلپ لیا ہے انھوں نے۔ شری منو بھائی مادھوانی نے اپنی تقریر میں کہا: میرے پرماتما کون ہے —— ہنومان جی۔ میں نے پانچ سو بار ہنومان جی سے اپنا دکھ درد کہا ہے۔ ہنومان جی نے پوجیہ باپو (مراری) کو بھیجا، انگلینڈ میں بھارت کی بھاؤنا قائم کرنے کے لئے۔ میں گورد

سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ما دھوائی پریاں ہی کر سکتا ہے۔

اس قسم کی باتیں لوگوں کی زبان سے سن کر میں نے سوچا کہ آدمی کو جب دین حق نہ ملے تو وہ دین امانی میں پناہ لیتا ہے۔ حتی کہ مسلمان بھی اگر قرآن سے کٹ جائیں تو دوسری چیز جہاں جا کر وہ ٹھہریں گے وہ دین امانی ہوگا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

لندن سے ۱۹۸۲ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ساڑھے تین سو صفحہ کی اس کتاب کا نام ہے —— مسلمانوں کی دریافت یورپ:

Bernard Lewis, The Muslim Discovery of Europe.

اس کتاب کے تعارف میں لندن کے اخبار سنڈے ٹائمس نے لکھا تھا کہ گیارھویں صدی عیسوی کی مسلم دنیا ایک عظیم تہذیب تھی۔ وہ ایک ایسے آرٹ اور سائنس کا مرکز تھی جو اسپین سے مڈل ایسٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ جب کہ اسی زمانہ میں یورپ تاریک ادوار (dark ages) میں پڑا سو رہا تھا۔ یہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کے بارہ میں بہت کم جانتی تھیں:

The two world knew little of one another.

کہا جاتا ہے کہ یہ جدید کمیونی کیشن سے پہلے کی بات ہے۔ ورنہ آج ساری دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ آج منٹوں میں ایک علاقہ کی خبر دوسرے علاقہ میں پہنچ جاتی ہے۔ مگر ایک اور اعتبار سے آج بھی صورت حال زیادہ مختلف نہیں۔ آج بھی مسلم دنیا بڑی حد تک مغرب کے حقیقی افکار سے ناآشنا ہے۔ اسی طرح مغربی دنیا بھی بڑی حد تک اسلام کی حقیقی تصویر سے بے خبر ہے۔ مسلم دانش ور "مغرب" کے نام سے ایک ایسی دنیا کو جانتے ہیں جو اسلام کی دشمن ہو۔ اور مغربی دانشور "اسلام" کے نام سے ایک ایسے مذہب کو جانتے ہیں جو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ دور آگہی میں بھی انسان کی بے خبری ختم نہیں ہوئی۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے لندن کو دنیا کے نمبر ایک شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ خاص شہر (the city) کہا جاتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب برٹش ایمپائر ٹوٹا تو لندن کی حیثیت بھی اسی طرح بہت کم ہوگئی جس طرح سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ماسکو کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

اسی مہینہ اگست ۱۶۶۶ میں لندن میں اس کی تاریخ کی سب سے بڑی آگ لگی تھی جس کو عظیم آگ

(great fire) کہا جاتا ہے۔ اس آگ میں لندن کا تقریباً دو تہائی حصہ تباہ ہوگیا تھا۔ تیرہ ہزار مکانات جل کر خاک ہو گئے۔

لندن کی سڑکوں پر چلنا اس سے بہت زیادہ مختلف تجربہ ہے جو دہلی میں پیش آتا ہے۔ یہاں ہارن کی آوازیں نہیں۔ ہوائی کثافت موجود ہے مگر وہ دہلی کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اگرچہ گاڑیوں کی تعداد یہاں دہلی سے زیادہ ہے۔ سڑک کے کنارے فوٹ پاتھ کی دکانداری کا یہاں کوئی وجود نہیں۔ جس علاقہ میں بھی میں گیا مجھے صفائی اور باقاعدگی نظر آئی۔ پرانی اور شور مچاتی ہوئی چلنے والی گاڑیاں کہیں نظر نہیں آئیں۔ لوگ نظم کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سڑکوں پر کہیں ٹوٹ پھوٹ دکھائی نہیں دی جو کہ دہلی وغیرہ میں عام ہے۔

ایک مرتبہ میں ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک بڑی گاڑی آواز لگاتی ہوئی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ یہ ایمبولنس کی گاڑی تھی۔ یہاں کوئی گاڑی جب بھی اس طرح سڑک پر دوڑ رہی ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ یا تو ایمبولنس کی گاڑی ہے یا فائر بریگیڈ یا پولیس کی۔ ایک عرب نوجوان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انڈیا اور یوکے میں یہ فرق ہے کہ یہاں ہر چیز میں اسٹینڈرڈائزیشن ہو چکا ہے۔ مگر انڈیا میں کسی چیز کا کوئی اسٹینڈرڈ نہیں۔ وہاں کا معروف اصول یہ ہے: سب چلتا ہے۔

برطانیہ کی اسٹیٹ جدید اصطلاح کے مطابق ویلفیئر اسٹیٹ ہے۔ یہاں تعلیم، علاج، ہر چیز فری ہے۔ قیمتیں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ ایک عرب نوجوان جو یہاں شادی کرکے رہ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنی ماں کو بلاؤں تو جب تک وہ یہاں رہیں گی، اگر میں چاہوں تو اس پوری مدت کے لئے ان کا خرچ حکومت سے وصول کر سکتا ہوں۔ ان چیزوں کا سب سے زیادہ فائدہ غالباً ہندستان اور پاکستان کے باشندوں نے اٹھایا ہے۔ لیکن اگر آپ لوگوں سے ملیں تو یہاں کے نظام سے سب سے زیادہ شاکی ہندستانیوں اور پاکستانیوں ہی کو پائیں گے۔ ملے ہوئے کو نہ دیکھنا اور نہ ملے ہوئے کو دیکھنا یہ ان کا عام مزاج بن گیا ہے۔ یہاں بھی اور خود اپنے ملک میں بھی۔

ہوٹل میں کانفرنس کے شرکاء کے لئے خالص "انڈین فوڈ" کا انتظام کیا گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا (اور پاکستان اور بنگلہ دیش) کے لوگ یہاں فوڈ کا بہت بڑا بزنس کر رہے ہیں۔ انھوں نے انڈین فوڈ کو نئے طریقہ پر بنا کر اور اس کو ماڈرن پیکنگ

کے ساتھ یہاں کامیابی کے ساتھ چلایا ہے۔ بہت سے انگریز بھی انڈین فوڈ کو استعمال کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے لوگ بھی کافی اس بزنس میں ہیں۔ مگر ہر ایک اس کو انڈین فوڈ کے نام سے بازار میں لاتا ہے نہ کہ پاکستانی فوڈ یا بنگلہ دیشی فوڈ کے نام پر۔ کیونکہ انڈین فوڈ سے اس کو شہرت ہو چکی ہے۔ کوئی اور نام چلایا جائے تو لوگوں کو وہ نامانوس معلوم ہوگا۔

میں نے کہا کہ اس کا راز انفرادی مفاد ہے۔ چوں کہ تجارت کے اعتبار سے اس میں فائدہ ہے کہ اس کو انڈین فوڈ کے نام سے بازار میں لایا جائے، اس لئے ہر تاجر بلا اعتراض اس نام کو استعمال کر رہا ہے۔ مگر جب قومی مفاد کے لئے ایسا کوئی مشترک لفظ بولا جائے تو یہی لوگ فوراً اس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیوں کہ اب ان کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ نہیں۔

یہاں آجکل رات چھوٹی ہے اور دن لمبا۔ فجر کا وقت یہاں تقریباً انڈیا کے مطابق ہے، یعنی صبح ساڑھے چار بجے۔ لیکن مغرب کا وقت یہاں آجکل شام کو ۹ بجے ہوتا ہے۔ بعض اوقات رات اور دن کا یہ فرق اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو عرصہ سے برطانیہ میں رہتے ہیں، ان سے یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض استثنائی افراد کو چھوڑ کر سارے مسلمانوں کا مذہب صرف ایک ہے، اور وہ منی (money) ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان مسلمانوں کا مذہب حقیقۃً مانوتھی ازم نہیں ہے بلکہ منی تھی ازم ہے۔ (یعنی توحید پرستی نہیں بلکہ دولت پرستی)

یہاں امرتسر کے چیف جتھے دار پروفیسر منجیت سنگھ بھی آئے ہوئے ہیں۔ ان سے چند بار ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی روایت کے مطابق، اگرچہ اپنے کندھے سے ایک کرپان لٹکائے ہوئے تھے اور ہاتھ میں بڑی تلوار لئے ہوئے تھے۔ مگر وہ اتنے میٹھے اور نرم انداز میں بول رہے تھے جیسے کہ ان کا "کرپان کلچر" سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی ہر بات میں سادگی اور متانت ٹپک رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس تلوار نہیں، مگر وہ اتنے جارحانہ انداز میں بولتے ہیں جیسے کہ وہ تلواروں کے بادشاہ ہوں۔ دوسری طرف اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس تلوار ہے مگر وہ اپنی تلوار کو اس کی روایتی حد کے اندر رکھتے ہیں۔ اپنی بولی اور اپنے عمومی سلوک میں اس کو دخیل ہونے نہیں دیتے۔

۳۰ جولائی کی صبح کو کمرہ سے باہر ٹہلنے کے لئے نکلا تو سوامی دیو گانند سرسوتی پہلے ہی سے باہر آکر ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک ہندی کتاب مجھے دی۔ یہ ۱۰۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ سوامی جی سے میں نے پوچھا کہ اس کتاب کا خلاصہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) جو سامنے دکھائی دے اس کی سیوا کرنا۔ (۲) جس کی شکتی سے دکھائی دے رہا ہے اس سے پریم کرنا۔ (۳) سیوا یا پریم کے بدلے کچھ نہ چاہنا۔ آخر میں انھوں نے کہا: کچھ نہیں چاہنے سے اپنا کام ہو جاتا ہے۔

گنگوتری میں سوامی جی کا ایک بڑا آشرم ہے۔ وہاں ہر روز تقریباً پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں۔ مگر بھوجن اور نواس کا ہمارے یہاں کوئی چارج نہیں۔ سوامی جی کے ساتھیوں نے کہا کہ اس طرح کیسے آشرم چلے گا۔ سوامی جی نے جواب دیا: آشرم تو چل ہی رہا ہے۔ پر جس دن تم چلاؤ گے اسی دن سے وہ نہیں چلے گا۔

۳۰ جولائی کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اس کا انتظام راونڈ وڈ پارک میں کیا گیا تھا جو بہت بڑا ہے۔ اس میں کافی بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا۔ ۱۰ بجے میں وہاں پہنچا تو اس کو دیکھ کر پہلا تاثر یہ ہوا کہ لندن کا شامیانہ بھی ترقی یافتہ ملک کے معیار کا ہے۔ شامیانہ سادہ بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ وہ اتنا لمبا تھا کہ ایک سرے پر کھڑے ہوں تو دوسرا سرا صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پورا شامیانہ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ باہر بھی کھڑے ہوئے نظر آئے۔

لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی نے افتتاحی تقریر کی۔ وہ نہ صرف ایک ڈپلومیٹ ہیں بلکہ مذہبیات کے ایک اچھے عالم بھی ہیں۔ اس کے بعد چند اور تقریریں ہوئیں۔ منو بھائی مادھوانی کی فیملی تنہا پوری کانفرنس کا خرچ دے رہی ہے جس کا بجٹ تین کروڑ روپیہ سے زیادہ ہے۔ منو بھائی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس سے پہلے وہ یوگنڈا میں بزنس کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ میں عیدی امین نے ان کو پکڑ کر قیدخانہ میں ڈال دیا۔ قیدخانہ میں انھوں نے گیتا اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں، اس سے ان کا ذہن بدلا۔ جیل سے رہائی پاکر وہ لندن آگئے اور یہاں دوبارہ اپنا بزنس قائم کیا۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ مذہب اور روحانیت کے پرچار کے لئے استعمال کریں گے۔ اسی کے مطابق وہ موجودہ کانفرنس کر رہے ہیں۔

آخر میں شری مراری باپو کی کتھا ہوئی جو کئی گھنٹہ تک جاری رہی۔ ان کے ساتھ تربیت یافتہ

FESTIVAL OF SPIRITUAL UNITY 1994

Chief Patron: His Excellency Dr L.M. Singhvi
High Commissioner for India

INVITATION LIST

PUJYA SANT SHRI MORARI BAPU

HIS DIVINE HOLINESS SHREE PRAMUKH SWAMI MAHARAJ

PUJYA SWAMI SATYAMITRANAND GIRIJI

PUJYA SANT SHRI RAMESHBHAI OZA

PUJYA SANT SHRI KRISHNA SHANKAR SHASTRI (DADAJI)

PUJYA SANT GOSWAMI SHREE INDIRA BETIJI

GURUDEV SHREE CHITRABHANUJI

DR. SADHAVI SADHANAJI

PUJYA MAULANA VAHIDUDIN KHAN SAHEB

PROFESSOR SARDAR MANJIT SINGHJI
(Chief Jathedar Akal Takhat)

DR MOHINDER SINGH

PUJYA SWAMI CHIDANAND SARASWATI (MUNIJI)

SWAMI YOGANAND SARASWATI

DAYARAMBAPU

PROFESSOR VIDYANIWAS MISHRA

REV. MARCUS BRAYBROOK
(Chairman of World Congress of Faiths)

SIR SIGMUND STERNBERG
(Chairman of the Council of Christians and Jews)

MOST VENERABLE DR M. VAJIRAGNANA
(Chief Sanghanayaka of Great Britain - The London Buddist Vihara)

THE MOST REV. TREVOR HUDDLESTONE
(Former Archbishop of the Indian Ocean)

TOTAL : 19 confirmed

سازندوں کی پوری ٹیم تھی۔ لمبی کتھا کے بعد انھوں نے " بولئے ہنومان جی کی جے" کہہ کر مخصوص انداز میں تقریر شروع کی۔ شری ہنومان جی کو انھوں نے رام دوار بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۸۹۳ میں جب سوامی دیویکانند امریکہ گئے تو کسی نے ان کو چڑھانے کے لئے پوچھا کہ سوامی جی، آپ کی گھڑی میں کتنا بجا ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ ایک۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔ سوامی جی نے دوبارہ کہا کہ ایک۔ کچھ دیر کے بعد اس آدمی نے پھر یہی سوال کیا۔ سوامی جی نے پھر کہا کہ ایک۔ اب اس آدمی نے مذاق کے انداز میں سوامی جی سے کہا کہ سوامی جی، آپ کیسی گھڑی پہن کر امریکہ آئے ہیں جس میں ہر وقت ایک ہی بجا رہتا ہے۔ سوامی دیوکانند نے نرمی سے جواب دیا: میرے بھائی، سادھوا دویت وادی ہوتا ہے۔ وہ دویت کو مانتا نہیں۔ اس لئے اس کی گھڑی میں تو ہمیشہ ایک ہی بجے کا سمے رہتا ہے۔ غالباً اس آدمی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بعد وہ یہ کہے کہ معاف کیجئے گا۔ میں بھی ایک بار اس عجیب گھڑی کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔

مراری باپو نے اچھی زندگی کا خلاصہ تین لفظوں میں بتایا —— ہمارے پاؤں میں بل ہو۔ ہمارے ہاتھوں میں پھل ہو۔ ہماری آنکھوں میں جل ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بل اہنکار شونیہ ہو۔ پھل ادھیکار شونیہ ہو اور جل پریم اور کرونا کا جل ہو۔

مراری باپو نے اپنی بات کی وضاحت کے لئے ایک اور قصہ سوامی دیویکانند کا سنایا۔ سوامی جی ایک بار کسی عیسائی کے یہاں گئے۔ اس نے اپنے کمرہ میں کچھ کتابیں اس طرح رکھیں کہ سب سے نیچے رام چیت مانس تھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور پھر سب سے اوپر بائبل۔ سوامی دیویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو اس نے مسکرا کر کہا کہ سوامی جی، اس کو دیکھئے۔ سوامی دیویکانند اس پر برہم نہیں ہوئے کہ ان کی مقدس کتاب سب سے نیچے رکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے اطمینان کے ساتھ کہا: فاؤنڈیشن تو بہت سندر ہے۔ یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ آدمی کس طرح اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکتا ہے۔

مراری باپو نے ایک اور قصہ اس طرح بتایا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو ہر ہفتہ دس روپیہ جیب خرچ دیتا تھا۔ بیٹا اس کو خرچ نہیں کرتا تھا بلکہ رامائن کے اندر رکھ دیتا تھا جو اس کی میز پر کھلی پڑی ہوئی تھی۔ اس طرح بہت سے روپئے اس کے اندر اکٹھا ہو گئے۔ باپ نے دیکھا تو کہا کہ تم کو پیسہ رکھنا تھا تو کہیں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح تو وہ چوری ہو سکتا ہے۔ بیٹے نے جواب دیا کہ میرا پیسہ یہاں سب سے

زیادہ محفوظ ہے۔ کیوں کہ جو چور ہوگا وہ رامائن کھولے گا نہیں۔ اور جو رامائن کھولے گا وہ چوری کریگا نہیں۔

مراری باپو کی کتھا کے آخر میں میں نے دیکھا کہ سیکڑوں لوگ اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ لوگ شاید اٹھ اٹھ کر جا رہے ہیں۔ مگر وہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہ لوگ اٹھ کر نہایت جوش کے ساتھ بالکل وارفتگی کے عالم میں زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک صاحب نے اس کو روحانی کیفیت سے تعبیر کیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ روحانیت ہو تو تماشا آخر کس چیز کا نام ہوگا۔

دہلی سے ڈاکٹر مہندر سنگھ بھی آئے تھے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہم تو اپنے کو مائنارٹی سمجھتے ہی نہیں۔ آپ دیکھئے، سکھ لوگ اس ملک میں صرف دو فیصد ہیں۔ مگر یہاں کے جاب اور یہاں کی اقتصادیات میں انھوں نے ۲۵ فیصد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پھر مائناریٹی کہہ کر ہم کیوں اپنے آپ کو گھٹائیں۔

اکال تخت کے چیف جتھے دار بھی یہاں آئے ہیں۔ ایک بار ہم دونوں ایک ہی کار میں سفر کر رہے تھے۔ روپہلے رنگ کی ایک چھوٹی کرپان وہ کندھے سے لٹکائے ہوئے تھے اور سنہرے رنگ کی بڑی تلوار اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سوا دوسو سال پرانی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ کبھی استعمال ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک سمبل ہے روحانی اتھارٹی کا۔ استعمال کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۳۰ جولائی کی شام کو ایشین ایج کی ٹیم اور سن رائز ریڈیو کی ٹیم قیام گاہ پر آئی۔ دونوں نے الگ الگ تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایشین ایج کا انٹرویو انگریزی میں تھا، اور سن رائز ریڈیو کا ہندی پروگرام کے تحت ہندی (آسان اردو) میں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ایشیائی کمیونٹی جو برطانیہ میں رہتی ہے، اس کے لئے یہاں باعزت زندگی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ کہ وہ یہاں لینے والے گروہ (taker group) بن کر نہ رہیں بلکہ دینے والے گروہ (giver group) بن جائیں۔ یہاں کے باشندوں کو محسوس ہو کہ آپ ان کے لئے نفع بخش گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کا یہی واحد راز ہے، باہر کے دیش میں اور خود اپنے دیش میں بھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہاں کے نوجوان طبقہ کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کریں۔ انھوں نے مسرت (pleasure) کو مطلق (absolute) چیز سمجھ لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسرت سے غیر محدود طور پر لطف اندوز ہوں۔ مگر ایسا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ انسان خود اپنی محدودیتوں کی وجہ سے لامحدود طور پر چیزوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ لوگ حقیقت پسند بنئے۔ زندگی کا سکھ حقیقت پسند بننے میں ہے۔ لذت پسندی کا موجودہ رجحان آپ کو آخر کار فرسٹریشن کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

دوپہر کا کھانا اجتماع گاہ میں تھا۔ ہندستانی انداز میں تھال کے اندر رکھ کر کھایا گیا۔ کھانے کے بعد جب میں بذریعہ کار ہوٹل کی طرف واپس آرہا تھا تو راستہ میں بھورے رنگ کی ایک خوبصورت عمارت دکھائی دی۔ اس میں نہایت خوبصورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا: برہماکماری اسپریچول یونیورسٹی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ منو بھائی نے ۱۹۷۲ میں جب جیل کے اندر گیتا اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس کے بعد انھوں نے ہنومان جی کو پالیا۔ وہ تاجر کے ساتھ سنت بن گئے۔ "گھر گھر میں پوجا کا سنکلپ لیا ہے انھوں نے"۔ اسی کا ایک اظہار یہ فیسٹول ہے۔ یہ سن کر میں سوچنے لگا کہ شاید ایک غیر حقیقی چیز پر بھی آدمی کو اتنا ہی یقین ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک حقیقی چیز پر۔

پچھلے دو سال کے اندر مجھے ہندو حلقوں میں جانے کا بہت زیادہ موقع ملا ہے۔ میں نے بہت زیادہ ان کو سنا ہے اور بہت گہرائی تک ان کو دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہندو سنتوں اور گروؤں کے اجتماعات میں لاکھوں لوگ دیوانہ وار آتے ہیں اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان کی باتیں سنتے ہیں۔ مگر میرا آخری تاثر یہ ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو سائنٹفک اصول پر قائم ہے۔ بقیہ تمام مذاہب، تحریف کے نتیجہ میں، غیر معقول صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اب وہ یا تو طلسماتی افسانے ہیں یا روحانی شاعری۔ کسی بھی دوسرے مذہب کی کوئی سائنٹفک بنیاد نہیں۔ دوسرے مذاہب پر لوگ اس لئے قائم ہیں کہ وہ ان کو ایک روایتی ضمیمہ کے طور پر لئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے مذہب پر اپنی عقل کو استعمال کریں تو شاید کوئی بھی ان مذاہب کو اختیار نہ کرسکے۔

تاہم یہ بات میں قرآن وسنت والے اسلام کے بارہ میں کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک اس اسلام کا تعلق ہے جس کی نمائندگی موجودہ زمانہ کے مسلمان کر رہے ہیں، وہ بھی بڑی حد تک غیر معقول صورت اختیار کر چکا ہے۔ وہ اضافوں کے نتیجہ میں دین بدعت ہے نہ کہ دین مسنون۔ کچھ مسلم مفکرین نے بطور خود اسلام کا ایک "انقلابی اڈیشن" نکالا ہے۔ مگر یہ انقلابی اڈیشن حقیقۃً ایک محرف اڈیشن ہے۔ اس خود ساختہ اسلام نے لوگوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے انھیں اسلام سے دور کر دیا ہے۔ مسلم ملکوں میں بھی اور غیر مسلم ملکوں میں بھی۔

اس قسم کے کچھ انقلابی نوجوانوں سے لندن میں ملاقات ہوئی۔ ان کا تعلق تونس سے تھا۔ انھوں نے آٹھ صفحہ کا اپنا "نشریہ سیاسیہ" دیا جس کو وہ مہینہ میں دوبار شائع کرتے ہیں۔ اس "نصف شہریہ" کا نام ہے، تونس الشہید۔ یعنی مقتول تونس۔ ان کے نزدیک تونس کے موجودہ حکمرانوں نے تونس کو اسلامی اعتبار سے قتل کر ڈالا ہے۔ اسی قسم کے جنونی لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس موت کی خوراک تو بہت ہے، مگر ان کے پاس آج کے انسان کے لئے زندگی کا کوئی پیغام نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مکمل اسلام کے علم بردار ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس محرف اسلام کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

۳۱ اگست کو فیسٹیول کا دوسرا دن تھا۔ مخصوص روایتی انداز میں ہم لوگ جلسہ گاہ کے اندر لیجائے گئے۔ جب میں ڈائس پر پہنچ کر اپنی نشست گاہ پر بیٹھا تو نظر آیا کہ لمبا پھیلا ہوا شامیانہ اس سرے سے اس سرے تک پورا بھر چکا ہے۔ لوگ وقت سے پہلے ہی آکر اپنی جگہ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ہر روز تمام شرکا کو مفت لنچ دیا جاتا ہے۔ آج سولہ ہزار افراد نے یہاں کھانا کھایا۔ اگر واپس جانے والوں کی تعداد کو شامل کر لیا جائے تو غالباً تمام شرکا کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہوگی۔

آج پہلی تقریر ایک جینی پیشوا شری چترbھانو جی کی ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ ۲۰ سال کے تھے تو انھوں نے مہاویر کا ایک واقعہ پڑھا۔ اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ جس طرح چھوٹے سے بیج کے اندر ایک پورا درخت ہوتا ہے، اسی طرح تمہاری آتما کے اندر پرماتما چھپا ہوا ہے۔ اس کو جان لو تو تم پرماتما ہو جاؤ گے۔ اس کو پڑھ کر میرے اندر انقلاب آگیا۔ اس کے بعد میں سنیاس لے کر گھر سے نکل گیا۔ اب میں ۷۰ سال کا ہوں۔ اب بھی روزانہ اٹھارہ گھنٹہ

کام کرتا ہوں، پر مجھ کو تھاک نہیں لگتی ہے۔ اس لئے کہ میں آپ لوگوں کا آشیرواد لیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ رام اجودھیا میں نہیں ہے، رام گھٹ گھٹ میں ہے۔

ان کا ایک سنٹر بمبئی میں ہے اور دوسرا امریکہ میں۔ اس کا نام جین میڈیٹیشن سنٹر ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں امریکہ گیا تو وہاں میں نے دیکھا کہ گائے جب تک دودھ دیتی ہے لوگ اس کو پالتے ہیں۔ اور جب دودھ دینا بند کر دیتی ہے تو وہ فوراً سلاٹر ہاؤس کو ٹیلی فون کرتے ہیں کہ یہ گائے ہم کو نہیں چاہئے۔ اس کے بعد سلاٹر ہاؤس والے اس گائے کو ذبح کرنے کے لئے اٹھالے جاتے ہیں اور دوسری گائے ان کے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ آج کے بعد میں دودھ، مکھن، دہی، کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ آج تک میں اسی پر قائم ہوں۔

اس طرح چند تقریریں ہوئیں۔ ۱۲ بجے مائک پر اعلان کیا گیا کہ اب شری پوجیہ مراری باپو کے چرنوں میں پرارتھنا ہے کہ وہ اپنی کتھا سے ہم سب کو آشیرواد دیں۔ حسب معمول آٹھ سازندوں کی ٹیم کے ساتھ انھوں نے اپنی کتھا شروع کی۔ انھوں نے گوسوامی تلسی داس کی راماٹن کا ایک حصہ پڑھا۔ کتھا کے آغاز میں بہت دیر تک "شری رام جے رام جے جے رام" کا لفظ آتا تھا۔ ہندو ذہن میں رام کا درجہ وہی ہے جو مسلمان کے ذہن میں خدا کا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جینی پیشوا نے ان کے جلسہ میں رام پر تنقید کی مگر اس پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

۳۱ جولائی کی شام کو ایک ہندو خاتون مسز دیوی پانڈے کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں اور میرے شوہر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے مجھ کو یہاں کے فیسٹیول میں دیکھا تھا۔ جب وہ میرے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان کو دیکھ کر بظاہر یہ خیال ہوا کہ وہ لندن کے ان ہندستانیوں میں سے ہیں جو یہاں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر بیٹھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر دونوں رونے لگے۔ آنسوؤں کے ساتھ انھوں نے اپنی کہانی سنائی۔ یہ کہانی وہی تھی جس کا یہاں کے حالات کے اعتبار سے میں نے پہلے ہی قیاس کر لیا تھا۔ ان کا لڑکا جو پہلے والدین کا بہت وفادار تھا، اب ایک غیر مذہب لڑکی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ اکثر وہ اسی لڑکی کے ساتھ رہتا ہے۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں اور باپ کو اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ماں نے کہا کہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں زہر کھا کر

پنے کو ہلاک کرلوں۔ باپ نے کہا کہ میری نیند اڑگئی ہے۔ آجکل میں روزانہ گولی کھاکر سوتا ہوں۔
یرہ۔
یو کے کی بظاہر خوشنما زندگی کے پیچھے جو تلخ حقائق ہیں، اس کو اگر لوگ جان لیں تو دہلی
ے برٹش ہائی کمیشن میں ویزا کے لئے لائن لگانے والوں کی تعداد بہت کم ہو جائے۔
اگلے دن مذکورہ نوجوان مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ان سے شادی کے مسئلہ پر بات کرتے
ے میں نے کہا کہ آپ لوگ جس چیز کو لو میرج کہتے ہیں وہ حقیقۃً لسٹ میرج ہوتی ہے۔ اگر یہ بات نہ
تو کیوں ایسا ہے کہ لو میرج زیادہ تر ٹوٹ جاتی ہے اور لورس کے درمیان شکایت کے ساتھ
ر کار جدائی ہو جاتی ہے۔ حقیقی محبت کبھی اس طرح ٹوٹ نہیں سکتی۔ میں نے کہا کہ چند سال
ے تجربہ کے بعد آپ مجھے خط لکھئے گا کہ آپ کی بات صحیح تھی یا میری بات۔
فیسٹیول کے منتظمین نے ایک پروگرام مختلف مذاہب کے تعارف کا رکھا تھا۔ ۳۱ اگست کی شام
سکھ ازم کے تعارف کا دن تھا۔ ہوٹل کے لان میں اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ اکال تخت امرتسر کے
یف جتھیدار پروفیسر منجیت سنگھ نے یہ ذمہ داری ادا کی۔ پہلے انھوں نے ہارمونیم پر گرو گرنتھ صاحب
ایک حصہ پڑھا۔ ہارمونیم وہ خود بجا رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سکھ دھرم کا تعارف کرایا۔
انھوں نے بتایا کہ سکھ دھرم میں گرنتھ (گرو گرنتھ صاحب) کو زندہ گرو مانا گیا ہے۔ امرتسر
ے بڑے گردوارہ میں اس کو پالکی پر اِدھر سے اُدھر منتقل کیا جاتا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں ۳۶
پرشوں کا کلام ہے۔ ہندو اور مسلمان، یہاں تک کہ شودر کا کلام بھی۔ اس میں سدنا قصائی کا کلام
ی موجود ہے جو مسلمان تھے اور قصائی کا کام کرتے تھے۔ پھر ان کو گیان پراپت ہوا اور اپنا پیشہ
موڑ کر سنت بن گئے۔
گولڈن ٹمپل (سورن مندر) کے بارہ میں انھوں نے بتایا کہ یہ انگریزوں کا دیا ہوا نام
ہے۔ اس کا اصل نام ہری مندر صاحب ہے۔ انھوں نے کہا کہ سکھ ازم میں میری اور پیری دونوں ایک
ں۔ یعنی سیاست اور مذہب دونوں کو ہم ایک سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں جو مذہبی پیشوا ہوتا ہے
ہی سیاسی سردار بھی مانا جاتا ہے۔
ان کی تقریر سننے کے بعد ایک ہندو نے مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا: جب گولڈن ٹمپل کا

نام بھی مندر ہے تو پھر ہندو اور سکھ میں جھگڑا کیوں۔

۳۱ اگست کو دن کے کھانے کے وقت میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی سوامی چیدانند کی تھی۔ اس کے بعد کی کرسی پر ایک صاحب آکر بیٹھ گئے اور سوامی جی سے باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر سادہ اور بظاہر غیر اہم تھے کہ کوئی ناواقف آدمی ان کو دیکھ کر یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی مالدار آدمی ہوں گے۔ سوامی جی نے بعد کو بتایا کہ یہ مسٹر سری چند ہندوجا تھے جو پچاس ہندستانی برلا کے برابر ہیں۔ اس قسم کے ہندو تاجر مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بہت بڑے بڑے بزنس کرتے ہیں اور ہندو اداروں اور تحریکوں کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ مالی تعاون دے رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلم ادارے عرب حکمرانوں کے تعاون سے چل رہے ہیں اور ہندو ادارے ہندو تاجروں کے تعاون سے۔ یورپ اور امریکہ میں بہت بڑے ہندو ادارے ہیں جن کا بجٹ کروڑوں ڈالر سالانہ ہوتا ہے۔ یہ سب ہندو تاجروں کے تعاون سے پورا ہوتا ہے۔ آجکل انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم اٹھارہ جلدوں میں چھپ رہی ہے۔ اس میں میکملن (ناشر) نے ۳۲ کروڑ روپیہ لگایا ہے اور ہندو تاجروں نے ۲۰ کروڑ روپیہ فراہم کیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام اسلامی ادارے پٹرو ڈالر کی خداداد دولت کے ذریعہ چل رہے ہیں نہ کہ خود اپنی کمائی ہوئی دولت سے۔ مگر کم از کم میں نے کسی بھی اسلامی ادارے کے لوگوں کو اس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نہیں سنا۔ تمام لوگ اس کو خود اپنے فضل و کمال کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو چیز سب سے زیادہ کمیاب ہوگئی ہے وہ یہی شکر ہے۔

ایک کٹر ہندو بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ ماننا ہے کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ دوسرے مذہبوں کو وہ لوگ سچا مذہب نہیں مانتے۔ ایسی حالت میں انڈیا میں ہندو مسلم ایکتا کیسے آسکتی ہے۔ آپ مسلمانوں کو سمجھائیے کہ وہ ہندو مذہب کو بھی اسلام ہی کی طرح سچا مانیں۔ ورنہ ہندستان میں رہنا ان کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ عیسائی لوگ بھی صرف اپنے مذہب کو سچا مذہب سمجھتے ہیں۔ پھر آپ لوگ یہاں کس طرح ان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۰۷

۱ جدہ سے نکلنے والے اخبار اردو نیوز کے نمائندہ مسٹر اسلم جمشید پوری نے ۷ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ خلیج میں بسنے والے ہندستانی مسلمانوں کو آپ کا مشورہ کیا ہے۔ کہا گیا کہ صرف ایک مشورہ ہے۔ یہ کہ وہ ڈبل اسٹینڈرڈ نہ بنیں۔ یہ مسلمان خلیج میں وہاں کے نظام سے آخری حد تک ایڈجسٹ کرکے رہتے ہیں۔ مگر ہندستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے وہ ٹکراؤ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان کو مسلمانوں سے کہنا چاہئے کہ ہم ایڈجسٹ کرکے کامیاب ہیں، تم بھی ایڈجسٹ کرکے کامیابی حاصل کرو۔

۲ دوردرشن (نئی دہلی) نے ۷ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا۔ یہ انٹرویو مساجد کے مسئلہ کے بارہ میں تھا۔

۳ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۸ جنوری ۱۹۹۶ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس میں بارہ امریکی پروفیسر شریک تھے۔ خصوصی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور ہندستانی مسلمان کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔

۴ ورلڈ کانگرس (World Environment Congress) کا چوتھا اجلاس ۱۱ جنوری ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانیت کی حقیقی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تشدد اور مادہ پرستی کی فضا ختم کی جائے اور امن اور روحانیت کا ماحول دنیا میں پیدا کیا جائے۔

۵ گوونددن (مہرولی) میں ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ کو ایک جلسہ ہوا۔ شرکاء میں زیادہ تر مغربی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذہب اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔

۶ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع انتخابی اصلاح تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انتخابات کو بہتر بنانے کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۷ ناٹرڈیم یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر فریڈ ڈالمیر (Fred Dallmyr) ۱۷ جنوری ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز میں آئے۔ وہ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام مکمل طور پر امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ صرف دفاعی ہے اور دفاعی جنگ بھی اس وقت ہے جبکہ اس کو اوائڈ کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہو۔

۸ انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر راہل دتہ نے ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ایک شخص اپنے مذہب کے لوگوں سے محبت کرتے ہوئے دوسرے مذہب کے لوگوں سے بھی یکساں محبت کر سکتا ہے۔ دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ وہ اپنی ماں سے محبت کرتے ہوئے یکساں درجہ میں اپنے باپ سے بھی محبت کرتا ہے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں۔

۹ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (اوکھلا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۸ جنوری ۱۹۹۶ کو اس کے تربیتی کیمپ میں شرکت کی اور وہاں ایک تقریر کی۔ موضوع تھا: دعوت کے ضمن میں تاریخی اور نفسیاتی مسائل۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام تھا۔

۱۰ مسٹر یوگندر سیکند (جے این یو) تبلیغی جماعت پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ۲۴ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت مکمل پیغمبرانہ کام کر رہی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تبلیغی جماعت ایک نہایت مفید کام کر رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو لڑائی جھگڑے سے ہٹا کر انھیں دینی کاموں میں مشغول کر رہی ہے۔

۱۱ بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع (۱۶-۱۸ اکتوبر ۱۹۹۵) میں ہر سال کی طرح اس بار بھی مکتبہ الرسالہ کا اسٹال لگایا گیا۔ ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد نے الرسالہ مشن سے دلچسپی کا اظہار کیا اور بڑی تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔

۱۲ ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع مذہب، سیاست اور جرائم تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ مذہب بذات خود محبت اور انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر کچھ لوگ مذہب کا غلط استعمال کرکے اس کو بدنام کرتے ہیں۔ تاہم مذہب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے مذہب کی اصولی تعلیمات کو دیکھنا چاہئے نہ کہ کچھ لوگوں کی طرف سے مذہب کے غلط استعمال کو۔

۱۳ ۱۳ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز نے میوات (ہریانہ) کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ اور علاقہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اس دورہ کی تفصیل انشاءاللہ "نیا میوات" کے عنوان سے الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۴ جاپان ایمبیسی (نئی دہلی) میں ۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ کو ایک علمی میٹنگ ہوئی۔ اس میں جاپان کے سفیر کے علاوہ ٹوکیو یونیورسٹی کے دو جاپانی پروفیسر ڈاکٹر دیا کاجی (Yamakage) اور ڈاکٹر یموچی (Dr M Yamauchi) شریک ہوئے۔ دہلی کے کچھ سینئر پروفیسر بھی اس میں موجود تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے سفیر جاپان کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے وہاں اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کے لئے دوسرے مسلم ملکوں سے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

۱۵ فاؤنڈیشن آف ایمیٹی اینڈ نیشنل سالیڈیریٹی (دہلی) کی طرف سے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۵ کو پارلیمنٹ انکسی میں ایک فنکشن بڑے پیمانہ پر کیا گیا۔ یہ فاؤنڈیشن کی گیارہویں سالگرہ پر کیا گیا تھا۔ اس میں پرائم منسٹر نرسمہاراؤ بھی شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انڈیا مسلمانوں کے لئے پرابلم کنٹری نہیں ہے۔ یہاں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے امکانات موجود ہیں۔

۱۶ سری نگر کی ٹی وی ٹیم نے ۲۴ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کے پانچ لکچر ریکارڈ کئے۔ ان تقریروں کا مشترک موضوع تھا: جدید دور میں اسلامی فکر۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام ہماری زندگی کے ہر مرحلہ میں کامیاب رہنمائی دیتا ہے۔ تاہم ہر زمانہ میں ضرورت ہوتی ہے کہ نئے حالات کو سمجھا جائے اور اسلام کو از سر نو وقت کے حالات پر منطبق کیا جائے۔

۱۷ میڈیا اسٹار (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر نقوی نے ۴ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر شخصی تجربات اور الرسالہ مشن کے بارے میں تھا۔ آنے والے ملکی انتخابات سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ حالت میں ہندستانی ووٹر کے لیے جو چوائس ہے وہ مسٹر کرپٹ اور مسٹر کلین کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ اصل چوائس مسٹر کرپٹ اور شری بھرشٹ کے درمیان ہے۔ ایسی حالت میں ملک کے سیاسی مستقبل کی تعمیر کے لیے الکشن کا رول بہت کم ہو جاتا ہے۔

۱۸ ارن کول پروڈکشن (نئی دہلی) نے دور درشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ کو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کشمیر کے مسلمان اقبال کے پرستار ہیں۔ مگر وہ اقبال کے اس شعر کا مصداق بن رہے ہیں:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

۱۹ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس کے اسسٹنٹ اڈیٹر پارسا ونکٹیشور راؤ نے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے تازہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمان اب مایوسی کے دور سے نکل کر امید اور اعتماد کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ اب کوئی بھی چیز ان کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

۲۰ کیتھڈرل چرچ آف ریڈیمپشن (نئی دہلی) میں کرسمس کے موقع پر ۲۷ دسمبر ۱۹۹۵ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مختلف فرقوں اور مذہبوں کے درمیان میل ملاپ کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۲۱ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز کپنا نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ ۱۹۹۶ ملک کے لئے کیسا سال ہوگا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خدا نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر نراشا کے ساتھ ایک آشا کا پہلو موجود ہو۔ اس لئے یقینی ہے کہ آنے والا سال امیدوں کا سال ہوگا۔

۲۱ اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کے تحت چترکوٹ (مدھیہ پردیش) میں ۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ کو آل انڈیا سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں خطابات اور ملاقاتوں کا پروگرام رہا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۲۲ ہندی روزنامہ ہندستان (دہلی) کے نمائندہ مسٹر اودھیش کمار نے ۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل سے متعلق تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے بہترین انتخابی پالیسی یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ کوئی آل انڈیا پالیسی نہ بنائیں بلکہ مقامی حالات کے لحاظ سے اپنی پالیسی وضع کریں۔

۲۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں مذاہب کا رول۔ اس میں بتایا گیا کہ معاشرہ کو بنانے میں مذہب کا رول نہایت بنیادی ہے۔ انسانی معاشرہ میں اسی وقت سے بگاڑ آیا ہے جب کہ اس پر سے مذہب کا اثر کم ہو گیا۔

۲۶ سمواد پریکرما ٹیلیویژن کی ٹیم نے اے این آئی کے لئے ۵ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اگلے الکشن میں مسلمانوں کی سیاست کا رخ کیا ہوگا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اب زیادہ حقیقت پسند ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ اس بار ان کی بڑی تعداد منفی ووٹ نہ دے کر مثبت ووٹ دے گی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۰ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۶

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا اخلاق تمام امت کے لیے نمونہ ہے۔ آپ کا اخلاق کیا تھا، اس کی بابت قرآن (القلم ۴) میں ارشاد ہوا ہے کہ بیشک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو (وانك لعلیٰ خلق عظیم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امت کو اسی بلند اخلاق کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

لا تکونوا اِمَّعَةً تقولون اِن احسن الناس اَحسنّا و اِن ظلموا ظلمنا ولکن وطّنوا انفسکم، ان احسن الناسُ اَن تُحسنوا و ان اساؤوا فلا تظلموا۔

(الترمذی)

تم لوگ امعہ نہ بنو کہ یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی اچھا کریں گے اور لوگ ہمارے اوپر ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ بلکہ تم اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ کرو کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو تم بھی اچھا سلوک کرو اور اگر وہ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اچھے کے ساتھ اچھا اور برے کے ساتھ برا یہ لین دین والا اخلاق ہے۔ اس قسم کے اخلاق کی اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ جو آدمی اپنے عمل کی قیمت دنیا ہی میں لے لے اس نے گویا دنیا ہی میں اپنا معاملہ برابر کر لیا۔ اس کے عمل کی آخرت میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ حقیقی اخلاق وہ ہے جو اعلیٰ اخلاق ہو، جو اصول کی پابندی میں برتا گیا ہو نہ کہ مفاد اور مصلحت کی پابندی میں۔

اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی۔ بلکہ اخلاق اس کے لیے ناقابل تغیر اصول کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہ دوسروں کے رویہ سے بے پروا ہو کر خود اپنے اصول کے تحت اپنی روش کا تعین کرے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ برا سلوک ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

یہی سچا اسلامی اخلاق ہے۔ اس قسم کا اخلاق ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک با اصول انسان ہیں۔ حالات آپ کے کردار کا تعین نہیں کرتے بلکہ خود آپ کا سوچا سمجھا اصول آپ کے کردار کا تعین کرتا ہے۔

۴ الرسالہ جولائی ۱۹۹۶

چپ رہنا

عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مــن صمت نجا۔ یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۳۶۰) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: الصمتُ حکمٌ وقلیل فاعلُه۔ یعنی خاموشی حکمت ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پر عمل کرتے ہوں (المفردات فی غریب القرآن، ۱۲۷)

خاموشی بے عملی نہیں، خاموشی خود ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا صاحبِ دماغ ہونا ہے۔ اور خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی واقعۃً دماغ والا انسان ہے۔ وہ اپنے اندر ذہنی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چپ رہنا سوچنا ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو وہ سادہ طور پر صرف چپ نہیں ہوتا، وہ اس وقت غور وفکر میں مشغول ہوتا ہے۔ اور غور وفکر بلاشبہ سب سے بڑا عمل ہے۔ بولنا اگر اعضاء وجوارح کی حرکت کا نام ہے تو چپ رہنا دماغ کی حرکت کا نام۔ بولنا اگر آدھا عمل ہے تو چپ رہنا پورا عمل۔

چپ رہنا سنجیدگی کی علامت ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے یہ سوچ رہا ہے کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔ وہ دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو مخاطب بنا رہا ہے۔ وہ عاجلانہ اقدام کے بجائے سوچے سمجھے اقدام کا منصوبہ بنانے میں مشغول ہے۔

بولنا بے صبری ہے اور چپ رہنا صبر ہے۔ بولنا بے احتیاطی ہے اور چپ رہنا احتیاط ہے۔ بولنا غیر ذمہ دارانہ انداز ہے اور چپ رہنا ذمہ دارانہ انداز۔ بولنا محدودیت ہے۔ جو آدمی بول دے اس کی گویا حد آگئی، مگر چپ رہنا لامحدودیت ہے۔ جو آدمی چپ ہو وہ اتھاہ آدمی ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کی ابھی حد نہیں آئی۔ بولنے والا آدمی فوراً بول پڑتا ہے، اور چپ رہنے والا آدمی اس وقت بولتا ہے جب کہ تمام لوگ اپنے الفاظ ختم کر چکے ہوں۔

اسلام آدمی کے اندر خود احتسابی اور غور وفکر کا مزاج بناتا ہے۔ وہ ایسے افراد تیار کرتا ہے جو سوچنے والے ہوں، جو بولنے سے زیادہ چپ رہنے کو محبوب رکھتے ہوں۔

ترک تعلق

قطع تعلق اور ترک کلام کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت ہے کہ :

لا یحل للرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال، یلتقیان فیُعرض ھذا ویعرض ھذا۔ وخیرھما الذی یبدأ بالسلام۔	کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ دونوں ملیں تو ایک ادھر منہ پھیر لے اور دوسرا اُدھر منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے

ایک روایت میں ہے کہ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ہر اس بندہ کو بخش دیا جاتا ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا ہو سوا اس آدمی کے جس کی اپنے بھائی کے ساتھ عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے بارہ میں انتظار کرو، یہاں تک کہ وہ آپس میں اپنے تعلق کو درست کرلیں (مسلم)

ایک روایت کے مطابق ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے بھائی سے ایک سال تک تعلق توڑے رہے تو وہ اس کا خون بہانے کے برابر ہے (ابوداؤد) سنن ابوداؤد میں ایک اور روایت اس طرح ہے :

لا یحلُّ لمسلم ان یھجرَ اخاہ فوق ثلاث۔ فمن ھجر فوق ثلاث فمات دخل النار۔ (سنن ابی داؤد ۴/۲۸۱)	کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ پس جو شخص تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے اور اسی حال میں مرجائے تو وہ آگ میں داخل ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی سے غصہ ہو کر اس سے تعلق توڑ لیتا ہے اور اس سے بولنا بند کر دیتا ہے۔ یہ برائی مردوں میں بھی ہے اور عورتوں میں بھی۔ مگر یہ سخت گناہ ہے۔ وہ اتنا زیادہ سنگین ہے کہ آدمی اپنی اصلاح نہ کرے اور اسی حالت میں اس پر موت آجائے تو نماز روزہ کے باوجود سخت اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔

درود وسلام

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ـــــ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر صلاۃ (درود) بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو (الاحزاب ۵۶) علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی صلاۃ (درود) رسولؐ پر رحمت بھیجنا ہے۔ فرشتوں کا درود استغفار کرنا ہے اور اہل ایمان کا درود دعا کرنا ہے۔

نبی پر درود وسلام کے بارے میں تفسیروں اور حدیث کی شرحوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس پر بہت سی مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً شیخ شمس الدین سخاوی کی کتاب القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع، وغیرہ۔

حدیث (النسائی، الترمذی) میں ہے کہ وہ شخص بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے (البخیل مَن ذُکِرتُ عندہ فلم یُصلِّ علیّ) حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا آپ کے احسان عظیم کا شکر ادا کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دیا۔ آپ نے انسانی تاریخ کو نزاعی نبوت کے دور سے نکال کر تسلیم شدہ نبوت کے دور میں پہنچایا۔ دین توحید کو تحریف کے دور سے نکال کر محفوظ دین کے دور میں پہنچایا۔ انسانی تمدن کو توہمات کے دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچایا۔ خدا کے کلمہ کو مغلوبیت کے دور سے نکال کر غلبہ کے دور میں پہنچایا۔ شریعت الٰہی کو غیر کامل دور سے نکال کر کامل دور میں پہنچایا۔ دین حق کو غیر تاریخی دور سے نکال کر تاریخی دور میں پہنچایا، وغیرہ۔

یہ تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے مشکل مشن تھا۔ اس مشکل ترین مشن میں آپؐ کے ساتھ آپ کے اصحاب اور آپ کے اہل خاندان نے ہر وہ قربانی پیش کی جو اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار تھی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ قیامت تک تمام لوگ رسولؐ پر اور اس مقدس جماعت پر درود وسلام بھیج کر اس کے احسانِ عظیم کا اعتراف کریں۔

جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود وسلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعا کی صورت میں اعتراف ہے۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ سیّدنا محمّد وعلی وآلہ وصحبہ وسلّم۔

خودشکن بنئے

سبکتگین ایک ترکی غلام تھا، سامانی (ایرانی) حکمرانوں نے اس کو غزنہ (افغانستان) کا گورنر بنایا۔ بعد کو حالات سے فائدہ اٹھاکر اس علاقہ میں اس نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ وہ ۹۷۷ء سے لے کر ۹۹۷ء تک اس غزنوی سلطنت کا حکمراں رہا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اس سلطنت کا حکمراں بنا جو محمود غزنوی (۱۰۳۰ - ۹۷۱) کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ۱۰۲۴ء میں پہلی بار سومناتھ (گجرات) پر حملہ کیا۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں شیو کا مندر ہے اور اس کے اندر بڑی مقدار میں سونا موجود ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مندر کو توڑ کر اس کا سونا حاصل کرے۔

اس سے پہلے ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے پشاور کے قریب راجہ جیپال کا مقابلہ کیا تھا۔ اس وقت محمود غزنوی کے پاس صرف پندرہ ہزار فوجی تھے۔ اس کے مقابلہ میں راجہ جیپال کے فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، حتیٰ کہ اس کے پاس ۳۰۰ ہاتھی بھی تھے۔ مگر محمود غزنوی نے اس مقابلہ میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اوپر اس کا ایک فوجی رعب قائم ہوگیا۔

چنانچہ محمود غزنوی جب اپنے لشکر کو لے کر سومناتھ پہنچا تو یہاں کے پنڈتوں نے اس سے مل کر یہ پیش کش کی کہ آپ ہمارے مندر کو نہ توڑیں۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو بڑی مقدار میں سونا، چاندی پیش کر دیں گے۔ محمود غزنوی نے اس کے جواب میں کہا: من بت شکنم نہ بت فروش۔ یعنی میں بت کو توڑنے والا ہوں نہ کہ بت کو بیچنے والا۔

محمود غزنوی نے اپنے آپ کو اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مگر اس کے اس فعل کا کوئی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بت شکنی اسلام کا کوئی اصول نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خودشکن بناتا ہے نہ کہ بت شکن۔ اور کسی مندر کا یا کسی بھی ادارہ کا خزانہ لوٹنا تو اس سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ وہ سراسر حرام ہے۔

خودشکن بننا یہ ہے کہ آدمی خواہش کے پیچھے نہ چلے بلکہ اصولِ حق کا اتباع کرے۔ وہ کبر کی نفسیات سے اوپر اٹھے اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ ذاتی مفاد کے بجائے انصاف کو اہمیت دے۔ وہ خودپرست کے بجائے خداپرست بن جائے۔

شریعت کا حکم

اسلامی شریعت کا ایک متفقہ مسئلہ ہے : المشقۃ تجلب التیسیر (مشقت آسانی کا موجب ہوتی ہے۔) یعنی جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو تو ایسے حالات میں خود شرعی حکم کو نرم کر دیا جاتا ہے، نہ یہ کہ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر شریعت کی تعمیل پر اصرار کیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک مسلمان پر حج کی عبادت فرض ہو چکی ہے، مگر اس کے لئے حج کے سفر کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ کسی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے تو ایسی حالت میں یہ حکم نہیں دیا جائے گا کہ تم جان و مال کا خطرہ مول لے کر حج کے لئے نکلو، بلکہ خود حج کا فریضہ اس کے اوپر سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص مرض میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آیا اور اس پر نماز کی ادائیگی فرض ہوگئی لیکن اندیشہ ہے کہ اگر وہ پانی سے وضو کرے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم جان پر کھیل کر وضو کرو۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ تم مٹی سے تیمم کر کے اپنی نماز ادا کر لو۔ اسی طرح ایک شخص بھوکا ہے اور وہ ایسے حالات میں ہے کہ وہاں خنزیر کے گوشت کے سوا کوئی اور چیز اس کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس وقت اس سے شریعت کا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ خواہ تم بھوک سے مر جاؤ مگر حرام گوشت کا کوئی ٹکڑا اپنے منہ میں مت ڈالو۔ اس کے برعکس ایسے مضطر شخص کے لئے خنزیر کے گوشت کو کھانا جائز قرار دیدیا جائے گا۔ وغیرہ۔

شریعت کا ہر حکم استطاعت کے ساتھ مشروط ہے (التغابن ۱۶) اسی کو حدیث میں ان الفاظ میں فرمایا کہ : اذا امرتکم بامر فأتوا منہ ما استطعتم (بخاری ومسلم) یعنی جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اس میں سے جتنا تمہارے بس میں ہو اتنا کرو۔

یہ شریعت کا ایک نہایت اہم اصول ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے علما اس اصول کو صرف جزئی مشقتوں پر منطبق کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں شاید کوئی بھی عالم نہیں جو اس شرعی اصول کو بڑی بڑی مشقتوں کے معاملہ میں چسپاں کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس کوتاہی کا بے پناہ نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر مسلم علاقہ میں "سیاسی انقلاب" کے نام سے تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا براہ راست ٹکراؤ حکومت وقت سے ہوتا ہے۔ حکومت وقت ان تحریکوں کو اپنے لئے سیاسی خطرہ سمجھ کر ان پر پابندی لگاتی ہے۔ اس کے بعد تحریکوں کے علمبردار تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال کرکے ان تحریکوں کو کچلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ آج دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں مختلف صورتوں میں پیش آ رہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں، اور وہ شکایت اور احتجاج ہے۔ وہ تحریک چلانے والے لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ حکمرانوں کو اسلام دشمن قرار دے کر رات دن وہ ان کی مذمت میں مشغول ہیں۔

یہ طریقہ واضح طور پر اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ جب شریعت یہ کہتی ہے کہ جس حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو رہا ہو وہ عمل مسلمانوں سے رفع کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ نوعیت کی تباہ کن سیاست کا مطلب اپنے آپ کو ایک ایسے حکم کا مکلف بناتا ہے جس کا مکلف شریعت نے ان کو نہیں کیا۔

جب یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مشقت کے موقع پر شریعت حکم کو آسان کر دیتی ہے تو یہی اصول اس سیاسی معاملہ میں بھی اپنایا جائے گا جس طرح وہ عبادت اور اکل وشرب کے معاملہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حکم کا تعلق جس طرح عبادت سے ہے اسی طرح جہاد سے بھی ہے۔

آج اگرچہ ہر ملک میں یہ صورت حال ہے کہ حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنے میں مشقت پیش آ رہی ہے۔ مگر عین اسی وقت ہر ملک میں غیر سیاسی میدان میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً تعلیم وتربیت، معاشی تعمیر، اصلاح معاشرہ، دعوت وتبلیغ، وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے نہایت قیمتی کام ہیں جو غیر سیاسی میدان میں کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان کو کرنے میں کسی مشقت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ مسلمانوں کو تباہ کن ٹکراؤ کے راستہ پر لے جا رہے ہیں اور ان کو تعمیر کے میدان میں کھلے مواقع کے استعمال کی طرف راغب نہیں کرتے وہ یقیناً شریعت سے انحراف کر رہے ہیں نہ کہ شریعت کی تعمیل۔

نیا فیصلہ

مراد آباد مغربی یوپی کا ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کافی تعداد میں مسلمان بستے ہیں۔ حال میں دو دن کے لئے میں مراد آباد گیا تھا وہاں ایک تقابلی واقعہ میرے علم میں آیا جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔

اس سے پہلے ۱۳ اگست ۱۹۹۰ کو مراد آباد میں ایک واقعہ ہوا تھا۔ اس کے بعد شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ قصہ یہ تھا کہ مراد آباد کی عیدگاہ ایک نالے کے عین کنارے ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں اکثر خنزیر گھومتے رہتے ہیں۔ ۱۳ اگست کو عید کا دن تھا۔ عیدگاہ کے وسیع میدان میں مسلمان چادریں بچھا کر نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے بعد خطبہ شروع ہوا تو ایک خنزیر عیدگاہ کے اندر گھس آیا۔ وہ جب گزرا تو کچھ مسلمانوں کی چادریں گندی ہو گئیں۔ اس پر مسلمان بھڑ اٹھے۔ پہلے ان کا ٹکراؤ پولیس سے ہوا جو قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی۔ زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ تقریباً چار مہینے تک شہر میں کرفیو لگا رہا۔ اس کے نتیجہ میں یہاں کا ایکسپورٹ بزنس تباہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کو دوبارہ بحال کرنے میں پانچ سال لگ گئے۔

اس واقعہ کے سولہ سال بعد اسی مراد آباد میں دوسرا برعکس واقعہ پیش آتا ہے۔ ۴ مارچ ۱۹۹۶ کو ہولی کا دن تھا۔ یہاں کے ایک بازار میں جہاں دونوں فرقہ کے لوگوں کی دکانیں ہیں ہولی کے دن ایسا ہوا کہ ایک غیر مسلم نے رنگ سے بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر پھینکی۔ بالٹی کا رنگ پورا کا پورا سامنے کی ایک مسلم دکان میں جا پڑا۔ دکان کا فرش ہولی کے رنگ سے رنگین ہو گیا۔

پچھلے مسلم مزاج کے اعتبار سے یہ ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔ مگر مسلم دکاندار اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ انھوں نے سادہ طور پر صرف یہ کیا کہ دکان بند کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد دکان کا فرش بدل دیا گیا۔ ایک ایسا واقعہ جو فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے کے لئے کافی تھا وہ خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ نہ کسی کا نقصان ہوا اور نہ بازار کی سرگرمیوں میں کوئی خلل پڑا۔

یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں۔ آج ایسے واقعات تقریباً ہر مقام پر پیش آ رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے بدلے ہوئے موڈ کو بتاتے ہیں۔ یہ مسلمان پہلے جن واقعات پر بھڑک اٹھتے تھے اب انھوں

نے ایسے واقعات کو نظر انداز کرنے کا فن سیکھ لیا ہے، اور یہ بلاشبہ ان کے لئے اور سارے ملک کے لئے نہایت مفید علامت ہے۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد مسلمان اس ملک میں مطلوب ترقی نہ کر سکے۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی، اور وہ عدم تحفظ کی وہ صورت حال تھی جس میں وہ مسلسل اپنے آپ کو پا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے نااہل لیڈروں اور دانشوروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں یہ سمجھ لیا تھا کہ ایسا اس لئے ہے کہ ملک کا ایڈمنسٹریشن ان کے حق میں متعصب ہے۔ چوں کہ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ایڈمنسٹریشن اس معاملہ میں ان کی امیدیں پوری نہیں کر رہا ہے اس لئے وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے لگے اور جب احتجاج سے بھی مقصد پورا نہیں ہوا تو وہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔

مگر یہ سوچ بجائے خود غلط تھی۔ پولیس اور ایڈمنسٹریشن کی بھی اسی طرح ایک حد ہے جس طرح ہر معاملہ کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد یہ ہے کہ پولیس اور ایڈمنسٹریشن وہاں کام کرتے ہیں جہاں معاملہ انفرادی ہو۔ جب کوئی معاملہ عمومی یا عوامی بن جائے تو وہاں پولیس اور ایڈمنسٹریشن اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

دو قومی نظریہ اور دوسرے مختلف اسباب سے اس ملک میں یہ ہوا ہے کہ ہندو اور مسلمان نفسیاتی اعتبار سے دو متقابل گروہ بن گئے ہیں۔ نااہل لیڈروں نے اپنی مسلسل نادانیوں سے دونوں میں اس اعتبار سے حساسیت بہت بڑھا دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک ہندو کے درمیان جب جھگڑے کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو فوراً ہی بڑھ کر وہ دو فرقہ کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ غیر معتدل صورت حال ہے جس نے اس معاملہ میں پولیس اور ایڈمنسٹریشن کو بے بس بنا دیا ہے۔ جہاں اس نوعیت کی نزاکت نہ ہو وہاں جب دو آدمیوں میں نزاع ہوتی ہے تو وہ دو فرد یا زیادہ سے زیادہ دو خاندان کی نزاع ہوتی ہے۔ ایسی نزاع کو کنٹرول کرنا پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے لئے آسان ہوتا ہے۔ مگر جب مذکورہ قسم کے حالات ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی نزاع فوراً پھیل کر دو فرقوں کی نزاع بن جاتی ہے۔ اس توسیع کی بنا پر وہ مسئلہ پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے اختیار سے باہر کا مسئلہ بن جاتا ہے یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے بے شمار احتجاج اور شکایت کے باوجود ایڈمنسٹریشن

کے لئے اس کو کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

مرادآباد کا واقعہ (اور اس طرح کے دوسرے واقعات) بتاتے ہیں کہ اب مسلمانوں نے اس حقیقت کو دریافت کر لیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل خود ان کے پاس موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نزاعی موقع پر تحمل کا طریقہ اختیار کرکے وہ معاملہ کو اول مرحلہ ہی میں ختم کر دیں اور اس کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ وہ پھیلے اور دو فرد کے بجائے دو فرقہ کا مسئلہ بن جائے۔

ہر سماج میں نزاعی واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ خود فطرت کے نظام کی بنا پر ہے نہ کہ کسی کی سازش کی بنا پر۔ اس لئے یہاں ایسے واقعات کا پیش آنا بالکل بند نہیں ہو سکتا۔ جو چیز بند ہو سکتی ہے وہ یہ کہ مسلمان ایسے مواقع پر مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔ اس طرح چنگاری پہلے ہی مرحلہ میں بجھ جائے گی۔ وہ پھیل کر دو فرقوں کا تباہ کن مسئلہ نہیں بنے گی جیسا کہ مرادآباد میں ہولی کے معاملہ میں پیش آیا۔

کسی بھی ترقی کے لئے امن لازمی طور پر ضروری ہے۔ مسلمان چوں کہ اشتعال انگیزی کے مواقع پر بھڑک اٹھتے تھے اس لئے فساد کی نوبت آجاتی تھی اور امن کی فضا بار بار بھنگ ہو جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ استقلال کے ساتھ کسی ترقیاتی کام میں مصروف ہونا ان کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔

اب نئے حالات ملک میں وہ معتدل فضا فراہم کر رہے ہیں جس کو امن کی فضا کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے تعمیر و ترقی اور تعلیم و تجارت جیسے کاموں میں سرگرم ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ پچھلے چند سال میں ملک کے مختلف علاقوں کے سفر کے دوران میں نے پایا ہے کہ مسلمانوں میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ وہ اعراض کا اصول اختیار کرکے نہایت تیزی کے ساتھ تعمیری میدانوں میں سرگرم ہوتے جا رہے ہیں۔

اس طرح ہندستان کے مسلمانوں میں ایک نیا آغاز ظہور میں آچکا ہے۔ اور صحیح آغاز ہمیشہ صحیح انجام تک پہنچتا ہے۔ یقینی ہے کہ اس ملک کے مسلمان اب تیزی سے ترقی کریں گے۔ اور ان کی ترقی ملک کی مجموعی ترقی میں اضافہ کا ذریعہ بنے گی۔ یہاں تک کہ یہ محسوس کیا جانے لگے گا کہ مسلمان اس ملک کے لئے بوجھ (liability) نہیں ہیں بلکہ وہ اس ملک کا سرمایہ (asset) ہیں۔ وہ ملک کی آبادی کا ایک تخلیقی حصہ ہیں نہ کہ کوئی جامد یا غیر مفید حصہ۔

مسلمانوں کا سیاسی المیہ

ہندستان میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کی تقریباً سو سیٹوں کے انتخابی حلقہ میں فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔ وہ اس ملک میں توازنی طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امکانی طور پر وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ الکشن میں وہ کسی سیاسی پارٹی کو ہرائیں اور کسی پارٹی کو کامیاب بنا دیں۔

مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ مسلمان ہی وہ فرقہ ہیں جو اس ملک میں سب سے زیادہ سیاسی محرومی کا شکار ہیں۔ ذاتی طور پر بعض مسلم افراد کچھ اتفاقات سے فائدہ اٹھا کر کوئی سیاسی منصب ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلم ملت کا اس ملک میں کوئی سیاسی مقام نہیں۔ نہ ملک کی سیاست میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ باہر کے مسلم ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ حتی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو اتنا سیاسی مقام بھی حاصل نہیں جتنا سیاسی مقام سری لنکا جیسے چھوٹے ملک کی مسلم اقلیت نے حاصل کر لیا ہے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر اس کی ذمہ داری دوسروں پر (بالفاظ دیگر ہندوؤں پر) ڈالتے ہیں۔ مگر میں اس کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں خود خدا کے قانون کے تحت، چھننا اور ملنا، دونوں کے اسباب ہمیشہ داخل میں ہوتے ہیں نہ کہ خارج میں۔ اس قسم کی کوئی توجیہہ بداہتہً ہی قابل رد ہے۔ کیوں کہ وہ قانون فطرت کے سراسر خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس المناک صورت حال کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ مسلمان دراصل خود اپنے نکمے لیڈروں کے نکمے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں کے درمیان صرف سطحی سیاستیں چلائیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر صحیح سیاسی شعور پیدا نہیں کیا جو اس اعتبار سے کرنے کا اصل کام تھا۔

اگر آپ الکشن کے زمانہ میں کسی شہر میں نکلیں تو آپ کو سب سے زیادہ الکشنی دھوم مسلمانوں کے محلہ میں دکھائی دے گی۔ ہندو محلے یا دوسرے فرقوں کے محلے نسبتاً الکشنی ہنگاموں سے خالی نظر آئیں گے۔ یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ کون سی غلطی ہے جس نے

انھیں اس ملک میں سیاسی محرومی کے مسئلہ سے دو چار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نااہل مسلم لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں وہ الکشن کے زمانہ میں دھوم مچانے کو سیاست میں حصہ لینا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سیاست میں حصہ لینا حقیقۃً یہ ہے کہ وہ ملک کے سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کریں۔

مسلمان اگر روزہ کے زمانہ میں سحری اور افطار اور لاؤڈاسپیکر کی دھوم مچائیں تو اس سے انھیں تقویٰ کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ تقویٰ کا انعام لینے کے لئے ضروری ہے کہ پورے سال بھر متقیانہ زندگی گزاری جائے۔ ٹھیک اسی طرح الکشن کے چند مقرر دنوں میں انتخابی سرگرمیاں دکھانے سے انھیں ملک میں کوئی سیاسی درجہ نہیں مل سکتا۔ ملک میں سیاسی درجہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مستقل طور پر ملک کے سیاسی عمل میں شرکت کی جائے اور اس میں بھرپور طور پر اپنا حصہ ادا کیا جائے۔

اس کی مثال لیجئے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک میں نے ہزاروں اجتماعات اور جلسوں میں شرکت کی ہے۔ اس پوری مدت میں میں نے مسلمانوں کا کوئی ایک بھی قابل ذکر اجتماع نہیں پایا جہاں ملک کے مسائل زیر بحث لائے جائیں۔ ملک کے قومی اشوز مسلمانوں کے دائرۂ بحث سے تقریباً خارج ہیں۔ ہر مسلم جلسہ میں صرف ملی مسائل، زیادہ صحیح لفظ میں ملی شکایات پر تقریریں ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی اشوز مسلمانوں کا کنسرن (concern) ہی نہیں۔

دوسری طرف ہندوؤں کے جلسوں میں بار بار میں نے پایا کہ وہ خالص ملکی مسائل پر بولتے ہیں۔ وہ قومی اشوز پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کے منظم کئے ہوئے کسی اجتماع میں اگر کوئی مسلمان آجائے تو میں نے دیکھا وہ وہاں بھی فوراً مسلم فرقہ کی شکایات کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کے سیاسی عمل میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔

سیاسی عمل مین شریک ہونے کی دوسری صورت بالواسطہ شرکت کی ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے پاس ایسے اخبارات ہوں جو پورے ملک میں پڑھے جاتے ہوں۔ ٹریڈ یونین کے اداروں میں ان کا کوئی مؤثر عمل دخل ہو۔ اس طرح کے مختلف ادارے ہیں جو بالواسطہ طور پر سیاست کے عمل پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ مگر مسلمان ان اداروں میں موجود ہی نہیں۔ مسلمانوں کے تمام اخبارات، اگر ان کو اخبار کہا جا سکے، تو وہ صرف ملی شکایت نامے ہیں۔ قومی صحافت سے

اچانک وہ دیکھیں گے کہ ملک کے اندر ان کی تصویر بدل گئی ہے۔ اس کے بعد وہ اِس ملک میں بوجھ نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ وہ ملک کا قومی اور سیاسی اثاثہ بن جائیں گے۔ اور جس دن ایسا ہوگا اسی دن اس ملک میں مسلمانوں کے لئے شاندار سیاسی مستقبل کا آغاز ہو جائے گا۔

ہندستان میں بلاشبہ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم سیاسی مستقبل کی تعمیر کے امکانات پوری طرح موجود ہیں۔ مگر اس سیاسی مستقبل کو پانے کا راز الکشن میں کسی کے موافق یا کسی کے خلاف ووٹ دینے میں نہیں ہے۔ اس کا راز خود اپنی شعوری اور سیاسی اصلاح میں ہے۔ اس کے اسباب مسلمانوں کے اپنے اندر ہیں نہ کہ ان کے باہر۔

اس وقت ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ہر جگہ یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ملک کا قومی ایجنڈا کیا ہو۔ اس کے لئے میٹنگیں ہو رہی ہیں۔ ہندی اور انگریزی اخبارات میں کثرت سے مضامین چھپ رہے ہیں۔ مستقل کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں میں مسلمان کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اس پورے معاملہ سے وہ تقریباً غیر متعلق ہیں۔

مسلمانوں کے اخبارات میں یا ان کے اجتماعات میں اکثر اس موضوع پر بحث ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعت بنائی جائے۔ مگر اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے مسائل میں صرف اضافہ کرنے والی ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ مسلمان قومی سیاسی جماعتوں میں شریک ہوں۔ وہ ان کے تنظیمی ڈھانچہ میں شامل ہو کر اپنے آپ کو وہاں پہنچائیں جہاں سیاسی معاملات پر فیصلے کئے جاتے ہیں۔

اس وقت مسلمان اس ملک میں صرف ایک شکایتی گروہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ مثبت معنوں میں وہ ایک سیاسی وجود کی حیثیت سے کہیں دکھائی نہیں دیتے، نہ فکری مجالس میں اور نہ عملی سرگرمیوں میں۔ مسلمان اگر اس خلا کو پر کر سکیں اور پوری طرح ملک کے سیاسی عمل (پولٹیکل پراسس) میں شامل ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس ملک کے لئے ایک سیاسی سرمایہ بن سکتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آئے گا جب کہ وہ اس ملک میں پرائم منسٹر کا عہدہ حاصل کر لیں۔

کفرانِ نعمت

پانی کے ایک گلاس سے لیکر حکومت اور سیاسی اقتدار تک جو کچھ اس دنیا میں کسی کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس دنیا میں جو کچھ بھی کسی کو ملتا ہے وہ اللہ کے چاہنے سے ملتا ہے۔ اللہ نہ چاہے تو کچھ بھی کسی کو نہیں مل سکتا، خواہ وہ بطور خود اس کے لئے کتنا ہی زور مارے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن و حدیث سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہے۔

دوسری چیز جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خدائی عطیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خصوصی عطیہ۔ اور دوسرے عمومی عطیہ۔ خصوصی عطیہ کو آجکل کی زبان میں سیاسی اقتدار کہا جاسکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔ اور نہ وہ پولٹیکل تحریک یا گن کلچر چلا کر کسی کو حاصل ہوتا۔ اس کا تعلق براہ راست سنت اللہ سے ہے۔ اس سنت اللہ میں سے ایک یہ ہے کہ جو گروہ حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا ثبوت دے اس کے لئے سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے (النور ۵۵) گویا اقتدار مطلوب ہو تب بھی اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی تحریک چلانا ہے نہ کہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا معرکہ جاری کرنا۔

اس کے بعد خدا کا عمومی عطیہ وہ ہے جو کم و بیش ہر ایک کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ اصولی طور پر دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے ـــــ پر امن حالات اور حصول رزق کی آسانی۔ یہ بات قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتی ہے:

وضرب اللّٰہ مثلاً قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یاتیھا رزقھا رغداً من کل مکان فکفرت بانعم اللّٰہ فاذاقھا اللّٰہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون (النحل ۱۱۲)

اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن اور اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔

اس آیت میں دو چیزوں کو انعم اللہ (خدا کے انعامات) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو ہی چیزیں ہیں جو دنیوی اعتبار سے انسان کے لئے ضروری ہیں۔ ایک امن اور دوسرے رزق۔ اگر یہ دو چیزیں کسی گروہ کو حاصل ہو جائیں تو اس کے بعد اس کو کسی اور چیز، مثلاً پولیٹیکل اقتدار کے لئے جنگ نہیں چھیڑنا چاہئے۔ بلکہ ان نعمتوں کو کافی سمجھتے ہوئے اللہ کی شکرگزاری میں لگ جانا چاہئے۔ تاآنکہ اللہ خود بقیہ چیزوں کے حصول کی راہ ہموار کر دے۔

اللہ کی شکرگزاری کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کا دینی اور تعمیری استعمال۔ ملے ہوئے پر قانع رہ کر اللہ کی یاد میں لگ جانا شکرگزاری ہے، اور اگر ملے ہوئے کو نظرانداز کرکے نہ ملے ہوئے کے لئے دھوم مچائی جائے تو اسی کا نام ناشکری ہوگا۔

جس مسلم گروہ کو امن اور رزق کی نعمت مل جائے، اس کے بعد اس کو ربانی سرگرمیوں میں مصروف ہونا چاہئے نہ کہ پولیٹیکل سرگرمیوں میں۔ اب اس کو یہ کرنا ہے کہ اپنے اندر ایمانی حرارت پیدا کرے۔ اپنے درمیان اخلاقی اصلاح کی تحریکیں اٹھائے۔ اپنی نسلوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی مہم شروع کرے۔ اللہ کے پیغام کو تمام قوموں تک پہنچانے کا نظام بنائے۔ وہ اپنی عبادت گاہوں کو آباد کرے۔ وہ اپنے علمی اداروں کو ترقی دے۔ وہ اپنی بستیوں کو نمونہ کی بستی بنا دے۔ وغیرہ۔

یہی سچی شکرگزاری ہے۔ یہ اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کرنا ہے۔ غیر مومن کی نگاہ اپنے حقوق پر ہوتی ہے۔ اور مومن کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں پر۔ اسی لئے غیر مومن ہمیشہ نہ ملے ہوئے کو پانے کی طرف دوڑتا ہے۔ اور مومن ہمیشہ ملے ہوئے کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جاتا ہے۔

جو لوگ شکرگزاری کے اس طریقہ پر نہ چلیں، اس کے بجائے وہ سیاسی تحریکوں کی دھوم مچائیں یا وہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف گن کلچر کو زندہ کریں، وہ بلاشبہ سرکش لوگ ہیں۔ ان کا کیس سرکشی کا کیس ہے، خواہ وہ اپنی تحریک کو اسلام یا دین مصطفیٰ کے نام پر کیوں نہ چلا رہے ہوں۔

ایسے لوگوں کے بارہ میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی سیاسی منزل تک نہیں پہنچیں گے، بلکہ امن اور رزق کی جو نعمتیں ان کو ملی ہوئی تھیں ان سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔ وہ ملے ہوئے کو بھی کھو دیں گے، اور نہ ملے ہوئے کو پانا تو ان کے لئے مقدر ہی نہیں۔ یہی اس معاملہ میں سنت اللہ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مذہبی اختلاف کا تعلق صرف ہندو اور مسلمان سے نہیں ہے۔ یہ اختلافات خود ہندوؤں اور ہندوؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک طبقہ بتوں کی پرستش کو صحیح مذہب سمجھتا ہے، دوسرا طبقہ بت پرستی کو بالکل غلط بتاتا ہے اور اس کا کھنڈن کرتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار اختلافات ہندوؤں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ پھر ہندو اگر باہمی اختلاف کے باوجود مل کر رہ سکتے ہیں تو ہندو اور مسلمان باہمی مذہبی اختلاف کے باوجود مل کر کیوں نہیں رہ سکتے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ کا فیصلہ بہت عمدہ طور پر سوامی ویویکانند نے کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک کی پیروی کرو اور دوسروں سے نفرت نہ کرو:

Follow one and hate none.

انھوں نے آپ کی تجویز کے مطابق یہ نہیں کہا کہ: Follow one and believe in all. یعنی ایک کی پیروی کرو اور سب کو سچ مانو۔ گویا اصل چیز دوسرے مذہبوں کو سچا ماننا نہیں ہے بلکہ دوسرے مذہبوں کو ہیٹ نہ کرنا ہے۔ اسی اصول پر ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے اور اسی اصول پر ہندستان کا نظام بھی چلے گا۔

لندن میں پاکستان کے لوگ بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ پاکستانی نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قول کو دہرایا کہ "پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے"۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے لئے بنایا گیا اور پاکستان میں اسلام کا نظام ہی قائم ہوگا۔ کسی دوسرے نظام کو یہاں چلنے نہیں دیا جائے گا۔

میں نے کہا کہ کوئی خطۂ ارض اسلامی نظام نہیں بناتا بلکہ انسان اسلامی نظام بناتے ہیں۔ اس معاملہ میں پہلی غلطی اورنگ زیب نے کی۔ انھوں نے بڑا زمینی خطہ حاصل کرنے کے لئے لڑائیاں کیں تاکہ اس میں ایک عظیم اسلامی ایمپائر بنایا جا سکے۔ مگر جب زمینی خطہ مل گیا تو معلوم ہوا کہ اسلامی ایمپائر بنانے کے لئے اصل ضرورت انسان کی ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب کے پاس مطلوب انسان موجود نہ تھے اس لئے خطۂ ارض مل جانے کے باوجود مطلوبہ اسلامی سلطنت نہ بن سکی۔ اس قسم کی بھیانک غلطی ایک بار کافی تھی۔ مگر پاکستان کے مفکرین نے یہی غلطی دوبارہ کی۔ انھوں نے ایک زمینی ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اور آخر میں معلوم ہوا کہ یہاں

اسلامی نظام نہیں بن سکتا۔ کیوں کر اس کے لئے ضروری انسانی ٹیم موجود نہیں ہے۔

روزانہ میں کمرہ ہی میں صبح کا ناشتہ کرتا تھا۔ یکم اگست کو ناشتہ کے لئے میں ہوٹل کے مطعم میں چلا گیا۔ وہاں اتفاق سے منو بھائی مادھوانی اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے۔ وہ بھی آکر میری میز پر بیٹھ گئے۔ ہم لوگوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔

مادھوانی پریوار سب کا سب نہایت سادہ اور متواضع ہے۔ خاندان کے تمام افراد ہر وقت مشارکین کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ مسٹر مادھوانی یہاں کے ارب پتی افراد میں سے ہیں۔ انھوں نے ہندستانی معیار سے تین کرور روپیہ اس کانفرنس کے لئے دیا ہے۔ میں نے منو بھائی مادھوانی سے پوچھا کہ آپ بزنس کے میدان میں ہیں، یہ بتائیے کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے باپ ہم لوگوں کو تین بات بتایا کرتے تھے :

1. Money is not your wealth. Your people are your wealth
2. When there is a will there is a way.
3. Be firm and kind, God will give you.

میں نے پوچھا کہ "پیپل" کو آپ کس طرح تیار کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں صرف یہی کام کرتا ہوں۔ میں نہ بنک جاتا اور نہ آفس میں بیٹھتا۔ میں مختلف دیشوں میں گھومتا رہتا ہوں اور کام کے آدمی تلاش کرتا ہوں۔ خاص طور پر نوجوانوں میں۔ جہاں کوئی نوجوان مجھے کام کا نظر آیا، میں اس کو فوراً اٹھا لیتا ہوں اور پھر اس کو پورا چانس دیتا ہوں۔

میں نے پوچھا کہ آدمیوں کے انتخاب میں آپ کا اندازہ غلط بھی ثابت ہوتا ہوگا۔ پھر اس کی شرح اب تک کیا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشکل سے تین فیصد۔ انھوں نے کہا کہ میری کوشش سب سے زیادہ یہ ہوتی ہے کہ اچھا منیجر تلاش کروں۔ میرا کام بہت سے دیشوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جدہ (سعودی عرب) میں بھی ہمارا آفس ہے، مگر یہ سارا کام میرے منیجر چلا رہے ہیں۔ ایک بات انھوں نے یہ بتائی کہ میں اپنے رشتہ داروں کو کبھی نہیں لیتا۔ میں ہمیشہ خاندان سے باہر کے آدمی کا انتخاب کرتا ہوں۔ یہ میرا مستقل اصول ہے۔

یکم اگست کو میری تقریر تھی۔ میں نے کہا کہ آج کی دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ امن ہے اور امن روحانی ترقی (spirtual uplift) کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے بتایا کہ انسان پیدائشی طور پر ایک روحانی مخلوق ہے۔ اس لئے انسان کو روحانی بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی روحانیت کو بچانا ہے۔ اس دنیا میں بار بار آدمی کے ساتھ ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں۔ بار بار اس کو زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات آدمی کے اندر منفی جذبات ابھارتے ہیں جو روحانیت کو بھنگ کرنے والے ہیں۔

ایسی حالت میں اپنی پیدائشی روحانیت کو باقی رکھنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی منفی چیزوں کو مثبت چیزوں میں تبدیل کر سکے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہی فن سیکھنا ہے۔ عام طور پر میری تقریر کو پسند کیا گیا۔ گنگوتری کے سوامی جی نے کہا: ایسا لگتا تھا کہ ہر دے کو بھا شامل رہی ہو۔

میرے بعد چیف جتھیدار پروفیسر منجیت سنگھ کی تقریر ہوئی۔ انھوں نے ایک قصہ سنایا کہ کچھ عیسائی برنارڈ شا کے پاس آئے۔ انھوں نے گلیلیو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ کہا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ مگر چرچ نے اس کو سزا دی کیوں کہ یہ نظریہ چرچ کے عقیدہ سے ٹکراتا تھا۔ برنارڈ شا نے کہا کہ گلیلیو نے جھوٹ کہا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں، برنارڈ شا نے جواب دیا، جس سیارہ پر برنارڈ شا پیدا ہوا ہو وہ بھلا کسی اور سیارہ کا سٹلائٹ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک طنز تھا۔ برنارڈ شا کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اپنی ذات سے سچائی کو ناپتے ہیں۔ وہ اس سچائی کا انکار کر دیتے ہیں جس میں ان کے خیال کے مطابق، ان کا اپنا قد چھوٹا ہو رہا ہو۔

جلسہ کے دوران مجھے ٹائیلٹ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک صاحب نے رہنمائی کر کے باہر پہنچایا۔ یہاں پنڈال سے متصل خوبصورت کیبن کی صورت میں بہت سے باتھ روم کھڑے کئے ہوئے تھے۔ یہ سب جدید طرز کے نہایت صاف ستھرے باتھ روم تھے۔ اس میں بھی ہندستان اور انگلینڈ کا فرق نمایاں طور پر دکھائی دیا۔

یکم اگست کی شام کو ہوٹل کے لان میں شامیانہ کے تحت ایک میٹنگ (ورک شاپ) ہوئی۔ اس کا موضوع جین ازم تھا۔ منی جی چید انند سرسوتی نیویارک سے آئے تھے۔ انھوں نے جین ازم کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔

حاضرین میں سے ایک ہندو نے سوال کیا کہ آپ لوگ اہنسا کو مطلق (absolute) مانتے ہیں۔ آپ کے نزدیک یدھ کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مگر ہندو ٹریڈیشن کے مطابق رام اور کرشن دونوں

نے یہ دریافت کیا۔ یہاں کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مذہب کے نام پر اکسپلائیٹیشن تھا۔ میٹنگ کے بعد ایک نشست میں ایک ہندو بھائی نے اس پر سخت تنقید کی۔ اس پر گنگوتری سے آئے ہوئے سوامی جی نے کہا: وہ تو ایسا ہی کہیں گے۔ کیوں کہ ان کے گرنتھوں میں لکھا ہوا ہے کہ رام اور کرشن دونوں نرک میں گئے۔

ایک اور نوجوان نے سوال کیا کہ جین ازم کے مطابق، ایک آدمی مر رہا ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کو کھانا پانی کچھ نہیں دینا چاہئے۔ کیوں کہ وہ اپنے کرم کو بھوگ رہا ہے۔ اس کے جواب میں منی جی نے کہا کہ یہ ایک فرقہ (sect) کا نظریہ ہے، وہ سارے جینیوں کا نظریہ نہیں۔ میٹنگ کے درمیان کچھ عورت اور مرد اٹھ کر جانے لگے تو انھوں نے مقرر کی طرف رخ کرکے دونوں ہاتھ جوڑے۔ اس طرح گویا جھک کر معافی مانگی۔ پھر باہر چلے گئے۔

میٹنگ کے بعد میں اپنے کمرہ میں آیا تو ایک ہندو نوجوان مجھ سے ملنے کے لئے اپنے ماں باپ کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ماں باپ کو شکایت تھی کہ وہ ایک مسلم لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس نے ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ ماں باپ اس پر بہت دکھی تھے۔ اس لئے وہ نوجوان کو مجھ سے ملانے کے لئے لائے تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام اگر آپ نے اس لئے قبول کیا ہے کہ وہ آپ کو صحیح نظر آیا تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نے مسلم لڑکی سے شادی کے لئے اسلام قبول کیا ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے تو میں نے شادی کی غرض سے اسلام کو اختیار کیا تھا۔ مگر اب میرا اس پر یقین ہو چکا ہے۔ حتی کہ اگر مسلم لڑکی میرا ساتھ چھوڑ دے تب بھی میں اسلام کو چھوڑنے والا نہیں۔ ان کو قرآن کی سورتیں ابھی یاد نہیں ہوئی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں انگریزی میں نماز پڑھتا ہوں۔ اگرچہ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی ابھی وہ نہیں کر رہے ہیں۔

۲ اگست کی صبح کو ابھی میں بستر پر تھا کہ باہر سے کوے کے بولنے کی آواز آئی۔ آنکھ کھول کر کھڑکی سے دیکھا تو اجالا شروع ہو چکا تھا۔ اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی۔ دہلی میں بھی اسی طرح ہر روز صبح کو کوے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چڑیوں کا جو طریقہ ہندستان میں ہے وہی انگلینڈ میں ہے۔ چڑیاں ہر جگہ یکساں کردار ادا کر رہی ہیں۔ انسان کو بھی فطرت کے اسی راستہ کو اختیار کرنا تھا۔ مگر انسان بار بار نفس

PROGRAMME OF SPEAKERS AND WORKSHOPS/ CULTURAL PROGRAMME (subject to change)

DAY	SPEAKER	THEME	INTRODUCTION BY:	WORKSHOP 6.30-8.30 p.m.
Saturday, 30th July	His Excellency Dr. L M. Singhvi	Keynote address	n/a	none
	Shree Maganbhai Bhimajiani	Welcome speech	n/a	
	Mr Manubhai M. Madhvani	Welcome speech	n/a	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Sunday, 31st July	Gurudev Shree Chitrabhanuji	Spiritual lecture	Dr L M. Singhvi	**Sikhism**
	H H Pramukh Swami Maharaj	Spiritual lecture	Dr L.M Singhvi	Professor Sardar Manjit Singhji
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Dr Mo ınder Singh
Monday, 1st August	Maulana Wahiduddin Khan Saheb	Spiritual lecture	Dr L.M Singhvi	**Jainism**
	Professor Sardar Manjit Singhji	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	Gurudev Shree Chitrabhanuji
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Dr Sadhvi Sadhnaji
Tuesday, 2nd August	Dr Sadhvi Sadhnaji	Spiritual lecture	Shrimati Kamla Singhvi	**Islam**
	Swami Chidanand Saraswati (Muniji)	Spiritual lecture	Mr Manubhai Madhvani	Maulana Wahiduddin Khan Saheb
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Wednesday, 3rd August	Sant Shree Rameshbhai Oza	Spiritual lecture	Muniji	**Youth Question & Answer**
	Shree Krishna Shanker Shastri	Spiritual lecture	Shree Maganbhai Bhimajiani	Sant Shree Rameshbhai Oza
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Muniji and Dr K.L. Seshagiri Rao
Thursday, 4th August	Most Venerable Dr M Vajiragnana	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	Shree Krishna Shanker Shastri
	Rev. Marcus Braybrook	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	Goswami Indira Betiji
	Sir Sigmund Sternberg	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Friday, 5th August	Goswami Indirabetiji	Spiritual lecture	Sant Shree Rameshbhai Oza	All Saints. Question & Answer on Unity
	Prof. Vidyaniwas Mishra	Spiritual lecture	Dr L M Singhvi	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Saturday, 6th August	Sant Shree Rameshbhai Oza	Spiritual lecture	Dr L.M Singhvi	Bhajan programme
	The Most Rev.Trevor Huddlestone	Spiritual lecture	Dr L.M Singhvi	
	Dr L.M. Singhvi	Spiritual lecture	Mr Manubhai Madhvani	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Sunday, 7th August	Swami Satyamitranand Giriji	Spiritual lecture	Muniji	Purnahoti
	Brahma Kumari Dadi Jankiji	Spiritual lecture	Muniji	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		

کی خواہشوں کے زیر اثر آجاتا ہے۔ انسان اگر اپنے کردار کو اصولِ فطرت کے تابع رکھے تو اس کا کردار بھی ہمیشہ اور ہر جگہ یکساں رہے گا۔ مگر انسان اصول کے بجائے مفاد کی پیروی کرنے لگتا ہے اس بنا پر اس کے کردار میں یکسانیت باقی نہیں رہتی۔

باپوجی کی کتھا کا طریقہ یہ تھا کہ وہ گوسوامی تلسی داس کی رامائن کے حصے روزانہ گاکر پڑھتے ہیں اور درمیان میں اس کی تشریح کرتے ہیں۔ تشریح میں اکثر چٹکلے اور قصہ کہانیاں ہوتی ہیں جن کو سن کر لوگ کبھی قہقہہ لگاتے ہیں اور کبھی تالیاں بجاتے ہیں۔ کبھی جوش میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تلسی داس کی رامائن مغل دور میں ہندی میں لکھی گئی۔ قدیم رامائن والمیکی کی ہے جو سنسکرت میں ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ والمیکی کی یہ رامائن ماقبل تاریخ دور میں اٹھارہ لاکھ سال پہلے تیار ہوئی۔ وہ مہابھارت کا واقعہ پیش آنے سے بھی پہلے لکھی گئی تھی۔ بعد کو اس کے پیشگی بیان کے مطابق عین اسی طرح مہابھارت کا واقعہ پیش آیا۔ انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم جس کو ساڑھے پانچ سو ہندو اہل علم نے تیار کیا ہے وہ اسی قسم کی باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں کے ایک سیکولر ہندو نے کہا: انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم کے لئے میری صرف ایک ترمیم ہے، اس کا نام بدل کر انسائیکلو پیڈیا آف ہندو مائتھالوجی رکھ دیا جائے۔

ہندستان میں کچھ مسلمان نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام اور ہندوازم میں مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح اسلامی دعوت کی راہ کھلے گی۔ مگر یہ سراسر نادانی کی سوچ ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہر قیمت پر نفرت اور کشیدگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ دونوں کے درمیان معتدل فضا میں اختلاط ہونے لگے۔ اس اختلاط کے دوران فطری طور پر دونوں میں آزادانہ ڈائیلاگ جاری ہو جائے گا۔ اور اسی ڈائیلاگ کے تقابلی نتیجہ کا نام دعوت ہے۔

۲ اگست کو صبح کے ناشتہ میں ایک صاحب نے اکال تخت کے جتھے دار صاحب سے کہا: پنجاب کا مسئلہ تو اب ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ باہر ختم ہو گیا، لیکن اندر اندر موجود ہے۔ پالی ٹیشین اس کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اگر یہ مسئلہ ختم ہو جائے تو ان کے پاس کوئی اشو باقی نہیں رہے گا۔ وہ اپنے آپ کو سیاسی موت سے بچانے کے لئے عوام کو تباہی کے گڑھے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ سیاسی

لیڈروں کی اسی پالیسی کی وجہ سے دیش کھنڈ کھنڈ ہورہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں منی پور (آسام) گیا وہاں میں بازار میں تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کیا انڈیا سے آرہے ہیں:

Are you coming from India?

گویا کہ انڈیا ایک الگ ملک ہے۔ وہ اپنے کو انڈین نہیں کہتے۔ علیحدگی پسندی کی یہ ذہنیت ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لوگ پیسہ کمانے میں اتنا زیادہ مشغول ہیں کہ وہ کسی اور چیز کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہو پاتے۔

برطانیہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کا مسئلہ بہت عام ہے۔ اکثر والدین اس مسئلہ سے پریشان ہیں۔ ایک روز ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ عورت مسلمان تھی اور مرد ہندو۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر دونوں کے والدین نے مخالفت کی۔ اس لئے دونوں ہی کو اپنے والدین کے گھر کو چھوڑ دینا پڑا۔ اب دونوں کہیں الگ رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو ایک دوسرے سے لو (Love) ہوگیا ہے۔ مگر ہمارے پیرنٹ ہم کو میریج کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ آپ بتائیے کہ ہم کیا کریں۔

میں نے کہا کہ زندگی میں اصل چیز لو نہیں ہے، اصل چیز نباہ ہے۔ لو کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اور نباہ کا تعلق عقل سے۔ اگر لو اصل چیز ہوتی تو نہ آپ اپنے ماں باپ کو چھوڑتے اور نہ یہ خاتون اپنے ماں باپ کو چھوڑتیں۔ پھر جب اولاد اور والدین کی خونی محبت ٹوٹ گئی تو میاں بیوی کی غیر خونی محبت کیسے نہیں ٹوٹے گی۔ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لو میریج کا طریقہ اختیار کرکے تباہ ہو چکے ہیں، پھر آپ کیوں اسی آزمائے ہوئے راستہ کو دوبارہ آزمانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اس وقت لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے جب میں واشنگٹن میں انڈیا کے سفیر کی حیثیت سے تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ کے مسلمانوں میں بریلوی اور دیوبندی کا جھگڑا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ بریلوی اور دیوبندی کون لوگ ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مسجدوں میں ہر جگہ یہ جھگڑے پائے جاتے ہیں۔

لندن کی گرینڈ مسجد میں میں نے نماز پڑھی تو وہاں میں نے دیکھا کہ مسجد کے باہر طرح طرح کے ہینڈ بل تقسیم کئے جارہے ہیں۔ مثلاً ایک ہینڈ بل میں تھا کہ عمر بکری محمد کا محاضرہ (لکچر) فلاں مسجد میں

ہے۔ اس کا عنوان تھا : مآسی الامۃ الراھنۃ و الحل الاسلامی۔ فلسطین ، ماذا بعد الاستسلام۔ الوضع السیاسی فی الجزائر والیمن ومستقبل الوحدۃ۔ ایک اور ہینڈ بل میں تھا کہ ابوطلحہ کا لکچر فلاں مسجد میں ہوگا۔ اس کا عنوان یہ بتایا گیا تھا : الشوریٰ والدیموقراطیۃ: ھل تتساویان ام تتناقضان۔ ایک اور ہینڈ بل میں شیخ ابوطارق کے محاضرہ کی خبر تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا : الطریق الی الدولۃ الاسلامیۃ۔ ایک ہینڈ بل میں مؤتمر الخلافۃ اور اس کی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا۔

یہاں سنتوں کی سیوا کے لئے جو عورت اور مرد کام کر رہے ہیں وہ سب اونچے گھرانوں کے لوگ ہیں۔ انھیں میں سے ایک خاتون ایک نوجوان کو لے کر میرے کمرہ میں آئی۔ اس نے کہا کہ یہ میرے منگیتر ہیں، آپ ہم دونوں کو آشیرواد دیجئے کہ ہمارا جیون سپھل رہے۔ میں نے نوجوان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کے حق میں دعا کی۔ ہندستان کے سماج میں کسی عورت کا اس طرح کہنا بہت انوکھی بات ہے۔ لیکن مغربی سوسائٹی میں یہ بہت معمولی چیز ہے۔ نوجوان کو میں نے دیکھا تو وہ چہرے سے ایک شریف اور سنجیدہ آدمی نظر آیا۔

ایک روز صبح کو میں ہوٹل کے باہر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ہوئے میں ایک گوشے میں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا کوڑا خانہ ہے۔ مگر یہ کوڑا خانہ ویسا نہ تھا جو دہلی کی سڑکوں کے کنارے دکھائی دیتا ہے جہاں ایک کھلی ہوئی جگہ پر ہر قسم کا کوڑا ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ اس کوڑا خانہ کے اندر مخصوص قسم کی بند گاڑیاں ہیں جن میں پہیہ لگا ہوا ہے۔ یہ گاڑیاں بھی کریہہ المنظر نہیں تھیں بلکہ نیلے رنگ میں رنگی ہوئی خوبصورت گاڑیاں تھیں اور ان پر لکھا ہوا تھا: کلین اوے (Clean away) لوگ اپنا کوڑا ان بند گاڑیوں میں رکھ دیتے ہیں۔ پھر صفائی کے محکمہ کی گاڑیاں آکر ان کو اٹھا لے جاتی ہیں۔

ایک سکھ پروفیسر جو اس جلسہ میں شرکت کے لئے انڈیا سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں سے مجھ کو امریکہ جانا ہے۔ وہاں کے کچھ سردار لوگوں نے ان کو بلایا تھا کہ آپ آکر ہمارے بچوں کو سمجھائیں کیوں کہ وہ بہت بگڑتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی انڈیا سے آئے ہوئے تمام مذہبی فرقوں کا مسئلہ ہے۔ مگر سمجھانے بجھانے سے کچھ ہونے والا نہیں۔ آپ یہاں اپنا کلچرل جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتے۔ جو لوگ یہاں پیسہ کی خاطر آئے ہیں اس کی انھیں بہر حال یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ ان کے لڑکے اور لڑکیاں ویسٹرن

طریقوں کو اختیار کریں۔ دوسری جنریشن تک ممکن ہے کہ کچھ کامیابی حاصل ہو جائے مگر تیسری جنریشن تک پہنچنے کے بعد تو کچھ بھی ہونے والا نہیں۔

۲ اگست کی شام کو "ورک شاپ" کے لئے اسلام کا موضوع رکھا گیا تھا۔ پہلے آدھ گھنٹہ تک میں نے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔ آج شرکاء اجتماع کی تعداد سب سے زیادہ تھی، اور سوالات بھی بہت زیادہ ہوئے۔ سوامی چیدانندنے پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ مختصر جواب دیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سوال کرنے کا موقع ملے۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر سوال کرنے والے اتنے زیادہ تھے کہ سوالات کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس پروگرام کے لئے مقرر وقت صرف ایک گھنٹہ کا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رکھنے کے بعد بھی سوالات ختم نہیں ہو رہے تھے۔ اس لئے منتظمین نے اعلان کیا کہ آج کا پروگرام اب ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ لوگوں کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسلام پر سوال و جواب کے لئے ایک اور نشست رکھی جائے گی۔ اس نشست کے بارہ میں لوگوں نے بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ لندن کی تاریخ میں یہ شاید پہلا اجتماع ہوگا جس میں اتنے زیادہ مخالفانہ سوالات کو جواب دینے والے نے اتنے ٹھنڈے طریقہ سے اور کنونسنگ انداز میں جواب دیا ہو۔

جین دھرم کو ماننے والے ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اسلام رحمت اور امن کا مذہب ہے۔ پھر آپ لوگ جانوروں کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں ان کو ذبح کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ذاتی طور پر ویجیٹیرین ہوں اور میں ایک پیدائشی ویجیٹیرین (born vegetarian) ہوں۔ اسلام میں بلاشبہ گوشت کھانا جائز ہے۔ مگر وہ کمپلسری نہیں ہے۔ اگر گوشت کھانا کمپلسری ہوتا تو میں بھی ضرور اسے کھاتا۔ کیوں کہ میں ایک پکا مسلمان ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ فطرت کے خلاف کوئی اصول نہیں بنا سکتے۔ "جیو ہتھیا" تو عین فطرت کے نظام میں شامل ہے۔ پانی اور سبزی اور ہوا میں بھی جیو ہیں۔ جب آپ ان کو استعمال کرتے ہیں تو آپ لاکھوں جیو کو مارتے ہیں۔ اگر آپ جیو ہتیا کے نظریہ کو مطلق مفہوم (absolute sense) میں لیں تو آپ کو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ نہ پانی پیو، نہ سبزی کھاؤ، نہ دودھ استعمال کرو۔ کیا ایسا اصول اس دنیا میں چل سکتا ہے۔ پھر ہماری زمین میں ایسے خطے ہیں جہاں صرف گوشت ہی ملتا ہے، دوسری کوئی قابل

خوراک چیز وہاں نہیں ملتی۔ کیا آپ ان لوگوں سے کہیں گے کہ تم لوگ خودکشی کرلو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مطلق جیو ہتیا کی بات کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے ایک اور دنیا بنانا چاہئے جہاں نیچر کے قوانین موجودہ دنیا سے الگ ہوں۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں تو اس اصول پر عمل کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں حتی کہ خود اس نظریہ کو ماننے والے لوگ بھی ہر روز لاکھوں جانوں کا ذبیحہ کر رہے ہیں تبھی وہ زندہ ہیں۔ مزید یہ کہ پروٹین ہمارے برین کی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہے۔ چنانچہ مشہور ہندستانی سائنٹسٹ ڈاکٹر سوامی ناتھن نے کہا ہے کہ ہمیں اپنی فوڈ ہیبٹ کو بدلنا ہوگا، ورنہ ہم ذہنی بونا پن (intellectual dwarfism) کا شکار ہو جائیں گے۔

میرے اندر ایک عجیب کمزوری یہ ہے کہ میں کار سک (car sick) ہوں۔ یعنی کار میں سفر کرنے سے مجھ کو چکر آتا ہے۔ یہاں میرے لئے ایک عمدہ کار مخصوص کی گئی تھی۔ مگر اس میں سفر کرنے سے بھی مجھ کو چکر آگیا۔ مسٹر راجیش مجیٹھیا سے اس کا ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں کوئی دوا میرے لئے مفید نہیں۔ گھوڑا گاڑی یا ٹرین یا شپ یا ہوائی جہاز کسی بھی سواری میں مجھ کو ایسا نہیں ہوتا۔ مگر کار میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کار ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر ہم آپ کے لئے کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس کا علاج تو بس لیموں چوسنا ہے۔ مگر اس سے میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔

وہ فوراً بازار گئے اور ایک خوبصورت ڈبہ لے آئے۔ اس کے اندر پھلوں سے بنی ہوئی کھٹی میٹھی ٹافیاں تھیں۔ مگر ڈبہ کے اوپر اس کا نام کھٹی میٹھی ٹافی نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کے اوپر لکھا ہوا تھا: ٹریول سویٹ (Travel Sweet) یہ اہل مغرب کا خاص مزاج ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک حسین آرٹ کی صورت دیدیتے ہیں۔ مثلاً ناشتہ کی میز پر سفید چینی کی پڑیہ کے ساتھ سوکھے گڑ کی پڑیہ بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کا نام سوکھا گڑ نہیں ہوتا بلکہ براؤن شوگر (brown sugar) ہوتا ہے۔ اس ذوق نے خود ان کی زبان میں بھی ایک تہذیبی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً لندن میں چلتے ہوئے ایک ذیلی روڈ پر لکھا ہوا تھا ڈاگ لین (dog lane) انگریزی میں یہ لفظ برا معلوم نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اسی کو اگر کتا گلی کہا جائے تو وہ سخت برا معلوم ہوگا۔

۲ اگست کی شام کی نشست (اسلام کا تعارف) کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کثیر تعداد میں سوالات

کئے گئے۔ ایک ہندو سوال کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو پہلے انھوں نے دو بار السلام علیکم کہا۔ اس کے بعد اپنا سوال پیش کیا۔ جلسہ کے بعد جب میں اسٹیج سے اٹھ کر جانے لگا تو جدھر جاتا ہر ایک السلام علیکم کہتا۔ عورت اور مرد سب ایسا ہی کر رہے تھے۔ یہ گویا ان کی طرف سے اپنی پسندیدگی کا اظہار تھا۔

کچھ انتہا پسند عرب نوجوان بھی جلسہ میں موجود تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ وہ قصداً یہاں آئے تھے اور انھوں نے گیٹ پر کچھ پمفلٹ بھی تقسیم کئے۔ ایک پمفلٹ کا عنوان تھا:

An invitation to think

اس میں یہ بتاتے ہوئے کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، یہ کہا گیا تھا کہ اس نے ایک مکمل نظام حیات ہم کو دیا ہے، یہ اسلام ہے۔ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حقیقی بدل ہے جس کا آج ہم شکار ہو رہے ہیں:

Islam is the true alternative to the capitalist dominated world we are suffering from

اسلام کو پیش کرنے کا یہی وہ طریقہ ہے جس نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں ایک جنگجو مذہب بنا دیا ہے۔ خدا ہمارا خالق ہے، وہی ہمارا الٰہ ہے، یہ بات صدفی صد درست ہے۔ مگر اس کے بعد جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ہر آدمی اللہ کا پرستار بنے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے۔ اس کے بجائے یہ لوگ عقیدۂ توحید کو بیان کرنے کے بعد فوراً یہ کہتے ہیں کہ خدا کے دین کو مکمل نظام کے طور پر زمین کے اوپر قائم کرنا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ غیر خدائی نظام کو توڑا جائے تاکہ اس کی جگہ خدائی نظام کو نافذ کیا جاسکے۔ اس طرح سارا معاملہ "اسلام ورسس سسٹم" بن جاتا ہے، حالاں کہ اصل معاملہ "اسلام ورسس انڈیویجول" ہے۔

ان عرب نوجوانوں نے میری تقریر کے بعد کچھ تیز و تند سوال بھی کئے۔ مثلاً یہ کہ پیغمبر کا اصل کام بتوں کو توڑنا تھا۔ آپ نے کافروں سے لڑائیاں کیں۔ اور آپ یہاں کہہ رہے ہیں کہ اسلام امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔ میں نے ہر سوال کا جواب ٹھنڈے طریقہ سے دیا۔ سوامی چیدانند نے بعد کو میرے طریقہ کی تائید کرتے ہوئے کہا: اشتعال کو ڈیفیوز کرنے کا آسان طریقہ صرف ایک ہے ـــــ نوری ایکشن (no re-action) سوامی چیدانند بڑی خصوصیات کے آدمی ہیں۔ جب بھی ان کی تعریف میں کچھ کہا جائے تو فوراً وہ کہیں گے: پربھو کی کرپا ہے۔

۳ اگست کی صبح کو ہوٹل سے جلسہ گاہ کے لئے روانگی ہوئی۔ مسٹر ہریش نگرپچا کار چلا رہے تھے۔ وہ یہاں تجارت کرتے ہیں۔ حسب عادت ان سے میں ان کے اپنے میدان کی باتیں کرتا رہا تاکہ ان سے کچھ نئی باتیں سیکھ سکوں۔ یہ صحابہ کا طریقہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (کان یتعلم من کل احد)

کار میں سیفٹی بیلٹ باندھتے ہوئے میں نے کئی باتیں اس کے بارہ میں دریافت کیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب جرمنوں نے اس مقصد کے لئے ایک نئی چیز نکالی ہے۔ وہ وھیل کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ اگر کار کو حادثہ پیش آجائے تو عین اسی وقت ایک بڑا سا غبارہ نکلتا ہے جو فوراً ہی ہوا سے بھر جاتا ہے۔ یہ کار اور مسافر کے درمیان فاصل (buffer) کی مانند حائل ہو جاتا ہے اور آدمی کو ٹکر سے بچا لیتا ہے

مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ہماری گاڑی ایک مقام پر پہنچی۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک سرسبز کمپاؤنڈ میں کچھ عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ مسٹر نگرپچا نے بتایا کہ یہ گاربیج ریسرچ سنٹر ہے۔ یہ لوگ یہاں اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ کس طرح کوڑے جیسی بظاہر بیکار چیز کو ایک کارآمد چیز میں تبدیل کر سکیں۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہاں عورت اور مرد گا رہے تھے: تو ہی بگاڑے تو ہی سنوارے، ہے رام، ہے رام۔ ہم لوگ عورتوں اور مردوں کے ہجوم سے گزر رہے تھے کہ آواز آئی "یہ سنت نہیں، بھگوان کے سروپ ہیں"۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو ایک صاحب نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سنت تو سنت ہیں۔ بدی سنتوں کو اگر نرک میں بھی جانا ہو تو وہاں بھی وہ رام کتھا ہی کریں گے۔ پھر انھوں نے یہ شعر پڑھا:

مرے سوا کوئی آئے نظر نہ دوزخ میں　　　　کسی کا ظلم ہو مالک مجھے سزا دینا

ایک اور صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اپنا مشن یہ بتایا کہ ہم کو گھر گھر اور گلی گلی گیتا کا سندیش پہنچانا ہے

گلی گلی اور گھر گھر میں جب سنسکرتی کریگی بسیرا، وہ بھارت ہو گا میرا

اس قسم کی باتیں دیر تک مائک پر گونجتی رہیں۔ لوگ بار بار تالیاں بجا کر اپنے جوش کا اظہار کرتے رہے میں اپنی سیٹ پر غم زدہ حالت میں سوچ رہا تھا کہ حق بات لوگوں کو کس طرح بتائی جائے۔ دور قدیم میں جبر لوگوں کو چپ رکھتا تھا۔ دور جدید نے ہر ایک کو زبان دیدی ہے۔ ہر طرف بھانت بھانت کی آوازیں اس طرح بلند ہو رہی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایسے شور وغل کے ماحول میں

کلمۂ حق کو قابل قبول بنانا تو درکنار اس کو لوگوں کے لئے قابل سماعت بنانا بھی عملاً ناممکن بن گیا ہے۔ آج داعیٔ حق اگر بولے تو اس کی بول اس عمومی ہنگامہ میں صرف شور میں ایک اضافہ بن کر رہ جاتی ہے۔

سنت شری بھائی اوزا نے کہا کہ میں کو مٹاتے جاؤ، مٹاتے جاؤ تو آخر میں کیول پر ماتما ہی بچے گا۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں میں گیتا پر بول رہا تھا کہ ایک ہندو نوجوان نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ گیتا کے شری کرشن بار بار میں کی زبان بولتے ہیں، آخر وہ اتنے خود پسند (egoist) کیوں ہیں۔

تقریروں کے بعد مراری باپو (باپوجی) کی کتھا شروع ہوئی۔ وہ مختلف قسم کے کلمات دہراتے تھے اور مجمع بھی تالیاں بجا کر انھیں دہراتا تھا۔ مثلاً کرپا کرو گرو دیو کی نائی۔ وہ رامائن سے لے کر ہنومان جی کے قصہ کی تشریح کرتے ہیں۔ اس کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ سنت لوگ کتھا کرتے ہیں اپنی مستی کے لئے، دوسروں کو سنانے کے لئے نہیں۔ انھوں نے کہا کہ باغ میں پھول کو ہر آدمی اپنے اپنے ڈھنگ سے دیکھتا ہے۔ پر بھگت پھول کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ پھول اتنا سندر ہے تو میرا کرشن کتنا سندر ہوگا۔ میں نے کہا کہ موحد اسی کو اس طرح کہے گا کہ خدا کتنا سندر ہوگا۔

مراری باپو کا اور میرا اس سے پہلے بمبئی میں آدھ گھنٹہ کے لئے کسی میٹنگ میں ساتھ ہوا تھا۔ مجھے یہ بات یاد نہ تھی۔ مراری باپو نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے بعد بمبئی کے مرہٹی اخبار میں چھپا کہ مراری باپو مولانا صاحب کے ساتھ حج کے لئے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف میرے بارہ میں وہاں کے اردو اخبار میں چھپا کہ مولانا صاحب مراری باپو کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے جانے والے ہیں۔ اخباروں کی اسی الٹی خبر رسانی نے موجودہ زمانہ میں سارا معاملہ بگاڑ رکھا ہے۔

اہل مغرب کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کو بے عقلی کے دور سے نکال کر عقل کے دور میں پہنچایا ہے۔ مگر یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک مغربی مفکر کی یہاں تقریر ہوئی۔ اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ساری علمی ترقیوں کے باوجود آج بھی کائناتی سوالات کا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بڑے سائنسٹ سے پوچھا گیا کہ درخت ہرے کیوں ہیں (Why the trees are green) وہ کہہ سکتا تھا کہ کلوروفل کی وجہ سے۔ مگر پھر سوال ہوگا کہ کلوروفل میں یہ صفت کیسے ہے، اور اس قسم کے ہزاروں سوالات جن کا کوئی جواب سائنس داں کے پاس نہیں۔ چنانچہ اس نے کہا کہ درخت ہرے

ہیں اس لئے کہ وہ ہرے ہیں :

Trees are green because they are green.

۳ اگست کی شام کو مسٹر رجنی کانت مہتا ملاقات کے لئے آئے۔ وہ لندن میں رہتے ہیں اور بمبئی کے ایک گجراتی اخبار (بمبئی سماچار) میں "ٹیمز کے ساحل سے" کے زیر عنوان کالم لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ تخریب کاری کبھی لامحدود طور پر جاری نہیں رہ سکتی۔ تخریب کاری کی ایک حد ہوتی ہے اور اپنی حد پر پہنچ کر ہمیشہ تخریب کاری ختم ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں تعمیر ابدی ہے اور تخریب صرف وقتی۔

شری مراری باپو نے اپنی ایک کتھا میں کہا کہ ہم لندن میں گھومنے کے لئے نہیں آئے بلکہ تمہارا دماغ گھمانے کے لئے آئے ہیں۔ تمہارا چنتن بدل جائے اس کے لئے آئے ہیں۔ یہاں بسے ہوئے ہندستانی جو اس طرح کی مجلسوں کا انتظام کرتے ہیں اس کا زیادہ بڑا محرک یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی نئی نسل کو اپنے آبائی مذہب پر باقی رکھ سکیں۔ مگر ان کوششوں کا انجام کیا ہے، اس کو خود مراری باپو نے ایک واقعہ کی صورت میں بیان کیا۔

انھوں نے کہا کہ بھارت سے ایک مہاتما یہاں آئے۔ یہاں روزانہ ان کا بیان ہوتا تھا۔ ایک ہندو نے ان سے مل کر کہا کہ میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کو بہت کہتا ہوں کہ وہ آپ کی مجلسوں میں آئے۔ مگر وہ آتا نہیں۔ کرپا کرکے آپ میرے یہاں چلیں اور میرے بیٹے کو آشیرواد دیں۔ مہاتماجی سرل آدمی تھے، مان گئے۔ فرصت ملنے کے بعد وہ اس ہندو کے گھر گئے۔ اس وقت رات کے ۱۲ بجے تھے اور لڑکا اپنے کمرہ میں سو چکا تھا۔ ماں باپ بڑی شردھا سے مہاتماجی کو لڑکے کے کمرہ میں لے گئے۔ اس کو اٹھایا اور کہا کہ دیکھو یہ مہاتماجی آئے ہیں، اٹھو اور ان کا آشیرواد لو۔ لڑکا اٹھا اور مہاتماجی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ قصہ بتا کر مراری باپو نے کہا : اس نوجوان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ مہاتما کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا بلکہ جھک کر ان کے چرنوں کو چھوا جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ٹھیک یہی کہانی مسلمانوں کی بھی ہے۔ مگر اس قسم کا تہذیبی جزیرہ (cultural island) بنانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ ہندستان کے ہندوؤں کو یہ پسند نہیں کہ وہاں کے مسلمان ہندستان میں اپنا الگ تہذیبی تشخص قائم کریں۔ اسی

طرح پاکستان کے ہندو اگر پاکستان میں اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے کی کوشش کریں تو وہاں کے مسلمان اس کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مگر یہی ہندو اور مسلمان جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ یہاں اپنے علیحدہ تشخص کو باقی رکھ سکیں اس تضاد کے ساتھ کسی کام میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

ورک شاپ میں ایک ہندو نے یہ سوال کیا کہ کیا گرو کو بھگوان کہا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ گرو کو خود نہیں بولنا چاہئے کہ میں بھگوان ہوں۔ مگر شسیوں کو یہی سمجھنا چاہئے کہ گرو جو ہے وہی بھگوان ہے، بلکہ گرو بھگوان سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیوں کہ گرو کے بغیر بھگوان کو پانا ممکن نہیں اس پر بعد کو شری رام باپا نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا منش بھگوان ہوسکتا ہے۔ بھگوان والی یا واکیا منش میں آسکتی ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں ایسا نہیں مانا گیا ہے۔ اسلام میں خدا خدا ہے، اور انسان انسان۔ مزید یہ کہ اسلام کے مطابق، خدا کو پانے کے لئے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں۔

۳ اگست کی شام کو حسب معمول ورک شاپ تھی۔ یہ ایک مشترک ورک شاپ تھی جس میں پانچ "سنت" سوالات کا جواب دینے کے لئے بٹھائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ اسلام کے بارہ میں جو سوالات آئے ان کا جواب میں نے دیا۔ مگر یہ سوالات زیادہ تر غلط فہمی کی نوعیت کے تھے۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ مکہ کے کعبہ میں جب شیولنگ موجود ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ اختلافات کیوں پائے جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ گائے کی پوجا کرو۔ میں نے کہا کہ یہ سب بالکل بے بنیاد باتیں ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک سوال عید الاضحیٰ کے تیوہار کے بارہ میں تھا، اس کی میں نے وضاحت کی اور بتایا کہ عید الاضحیٰ کا مقصد کیا ہے۔

یہ ورک شاپ ہوٹل کے وسیع لان میں رکھی گئی تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو چھوٹے بچے مل کر گیت گا رہے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ہندستان کے نواسی سبھی جان ایک ہے　　　رنگ روپ ویش بھاشا چاہے انیک ہے

ہندو دھرم سے متعلق سوال کا جواب دینے کے لئے کئی لوگ موجود تھے ـــــ شری رمیش بھائی اوزا، سوامی چیدانند، ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی، ڈاکٹر کے ایل سیشا گری راؤ۔

لندن میں مقیم ایک ہندو نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہندو لوگ ہندو دھرم کو چھوڑ کر مسلمان یا عیسائی بن جاتے ہیں۔ کیا ہمارے دھرم میں کوئی خرابی ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہندو دھرم میں اتنے زیادہ خدا کیوں ہیں، جب کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سچائی صرف ایک ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ گرو کا درجہ بھگوان سے بھی زیادہ ہے، ایسا کیوں۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے سوال کیا کہ ہندوازم کی تعریف کیا ہے۔ ڈاکٹر سیشاگری راؤ (اڈیٹر انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم) نے مہاتما گاندھی کی زبان میں جواب دیا کہ ہندوازم پرامن طور پر سچائی کی تلاش ہے:

Hinduism is a search for truth through non-violent means.

شری رمیش بھائی اوزا نے ایک سوال کے جواب میں جو بات کہی وہ شاید ان مذاہب سے متعلق تمام سوالات پر چسپاں ہوتی ہے۔ ایک ہندو نوجوان نے سوال کیا کہ مہابھارت کے اندر بھگوان کرشن دھوکا دیتے ہیں۔ اور دوسری غیر اخلاقی باتیں کرتے ہیں۔ پھر وہ کیسے بھگوان ہیں۔ شری رمیش بھائی اوزا نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ عقل سے اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ ایک شخص نے شری کرشن کی طرف سے کہا ہے، اسی کو یہاں میں دہراؤں گا ــــــ مجھ کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، بس مجھ سے پریم کرو:

Don't try to understand me. Just love me.

۴ اگست کی صبح کو حسب معمول ہوٹل سے جلسہ گاہ (راونڈ ووڈ پارک) کے لیے روانہ ہوا۔ ہماری کار میں دو پروفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈاکٹر شیشاگری راؤ اور دوسرے صاحب جو کار کو چلا رہے تھے۔ صاحب کار نے کہا کہ آجکل میں ایک مغربی مصنف کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اس کا نام ہے مسرت کا شہر (City of Joy)۔ انڈیا کے تذکرہ کے تحت اس میں بتایا گیا ہے کہ دیوالی ہندوؤں کے لیے جوئے کا تیوہار ہے۔ دیوالی میں ہندو بڑے پیمانہ پر گیمبلنگ کرتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے تنقیدی انداز میں کہی۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ گیمبلنگ تو زندگی کا حصہ ہے۔ آپ کی میرج بھی تو گیمبلنگ ہے۔ میں نے کہا کہ میرج گیمبلنگ نہیں ہے، البتہ وہ رسک ہے، اور رسک بلاشبہ زندگی کا ایک حصہ ہے۔ صاحب کار نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر راؤ جو زیر ترتیب انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم کے چیف اڈیٹر ہیں، انھوں نے کہا کہ ہندوازم اتنا پیچیدہ ہے

کہ کوئی بھی بات جو آپ ہندو ازم کی طرف منسوب کریں اس کی فوراً کوئی تردید کی جا سکتی ہے:

Hinduism is so complex that you cannot claim anything which cannot immediately be denied.

روایتی طریقہ کے مطابق آج بھی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے تین صاحبان نے تقریر کی، پنڈت وتیج رنگایا (بدھسٹ) سر سگمنڈ اسٹمبرگ (یہودی) ریورنڈ مارکس (عیسائی)۔ تینوں تقریروں کے بعد بھارتیہ ودیا بھون کے چیرمین کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تینوں مقررین نے جو بات کہی عین وہی ہندو اسکرپچر میں بھی ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں:

There is absolutely no difference.

اس کے بعد حسب معمول مراری باپو کی کتھا شروع ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ راماین کے قصیدوں کی خوبصورت توجیہ میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی مثالیں ان کے ہر بیان میں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً راماین کے مطابق، سیتا کو راون چرا کر لنکا لے گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بھلا سیتا کو کوئی چرا سکتا ہے۔ سیتا چرائی نہیں گئیں۔ وہ رام کی رضامندی سے لنکا کو پوتر کرنے کے لئے ماں کے روپ میں لنکا گئی تھیں۔ انھوں نے لنکا کو پاتر تا دیا۔ اسی طرح رام چرت مانس میں ہے کہ ہنومان جی لنکا گئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں ہر مکان مندر ہے۔ انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ ہنومان جس گھر میں جائیں وہ تو مندر ہی ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان کی یہ توجیہات فی الواقع توجیہ ہیں یا لطیفہ۔

درمیان میں وہ طرح طرح کے نکتے بیان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک قصہ کے ذیل میں انھوں نے کہا: نہ بھوگنا ہے، اور نہ بھاگنا ہے، کیول پربھو (کرشن) میں بھیگنا ہے۔ ایک قصہ کے ضمن میں انھوں نے کہا کہ ایک سجن نے مجھ سے پوچھا کہ باپو، آپ سورگ میں جائیں گے یا نرک میں۔ میں نے کہا کہ نہ ہم کو سورگ میں جانا ہے اور نہ ہم کو نرک میں جانا ہے۔ ہم کو بار بار سنسار (بھارت) میں جنم لینا ہے اور یہی رام کتھا کرنا ہے۔ اگر بھگوان نے ہم کو نرک میں ڈال دیا تو ہم بھگوان سے کہیں گے کہ ہم کو وہ ستا کر دو کہ ہم یہاں بھی اپنی رام کتھا کرتے رہیں۔ رام کتھا وہ نہایت جوش اور مستی کے ساتھ کرتے ہیں۔ تین چار گھنٹہ تک مسلسل کتھا کرتے رہے۔ مگر نہ وہ تھکے اور نہ ۲۵ ہزار کا مجمع اکتایا۔

گھنٹوں تک جاری رہنے والی پوری کتھا قصے کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ بال شنکر کی ماں کو کسی سخت ضرورت سے باہر جانا تھا اور اگلے دن درگا پوجا کا دن آنے والا تھا ماں نے اپنے بچہ سے کہا کہ مجھ کو جانا ضروری ہے۔ تم ایسا کرنا کہ درگا پوجا کے دن ایک پیالہ میں گائے کا تازہ دودھ لے کر درگا دیوی کو بھوگ لگا دینا۔ بال شنکر نے ماں کے کہنے کے مطابق، اگلے دن ایک صاف پیالہ میں دودھ بھرا اور گھر میں درگا دیوی کی جو مورتی تھی اس کے سامنے اسے رکھ دیا۔ اس کے بعد بال شنکر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچہ یہ سمجھتا تھا کہ ماں درگا پیالہ کا دودھ پئے گی۔ لیکن ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ گزرا۔ کئی گھنٹے گزر گئے مگر دودھ ویسا کا ویسا پڑا رہا۔ اب بال شنکر رو پڑا۔ اس نے کہا کہ ماں، تم دودھ کیوں نہیں پیتی ہو۔ کیا اس لئے کہ میں چھوٹا بالک ہوں۔ وہ روتا رہا۔ یہاں تک کہ درگا دیوی نے پیالہ کا سارا دودھ پی لیا۔ یہ دیکھ کر بال شنکر دوبارہ رونے لگا۔ اس نے کہا کہ میری ماں تو پیالہ کا آدھا دودھ پیتی تھی اور آدھا میرے لئے چھوڑ دیتی تھی اور تم سارا ہی دودھ پی گئیں۔ جب اس نے ایسا کہا تو درگا دیوی نے بچہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنی چھاتی سے اس کو دودھ پلایا۔

یہ عجیب و غریب قصہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے سنایا کہ انسان اگر بھگوان سے سچے دل سے مانگے تو وہ ضرور اس کو دیتا ہے۔ چنانچہ ماں جب بھوگ لگاتی تھی تو درگا دیوی نے کبھی اس کو نہیں پیا۔ مگر جب بال شنکر رو پڑا تو اس نے دودھ کو نہ صرف پیا بلکہ خود بچہ کو بھی پلایا۔

اس قسم کی انوکھی کہانیوں اور توجیہات سے ان کی کتھا بھری ہوئی ہے۔ عین یہی بات خود مسلمانوں میں بھی پوری طرح داخل ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں لاکھوں بے اصل کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور بزرگوں کے بیانات زیادہ تر انھیں سے بھرے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دونوں ہی فرقے قصہ کہانیوں کی ایک طلسم ہوشربا میں گم ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی خدا کی اصل ہدایت کا پتہ نہیں۔

۴ اگست کی شام کی ورک شاپ صرف سوال و جواب کے لئے تھی۔ اس میں چار لوگوں کو سوالات کا جواب دینا تھا ــــــ چیف جسٹس دار پروفیسر منجیت سنگھ، سنت شری رشی بھالی اوزا، شریمتی جیجا جی، اور راقم الحروف۔

شریمتی جیجا جی نے ایک سوال کے جواب کے تحت کہا کہ ہندو کا لفظ ہمارے شاستروں میں نہیں

ہے۔اس لئے ہم کو اس لفظ کا استعمال چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کے بجائے ہم کو بھارتیہ (بھارتی) کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ یہ زیادہ صحیح لفظ ہے اور ہندستان میں کسی کو بھی اس لفظ کے استعمال پر اختلاف نہیں ہوگا۔ ایک سوال یہ تھا کہ جب پوجا صرف بھگوان کی ہے تو گرو کے سامنے پوجا کیوں۔ شریمتی بیجاجی نے اس کے جواب میں کہا کہ گرو ہم کو بھگوان سے ملاتا ہے اس لئے اس کا اعتراف تو کرنا ضروری ہے۔ ہمیں گیان دینے والے کا سمان کرنا ہے۔ پھر اس کو کیسے کریں۔ ہماری پرمپرا میں "تھینک یو" نہیں ہے۔ بلکہ پوجا ہے۔ جس اعتراف کے لئے یورپ کے لوگ تھینک یو کہتے ہیں، اس کے لئے ہمارے یہاں پوجا کا طریقہ ہے۔

اسلام کے بارہ میں کئی سوالات کئے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام اتنا زیادہ بے برداشت (intolerant) مذہب کیوں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہ کہیں کہ آجکل کے کچھ مسلمان بے برداشت ہوگئے ہیں تو میں صد فی صد اس سے اتفاق کروں گا۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اسلام بے برداشت مذہب ہے تو میں اس سے صد فی صد اختلاف کروں گا۔ ڈاکٹر سیتا گری راؤ نے بتایا کہ انھیں یہ جواب بہت پسند آیا۔ ایک ہندو نوجوان نے عین جلسہ کے درمیان کھڑے ہو کر کہا: آج سے پہلے میں مسلم سے ہیٹ کرتا تھا، آج میری ہیٹ ختم ہوگئی۔ اسی قسم کی بات کئی اور ہندو نوجوانوں نے مجھ سے کہی۔ بہت سے ہندو میرے کمرہ میں آئے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ میری باتیں سن کر اسلام کے بارہ میں ان کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

جلسہ کے بعد بہت سے ہندو، خاص طور پر نوجوان، مجھ سے ملے اور کہا کہ ہمارے دل میں اسلام کے خلاف بہت سی باتیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم اسلام کو ایک برا مذہب سمجھتے تھے۔ مگر آپ کی باتیں سننے کے بعد ہمارا ذہن صاف ہوگیا اور اسلام کے خلاف ہمارے جو خیالات تھے وہ ختم ہوگئے۔ کئی ہندو ایسا کہتے ہوئے رو پڑے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی گہرائی کے ساتھ باتوں کا اثر قبول کیا تھا۔

کئی انگریز نو مسلموں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک عبد العظیم صاحب (عمر ۴۸ سال) تھے۔ ان کا قدیم نام پیٹر سینڈرس (Peter Sanders) ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۰ میں اسلام قبول کیا۔ وہ اپنی دس سال کی بچی فردوس کے ساتھ آئے۔ بچی نے بتایا کہ وہ جس اسکول میں پڑھتی

ہے اس میں کچھ پاکستانی بچے بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم آدھی مسلم (half-Muslim) ہو۔ کیوں کہ تمہاری پیدائش انگلینڈ میں ہوئی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے لوگ پورے مسلمان ہیں۔

۴ اگست کی دوپہر کو جب لندن کے راونڈ وڈ پارک میں مراری باپو کی کتھا ہو رہی تھی، ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ کتھا کے درمیان جوش میں آ کر ایک ہندو خاتون کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ترنگا ہندستانی جھنڈا تھا۔ وہ اس جھنڈے کو اٹھا کر فضا میں لہرانے لگی۔ یہ دیکھ کر باپو جی نے کہا: جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔ اور پھر حاضرین تالیاں بجا کر ہندستان کا قومی ترانہ جن من گن بلند آواز سے گانے لگے۔ وسیع شامیانہ میں کچھ دیر کے لئے یہ منظر تھا کہ فضا میں ہندستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور دوسری طرف وسیع پنڈال میں جن من گن کا ترانہ گونج رہا ہے۔

اس وقت اسٹیج پر دو انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ پھیلی ہوئی جلسہ گاہ میں کئی انگریز نوجوان تھے جو ویڈیو ریکارڈنگ کے نظام کی نگرانی کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ حاضرین میں بھی کچھ انگریز موجود ہوں۔ لیکن انگریز یہ منظر دیکھ کر صرف مسکراتے رہے۔ کسی نے بھی ناراضگی یا احتجاج کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ حالاں کہ اگر ہندستان یا پاکستان کے کسی جلسہ میں اس نوعیت کا واقعہ ہو تو اسی وقت ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اور عجب نہیں کہ وہ خونیں فساد کے مرحلہ تک پہنچ جائے ——— قوموں کی ترقی کا راز صبر ہے اور قوموں کی ناکامی کا راز بے صبری۔

ڈاکٹر سیشاگری راؤ سے میں نے پوچھا کہ انگریزوں اور ہندستانیوں میں مزاج کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی لوگ ایموشنل (جذباتی) ہوتے ہیں اور انگریز حقیقت پسند۔ میں نے کہا کہ اسی فرق نے دونوں کے درمیان وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جو موجودہ زمانہ میں پایا جاتا ہے۔ انگریزوں نے ایک عالمی ایمپائر بنایا۔ مگر اتنے بڑے ایمپائر میں کسی بھی مقام پر کسی انگریز نے رِوولٹ (revolt) نہیں کیا۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے ملکی سطح پر ایک چھوٹا سا ایمپائر بنایا اور اس کا حال یہ ہوا کہ ہر حاکم اور گورنر جس کو موقع ملا وہ مرکز سے بغاوت کر کے اپنی الگ سلطنت بنا کر بیٹھ گیا۔ آج آزاد ہندستان میں ہر سرحدی ریاست میں سیاسی لیڈر یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ کس طرح وہ اس کو نئی دہلی سے کاٹ لیں اور وہاں اپنی ایک الگ ریاست قائم کر دیں۔

مراری باپو اکثر کتھا کے آخر میں کہتے تھے: بھگوان سے ایک ہی چیز مانگو۔ تمہاری ملاقات

کسی سچے سادھو سے کرا دے جو تمہارے اندر کو خالی کرکے اس کو گیان سے بھر دے۔ ہندو دھرم میں گرو کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ عجیب بات ہے کہ عین یہی تصور اب مسلمانوں میں بھی پوری طرح آگیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی کچھ "بڑے" فرض کر لئے ہیں۔ ان کا سارا مذہب انھیں انسانی بڑوں کے گرد گھومتا ہے۔ خدا مرکزی مذہب نہ ہندوؤں کے یہاں پایا جاتا ہے اور نہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں۔

مراری باپو کی کتھا خوبصورت انداز میں ہندوازم کا پرچار ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ ۴ اگست کی کتھا کے دوران انھوں نے کہا کہ آجکل کے بچے بہت ہوشیار ہیں۔ ایک باپ نے اپنے چھوٹے بچہ کو بتایا کہ کوئی چیز ناممکن نہیں۔ نپولین نے کہا ہے کہ ناممکن کا لفظ صرف بیوقوفوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔ بیٹا یہ سن کر باتھ روم میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹوتھ پیسٹ کا ٹیوب تھا۔ اس نے ٹیوب دبا کر پیسٹ نکالا اور پھر باپ سے کہا کہ اگر ہر چیز ممکن ہے تو آپ اس پیسٹ کو دوبارہ ٹیوب میں ڈال دو۔ باپ نے ہار مان لی۔

انھوں نے بتایا کہ مجھ سے یہاں کے ایک بچے نے کہا کہ باپو یہ بتائیے کہ بی (B) ٹھنڈا کیوں ہوتا ہے۔ مراری باپو نے بہت سوچا مگر بی کے ٹھنڈا ہونے کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ بچہ نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا کہ بی اس لئے ٹھنڈا ہوتا ہے کہ وہ اے اور سی کے درمیان ہوتا ہے:

Because it is between A/C.

مراری باپو نے اس قصہ کو بتانے کے بعد کہا کہ آجکل کے بچے جو اتنے زیادہ ہوشیار ہو گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بار بار جنم لیا۔ بار بار وہ اس دنیا میں آکر اپنا گیان بڑھاتے رہے۔ مراری باپو نے اس طرح مذکورہ قصہ سے ہندوازم کا آواگمن کا نظریہ ثابت کیا۔ مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ خود مراری باپو نے کیا بار بار جنم نہیں لیا ہے۔ بار بار جنم لینے والی ہوشیاری صرف برطانیہ کے لوگوں میں کیوں آئی ہے، جب کہ وہ اس عقیدہ کو مانتے ہی نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کا آشیرواد لینے کے لئے آئے ہیں۔ خاتون نے بتایا کہ ان کے گرو دہرہ دون کے پاس رہتے ہیں۔ انھوں نے برسوں تک جھاڑی میں رہ کر تپسیا کی ہے۔ اب ۱۲ برس سے وہ مون میں ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ ہندو قوم میں زاہد شاید

انھیں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی "فقیر" کا لفظ اپنے اندر ایک طلسماتی اثر رکھتا ہے۔ میں چوں کہ بہت سادہ رہتا ہوں۔ میرے دبلے پتلے جسم اور میرے الجھے ہوئے بال میں انھیں فقیر کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ مجھ کو دیکھ کر بہت زیادہ تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔

صوفیوں کی طرف ہندوؤں کا کھنچاؤ اسی لئے ہوا کہ صوفی کی ترک دنیا کی زندگی میں ہندو کو فقیری کا رنگ دکھائی دیا۔ اسی قسم کے ایک صوفی سے احمد آباد کے قریب بہت سے ہندو متاثر ہوئے۔ یہ لوگ اس وقت تقریباً ۱ لاکھ کی تعداد میں ہیں۔ مگر وہ آدھے ہندو آدھے مسلمان بن کر رہ گئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ صوفی کے یہاں صرف شخصیت کا وسیلہ کام کر رہا تھا۔ شخصیت کے ہٹنے کے بعد کوئی اور چیز (مثلاً لٹریچر) موجود نہ تھا جو ان متاثرین کی مزید ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ خبر ہے کہ اب وہ لوگ دوبارہ اپنے قدیم مذہب کی طرف لوٹا دئے گئے ہیں۔

لندن میں مختلف اجتماعات میں میری کئی تقریریں ہوئیں۔ اسلام کے بارہ میں سوالات کا جواب دینے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ہندو مجھ سے اس طرح ملنے لگے جیسے کہ میں ان کا روحانی گرو ہوں۔ کثرت سے ہندو مرد اور عورت میرے پاس آتے اور اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کرتے۔ ان میں سے اکثر کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رونے لگے۔ حتی کہ کئی ہندوؤں نے کہا کہ رام کتھا سے زیادہ ہم کو آپ کے ذریعہ ملا ہے۔

میں دنیا کے اکثر ملکوں میں گیا ہوں۔ ہر قوم کے لوگوں سے میرا سابقہ پیش آیا ہے۔ ایشیا افریقہ، یورپ، امریکہ، غرض ہر جگہ کے لوگوں کے بارہ میں مجھے براہ راست طور پر جاننے کا موقع ملا ہے۔ مگر یہ بات میں نے صرف ہندوؤں میں پائی۔ ہر قوم میں مجھے ایسے لوگ ملے جنھوں نے میری تحریر یا تقریر پر غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر دوسری کسی بھی قوم میں مجھ کو ایسے لوگ نہیں ملے جو اپنے تاثرات کو ظاہر کرتے ہوئے رونے لگیں۔ یہ تاثر پذیری (receptivity) کم از کم میرے تجربہ میں، صرف ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اس صفت کو سوچ کر میں بے اختیار رونے لگتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدایا، تو اس قوم کی ہدایت کا سامان کر۔ خدایا، تو اس قوم کے لئے اپنی معرفت کے دروازے کھول دے۔ خدایا، تو اس قوم کو اپنے دین کے لئے قبول فرما۔

۵ اگست کو صبح نو بجے کا وقت ہے۔ دروازہ کھولتا ہوں تو ایک ہندو نوجوان کھڑے ہوئے ملتے

ہیں۔ وہ لسسٹر میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا نام اچاری بتایا۔ انھوں نے ہندو طریقہ سے جھک کر نام کیا۔ اور پھر کہا : ہم لوگوں کو بہت غلط امپریشن تھی اسلام کی۔ اب آپ کو سننے اور دیکھنے کے بعد ہماری ساری درشٹی بدل گئی۔

اس طرح کی بات یہاں بہت سے ہندوؤں نے کہی۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ہندو نوجوانوں میں کچھ فرقہ پرست لیڈروں نے جو زہر اسلام کے خلاف پیدا کیا ہے، اس کو ختم کرنا بہت آسان ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ مسلم رہنما ردعمل کا انداز اختیار نہ کریں بلکہ مثبت انداز میں دین رحمت اور پیغمبر رحمت کا تعارف لوگوں کے سامنے لایا جائے اور ان کے لئے خدا سے دعا بھی کی جائے۔

مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کے سابق لیڈر مسٹر الطاف حسین آجکل لندن میں رہتے ہیں۔ کیوں کہ پاکستان میں وہ غدار وطن قرار دے دیے گئے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کرنا چاہا مگر ان سے ربط قائم نہ ہوسکا۔ الطاف حسین پاکستان کی پراسرار شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ میثاق (جون ۱۹۹۴) میں ان کی بابت حسب ذیل الفاظ چھپے ہوئے تھے۔

" افواہ گرم ہے اور بہت وثوق سے بتایا جاتا ہے کہ الطاف حسین نے لندن میں اپنی رہائش کے لئے بیالیس لاکھ پونڈ اسٹرلنگ کا مکان خرید رکھا ہے۔ نیویارک میں پانچ کروڑ ڈالر میں خریدا ہوا ان کا ہوٹل شب و روز مال بنا رہا ہے۔ اور یہ کہ ان کے پاس نقد موجود رقم کی مالیت دس ارب روپیہ ہے۔ ایم کیو ایم کا سازشی عنصر نیو ورلڈ آڈر کے لئے ہانگ کانگ کا متبادل تیار کرنے کے لئے کراچی کو سندھ سے کاٹنا چاہتا ہے" صفحہ ۶

لندن سے ایک ہفت روزہ انگریزی اور گجراتی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام گراوی گجرات (Garavi Gujrat) ہے۔ اس نے اپنی دو اشاعتوں میں میرے مضامین شائع کئے اور ان کو جلسہ میں تقسیم کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انٹرویو بھی لیا۔

لندن کے فیسٹول میں مذاہب کے جو ذمہ دار افراد شریک ہوئے، ان میں سے ایک اکال تخت (امرتسر) کے چیف جتھے دار پروفیسر منجیت سنگھ بھی تھے۔ وہ چوں کہ معتدل اور امن پسند آدمی ہیں، ان کے خلاف انتہا پسند سکھوں کی طرف سے یہ خبر پھیلائی گئی کہ ان کو لندن کی

کانفرنس میں ایک سازش کے تحت بلایا گیا تھا تاکہ لندن میں مقیم سکھ انتہا پسندوں کو مین اسٹریم میں لایا جائے اور خالصہ تحریک کو سبوتاز کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے را (RAW) نے ان کو بیرونی کرنسی میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ (Rs. 1.5 crore) کی رقم ادا کی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۴) کی ایک رپورٹ کے مطابق، چیف جتھے دار نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ سفر سکھ ازم کے پرچار کے لئے تھا:

He clarified that his visit was to propagate Sikhism.

پروفیسر منجیت سنگھ کے سفر کو دو رخ سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ دوسروں سے لینے کے لئے گئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کو دینے کے لئے وہاں گئے ہیں۔ سکھ نوجوانوں نے ان کے سفر کو پہلے رخ سے دیکھا اس لئے وہ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ اگر وہ ان کے سفر کو دوسرے رخ سے دیکھتے تو وہ خوش ہوتے اور ان کی مذمت کرنے کے بجائے ان کو مبارک باد کا ٹیلیگرام بھیجتے۔

برطانیہ کے ایک عام آدمی سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران اس نے ایک لطیفہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ مسٹر ونسٹن چرچل جب پرائم منسٹر نہیں ہوئے تھے، اس وقت ان کا بی بی سی پر ریگولر پروگرام ہوا کرتا تھا۔ ایک روز چرچل کا پروگرام تھا۔ وہ گھر سے نکلے تو کچھ دیر ہو گئی تھی۔ انھیں فوراً بی بی سی کے آفس میں پہنچنا تھا۔ انھوں نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ اس نے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس وقت مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے اور وہاں چرچل کو سننا ہے۔ چرچل نے اپنا نام نہیں بتایا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو بی بی سی کے دفتر پہنچا دو، میں تم کو ستر پونڈ دوں گا۔

ستر پونڈ اصل کرایہ سے دس گنا زیادہ تھا۔ ٹیکسی والے نے جب ستر پونڈ کا لفظ سنا تو بولا: چرچل بھاڑ میں جائے۔ آؤ میں تم کو لے چلتا ہوں:

Let Churchill go to hell. Come on.

ایک اور برطانی آدمی سے ایک بار بات ہو رہی تھی۔ کسی معاملہ میں وہ اپنے نقطہ نظر کو بتا رہا تھا۔ اس درمیان میں بے ساختہ طور پر اس کی زبان سے نکلا:

It is a far cry to London.

مجھے یاد آیا کہ یہ 'ہنوز دلی دور است' کا انگریزی استعمال ہے۔ زبانوں میں یہ یکسانیت

غالباً دو وجہ سے آتی ہے۔ ایک یہ کہ تمام تصورات یکساں طور پر ہر آدمی کی فطرت میں پیوست ہیں۔ اور وہ اندرونی زور پر لفظ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسانی اختلاط کے دوران زبانوں میں برابر لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔ پہلی چیز عالمی لسانی یکسانیت کی داخلی توجیہ ہے اور دوسری چیز لسانی یکسانیت کی خارجی توجیہ۔

دہلی کے اردو ہفت روزہ الجمعیۃ (۴ - ۱۰ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: ہندستانی فرقہ پرستی کی ہوا دیار فرنگ تک پہنچی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ لندن کے علاقہ ساؤتھ آل میں قدیم ٹاؤن ہال کو نیلام کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس کو مسجد کے لئے لینا چاہا۔ مگر فرقہ پرستی کا زہر ہندستان سے سفر کرکے لندن تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ضد میں ہندوؤں نے اعلان کر دیا کہ وہ ٹاؤن ہال کو خرید کر وہاں شاندار مندر تعمیر کریں گے۔ نیلام کے دن دونوں فرقوں کی طرف سے بڑھ بڑھ کر بولیاں لگائی گئیں۔ کونسل نے مزید رقم کی امید میں تاریخ بڑھا دی جو کہ ضابطہ کے خلاف تھی۔ اس کے بعد معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ ہندوؤں کا مقصد مندر کی تعمیر نہیں ہے بلکہ صرف مسجد کی تعمیر کی مخالفت کرنا ہے۔ اسی طرح کونسل کا مقصد یہ ہے کہ اپنی جائداد کو اونچی سے اونچی قیمت پر فروخت کرے۔

یہ ایک عجیب رپورٹ تھی۔ لندن میں میں نے چاہا کہ اس کی تحقیق کروں۔ معلوم ہوا کہ یہ محض ایک سادہ سا مسئلہ تھا جس کو دہلی کے اردو اخبار نے مبالغہ آرائی کرکے اشتعال انگیز بنا دیا۔ چنانچہ اس وقت یہ عمارت مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ وہاں باقاعدہ نماز ہوتی ہے اور اس کی تعمیر جدید کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یہاں کوئی نزاع نہیں۔

انگلینڈ میں تعلیم کی نہایت آسانی ہے۔ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے، پی ایچ ڈی تک ساری تعلیم ذاتی خرچ کے بغیر حکومت کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مگر بیشتر لوگ صرف ۱۶ سال کی عمر تک پڑھ پاتے ہیں، کیوں کہ اس عمر تک کے لوگوں کے لئے پڑھنا قانونی طور پر لازمی ہے۔ طلبہ کی ۱۰ فیصد تعداد ہی یونیورسٹی تک پہنچ پاتی ہے۔ انگریزوں میں یونیورسٹی تک پہنچنے والے بچوں کی تعداد صرف سات فیصد ہے۔

۱ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۵ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ یہ انٹرویو زیادہ تر اسلامی مرکز کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ اسلامی مرکز کا مقصد کیا ہے اور کس طرح وہ پر امن انداز میں اس مقصد کے راستہ میں لگا ہوا ہے۔

۲ انڈیا پلس ٹی وی (India Plus TV) کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر وی پی شرما نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع سپریم کورٹ کا فیصلہ (۱۱ دسمبر ۱۹۹۵) تھا۔ جس میں ہندتو یا ہندویا ہندوازم کے الکشن مہم میں استعمال کرنے کو جائز ٹھہرایا گیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ فیصلہ یقینی طور پر غیر دستوری ہے۔ ہندتو کا لفظ سب سے پہلے ۱۹۲۴ میں ہندو مہاسبھا کے رہنما ویر ساورکر نے وضع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس لفظ کا مطلب ہندو راشٹر ہی رہا ہے۔ معروف مفہوم کے لحاظ وہ سیکولرزم کا ضد ہے۔

۳ ۲ فروری ۱۹۹۶ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر عید الفطر (اسلامی تیوہار) کے بارہ میں تھی۔ اس میں بتایا گیا کہ تیوہار انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور عید دراصل تیوہار کی رسم کا اسلامائزیشن ہے۔

۴ انڈیا پاکستان فرینڈشپ کے تحت ۳ فروری ۱۹۹۶ کو جامعہ ملیہ (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی اس میں شرکت کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ دونوں ملکوں میں نارمل تعلقات قائم کرنے کی سادہ تدبیر یہ ہے کہ دونوں کے درمیان انٹرایکشن اور آنا جانا بڑھایا جائے جس طرح عرب ملکوں میں عربوں کے لئے ویزا نہیں ہے اور یورپی ملکوں میں یورپ کے باشندوں کے لئے ویزا نہیں ہے۔ اسی طرح ہندستان اور پاکستان میں بھی رائج کر دیا جائے۔

۴ ۴ فروری ۱۹۹۶ کی شام کو راجدھانی کی کچھ اعلیٰ شخصیتوں کی میٹنگ کنشکا ہوٹل (نئی دہلی) میں ہوئی۔ اس کا موضوع سیاسی اصلاحات پر غور کرنا تھا۔ اس کے داعی جسٹس

دہلی سنگھ تیو تیاتھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی اس میں شرکت کی۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "پریشر گروپ" کو جاننا چاہئے کہ سیاسی اصلاح کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا پولیٹیکل اویرنس (سیاسی جاگ) پیدا کرنا۔ دوسرا ہے پولیٹیکل ایکشن (سیاسی اقدام) پہلا مرحلہ طے کئے بغیر دوسرے مرحلہ میں داخلہ نتیجۃً سیاسی اصلاح نہیں ہے بلکہ سیاسی بگاڑ ہے۔

۵ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے تحت نئی دہلی میں ۵ - ۶ فروری ۱۹۹۶ کو انڈیا - پاکستان ڈائیلاگ ہوا۔ جس میں دونوں طرف سے اعلیٰ شخصیتیں شریک ہوئیں۔ اس کی دعوت پر ۵ فروری کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور دونوں ملکوں میں تعلقات کو بہتر بنانے پر اظہار خیال کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس معاملہ میں ایک فارمولا درکار ہے۔ اور وہ فارمولا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں موجود ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ معاملہ کے سیاسی پہلو کو اس کے غیر سیاسی پہلو سے الگ کر دیا جائے۔ سیاسی پہلو کو انتظار کے خانہ میں ڈال کر یہ کیا جائے کہ دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت کو بڑھایا جائے۔ تجارت کھول دی جائے۔ تعلیم کے لئے دونوں طرف آنا جانا شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مثالیں دیکر اس کو واضح کیا گیا۔

۶ آکاشوانی نئی دہلی (ہندی دارتا) سے ۱۹ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: عید: میل ملاپ کا تیوہار۔

۷ دہلی کے ہندی میگزین کرنٹ ادیوگ کے سب اڈیٹر راکیش کھتری نے ۲۲ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملکی مسائل کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے یہاں میں تعلیم عام نہ ہو سکی۔ اچھے تعلیم یافتہ ابھی تک ۱۰ فیصد بھی نہیں ہیں۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہوگی اس وقت تک محض وقتی تدبیروں سے کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

۸ دہلی کے قریب بھونڈسی (Bhondsi) میں واقع چندر شیکھر آشرم میں ۲۴ - ۲۵ فروری

۱۹۹۶ کو ایک آل انڈیا سیمنار ہوا۔ اس میں تقریباً ۹۰ کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا ایجنڈا ایشن بلڈنگ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کئے۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک کے جو مسائل ہیں وہ کسی وقتی تدبیر سے حل نہیں ہو سکتے۔ تمام مسائل کی جڑ تعلیم کی کمی ہے۔ اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ عمومی سطح پر لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

۹ دہلی سے نکلنے والے ملیالم اخبار نئی دہلی انو (New Delhi Innu) کے ایسوسی ایٹ اڈیٹر مسٹر راجیش (Rajesh Chombala) نے ۲۵ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ الکشنی تبدیلیوں سے ملک میں کوئی انقلاب آنے والا نہیں۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی مدت تک کام کرنا پڑے گا۔

۱۰ سنٹر فار پیس اینڈ پراگرس کی طرف سے ۲۹ فروری ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ریلیجن اینڈ پالی ٹکس۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کا اکسپلائٹیشن غلط ہے۔ لیکن اگر مذہب کی اخلاقی قدروں کو سیاست پر منطبق کیا جائے تو یہ ایک درست بات ہوگی۔

۱۱ بزنس انڈیا ٹیلیویژن انٹرنیشنل کی ٹیم نے یکم مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کی انتخابی پالیسی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے تمام مسائل کی واحد ذمہ داری ان کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ اگر یہ نام نہاد لیڈر چپ رہتے تو کبھی ہندو اور مسلمان کی کشمکش پیدا نہ ہوتی۔ فطرت کے قانون کے تحت دونوں مل جل کر رہتے اور ترقی کرتے۔

۱۲ دنیش شرما اور ان کی ٹیم نے ۸ مارچ ۱۹۹۶ کو دوردرشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مستقبل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب

میں کہا گیا کہ ہندستان اور پاکستان کو چاہئے کہ اس معاملہ کو شملہ ایگریمنٹ کی روشنی میں طے کریں جس پر دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے ۱۹۷۱ میں دستخط کئے تھے۔

۱۳ صدر اسلامی مرکز نے ۹۔۱۱ مارچ ۱۹۹۶ کو مراد آباد کا سفر کیا۔ وہاں مختلف قسم کے پروگرام اور ملاقاتیں ہوئیں۔ ہندی اخبار امر اجالا کے نمائندہ نے تفصیلی انٹرویو لیا جو اخبار کے ۱۱ مارچ کے شمارہ میں چھپا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۴ ہفت روزہ نئی دنیا کے نمائندہ مسٹر ودود ساجد نے ۱۳ مارچ ۱۹۹۶ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس خبر سے تھا کہ ایران کی حکومت نے سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو واپس لے لیا ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ واپسی یقیناً قابل تعریف ہے، تاہم ضرورت ہے کہ اسی کے ساتھ یہ اعتراف کیا جائے کہ یہ ایک لغو فتوی تھا۔ اسلام میں کسی جرم پر سزا کا مسئلہ قضا (عدالت) کا مسئلہ ہے، وہ کسی انفرادی عالم کے فتوے کا مسئلہ نہیں۔ اس لئے اس کا بھی اعلان کیا جانا چاہئے کہ آئندہ ایسی جسارت کبھی نہیں کی جائے گی۔

۱۵ راشٹریہ جاگرتی سنستھان کے تحت ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمینار ہوا جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا مقصد ترجیحی بنیاد پر نیشنل ایجنڈا تلاش کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ حالات میں اہم ترین اشو یہ ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ کے تحت عمومی تعلیم کو قومی نشانہ بنایا جائے، یہاں تک کہ پوری قوم صد فی صد تعلیم یافتہ ہو جائے۔

۱۶ وائلٹ گراف (Violette Graff) فرانس کی ایک خاتون پروفیسر ہیں۔ وہ پیرس میں رہتی ہیں۔ (Tel. 1-43364153) اور ہندستانی مسلمانوں پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ آخر میں انھیں انگریزی الرسالہ اور انڈیا بین مسلمس بطور ہدیہ دی گئی۔

اُردو	Rs						
تذکیر القرآن جلد اول	200/-	تاریخ دعوت حق	5/-	نار جہنم	7/-	God Arises	Rs 95/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-	مطالعہ سیرت	12/-	خلیج ڈائری	10/-	Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
اللہ اکبر	45/-	ڈائری جلد اول	80/-	رہنمائے حیات	7/-	Islam As it Is	55/-
پیغمبر انقلاب	50/-	کتاب زندگی	55/-	مضامین اسلام	45/-	God-Oriented Life	70/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-	انوار حکمت	—	تعدد ازدواج	10/-	Religion and Science	45/-
عظمت قرآن	35/-	اقوال حکمت	25/-	ہندستانی مسلمان	40/-	Indian Muslims	65/-
عظمت اسلام	50/-	تعمیر کی طرف	8/-	روشن مستقبل	7/-	The Way to Find God	20/-
عظمت صحابہ	7/-	تبلیغی تحریک	20/-	صوم رمضان	7/-	The Teachings of Islam	25/-
دین کامل	60/-	تجدید دین	25/-	علم کلام	9/-	The Good Life	20/-
الاسلام	45/-	عقلیات اسلام	35/-	اسلام کا تعارف	2/-	The Garden of Paradise	25/-
ظہور اسلام	50/-	مذہب اور سائنس		علماء اور دور جدید	8/-	The Fire of Hell	25/-
اسلامی زندگی	30/-	قرآن کا مطلوب انسان	8/-	سیرت رسولؐ	10/-	Man Know Thyself	8/-
احیاء اسلام	35/-	دین کیا ہے	5/-	ہندستان آزادی کے بعد	1/-	Muhammad The Ideal Character	5/-
راز حیات	50/-	اسلام دین فطرت	7/-	مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-	Tabligh Movement	25/-
صراط مستقیم	40/-	تعمیر ملت	7/-	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-	Polygamy and Islam	8/-
خاتون اسلام	60/-	تاریخ کا سبق	7/-	منزل کی طرف	2/-	Words of the Prophet Muhammad	75/-
سوشلزم اور اسلام	40/-	فسادات کا مسئلہ	5/-	الاسلام یتحدی (عربی)	85/-	Islam The Voice of Human Nature	30/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-			Islam Creator of the Modern Age	55/-
الربانیہ	40/-	تعارف اسلام	5/-			Woman Between Islam And Western Society	95/-
کاروان ملت	45/-	اسلام پندرھویں صدی میں	5/-			Woman in Islamic Shari'ah	65/-
حقیقت حج	30/-	راہیں بند نہیں	12/-			Hijab in Islam	20/-
اسلامی تعلیمات	25/-	ایمانی طاقت	7/-			Concerning Divorce	7/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-	اتحاد ملت	7/-				
حدیث رسولؐ	35/-	سبق آموز واقعات	7/-				
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-	زلزلۂ قیامت	10/-				
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-	حقیقت کی تلاش	7/-				
میوات کا سفر	35/-	پیغمبر اسلام	5/-				
قیادت نامہ	30/-	آخری سفر	7/-				
راہ عمل	25/-	اسلامی دعوت	7/-				
تعبیر کی غلطی	70/-	خدا اور انسان	12/-				
دین کی سیاسی تعبیر	20/-	حل یہاں ہے	10/-				
امہات المومنین	20/-	سچا راستہ	8/-				
عظمت مومن	7/-	دینی تعلیم	7/-				
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-	حیات طیبہ	7/-				
طلاق اسلام میں	3/-	باغ جنت	7/-				
		فکر اسلامی	50/-				

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتک واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs
حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسولؐ	25/-
میدان عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

اظہار خیال کی آزادی

اسلام میں انسان کو مکمل فکری آزادی دی گئی ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام ہی نے پہلی بار انسانی تاریخ میں یہ انقلاب برپا کیا کہ ہر آدمی کو فکر و خیال کی آزادی ہو۔ اسلام سے پہلے تاریخ کے تمام زمانوں میں جبر کا نظام قائم تھا اور انسان فکری آزادی سے محروم تھا۔ فکری آزادی کوئی سادہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی ترقیوں کا راز اسی فکری آزادی میں چھپا ہوا ہے۔

فکری آزادی کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس اعلیٰ نیکی کو حاصل کرتا ہے جس کو قرآن میں خوف بالغیب کہا گیا ہے (المائدہ ۹۴) یعنی خدا کی طرف سے ظاہری دباؤ کے بغیر خود اپنے ارادہ کے تحت آزادانہ طور پر خدا کا اعتراف کرنا اور اس سے ڈر کر دنیا میں رہنا۔ جب تک مکمل آزادی کا ماحول نہ ہو کسی کو اس ناقابل بیان لذتِ روحانی کا تجربہ نہیں ہو سکتا جس کو غیب میں خدا سے ڈرنا کہا گیا ہے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی کو اس اعلیٰ انسانی عمل کا کریڈٹ دیا جا سکے۔

آزادیٔ فکر وہ چیز ہے جو آدمی کو منافقت سے بچاتی ہے۔ انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ اس کا ذہن لازمی طور پر سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آزادانہ اظہار رائے پر پابندی لگا دی جائے تو لوگوں کی سوچ تو بند نہیں ہوگی البتہ ان کی سوچ زبان و قلم پر نہیں آئے گی۔ جو ادارہ یا جو قوم یا جو ریاست اظہار خیال کی آزادی پر پابندی لگائے وہ آخر کار منافقوں سے بھر جائے گا۔ ایسے ماحول کے اندر مخلص انسان کبھی پرورش نہیں پا سکتے۔

اسی طرح فکری آزادی کا براہ راست تعلق تخلیقیت سے ہے۔ جس سماج میں فکر و خیال کی آزادی ہو وہاں تخلیقی انسان جنم لیں گے۔ اور جس سماج میں فکر و خیال کی آزادی پر روک لگا دی جائے وہاں لازمی طور پر ذہنی جمود طاری ہو جائے گا اور نتیجۃً یہ ہوگا کہ ایسے سماج میں تخلیقی ذہن کی پرورش اور اس کا ارتقاء ہمیشہ کے لیے رک جائے گا۔

اظہار اختلاف یا تنقید کے معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ لوگ اس معاملہ میں اپنی غیر ضروری حساسیت کو ختم کر دیں نہ یہ کہ خود تنقید و اختلاف کے عمل کو بند کرنے کی کوشش کریں۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے اور یہی فطرت کا تقاضا بھی۔

حدیث میں مومن کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ : الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ (مسند احمد) یعنی وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی حق دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرلیں۔ یہاں حق سے مراد امر حق ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مومن وہ ہے جس کے اندر اعتراف حق کا مادہ کامل طور پر موجود ہو۔ جب بھی کوئی سچائی اس کے سامنے لائی جائے، جب بھی اس کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو کوئی بھی احساس اس کے لیے قبول حق کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

اس صفت کا کامل درجہ یہ ہے کہ آدمی خود ہی پیشگی طور پر اس انتظار میں رہے کہ کب کوئی بتانے والا اس کو اس قسم کی کوئی بات بتائے اور وہ خوش دلی کے ساتھ فوراً اسے اپنا لے۔ وہ اپنی اصلاح اور اپنی درستگی کا حریص بن جائے۔ یہی مومنانہ کیفیت حضرت عمر فاروقؓ کی زبان سے ان الفاظ میں ظاہر ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ اللہ اس انسان پر رحم کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے بھیجے (رحم اللہ امرأ اھدیٰ الیّ عیوبی)

حقیقت یہ ہے کہ اعتراف حق ایک عبادت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے لیے آدمی کو سب سے بڑی قربانی دینا ہوتا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی اس کو سب سے بڑی عبادت بنا دیتی ہے۔ یہ قربانی اپنے وقار کی قربانی ہے۔ یہ اپنی بڑائی کو کھونے کی قربانی ہے۔ یہ حق کے لیے اپنے آپ کو بے قیمت کرنے کی قربانی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ آدمی جنت کی قیمت دے کر جنت میں داخلہ کا استحقاق حاصل کرلیتا ہے۔

اس عظیم عبادت اور اس عظیم خوش قسمتی کا موقع کسی کو کب ملتا ہے۔ یہ موقع صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ لوگوں کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہو۔ جب کسی رکاوٹ کے بغیر ایک آدمی دوسرے آدمی پر تنقید کر سکے۔ جب معاشرہ میں یہ ماحول ہو کہ کہنے والا بے تکلف اپنی بات کو کہے اور سننے والا کھلے طور پر اس کو سنے۔

جس طرح مسجد نماز باجماعت کی ادائیگی کا مقام ہے، اسی طرح اظہار خیال کی آزادی گویا وہ سازگار ماحول ہے جس کے اندر حق کو کہنے اور حق کو قبول کرنے والی عظیم نیکیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی طرح کے ماحول میں وہ معاملات پیش آتے ہیں جب کہ ایک شخص کو اعلان حق کا کریڈٹ دیا جائے اور دوسرے شخص کو قبول حق کا انعام۔

خدا کا تخلیقی نقشہ

دنیا میں ہدایت کا نظام ایمان بالغیب (البقرہ ۳) کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی یہاں تمام حقیقتوں کو غیر مرئی حالت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی فکری قوتوں کو عمل میں لاکر ان پوشیدہ حقیقتوں کو دریافت کرے اور پھر ان کی کامل مطابقت میں اپنی زندگی گزارے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو اپنا بڑا بنائے، حالاں کہ خدا کی بڑائی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے ڈرے، حالاں کہ خدا کی تعذیبی طاقت دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ داعیان حق کا ساتھ دے، مگر داعیان حق ہمیشہ عام انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں، ان کو پہچاننا صرف اس کے لیے ممکن ہوتا ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن کی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہی عام دنیوی چیزوں کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں بے شمار مادی امکانات تھے۔ مگر وہ سب زمین کے اندر چھپا کر رکھ دیے گئے۔ ان مادی امکانات کو دریافت کرکے انھیں ایک ترقی یافتہ تمدن کی صورت دینا، یہ انسان کا کام تھا جو موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر انجام دیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فطرت کا طریقہ عین وہی ہے جس کو فن تعلیم میں اکتشافی طریقہ (discovery method) کہا جاتا ہے۔

اس اکتشافی طریقہ کو قابل عمل بنانے کے لیے انسان کو ایک اعلیٰ درجہ کا ذہن دیا گیا جو امکانی طور پر ہر قسم کی ضروری صلاحیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان کا ذہن اس قابل تھا کہ وہ غور و فکر کرکے اشیاء کی حقیقتوں کو جانے۔ ایک طرف وہ اپنے خالق کو پہچانے، اور دوسری طرف دنیا کے اندر چھپی ہوئی مادی نعمتوں کو دریافت کرکے انھیں اپنی تعمیر حیات میں استعمال کرے۔

پیغمبر کی حیثیت اس عمل میں ایک مستند رہ نما کی ہے۔ خدا کا پیغمبر وہ بنیادی اصول دے دیتا ہے جس کی رہ نمائی میں انسان اپنا اکتشافی سفر شروع کرے اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔ اس طرح جو حقیقت ملتی ہے وہ آدمی کے لیے اس کی ذاتی دریافت ہوتی ہے۔ وہ اس کی پوری شخصیت کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے ابدی سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

مگر دنیا کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر انسانیت کے آغاز کے جلد ہی بعد بادشاہت کی صورت میں جبر کا نظام قائم ہوگیا۔ تمام آباد دنیا کچھ بادشاہوں کے زیر قبضہ آگئی۔ ان بادشاہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے کامل جبر کا نظام اختیار کرلیا۔ اس طرح ساری دنیا میں آزادانہ فکر اور آزادانہ اظہار خیال کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ چیز جس کو آزادی اظہار (freedom of speech) کہا جاتا ہے وہ قدیم دنیا میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

یہی جبر کا نظام ہے جس نے پچھلے زمانوں میں پیغمبروں کی بات کو چلنے نہیں دیا۔ پھر یہی جبر کا نظام ہے جو سائنسی دریافتوں اور ترقیوں میں مسلسل رکاوٹ بنا رہا۔ کیوں کہ کوئی بھی تصور اپنے ارتقاء کے لیے آزادانہ سوچ اور آزادانہ بحث چاہتا ہے۔ قدیم نظام جبر میں اظہار خیال کی آزادی نہ تھی، اس لیے کھلا غور و فکر بھی اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عامہ کے علاوہ یہ خاص کام بھی سونپا گیا کہ وہ دنیا میں قائم شدہ جبر کے نظام کو توڑ دیں۔ اس کے لیے انھیں خصوصی طور پر تمام ضروری مدد فراہم کی گئی۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں ساری دنیا میں یا تو شاہی جبر کے اداروں کو توڑ دیا، یا اس کی بنیادیں اتنی کمزور کر دیں کہ اپنے وقت پر وہ خود ہی گر پڑے۔ اس سلسلہ میں رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے جو جہاد کیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ جبر کے مصنوعی نظام کو توڑ کر آزادیٔ فکر کے فطری نظام کو قائم کر دیا جائے، تاکہ انسان کے لیے ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کا دروازہ کھل جائے۔

اسی نظام جبر کو قرآن میں فتنہ کہا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ اس نظام کے حاملین سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے (الانفال ۳۹) اس آیت میں دین سے مراد دین شرعی نہیں ہے بلکہ دین فطری ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں خلل ڈالنے والے ان ظالموں سے جنگ کرو تاکہ فکری جبر کا غیر فطری نظام جو انھوں نے رائج کر رکھا ہے اس کا خاتمہ ہو اور فکری آزادی کی بنیاد پر خدا کا مطلوب نظام دنیا میں قائم ہو سکے۔ مصنوعی حالت ختم ہو کر اصل فطری حالت زمین پر بحال ہو جائے۔ یہ کام اب مکمل طور پر ساری دنیا میں انجام پا چکا ہے۔ اور اس نے انسان کے اوپر ہر قسم کی سعادت کے دروازے کھول دیے ہیں۔

تواصی بالحق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خسران اور گھاٹے سے صرف وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا کام کریں (سورہ العصر) اسی طرح قرآن میں خیرامت یا بہتر گروہ کی خاص صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ان کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم ہو (آل عمران ۱۱۰)

یہ تواصی بالحق یا امر بالمعروف کیا ہے، وہ حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی نادرست بات دیکھے تو وہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرے۔ طاقت ہو تو ہاتھ سے اور طاقت نہ ہو تو زبان سے۔ تواصی بالحق اسی عمل کا ابتدائی درجہ ہے، اور امر بالمعروف اسی عمل کا اگلا درجہ یا مرحلہ۔

اس مطلوب شرعی عمل کو کسی سماج میں جاری کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہاں اظہار خیال کی مکمل آزادی ہو۔ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہو کہ جب بھی وہ کسی خلاف حق بات کو دیکھے تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر کھلے طور پر اس کے بارہ میں بول سکے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ حق اور ناحق کا اصل معیار قرآن و سنت ہے نہ کہ کسی شخص کا اپنا خیال۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص اس احساس میں مبتلا ہو گا تو وہ سب سے پہلے زبان یا قلم کے ذریعہ اس کا اظہار کرے گا تاکہ اس پر بحث شروع ہو۔ اس طرح بحث و مباحثہ کے بعد یہ ثابت ہو گا کہ کیا چیز درست ہے اور کیا چیز نادرست۔ اس طرح ثابت ہونے کے بعد صاحب اثر افراد کا یہ کام ہو گا کہ وہ اس کو حسب استطاعت عملاً نافذ کریں۔ گویا تواصی بالحق اور امر بالمعروف کی تعلیم کا تقاضا ہے کہ مسلم معاشرہ میں دائمی طور پر اظہار خیال کی آزادی موجود رہے۔ اس قسم کی آزادی کے بغیر یہ شرعی عمل سرے سے اپنی صحیح صورت میں جاری ہی نہیں رہے گا۔

اسلام چاہتا ہے کہ ہر شخص کو کسی روک ٹوک کے بغیر یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ دوسروں کے کے بارہ میں اپنی رائے دے سکے۔ اس عمل کے پیچھے اگر واقعۃً نیک جذبہ کارفرما ہو گا تو اس کا یہ عمل قابل انعام ہو گا۔ اور اگر اس نے کسی برے جذبہ سے یہ کام کیا ہو گا تو وہ خدا کے یہاں قابل سزا قرار پائے گا۔

قرآن میں حضرت مسیح کی زبان سے یہ آیت ہے کہ وجعلنی مبارکاً اینما کنت (مریم ۳۱) مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا کہ : معلماً للخیر۔ یعنی خدا نے مجھ کو خیر کا معلم بنایا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : المؤمن مرآۃ المومن (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ) یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ کی مانند ہے۔ جس طرح آدمی آئینہ کے سامنے کھڑا ہو تو آئینہ کسی کمی بیشی کے بغیر اس کا اصل چہرہ اسے دکھا دے گا۔ اسی طرح مومن اپنے بھائی کو اس کی کمیوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور دوسرے کو نیچا۔

یہی بات دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ : فطوبیٰ لعبد جعله الله مفتاحاً للخیر مغلاقاً للشر (ابن ماجہ، مقدمہ) یعنی بابرکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے خیر کا دروازہ کھولنے والا اور شر کا دروازہ بند کرنے والا بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی سچا خدا پرست ہو وہ خیر اور شر کے بارہ میں انتہائی حساس ہوگا۔ اس کی یہ حساسیت اس کو مجبور کرے گی کہ جب بھی وہ کوئی خلاف حق بات دیکھے تو فوراً اس کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

تاہم یہ بات یک طرفہ نہیں ہے۔ خدا پرستی جس طرح آدمی کے اندر اظہار حق کا جذبہ ابھارتی ہے، اسی طرح وہ قبول حق کا جذبہ بھی آخری حد تک اس کے اندر پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا آدمی جس طرح دوسروں کے خلاف تنقید یا اظہار رائے کرتا ہے، وہ خود بھی ہر وقت اس کے لیے تیار رہتا ہے کہ جب بھی اس کے سامنے امر حق پیش کیا جائے وہ فوراً اس کو قبول کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے اوپر تنقید کا حق صرف اسی شخص کو ہے جو اسی شدت کے ساتھ خود اپنا بھی احتساب کرتا ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنا اسی کے لیے جائز ہے جو قلب و ذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کے لیے تیار رہے کہ جب بھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے گا تو انانیت یا وقار کا سوال اس کے لیے حق کی قبولیت میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ وہ کھلے دل کے ساتھ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔

تواصی بالحق یا امر بالمعروف کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ دو طرفہ ہو۔ اگر وہ یک طرفہ ہو، ایک سنانے والا ہو اور دوسرا صرف سننے والا، تو ایسے ماحول میں کبھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو تواصی بالحق اور امر بالمعروف کے نظام سے مطلوب ہے۔

اختلاف میں رحمت

ایک حدیث ہے کہ : اختلاف امتی رحمۃ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے)
محقق علماء اس کو مستند احادیث میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات بجائے خود درست ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری ناقابل انکار حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا پورا ذخیرہ جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خود علمائے امت نے بے شمار اختلافات کیے ہیں۔ قرآن کی تفسیریں اختلافات سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح احادیث کی شرحوں کا یہ حال ہے کہ شاید کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس کی تشریح میں اختلاف موجود نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ اختلافات کیوں۔ اور یہ کہ یہ اختلاف رحمت تھا یا زحمت۔ قرآن ایسی ریاضیاتی زبان میں اتر سکتا تھا کہ اس کی تفسیر و تاویل میں کسی قسم کے اختلاف کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو۔ اسی طرح حدیثوں میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے الفاظ اختیار کر سکتے تھے جو دو اور دو چار کی مانند ہوں، اور اس کا امکان ہی نہ ہو کہ ان کی شرح میں کوئی شخص اختلاف کا پہلو نکالے۔

اصل یہ ہے کہ اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگ قرآن و حدیث میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کریں۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ اسلام ان کے لیے کوئی جامد چیز نہ ہو بلکہ وہ ان کے لیے خود دریافت کردہ حقیقت بن جائے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی سرگرمیاں جاری ہوں اور آخر کار ہر ایک مومن کو تخلیقی فکر کا حامل انسان بنا دیں۔

الزام تراشی اور عیب جوئی ایک جرم ہے۔ بلکہ وہ کمینہ پن ہے جو بلاشبہ سب سے بری اخلاقی صفت ہے۔ مگر علمی اختلاف جو سنجیدہ غور و فکر سے ابھرتا ہے، وہ تو ایک نعمت ہے اور انسانیت کی ترقی کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جو سماج اختلاف سے خالی ہو جائے وہ ترقی سے بھی خالی ہو جائے گا۔

انسان کا ذہن ایک بند خزانہ ہے۔ اس بند خزانہ کو جو چیز کھولتی ہے وہ یہی اختلاف ہے۔ اختلاف رائے سے ذہن ترقی کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک انسان سپر انسان بن جاتا ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ اختلاف کیا جائے یا نہ کیا جائے، اختلاف تو ہر وقت ہی ہر سطح پر اور ہر دینی معاملہ میں موجود ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ دین میں روز اول سے آج تک جو بے شمار اختلافات پائے جا رہے ہیں ان کی توجیہہ کیا کی جائے۔ گویا مسئلہ موجودگی کی توجیہہ کا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنے کا یا باقی نہ رکھنے کا۔

مثلاً آپ قرآن کا مطالعہ شروع کریں اور اس کے لیے کوئی مستند تفسیر لیں، مثلاً القرطبی کی الجامع لاحکام القرآن۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر شروع ہوتے ہی آپ کو یہ فقرہ لکھا ہوا ملے گا: فیہا سبع وعشرون مسئلۃ (اس میں ۲۷ مسئلے ہیں) گویا چار لفظ کے ایک جملہ میں دو درجن سے زیادہ اختلافی مسائل۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں اتنے زیادہ مسائل ہیں کہ چند سطر کی ایک سورہ کے مباحث پورے ۳۴ صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح ۲۰ جلدوں کی یہ تفسیر آپ اس طرح پڑھیں گے کہ شاید اس کا کوئی بھی صفحہ اختلافی رایوں اور اختلافی اقوال سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ معوذتین تک پہنچیں گے تو اس کی تفسیر میں دوسرے بہت سے اختلافات کے ساتھ یہ انتہائی نوعیت کا اختلاف آپ کو پڑھنے کے لیے ملے گا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خیال کے مطابق، یہ دونوں آخری سورتیں دراصل دعا ہیں وہ قرآن کا حصہ نہیں (وزعم ابن مسعود انہما دعاء تعوذ بہ ولیستا من القرآن) القرطبی ۲۰/۲۵۱

یہی معاملہ مزید اضافہ کے ساتھ حدیث کا ہے۔ آپ اس کی کوئی بھی شرح لیں، مثلاً صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کو لیجئے۔ آپ اس کو کھولیں تو پہلی حدیث یہ ملے گی کہ انما الاعمال بالنیات۔ یعنی عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ یہ ایک متواتر حدیث ہے اور نہایت مستند ہے۔ مگر اس کی تقریباً نو صفحہ کی تشریح میں چھ بار اختلف اور اختلفوا جیسے الفاظ آئے ہیں۔ تیرہ جلدوں پر مشتمل پوری فتح الباری اسی طرح اختلافی تشریحات سے بھری ہوئی ہے۔

اس کے بعد اگر آپ فقہ اور عقائد کی کتابیں دیکھیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اختلافات کا ایک لامتناہی جنگل ہے۔ یہاں شاید کوئی ایک معاملہ بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو اختلافی رایوں سے خالی ہو۔ یہ اختلافات کوئی برائی نہیں، بلکہ وہ فکری مہمیز ہیں۔ وہ لوگوں کو سوچ پر ابھارتے ہیں۔ وہ ذہنوں کو متحرک کر کے انھیں ارتقاء کی طرف لے جاتے ہیں۔

نصیحت، تعییب

قرآن میں حق کے داعیوں کے لیے نُصح اور ناصح کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا کلام نصیحت کا کلام ہوتا ہے۔ یعنی اس کے لکھنے یا بولنے کا محرک صرف اصلاح اور خیرخواہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا محرک نہیں ہوتا جس کے تحت وہ دوسروں کے بارہ میں بولے یا دوسروں کے اوپر قلم اٹھائے۔

ناصح کا کلام ذمہ داری کے احساس کے تحت نکلتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور لکھنے سے پہلے تحقیق کرتا ہے۔ اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میں خاموش رہا تو میں خدا کے یہاں پکڑا جاؤں گا۔ وہ شہرت یا اظہار خویش یا کسی دنیوی فائدے کے لیے نہیں بولتا۔ وہ صرف اس لیے بولتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ بولنا اس کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ جس کے بارہ میں بولتا ہے، اس کے حق میں عین اسی وقت وہ دل سے دعا بھی کر رہا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس لکھنے اور بولنے کی دوسری صورت وہ ہے جس کو عیب جوئی یا تنقیص کہا جا سکتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ : وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (حم السجدہ ۲۶) اس آیت میں والغوا فیہ کی تشریح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ کی ہے کہ عیّبوہ (تفسیر ابن کثیر ۴/۹۸) یعنی اس پر عیب لگاؤ، اس کو دوسروں کی نظر میں برا بتاؤ تاکہ لوگ بھڑک کر اس سے دور رہو جائیں۔

نصیحت اگر خیرخواہی کے جذبہ کے تحت نکلتی ہے تو تعییب اس کے برعکس بدخواہی کے جذبہ کے تحت۔ عیب جوئی اور الزام تراشی کرنے والے کے پیچھے نفرت، حسد، انانیت جیسے منفی محرکات ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد دوسرے کی اصلاح کرنا نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے کو گرانا اور بے وقعت کرنا ہوتا ہے۔

نصیحت نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ کار ثواب ہے۔ اس کے مقابلہ میں تعییب وتنقیص یقینی طور پر حرام ہے، وہ صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرنے والی ہے۔ نصیحت صحت مند معاشرہ کی علامت ہے اور تعییب صرف بیمار معاشرہ کی علامت۔

جس معاشرہ میں نصیحت کی فضا ہو وہاں لوگ ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں گے۔ لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا ہوگی۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے عزت و محبت کے جذبات ہوں گے۔ کوئی کسی کو غیر نہیں سمجھے گا۔ کوئی کسی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی کسی کا استحصال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

مزید یہ کہ ایسے ماحول میں جب ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف کوئی تنقیدی بات کہے گا تو سننے والا اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائے گا۔ بلکہ اس کو ایک سادہ بات کے طور پر سنے گا۔ اس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان کھلی گفتگو ہو۔ دونوں اپنی ذات کو الگ کرکے خالص حق تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور پھر جو بات درست ہو اس کو بخوشی قبول کرلیں۔

اس کے برعکس تعییب (عیب جوئی) کے انداز میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ عیب جوئی کرنے والے کی بات کو سن کر اگر دوسرا آدمی بھڑک اٹھے تو دونوں میں لڑائی شروع ہو جائے گی جو تمام برائیوں میں سب سے زیادہ سنگین برائی ہے۔ اور اگر بالفرض سننے والا متحمل مزاج ہے اور وہ اپنے خلاف عیب جوئی کو سن کر خاموش رہ جاتا ہے تب بھی وہ نقصان سے خالی نہیں۔ اول یہ کہ عیب لگانے والے نے اپنا وقت ضائع کیا۔ وہ اپنے اس وقت کو کسی صحت مند کام میں استعمال کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ معاشرہ کے اندر یہ بری روایت قائم ہوئی کہ ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم اس حدیث میں ملتی ہے کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

قول خیر وہ ہے جو ثابت شدہ حقیقت پر مبنی ہو، جس سے کوئی تعمیری فائدہ مقصود ہو۔ جو تمام تر اظہار حق کے جذبہ کے تحت نکلا ہو۔ جو اصلاً خدا کے لیے ہو نہ کہ کسی انسان کے لیے۔

جو آدمی سنجیدہ ہو، جو اللہ سے ڈرتا ہو، اس کے دماغ میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی بات فی الواقع کسی مثبت قدر کی حامل ہے تو وہ بولتا ہے، ورنہ وہ خاموشی اختیار کرلیتا ہے۔

افکار کا ٹکراؤ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو زمین پر بسایا تو پیشگی طور پر ان کو بتا دیا کہ نسلِ انسانی ایک دوسرے کی دشمن ہوگی (بعضکم لبعض عدو) یہ گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان جیسی ایک مخلوق جب دنیا میں آباد ہوگی تو اس کا یہاں آباد ہونا کوئی سادہ بات نہیں ہوگی۔ یہاں انسانوں کے درمیان اختلاف و نزاع کی صورتیں پیدا ہوں گی جو بعض اوقات شدید ہو کر عداوت تک جا پہنچیں گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے خالق نے ترقی کا کیا کورس مقرر کیا ہے۔ وہ کورس یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان خیالات کا ٹکراؤ ہو۔ اس سے انسان کی ذہنی صلاحیتیں جاگیں گی۔ اس کی تخلیقیت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں وہ نئی نئی دریافتیں کرتا چلا جائے گا۔ افکار کا ٹکراؤ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے کا سبب بن جائے گا۔

اس پہلو سے دیکھئے تو اظہار رائے کی آزادی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر آزادانہ اظہار رائے نہیں ہوگا تو خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ اور جب خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا تو ذہنی جمود نہیں ٹوٹے گا۔ انسان نئی حقیقتوں تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔

مثلاً اسلام کے دور اول میں جب قرأت کے اختلاف کی بنا پر لوگ قرآن کی تلاوت مختلف انداز سے کرنے لگے تو لوگوں میں یہ بحث شروع ہوگئی کہ کون سی قرأت صحیح ہے اور کون سی قرأت غلط۔ اس کے نتیجہ میں کتابت کے فن نے ترقی کی۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگ قرآن کے معانی میں اختلاف کرنے لگے۔ اس نے بھی ایک لسانی بحث کا آغاز کیا جو یہاں تک پہنچا کہ مسلمانوں میں عربی زبان کے ماہرین پیدا ہوئے، اور عربی کی ڈکشنریاں تیار کی گئیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ اسی طرح لوگ شرعی امور میں طرح طرح کے اختلافات کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے زبردست بحثیں شروع ہوئیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم عقائد اور دوسرے علوم باقاعدہ صورت میں مدوّن ہو گئے۔ وغیرہ۔ دور اول میں اگر یہ اختلافات پیش نہ آتے تو نہ ذہنوں میں بیداری پیدا ہوتی اور نہ علوم و فنون کا ارتقاء ممکن ہوتا۔

پھر یہ عمل یہیں نہیں رکا۔ عباسی خلافت کے زمانہ تک پہنچ کر یہ ہوا کہ مسلمان ایشیا اور افریقہ کے پورے علاقہ میں پھیل گئے، حتی کہ وہ یورپ کے اندر داخل ہو گئے۔ اب ان کا فکری ٹکراؤ مصر، ایران، یونان، وغیرہ ملکوں کے خیالات وافکار سے ہوا۔ اس کے فطری نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے درمیان عقلی بحثیں شروع ہو گئیں۔ یہ فکری ٹکراؤ آخرکار یہاں تک پہنچا کہ ایک نہایت طاقت ور علم کلام مدون ہوگیا۔ یہ کام زیادہ تر عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں ہوا۔ المامون نہایت فراخ دل تھا۔ اس نے اس زمانہ کے اہل علم کو اظہار خیال کی پوری آزادی دے رکھی تھی: واطلق حرية الكلام للباحثين واهل الجدل والفلاسفة (الاعلام ۴/۱۴۲)

پھر یہ سیلاب یہیں نہیں رکا۔ علم وتحقیق کا یہ عمل مزید آگے بڑھ کر دوسرے علمی وفنی شعبوں تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں میں فلسفہ، طب، ریاضی، بحریات، فلکیات، ارضیات کے ماہرین پیدا ہوئے۔ انھوں نے وقت کے تمام سیکولر علوم میں امامت کا درجہ حاصل کر لیا۔

پہلے مسلمانوں کا فکری ٹکراؤ دوسری قوموں سے ہوا تھا۔ جب مسلمان علمی ترقی میں آگے بڑھ گئے تو اب دوسری قوموں کا فکری ٹکراؤ مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے لگا۔ اس ٹکراؤ کے دوران مسلمانوں کے پیدا کردہ علوم اٹلی، اسپین، سسلی اور فرانس تک پہنچ گئے۔ اس کے نتیجہ میں یورپ میں نیا سائنسی دور شروع ہوا جو آخرکار موجودہ صنعتی انقلاب تک جا پہنچا۔ مغرب کا سائنسی اور صنعتی انقلاب براہ راست طور پر دور اول کی مسلم بیداری سے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔

وہی عرب جب تک اپنے ملک کے حدود میں بند تھے وہ کوئی علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ مگر جب وہ اپنے ملک سے باہر نکلے اور بیرونی قوموں سے ان کا فکری وذہنی ٹکراؤ پیش آیا تو انھیں لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ وہ علم وفکر کے عالمی امام بن گئے۔ یہ سارا معجزاتی واقعہ آزادانہ فکری تبادلہ کے نتیجہ میں پیش آیا۔

تنقید یا اظہار اختلاف دراصل تبادلۂ افکار ہی کا دوسرا نام ہے۔ کسی معاشرہ میں جتنا زیادہ فکری آزادی ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہاں فکری تبادلہ ہوگا، اور اس فکری تبادلہ کے دوران تنقید اور اظہار اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوں گی۔ فطرت کا مقرر کردہ یہی واحد ترقیاتی کورس ہے، افراد کے لیے بھی اور بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے بھی۔

فطرت کا نظام

اسلام سے پہلے تقریباً ۲۵ ہزار سال تک انسانی تاریخ کے آثار ملتے ہیں۔ مگر اس لمبی مدت تک انسان کوئی علمی ترقی نہ کر سکا۔ تمام علمی اور سائنسی ترقیاں بعد کو اس وقت شروع ہوئیں جبکہ اسلام نے قدیم شاہانہ جبر کے نظام کو توڑ کر دنیا میں فکری آزادی کے دور کا آغاز کیا۔

اس کا راز یہ ہے کہ ذہنی ترقی ہمیشہ تبادلۂ افکار کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور جبر اور تقلید کے نظام میں افکار کے تبادلہ کا عمل (پراسس) یکسر رک جاتا ہے۔ اسی بات کو امریکی ادیب والٹر لپمان (Walter Lippmann) نے ان لفظوں میں بیان کیا کہ جب تمام لوگ ایک طرح سوچیں تو کوئی بھی شخص بہت زیادہ نہیں سوچتا:

When all think alike, no one thinks very much.

اصل یہ ہے کہ حقائق کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ مگر ایک شخص کا تنہا ذہن صرف محدود طور پر سوچ پاتا ہے۔ اس لیے اگر جبر اور تقلید کا ماحول ہو تو ہر آدمی صرف محدود واقفیت کا حامل ہوگا۔ اس کے برعکس اگر لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہو تو لوگوں کے درمیان خیالات کا تبادلہ شروع ہو جائے گا۔ اب ہر آدمی دوسرے سے سیکھنا شروع کر دے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر لوگ بہت زیادہ باتوں کو جان لیں گے۔ اس کے برعکس جہاں ایسا ماحول ہو جس میں تمام لوگ اپنے ہی دائرہ میں سوچیں تو ایسے ماحول میں لوگوں کی مجموعی واقفیت بھی بہت کم ہوگی۔

جب لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی کھلی آزادی ہوگی تو لازماً اختلاف رائے پیدا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر تنقید کریں گے۔ یہ تنقیدی عمل ذہنی ارتقاء کا لازمی جزء ہے۔ تنقید کا خاتمہ سادہ طور پر صرف تنقید کا خاتمہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی ارتقاء کا خاتمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو بند کریں تو عملاً جو چیز باقی رہے گی وہ ذہنی جمود ہوگا نہ کہ صرف بے تنقید صورت حال۔

فکری آزادی فطرت کے نظام میں معاونت ہے اور فکری پابندی فطرت کے نظام میں رکاوٹ۔

دربار الٰہی میں

قرآن میں پہلے انسان (آدم) کی پیدائش کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے : اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو سارے نام۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علیم و حکیم ہے۔ اللہ نے کہا کہ اے آدم، ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام (اور فرشتوں کا اشکال ختم ہو گیا) تو اللہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں (البقرہ ۳۰-۳۳)

فرشتوں کا یہ قول اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر بظاہر ایک اعتراض تھا۔ مگر اللہ نے اس پر زجر و توبیخ نہیں کی۔ بلکہ انھیں اصل منصوبہ کی تفصیل بتائی۔ اس کے بعد ان کا اشکال اپنے آپ ختم ہو گیا۔ اور شبہ کی جگہ یقین واپس آ گیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز انسانیت میں خود اپنی ذات کمال سے یہ نمونہ قائم فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں اعتراض یا اشکال ظاہر کرے تو خود اعتراض پر اسے مطعون نہیں کیا جائے گا بلکہ اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے گی تاکہ مکمل صورت حال سامنے آجائے۔ گویا جو واقعہ آئندہ تاریخ میں انسانوں کے درمیان پیش آنے والا تھا، اس کو خدا اور فرشتوں کے درمیان واقع کر کے عملی طور پر بتا دیا گیا کہ اس طرح کے مواقع پر انسان کو کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے۔

اس واقعہ میں یہ بھی مثال ہے کہ جب معاملہ کی وضاحت کر دی جائے تو معترض کو فوراً اسے دل سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس واقعہ میں ایک طرف اگر اعتراض کا نمونہ ہے تو دوسری طرف اس میں اعتراف کا بھی اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔

پیغمبر کی مثال

غزوۂ بدر کے ابتدائی واقعات میں سے ایک واقعہ ابن اسحاق نے اس طرح بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کرتے ہوئے تیزی سے بڑھے۔ آپ نے بدر کے قریب ایک چشمہ کے پاس پڑاؤ کیا۔ اس وقت الحباب بن المنذر بن الجموح نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ مقام کیا ایسا ہے کہ یہاں اللہ نے آپ کو اتارا ہے جس میں ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم اس سے آگے بڑھیں یا اس سے پیچھے ہٹیں۔ یا کہ یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ رائے اور جنگی تدبیر ہے (بل ھو الرای والحرب والمکیدۃ)

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، پھر تو یہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں (فان ھذا لیس بمنزل) آپ یہاں سے روانہ ہو کر آگے چلئے۔ ہم لوگ اس چشمہ کے پاس اتریں جو قریش کے قریب ہے۔ اور پھر پیچھے جتنے پانی کے گڑھے ہیں، ان کو ناکارہ کردیں۔ اور وہاں ایک حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیں۔ پھر ان لوگوں سے جنگ کریں۔ تاکہ ہم پانی پئیں اور وہ نہ پئیں (فنشرب ولا یشربون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے بہت ٹھیک رائے دی (لقد اشرتَ بالرأی)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب ساتھی اٹھ کر چلے۔ یہاں تک کہ جب قریش کے قریب ترین چشمہ کے پاس پہنچے تو وہاں اتر گئے۔ پھر دوسرے چشموں کے متعلق آپ نے حکم دیا تو وہ ناکارہ کر دیے گئے۔ جس چشمہ پر آپ اترے تھے اس پر حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیا گیا (البدایۃ والنہایۃ ۲۶۷/۳)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اظہار رائے کا کھلا ماحول ہوتا تھا۔ ایک شخص نے جب آپ کی رائے کے خلاف رائے دی تو اس کو برا نہیں مانا گیا اور نہ اس پر غصہ کیا گیا۔ اس کے برعکس صرف یہ پوچھا گیا کہ تمہاری مختلف رائے کیوں ہے۔ جب اس نے وضاحت کی تو معلوم ہوا کہ اس کی رائے درست تھی۔ چنانچہ اس کی تعریف کی گئی اور فوراً اس کو قبول کر لیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو اختلاف رائے کا موقع دینا اور اس کو سن کر اس سے فائدہ اٹھانا بھی پیغمبر کی سنتوں میں ایک سنت ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کی مثال

الاقرع بن حابس التمیمی اور عُیینہ بن حصن الفزاری کا شمار مؤلفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حنین کی فتح کے دن ان میں سے ہر ایک کو تالیف قلب کے طور پر سو سو اونٹ دیے تھے (البدایہ والنہایہ ۷/۱۴۱) روایات میں آتا ہے کہ یہ اونٹ انھیں آپ نے ان کے قبول اسلام سے پہلے دیا۔

ابن ھمام نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں یہ دونوں صاحبان آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے خلیفہ اول سے ایک زمین طلب کی۔ خلیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے پیش نظر مطلوبہ زمین انھیں دے دی اور ان کے کہنے پر اس کی ایک تحریر بھی لکھ کر ان کے حوالے کر دی۔

دونوں صاحبان تحریر لے کر باہر نکلے۔ حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ خلیفہ نے فلاں زمین ہمیں دے دی ہے۔ حضرت عمر نے تحریر ان سے لی اور اس کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (فمزقہ عمر) حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی چیز تم کو پہلے دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ لیکن اب اللہ نے اسلام کو عزت وطاقت دے دی ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ تم اسلام پر قائم رہو تو بہت اچھا ہے، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

دونوں لوٹ کر دوبارہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور قصہ بتا کر کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر (الخلیفۃ انت ام عمر) حضرت ابوبکر نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو وہی خلیفہ ہیں۔ حضرت ابوبکر نے اس معاملہ میں حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور صحابہ میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی (التفسیر المظہری، المجلد الرابع، صفحہ ۲۳۶)

اس واقعہ میں نہ صرف خلیفہ اول پر تنقید تھی بلکہ بظاہر ان کی توہین بھی تھی۔ مگر یہ واقعہ جب حضرت ابوبکر اور دوسرے صحابہ کے علم میں آیا تو انھوں نے ان ظاہری پہلوؤں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے صرف یہ سوچا کہ باعتبار حقیقت حضرت عمر کی رائے درست ہے یا غیر درست۔ اور جب محسوس ہوا کہ اصولاً وہ بالکل درست ہے تو سب نے اس کو قبول کر لیا۔

عمر فاروقؓ کی مثال

حضرت عمر فاروق جب خلیفہ تھے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تمہاری ہی طرح ہوں اور تم لوگوں میں سے صرف ایک ہوں۔ اس لیے تم میرے خلاف جو بات بھی محسوس کرو اسے آزادانہ طور پر کہہ سکتے ہو۔ اس معاملہ میں تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں۔

ایک بار مدینہ کی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت عمر لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے، اس دوران انھوں نے کہا کہ میرے اندر اگر تم کوئی ٹیڑھ دیکھو تو اس وقت تم کیا کرو گے۔ ایک لمحہ خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر ہم نے آپ کے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھا تو اس کو ہم اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے (واللہ لو علمنا فیك اعوجاجا لقومناہ بسیوفنا)

اس کے بعد مسجد میں جو واقعہ پیش آیا وہ راوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ حضرت عمر خوش ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مسلمانوں میں ایسے افراد بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے (الحمد اللہ ان جعل فی المسلمین من یقوم اعوجاج عمر بسیفہ)

العبقریات الاسلامیۃ، صفحہ ۴۳۸

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد کی یہ مثال بتاتی ہے کہ تنقید و اختلاف کوئی مبغوض چیز نہیں، بلکہ وہ انتہائی محبوب چیز ہے۔ حتیٰ کہ ایک عام آدمی اگر خلیفۂ وقت کے خلاف غیر مودبانہ انداز میں بولے تب بھی اس کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تنقید کے وقت ناقد کو نہ دیکھو، بلکہ اپنے آپ کو دیکھو۔ ناقد اگر تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی کر رہا ہے تو وہ عین تمہاری بھلائی کا کام کر رہا ہے۔ ایسے اچھے کام کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنی بات کہنے کے لیے نامناسب اسلوب اختیار کیا تھا۔

خلیفۂ دوم کے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں جو بڑے لوگ ہوں انھیں چاہیے کہ وہ آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کریں۔ حتیٰ کہ خود اپنے آپ کو کھلی تنقید کے لیے پیش کریں۔ اور یہ پیش کرنا حقیقی طور پر ہو نہ کہ مصنوعی طور پر۔

عثمان غنیؓ کی مثال

حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح نے ایک روز حضرت عثمان سے بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ میں تین چیزوں میں آپ سے افضل ہوں۔ حضرت عثمان نے پوچھا کہ وہ کیا چیزیں ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے جواب دیا۔

اول یہ کہ بیعت رضوان (حدیبیہ) کے وقت میں حاضر تھا، اور آپ اس وقت غائب تھے۔ دوسرے یہ کہ میں بدر کے غزوہ میں شریک ہوا اور آپ نے اس میں شرکت نہیں کی۔ تیسرے یہ کہ غزوۂ احد کے موقع پر میں ان لوگوں میں تھا جو ثابت قدم رہے اور آپ اس میں ثابت قدم نہ رہ سکے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان اس پر غصہ نہیں ہوئے بلکہ یہ بولے کہ آپ نے سچ کہا (فلم یغضب عثمان ولکنہ قال لہ صدقت)

پھر اپنا عذر بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان نے کہا کہ جہاں تک بیعت رضوان کا معاملہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حاجت کے تحت مجھے مکہ بھیجا تھا۔ اور غزوۂ بدر میں جو ہوا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی جگہ پر مدینہ میں مقرر فرمایا تھا۔ اور جہاں تک غزوۂ احد میں میری پس پائی کی بات ہے تو اللہ نے مجھے میری اس کوتاہی کے لیے معاف کر دیا (العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۷۰۱)

اس واقعہ میں حضرت عثمان پر براہ راست حملہ کیا گیا تھا۔ مذکورہ تینوں باتیں بظاہر ان کی شخصیت کو سخت مجروح اور مشتبہ کر رہی تھیں۔ مگر حضرت عثمان اتنی سخت بات کو سن کر بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے ٹھنڈے طریقہ سے کہا کہ بطور واقعہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ پھر اس اعتراف کے بعد انھوں نے تینوں واقعہ کے بارہ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

تیسرے خلیفۂ راشد کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ انتہائی سخت تنقید کو بھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنا جائے۔ اپنے آپ کو اشتعال سے بچاتے ہوئے سادہ طور پر اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے۔

علی مرتضیٰؓ کی مثال

شورش پسند مسلمانوں کی ایک بھیڑ ۳۵ھ میں مدینہ میں داخل ہوئی اور اس نے خلیفہ سوم حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اتنا خلفشار برپا ہوا کہ مدینہ پانچ روز تک خلیفہ سے خالی رہا۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ تاہم مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس بیعت پر متفق نہ تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ پہلے عثمان کا خون کرنے والوں کو سزا دی جائے، اس کے بعد وہ خلیفہ چہارم کی اطاعت کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت علی یہ کہتے تھے کہ پہلے خلافت کے معاملہ کو مستحکم ہونے دو، اس کے بعد قاتلین کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔

اس طرح مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک حضرت علی کے ساتھیوں کا، اور دوسرا آپ کے مخالفوں کا۔ دونوں میں سخت اختلاف تھا، یہ اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی۔

حضرت علی اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا اشتعال ختم ہو اور امت میں اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر بصرہ والے آپ کی بات نہ مانیں تو آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم ان کو چھوڑے رہیں گے جب تک وہ ہم کو چھوڑے رہیں (ترکناھم ما ترکونا) کہنے والے نے کہا کہ اگر وہ لوگ آپ کو نہ چھوڑیں اور جنگ پر آمادہ ہو جائیں تو پھر آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم مدافعت میں لڑیں گے۔ ابو سلام الدالانی نے کہا کہ ہمارا حال اور ان کا حال کیا ہو گا اگر کل کے دن ان سے ہمارا ٹکراؤ ہو جائے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا یا ان کا جو آدمی بھی قتل ہو گا اور اس کا دل پاک ہو گا تو اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا (انی لارجو ان لا یقتل منا ومنھم احد نقی قلبہ للہ الا ادخلہ اللہ الجنۃ) البدایہ والنہایہ ۲۳۸/۷

خلیفہ چہارم کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اختلاف اتنا بڑھے کہ باہمی طور پر جنگ کی نوبت آجائے تب بھی مومن فریق ثانی کے بارہ میں اچھا ہی گمان رکھتا ہے۔ رائے کا اختلاف کسی بھی حال میں دل کے اختلاف یا بگاڑ کا سبب نہیں بنتا۔

ایک واقعہ

صحیح البخاری (کتاب العلم) میں انس بن مالکؓ کی ایک روایت ہے۔ وہ مدینہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس میں وہ خود موجود تھے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے:

بَيْنما نحنُ جُلوسٌ مع النبيِّ ﷺ في الْمسْجدِ دخل رجُل على جَمَل فَأَناخهُ في الْمسْجدِ ثُمَّ عقَلهُ ثُمَّ قَال لهم: أيكُمْ محمدٌ - والنبيُّ ﷺ مُتكَئٌ بَيْن ظهْرانيهمْ - فقُلْنا: هذا الرجُلُ الأبْيَضُ الْمُتَّكِئُ، فَقالَ لَهُ الرجلُ. ابنَ عَبد المطَّلب. فقالَ له النبيُّ ﷺ: قدْ أجَبْتك: فقالَ الرجلُ للنبيِّ ﷺ: إني سائلُكَ فَمُشدِّدٌ عليْك في الْمَسْألة، فَلا تَجدْ عليَّ في نَفْسكَ. فقال: سَلْ عَمَّا بَدالكَ. فَقال: أسألك بربِّك وربِّ منْ قبْلك، آللهُ أرْسلك إلى النّاس كلِّهمْ؟ فقال: اللهُمَّ نعم. الخ. (فتح الباري بشرح صحيح البخاري ۱۷۹/۱)

ہم لوگ مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر داخل ہوا۔ اس نے اپنا اونٹ مسجد میں بٹھایا، پھر اس نے اسے باندھا۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ تکیہ لگائے ہوئے ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ سفید آدمی جو تکیہ لگائے ہوئے ہے۔ آنے والے نے کہا، اے عبدالمطلب کے بیٹے، آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہاری بات سن لی۔ اس نے کہا کہ میں آپ سے سوال کروں گا اور سوال میں آپ سے سختی کروں گا۔ آپ اپنے دل میں میرے اوپر غصہ نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پوچھو جو تم پوچھنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو آپ کے رب کی اور جو آپ سے پہلے تھے ان کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو سارے انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا، خدایا ہاں۔ الخ

پیغمبر اسلامؐ کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی سے بھی جو سوال چاہے کرے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کلام میں سخت انداز اختیار کرنے کے لیے بھی آزاد ہے۔ مخاطب کو چاہیے کہ وہ سائل پر غصہ نہ ہو بلکہ ٹھنڈے طریقہ پر اس کے ہر سوال کا جواب دے۔

ظاہر داری نہیں

قرآن (المائدہ ۱۰۷) میں وراثت کا قانون بتاتے ہوئے ایک آیت یہ آئی ہے کہ:
من الذین استحق علیھم الاولیان (ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے) اس آیت کے لفظ الاولیان کی قرأت میں اختلاف ہے۔ حسن نے اس کو الاوّلان پڑھا ہے، اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے (القرطبی ۳۵۹/۶)

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی اور الاولیان کی قرأت اپنے لحاظ سے کی جو کہ خلیفہ دوم عمر فاروق کی قرأت سے مختلف تھی، حضرت عمر نے اس کو سن کر کہا کہ تم نے جھوٹ کہا (کذبتَ) حضرت کعب نے جواب میں کہا کہ تم خود زیادہ بڑے جھوٹے ہو (انتَ اکذب) ایک شخص نے اس کو سن کر حضرت کعب سے کہا کہ تم امیر المومنین کو جھوٹا کہہ رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیر المومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے، میں نے اللہ کی کتاب کی تکذیب کے معاملہ میں امیر المومنین کی تصدیق نہیں کی۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ انھوں نے ٹھیک کہا (حیاۃ الصحابہ ۷۴/۲ - ۷۵)

یہ گفتگو دو بڑے صحابی کے درمیان ہوئی۔ معترض صحابی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مختلف قرأت سن کر یہ کہتے کہ یا شیخ یا فضیلۃ الاستاذ، اسمح لی، لعلك اخطأتَ فی القراءۃ۔ بلکہ اپنی اندرونی کیفیت کے مطابق، بے تکلف ان کی زبان سے نکلا کہ: کذبتَ (تم نے جھوٹ کہا)

اس واقعہ سے ایک اہم اصول اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اظہار رائے کی آزادی کسی شرط کے بغیر ہونی چاہیے۔ شرط عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دل میں کچھ ہو اور الفاظ کے ذریعہ اس کا اظہار وہ کچھ اور انداز میں کریں۔ یہ طرز کلام دھیرے دھیرے لوگوں کے اندر ظاہر داری پیدا کرے گا، اور ظاہر داری آخر کار ریاکاری کی صورت اختیار کرے گی۔

ایک بات جس کو آدمی حق سمجھے، فطری طور پر وہ اس کو بے کم و کاست ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے اوپر مصنوعی پابندی لگائی جائے تو وہ شدید تر نقصان کا باعث بن جائے گی۔ وہ لوگوں کے اندر دہرا شخصیت کی تشکیل کرے گی۔

سوال وجواب

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ آپ کا باغی ہوگیا۔ اس نے زبردست خلفشار برپا کیا۔ دو لڑائیاں ہوئیں جن میں تقریباً چالیس ہزار مسلمان مارے گئے۔ حتیٰ کہ خود حضرت علی کو شہید کر دیا گیا۔ اس خلفشار کے زمانہ میں آپ کے مخالف گروہ کا ایک آدمی آپ سے ملا۔ اس نے آپ سے کچھ ناقدانہ سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں ہے کہ آپ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اتنا اختلاف و انتشار پیدا ہوگیا۔ حالاں کہ ابوبکر وعمر خلیفہ تھے تو ان کے زمانہ میں اس طرح کے اختلافات برپا نہیں ہوئے۔ حضرت علی نے جواب دیا:

لِأَنَّ ابا بكرٍ وعمرَ كانا واليين على مثلي وانا اليوم والٍ على مثلك۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۲۱۱)

اس لیے کہ ابوبکر وعمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم تھے اور میں آج تمہارے جیسے آدمی کے اوپر حاکم ہوں۔

اس اعتراض وجواب سے ایک اہم حقیقت واضح ہوکر سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ صحیح اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی سب سے اہم شرط کیا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ سماج کے اندر واضح طور پر اس کے موافق حالات موجود ہوں۔ حضرت علی کے جواب کے الفاظ میں یہ کہنا درست ہوگا کہ صالح سیاسی نظام کے قیام کی شرط یہ ہے کہ ایک طرف صدر ریاست کی کرسی پر ابوبکر وعمر جیسا ایک فرد بیٹھا ہوا ہو، اور دوسری طرف معاشرہ پر اصحاب رسول جیسے لوگوں کا غلبہ ہو۔ خلافت مثل عمر کے ہاتھ میں ہو اور معاشرہ امثال علی پر مشتمل ہو۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے دور اول میں کس طرح یہ ماحول تھا کہ ایک عام آدمی وقت کے خلیفہ سے براہ راست ناقدانہ سوال کر سکتا تھا اور خلیفہ معتدل انداز میں اس کا جواب دیتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ میں سوال وجواب کا کھلا ماحول ہو تو کس طرح الجھے ہوئے ذہنوں کی صفائی ہوتی ہے۔ کس طرح بڑے بڑے اشکالات کا حل خود متعلق شخصیتوں کے ذریعہ منقح ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

حد بندی

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ خالد بن الولید اور سعد بن ابی وقاصؓ کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف تھا، ان لوگوں کے درمیان اس پر بحث ہوتی تھی۔ مگر بہت دن تک دونوں کا اختلاف ختم نہیں ہوا۔

اس درمیان میں ایک شخص سعد بن ابی وقاص کے پاس آیا، اس نے حضرت سعد سے خالد بن الولید کی کچھ برائی بیان کی (مثلاً یہ کہ انھوں نے بہت دیر بعد اسلام قبول کیا اور غزوہ احد میں وہ مشرکین کی فوج کے سردار تھے) حضرت سعد نے مذکورہ شخص کی باتوں کو سن کر کہا کہ رک جا، ہمارے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہوگا (مہ، ان ما بیننا لم یبلغ دیننا) حیاۃ الصحابہ ۲/ ۲۱۵

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑے سے بڑے عالم یا بزرگ کے درمیان گہرا اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر عین اختلاف کے وقت بھی وہ سختی کے ساتھ اپنی حد پر رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی حد سے باہر نہیں جائے گا۔

یہ حد بندی دو اعتبار سے ہوگی۔ ایک تو یہ کہ دونوں جب اس معاملہ میں بحث و گفتگو کریں گے تو ان کا کلام شدت کے ساتھ صرف اختلافی نکتہ تک مرتکز رہے گا، وہ اصل اختلافی نکتہ سے اِدھر اُدھر منحرف نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ دونوں فریق کامل طور پر اس کا لحاظ رکھیں گے کہ ان کا اختلاف دماغی بحث کی سطح پر رہے، وہ اس سے آگے بڑھ کر دلوں کی کدورت نہ بننے پائے۔

"وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس اختلاف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرنے لگیں۔ ہم ایک دوسرے پر اخلاقی نوعیت کا الزام لگانے لگیں۔ ہم ایک دوسرے کی شخصیت پر چوٹ کرنا شروع کر دیں۔ ہم دونوں کی بحث تمام تر دلائل پر چلے گی نہ کہ الزام تراشی اور عیب جوئی پر۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر مصر کے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور و غل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً ۴۰ دن تک جاری رہا تھا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب کی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

فإذا احسنَ الناسُ فأحسِن معهم وَإذا اساؤا فاجتنب اساءتهم۔	جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔
(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۲/۲۲۱)	

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

صحت مند نتائج

سعید بن ابی عروبہ تابعی نے عالم کی تعریف کرتے ہوئے کہا جو آدمی اختلاف کو نہ سنے اس کو عالم نہ شمار کرو : من لم یسمع الاختلاف فلا تعدوہ عالماً (جامع بیان العلم وفضلہ، لابن عبد البر، صفحہ ۴۶)

اختلاف سے مراد جھوٹی تنقید یا الزام تراشی والی باتیں نہیں ہیں۔ اختلاف سے مراد علمی اختلاف ہے۔ اور سنجیدہ علمی اختلاف اتنی قیمتی چیز ہے کہ جو حقیقی عالم ہوگا وہ اس کا حریص ہوگا نہ کہ وہ اس کو برا مانے اور اس کو بند کرنے کی کوشش کرے۔

علم اتنا زیادہ وسیع خزانہ ہے کہ وہ کسی ایک دماغ میں سما نہیں سکتا۔ اس لیے ہر سچا عالم حرص کی حد تک اس کا طالب رہتا ہے کہ کوئی ملے جو اس کی رائے سے اختلاف کرے۔ تاکہ علم کے نئے گوشے کھلیں، تاکہ دوسروں کے علم سے وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔

تاہم اختلاف اور مذاکرہ کا یہی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ مزید معلومات سامنے آتی ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خود عالم کا اپنا ذہن زیادہ منقح ہوتا ہے۔ اختلاف و مذاکرہ کے دوران وہ خود اپنے خیالات کو زیادہ واضح اور جامع صورت میں مرتب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک سچی علمی گفتگو، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ اختلافی ہو، ایک صاحب علم اور حقیقت پسند شخص کے لیے لذیذ ترین تجربہ ہے۔ ایسا لمحہ گویا علم کے سمندر میں مشترک غوطہ زنی کے ہم معنی ہے۔ جو بے حد پُر کیف بھی ہے اور بے حد مفید بھی۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ جھوٹے ناقدین بہت بڑھ گئے ہیں اس لیے بہت سے لوگ سچی تنقید کو بھی برا سمجھنے لگے ہیں۔ حالاں کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جھوٹی تنقید اگر بدبو ہے تو سچی تنقید خوشبو، جھوٹی تنقید اگر کانٹا ہے تو سچی تنقید ایک حسین پھول۔

جھوٹی تنقید ایک قسم کی تخریب کاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں سچی تنقید ایک تعمیری عمل ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کو ہر حال میں جاری رکھا جائے۔

حریت فکر

مدینہ میں غلام طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک مرد اور ایک عورت رہتے تھے۔ مرد کا نام مغیث اور عورت کا نام بریرہ تھا، انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ایک عرصہ کے بعد خاتون آزاد ہوگئیں۔ آزادی کے بعد از روئے قاعدہ انھیں اختیار مل گیا کہ خواہ وہ سابق شوہر کے ساتھ رہیں یا اس سے علٰحدگی اختیار کرلیں۔ بریرہ نے علٰحدگی کا فیصلہ کیا۔ مگر مغیث کو اس خاتون سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بریرہ اپنے فیصلہ کو بدل دیں اور ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائیں۔

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ حتیٰ کہ بریرہ اور مغیث پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر کار ان کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ بریرہ آگے آگے تھیں اور مغیث، جو سیاہ فام تھے، ان کے پیچھے اس طرح چل رہے تھے کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی کے بال تر ہوگئے تھے۔ اس کے بعد ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو راجعتہ۔ قالت یارسول اللہ تأمرنی۔ قال انما أنا اشفع۔ قالت لا حاجۃ لی فیہ۔

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۳۱۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اچھا ہے کہ تم اس کی طرف رجوع کرلو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

یہ اس بات کی ایک انتہائی اعلیٰ اور آخری مثال ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی کوئی سرکشی نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کی رعایت ہے۔ انسان کی شخصیت کا ارتقاء صرف آزادی کے ماحول میں ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک درخت کھلی فضا ہی میں پروان چڑھتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک انسان کا ذہنی اور روحانی وجود صرف اسی وقت بھرپور طور پر نشوونما پاتا ہے جب کہ اس کو کامل فکری آزادی ملی ہوئی ہو۔

حق کا اعتراف

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں عراق فتح ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال تھا کہ دجلہ وفرات کے علاقہ کی زرخیز زمینیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہیں، ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ سابق رواج کے مطابق، فوجی سرداروں کی رائے یہ تھی کہ اس مفتوحہ زمین کا بڑا حصہ فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ زمین کو سرکاری بیت المال کے زیر تصرف رہنا چاہئے تاکہ آئندہ نسلوں تک اس کا فائدہ تمام لوگوں کو مل سکے۔

اس مسئلہ پر سخت اختلاف ہوا اور کئی دن تک بحث جاری رہی۔ خاص طور پر خالد بن الولید، عبد الرحمن بن عوف اور بلال بن رباح نے اتنی زیادہ حجت کی کہ حضرت عمر فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکل آئے کہ: اَللّٰھُمَّ اَکْفِنِی بِلَالاً۔ یعنی اے اللہ، تو مجھ کو بلال سے نجات دے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا جس میں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ جیسے لوگ تھے۔ اس کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

کئی دن کی بحث کے بعد آخر کار حضرت عمر کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ (غنیمت میں) ان مفلس مہاجروں کے لئے حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے دار الاسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے (والذین جاؤا من بعدھم) الحشر ۸-۱۰

حضرت عمر فاروق نے لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی اور کہا کہ اس آیت میں غنیمت

اور فئی کا حکم بیان کرتے ہوئے والذین جاؤ امن بعدھم (اور جوان کے بعد آئے) کا لفظ ہے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فتوحات کے ذریعہ جو اموال ملیں وہ صرف حال کے لوگوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر ان مفتوحہ زمینوں کو میں موجودہ فاتحین کے درمیان بانٹ دوں تو ہماری آئندہ نسلوں کو اس میں حصہ نہیں مل سکے گا۔ اور یہ قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا۔ حضرت عمر کے اس استدلال کو تمام لوگوں نے مان لیا اور ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہی کی رائے درست ہے۔

اس کے بعد یہ اصول قائم ہو گیا کہ فتوحات کے ذریعہ جو زمینیں اسلامی مملکت میں داخل ہوں وہ حکومت اسلامی کی ملکیت قرار پائیں نہ یہ کہ فوج کے افراد میں تقسیم ہو کر ان کی انفرادی ملکیت میں چلی جائیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت نے لوگوں کے ہونٹ سی دئے اور اب ان کے لئے کچھ بولنے کا موقع باقی نہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قبولیت حق کا مادہ تھا۔ ان کی بحث نہ سمجھنے کی وجہ سے تھی نہ کہ محض سرکشی کی بنا پر۔ اس لئے جب قرآن کی آیت نے حقیقت کھول دی تو اس کے بعد ان کے لئے سمجھنا کچھ دشوار نہ رہا۔

اس دنیا میں بولنے کی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ آدمی ہر دلیل کے جواب میں اس کے خلاف بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ اب جو لوگ غیر سنجیدہ ہیں وہ اسی طرح ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کر کے اسے رد کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ سنجیدہ ہوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات کسی بات کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر جب اس بات کو زیادہ واضح دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اصل بات کو ماننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار خیال کی آزادی کے آداب و قواعد کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفۂ وقت سے اختلاف کرے۔ مگر اسی کے ساتھ آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ جب دلیل سامنے آئے تو وہ اس کو پہچان سکے اور اس کے بعد اپنے اختلافات کو ختم کر دے۔

حق کی برتری

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک مسئلہ میں اپنے شیخ طریقت پر تنقید کی اور ان سے مختلف رائے دی۔ کسی شخص نے کہا کہ آپ اپنے شیخ سے اختلاف کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شیخ ہم کو محبوب ہیں۔ مگر حق ہمیں شیخ سے بھی زیادہ محبوب ہے (الشیخ حبیبٌ الینا ولکن الحق احبُّ الینا من الشیخ)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کا حسب مراتب احترام کیا جائے گا۔ ہر ایک کے انسانی اور اخلاقی حقوق پوری طرح ادا کیے جائیں گے۔ مگر جب حق کا معاملہ سامنے آجائے تو حق کو سب سے زیادہ برتری حاصل ہوگی۔ انسان اور انسان کا مقابلہ ہو تو انسان اہم ہے۔ اور انسان اور حق کا مقابلہ ہو تو حق اہم ہے۔ حق کی اہمیت مطلق ہے اور انسان کی اہمیت مقید۔

انسان کے ساتھ سلوک کا معاملہ اخلاق کے تابع ہوتا ہے۔ مگر جب حق سامنے آجائے تو خود اخلاق بھی حق کے تابع ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس دنیا میں حق سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ حق کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ حق اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ حق کا سامنے آنا گویا خدا کا سامنے آنا ہے۔ پھر جب خدا خود سامنے آجائے تو دوسری کون سی چیز ہوگی جو اس کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی حق کا نام لے کر کھڑا ہو اس کو دوسروں کے اوپر لامحدود اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں جو فضیلت ہے وہ نفس حق کے لیے ہے نہ کہ حق کا نام لینے والے کسی انسان کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کا نام لے کر اٹھنے والے کسی فرد کو بھی اسی معیار سے جانچا جائے گا جس سے وہ دوسروں کو جانچنا چاہتا ہے۔ دونوں میں سے جو بھی حق کے معیار پر پورا نہ اترے وہ قابل ملامت ہے، اور اس کی بہترین سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف حق کے فیصلہ کو دل سے قبول کر لے۔ حق کا ظہور خدا کا ظہور ہے۔ مبارک ہے وہ جس کے سامنے حق ظاہر ہو اور وہ اس کو پہچان کر فوراً اس کے آگے جھک جائے۔

اضافۂ ایمان

ایمان کوئی جامد چیز نہیں اور نہ کسی مجموعۂ الفاظ کو زبان سے دُہرا لینے کا نام ایمان ہے۔ لفظی مجموعہ ایمان کی ظاہری علامت ہے نہ کہ خود لفظی مجموعہ ہی اصل ایمان ہے۔ تمام اعلیٰ حقیقتوں کی اہمیت ان کے معنوی پہلو کے اعتبار سے ہوتی ہے، پھر ایمان جیسی اعلیٰ ترین حقیقت کی اہمیت اس کے الفاظ تک کیوں کر محدود ہو جائے گی۔

ایمان حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت ہے۔ ایمان علوم کے سرے کو پکڑنا ہے۔ ایمان معانی کے سمندر میں داخل ہونا ہے۔ ایمان اپنی محدودیت کو لامحدود کے درجہ تک لے جانا ہے۔ ایمان زمینی پستیوں سے اٹھ کر آسمانی بلندیوں تک پہنچ جانا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی ایک ایسے روحانی سفر کا مسافر بن جائے جہاں ہر آن نیا تجربہ ہے۔ وہ ایک ایسا شعوری ارتقاء ہے جس کا سلسلہ کبھی اور کہیں ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں ایمان کو ایک ارتقاء پذیر حقیقت بتایا گیا ہے، ایک ایسا قلبی سرمایہ جس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے (الفتح ۴) ایمان ایک اعلیٰ ترین علم ہے جو ہمیشہ اللہ کی توفیق سے بڑھتا رہتا ہے۔

ایمان میں یہ زیادتی کس طرح ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ذریعہ تفکر و تدبر ہے۔ انسان خدا کی باتوں کو پڑھتا ہے۔ وہ خدا کی چیزوں میں غور کرتا ہے (آل عمران ۱۹۱) اس طرح حق و صداقت کی نئی نئی تجلیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ پھر وہ اہل ذوق کے ساتھ ان پر مذاکرہ کرتا ہے، جیسا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: تعالٰی نؤمن ساعة، ھلم فلنذکر ربنا۔ اس طرح فکری تبادلہ کے ذریعہ ہر ایک اپنے علم کو بڑھاتا ہے۔ ہر ایک اپنی معرفت میں اضافہ کرتا ہے۔

فکری ارتقاء کے اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ میں آزادانہ تبادلۂ خیال کا ماحول ہو۔ لوگ کھلے طور پر اپنی بات کو کہیں اور دوسرے کے تبصرہ کو سنیں۔ کہنے والے کو آزادانہ طور پر اپنے دل کی بات کہنے کا موقع ہو اور سننے والوں میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس کو سنیں۔ اس طرح تبادلۂ افکار کے ذریعہ شعور ایمان کا ارتقائی سفر مسلسل جاری رہے۔ اضافۂ ایمان خلا میں نہیں ہوتا بلکہ افکار کے طوفانوں کے درمیان ہوتا ہے۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے:
قل رب زدنی علماً (طٰہٰ ۱۱۴) اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ربّ زدنی علماً کا مطلب ہے ربّ زدنی فہماً
(القرطبی ۱۱/ ۲۵۰) یعنی میرے فہم دین میں اضافہ کر دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فہم دین یا علم دین ایک ایسی چیز ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے بھی اور بصیرت و معرفت کے اعتبار سے بھی۔

یہ اضافہ بلاشبہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ مگر اس عالم امتحان کے لیے اللہ کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہر ملنے والی چیز حالات و اسباب کے درمیان ملتی ہے۔ اسی طرح دین کا علم و فہم بھی آدمی کو حالات و اسباب کے درمیان حاصل ہوتا ہے۔

انھیں حالات و اسباب میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو کھلا رکھے۔ وہ اضافۂ علم کے لیے مسلسل حریص بنا رہے۔ مطالعہ، مشاہدہ اور مذاکرہ جیسی چیزوں میں برابر مشغول رہے۔ دوسروں سے سیکھنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ جب بھی کسی صاحب علم یا صاحبِ ذوق سے اس کا ٹکراؤ ہو تو انا کے خول سے باہر نکل کر وہ اس کی باتوں کو سنے اور ذاتی وقار کے احساس سے بلند ہو کر اس سے استفادہ کرے۔

علم میں اضافہ کا براہ راست تعلق طلب میں اضافہ سے ہے۔ بڑھی ہوئی طلب والا ایک آدمی ہی اپنے علم و فہم میں اضافہ کرتا ہے۔ اور طلب کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ علم جہاں بھی ملے وہ اس کو لے لے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

ہر علم تبادلہ کے ذریعہ بڑھتا ہے، اسی طرح ربانی علم بھی اس دنیا میں تبادلہ کے ذریعہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے، مذاکرہ، تبادلۂ افکار، ایک دوسرے کے بارہ میں اظہار خیال، ایک دوسرے کو اپنی روحانی دریافتیں بتانا اور ان پر اہل ذوق کا تبصرہ سننا، یہ سب وہ ذریعے ہیں جو فہم دین میں اضافہ کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ماحول میں آزادانہ طور پر افکار و تجربات کا لین دین جاری رہے۔

علم میں اضافہ کی دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے خود اپنی داخلی تڑپ کا ایک دعائیہ اظہار ہے نہ کہ متعین قسم کے خارجی الفاظ کی کوئی لسانی تکرار۔

بے جا غلو

قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ــــــ امید ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے (عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا) الاسراء ۹،

بغداد میں ۳۱۷ھ میں اس آیت پر دو مسلم گروہوں کے درمیان بحث ہوئی۔ ایک طرف ابو بکر المروذی الحنبلی کے اصحاب تھے، اور دوسری طرف عوام کا ایک طبقہ۔ حنابلہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ قیامت کے دن آپ کو عرش کے اوپر بٹھائے گا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ اس سے مراد شفاعت عظمیٰ ہے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ دونوں گروہوں میں باقاعدہ جنگ ہوگئی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے (البدایہ والنہایہ ۱۱/۱۶۲)

اس قسم کے واقعات پہلے بھی بار بار پیش آئے اور آج بھی ایسے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ بحث و اختلاف بذاتِ خود غلط ہے۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ صرف مقلد بن کر رہیں۔ کسی بھی قسم کی اختلافی بحث میں نہ پڑیں۔ یہ مشورہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ مشورہ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اختلاف کا صحیح طریقہ بتائیں نہ یہ کہ خود اختلاف کو بند کرنے کا مطالبہ کریں۔

مذکورہ افسوس ناک واقعہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے علمی اختلاف اور جنگی ٹکراؤ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ علمی اختلاف کا اول و آخر ہتھیار دلیل ہے، اور جنگی ٹکراؤ کا ہتھیار تلوار اور بندوق ہے۔ اگر جنگی ٹکراؤ پیش آجائے تو متشددانہ اسلحہ کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت ہوگا۔ کیوں کہ جنگی ٹکراؤ میں فیصلہ کن چیز ہمیشہ ہتھیار ہی رہا ہے۔

مگر علمی اختلاف کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ اس میں ہتھیاروں کا استعمال صرف ایک قسم کا پاگل پن ہے۔ کیوں کہ علمی اختلاف میں اصل اہمیت کی چیز دلیل ہوتی ہے نہ کہ تشدد۔ فریق ثانی اگر ایک دلیل کو نہیں مانتا تو اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کیجئے۔ دوسری دلیل سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تو تیسری اور چوتھی دلیل پیش کیجئے۔ علمی بحث میں ہمیشہ صرف دلیل پیش کی جائے گی، خواہ کوئی اسے مانے یا ماننے سے انکار کر دے۔

مذکورہ واقعہ سے جو چیز غلط یا قابل ترک قرار پاتی ہے وہ تنقید اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ غلو اور شدت پسندی ہے، اور غلو ہر معاملہ میں برا ہوتا ہے۔

تنقید کو بند کرو، اختلاف رائے کو ختم کرو، تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے ـــــــ یہ جملہ قواعد کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لئے وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ زیادہ صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلاف رائے کو برداشت کرو تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امت مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے، اسی طرح محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتی کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کرکے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدان جنگ کا انتخاب ممکن ہوگیا۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالب خویش اور دوسرا طالب حق۔ طالب خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالب حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

جارحیت نہیں

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسان خود اپنی فطرت کے تحت یہ چاہتا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر اظہار خیال کرے۔ انسانی فطرت کی یہ ایسی صوصیت ہے جس کو کسی طرح بھی انسان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان ایک منفرد وجود ہے۔ ہر انسان کا طرز فکر وسرے تمام انسانوں سے جدا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک ڈھنگ پر سوچنے بں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اختلاف ایک تقاضائے فطرت ہے، ایسی حالت میں سانوں کے درمیان اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ انسان کے بارہ میں صحیح اور ممکن رویہ صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تحمل کا طریقہ اختیار کریں۔ اس دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ تمل ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔

مورخین اسلام اس پر متفق ہیں کہ عملی اعتبار سے حضرت امیر معاویہؓ ایک نہایت کامیاب مراں تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ نہیں تھا کہ انھوں نے اپنی زیر حکم دنیا میں اختلاف کو مٹا دیا تھا۔ س کے بجائے ان کی کامیابی کا راز وہ تھا جس کو ایک مورخ نے "الحلم السیاسی" کا نام دیا ہے۔ وہ انتہائی غیر موافق بات کو انتہائی تحمل کے ساتھ سن سکتے تھے۔ ابن قتیبہ نے ان کا ایک اقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

غلظ رجل لمعاوية فحلم عنه۔ قيل له، تحلم عن هذا۔ فقال انى : احول بين الناس وبين السنتهم الم يحولوا بيننا وبين سلطاننا

عیون الاخبار ۱/۲۸۳

ایک شخص نے امیر معاویہ سے سخت کلامی کی۔ انھوں نے اس سے درگزر کیا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ایسے آدمی سے درگزر کا معاملہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں لوگوں کے درمیان اور ان کی زبان کے درمیان حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے درمیان اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں۔

اس تحمل کا تعلق صرف سلطنت یا سیاسی اقتدار سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، خواہ وہ سیاسی دائرہ میں ہو یا غیر سیاسی دائرہ میں، آپ انسان کی اس دنیا کو ٹھوکر نہ ماریں۔ بلکہ اپنا اختلاف تمام تر صرف دلائل پیش کرنے تک محدود رکھیں، اگر آپ ایسا کریں تو معاشرہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ البتہ اختلاف اس وقت خلل اندازی کے ہم معنی بن جاتا ہے جب آپ آدمی کی اپنی مخصوص دنیا کے ساتھ تصادم چھیڑ دیں۔

اختلاف کا صحیح اور فطری اصول یہ ہے کہ اختلاف کو صرف اختلاف کے دائرہ میں رکھا جائے، اس کو تصادم یا عملی جارحیت کے درجہ تک ہرگز پہنچنے نہ دیا جائے۔

ایک حاکم کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ اختلاف کرنے والا نظری اختلاف کی حد سے گزر کر اس کے اقتدار سے ٹکرانا شروع کر دے۔ وہ اس کے قلب و دماغ کو مخاطب کرنے کے بجائے اس کے سیاسی وجود کو مٹانے پر تل جائے۔

ایک عام انسان کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ اختلاف کی حد پر نہ رکے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ زیر اختلاف شخص کی ذات کو مطعون کرنے لگے۔ وہ اس کی تذلیل و تحقیر کرے۔ وہ اس کو بدنام کرنے کی مہم چلائے۔ اس کی حیثیت عرفی کو بگاڑنے کی کوشش کرے۔ لوگوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کرے۔ اس کے اخلاقی قتل کی مہم چلائے۔ سازشی منصوبہ کے ذریعہ وہ اس کی تدبیر کرے کہ اس کے سماجی تعلقات ٹوٹ جائیں اور وہ اپنے ماحول میں اکیلا ہو کر رہ جائے۔

عملی جارحیت کیا ہے، اس کا تعین ہر آدمی کے اپنے حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ اصولی طور پر عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی کے دماغ سے اپیل کرنے کے بجائے خود اس کے وجود سے تصادم شروع کر دیا جائے۔ اس کو سنجیدہ دلائل سے قائل کرنے کے بجائے غیر سنجیدہ طریقوں سے اسے زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔

آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ مگر اس حق کو استعمال کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو تشدد اور جارحیت تک نہ لے جائے۔

مشترک ذمہ داری

ابن ماجہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ با برکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بنایا (فطوبی لعبد جعلہ اللہ مفتاحاً للخیر مغلاقاً للشر)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے اسلامی معاشرہ میں لوگ کس احساس کو لے کر جیتے ہیں۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی اس احساس کے تحت جی رہا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے احوال میں اسے غیر جانب دار نہیں رہنا ہے بلکہ ہر موقع پر اپنا اصلاحی کردار ادا کرنا ہے۔ جہاں اس کو نظر آئے کہ وہ ایک بھلائی کی روایت قائم کر سکتا ہے تو فوراً وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جہاں اس کو دکھائی دے کہ ایک شر جنم لے رہا ہے تو فوراً وہ اس کو روکنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے گا۔ خیر کا راستہ کھولنا اور شر کا دروازہ بند کرنا ایمان کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔

اسلام کا یہ مطلوب اصلاحی عمل کسی ایسے معاشرہ ہی میں انجام دیا جا سکتا ہے جہاں تنقید کو برا نہ سمجھا جاتا ہو۔ جہاں باتوں کو اس لحاظ سے نہ دیکھا جائے کہ وہ کس کے موافق ہے اور کس کے خلاف۔ اس کی وجہ سے کس کی شخصیت اونچی ہوتی ہے اور کس کی شخصیت نیچی۔ حتیٰ کہ کلام کے اس پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ نرم الفاظ میں ہے یا سخت الفاظ میں۔ معاشرہ میں جب تک اس قسم کا آزادانہ ماحول نہ ہو، کسی کے لیے مذکورہ مومنانہ عمل انجام دینا ممکن ہی نہیں۔

کسی معاشرہ میں اس روح کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرہ کے افراد صرف اپنے لیے نہیں سوچتے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سوچتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی احساسات زندہ ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے بارہ میں انتہائی سنجیدہ ہیں۔ وہ حق کے لیے کسی اور کی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر خواہی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ مجموعی انسانیت کا فائدہ چاہتے ہیں نہ کہ صرف اپنا یا اپنی ذات کا فائدہ۔ تاہم یہ نیکی صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اظہار حق کے ساتھ قبولیتِ حق کا مادہ بھی اپنے اندر رکھتے ہوں۔

بھلائی کا دروازہ کھولنا اور برائی کا دروازہ بند کرنا، یہ کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو خدائی لائسنس دے دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا احتساب کریں اور دوسروں کو ان کا احتساب کرنے کا حق نہ ہو۔ بلکہ یہ دوطرفہ عمل ہے، اور معاشرہ کے سبھی لوگوں کی طرف سے سبھی لوگوں کے اوپر جاری رہتا ہے۔

اسی لیے قرآن و حدیث میں اس کے لیے وہ صیغے استعمال کیے گئے ہیں جن میں دوطرفہ مشارکت کا مفہوم ہے۔ مثلاً فرمایا کہ وتواصوا بالحق (العصر) یعنی ایک دوسرے کو باہم حق کی نصیحت کرو۔ اسی طرح فرمایا کہ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ (المائدہ ۹) یعنی وہ بگاڑ کے وقت ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہیں تھے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ بل ائتمروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر (سنن ابی داؤد) یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کو معروف کی تلقین کرو اور آپس میں ایک دوسرے کو برائی سے روکو۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بہت سے واقعات اس سلسلہ میں سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً متعدد بار ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک حکم جاری کیا۔ ایک شخص نے شرعی دلیل کے ساتھ بتایا کہ آپ کا حکم درست نہیں۔ اس کے بعد فوراً انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا کہ لولا فلان لهلك عمر (اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا) ایک مرتبہ حضرت عمر رات کے گشت پر نکلے۔ دیکھا کہ ایک آدمی شہر کے باہر کھڑا ہوا ایک عورت سے بات کر رہا ہے۔ انھوں نے اس کو کوڑا مار دیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے کیوں مجھے کوڑا مارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم رات کے وقت ایک اجنبی عورت سے بات کر رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ یہ اجنبی عورت نہیں ہے، یہ میری بیوی ہے۔ ہم دونوں باہر سے آکر ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم مشورہ کر رہے تھے کہ اس وقت شہر میں کس کے گھر جائیں۔ حضرت عمر نے فوراً کوڑا مذکورہ آدمی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ اب تم مجھے کوڑا مارو، کیوں کہ اس معاملہ میں اصل غلطی میری تھی۔

یہی ہمیشہ تمام صالحین کا معاملہ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اپنے خلاف تنقید سننے کے لیے تیار نہ ہو، اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسروں کے اوپر تنقید کرے۔ اسلام میں اختلاف اور محاسبہ کا حق ایک مشترک حق ہے نہ کہ کسی ایک کا مخصوص حق۔

آزادی کی حد

فکری آزادی بلا شبہ کسی انسان کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اسی طرح آزادی کی بھی حد ہے۔ آزادی اپنی حد کے اندر نعمت ہی نعمت ہے۔ مگر اپنی حد کے باہر وہ فساد ہی فساد ہے۔

فکری آزادی کی حد یہ ہے کہ وہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقتوں کے دائرہ میں جاری ہو، مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر نہ کوئی رائے قائم کی جائے اور نہ اس قسم کی بے اصل باتوں کو لے کر کوئی نظریاتی عمارت کھڑی کی جائے۔ قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ ——— اور تم ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی بابت آدمی سے پوچھ ہوگی (الاسراء ۳۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو غیر ذمہ دارانہ کلام سے بچنا چاہیے۔ اس کو وہی بات بولنا چاہیے جس کی بابت سننے اور دیکھنے اور سمجھنے کی طاقتوں کو بھرپور طور پر استعمال کر کے وہ اس کی تحقیق کر چکا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس بات کا مجرم قرار دیا جائے گا کہ خدا کی دی ہوئی ضروری صلاحیتوں کو استعمال کیے بغیر بالکل بے بنیاد طور پر اس نے اظہار خیال کرنا شروع کر دیا۔

آدمی اگر کسی شخص کے خلاف یا کسی مسئلہ کے بارہ میں کلام کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی پوری تحقیق کرے۔ وہ اظہار خیال سے پہلے پوری طرح اس کی جانچ کرے۔ اور پھر وہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کے پاس بولنے کے لیے کوئی محکم بات ہو، بصورت دیگر اس پر فرض ہے کہ وہ خاموشی کا طریقہ اختیار کرے۔

بولنا اس آدمی کے لیے جائز ہے جو بولنے سے پہلے اس کی تیاری کرے۔ وہ اپنے آپ کو بولنے کا اہل بنائے۔ سنی سنائی باتوں پر رائے دینا اتنا برا ہے کہ حدیث میں اس کو جھوٹ کہا گیا ہے۔ اسی طرح نیت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو زیر بحث لانا سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ آزادانہ اظہار رائے جس طرح ایک حق ہے اسی طرح وہ ایک ذمہ داری بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کامل واقفیت کے بغیر آدمی کبھی اظہار رائے نہ کرے۔

قتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ او رعمرؓ مکہ اور منیٰ میں قصر کرکے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ عثمانؓ نے بھی اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد عثمانؓ نے قصر نہیں کیا بلکہ چار رکعت نماز پڑھی۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اس کو غلط بتایا۔ اس کے بعد وہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ ان سے کہا گیا کہ چار رکعت نماز پر آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور پھر خود بھی آپ نے خلیفہ کی پیروی میں چار رکعت نماز پڑھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ خلاف کرنا زیادہ برا ہے (الخلاف شر) حیاۃ الصحابہ ۹/۲

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ مثال ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے۔ اور وہ ایک فرق ہے جس کو اس طرح کے اختلافی معاملہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اختلافی معاملہ میں بولنے کے وقت تو اصل معیار کو سامنے رکھا جائے گا۔ مگر عمل کرنے کے معاملہ میں عملی پہلوؤں کی رعایت کی جائے گی۔

آزادی ہر فرد کا ایک حق ہے۔ مگر ہر حق کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح آزادی کے حق کے ساتھ بھی کچھ لازمی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کرنے سے پہلے بار بار یہ سوچے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیسا ثابت ہوگا وہ تعمیری نتیجہ پیدا کرے گا یا تخریبی نتیجہ۔

اسی طرح یہ بھی ایک ذمہ داری ہے کہ اجتماعی نظام میں اجتماعی فیصلہ کی پیروی کی جائے۔ جس آدمی کے ہاتھ میں اجتماعی معاملہ کا نظم نہ ہو، وہ زبانی طور پر اپنا اختلاف ظاہر کر سکتا ہے، مگر عملی اعتبار سے اس کو وہی کرنا چاہیے جو دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اجتماعی اتحاد ٹوٹ جائے گا، اور اجتماعی اتحاد کا ٹوٹنا تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔

حدیث میں ہے کہ فعلیکم بالسواد الاعظم (ابن ماجہ، کتاب الفتن) یعنی سواد اعظم کی پیروی کرو۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے۔ یعنی جب فتنہ کی حالت ہو اور صورت حال پر تمہارا کنٹرول قائم نہ رہے تو تم قول کی حد تک حکیمانہ انداز میں حق کا اعلان کر سکتے ہو۔ مگر عمل کے معاملہ میں تمہیں مسلمانوں کے سواد اعظم کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں عملی اختلاف زیادہ بڑی برائی کا سبب بن جائے گا۔

اختلافات کی توجیہہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ——— کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بہت اختلاف پاتے (النساء ۸۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے جو دین اسلام بھیجا ہے وہ ایک ایسا دین ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ میں نے تم کو ایک روشن دین پر چھوڑا ہے، اس کی راتیں بھی اس کے دنوں کی طرح ہیں (لقد ترکتکم علی مثل البیضاء لیلھا کنھارھا) ابن ماجہ، مقدمہ

مگر ایک شخص جب قرآن کی تفسیروں اور حدیث کی شرحوں کو پڑھتا ہے۔ جب وہ فقہ اور عقائد کی کتابوں کو دیکھتا ہے تو بظاہر بالکل برعکس تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں وہ اتنے زیادہ اختلافات دیکھتا ہے کہ شاید اسلام کی کوئی ایک تعلیم بھی نہیں جس میں علماء کے درمیان کثرت سے اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ یہاں دین اسلام بظاہر دین اختلاف معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایک دارالعلوم کے شیخ الحدیث نے کہا کہ شوال کے مہینہ میں حدیث کے اسباق کی بسم اللہ ہوتی ہے اور رجب میں اس کی تمت ہوتی ہے۔ ان دس مہینوں میں اسباق کا کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں کم از کم بیس مرتبہ یہ نہ کہنا پڑتا ہو کہ اس مسئلہ میں فلاں امام کا یہ مذہب ہے اور فلاں کا یہ مختلف مذہب ہے۔ صحابہ کا یہ مذہب تھا، تابعین میں یہ اختلاف ہے اور یہ کہ رأینا صواب و رائی غیرنا خطأ (ہماری رائے درست ہے اور دوسروں کی رائے خطا ہے)

ایک بے اختلاف دین با اختلاف دین کیوں بن گیا۔ اور اس معاملہ کی اطمینان بخش توجیہہ کیا ہے۔ اس پر پچھلے ہزار برس کے دوران بہت لکھا گیا ہے اور بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آج بھی اس کے بارہ میں کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

یہ سوال ابتدائی طور پر صحابہ کے زمانہ ہی میں موجود تھا۔ تاہم باقاعدہ صورت میں وہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نمایاں ہوا۔ جب حدیثیں اکٹھا کی گئیں تو معلوم ہوا کہ خود روایات میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اب لوگوں نے یہ سوال کرنا

شروع کیا کہ کس روایت کی پیروی کریں اور کس روایت کی پیروی نہ کریں۔

اس وقت ابتداءً یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا کہ یہ مختلف روایتیں تو خود صحابہ سے مل رہی ہیں۔ اور صحابہ سب کے سب قابل تقلید ہیں۔ پھر ہم کیوں کر ایسا کہہ سکتے ہیں کہ اِس صحابی کی روایت کو مانو اور اُس صحابی کی روایت کو نہ مانو۔

محمد بن عبد الرحمٰن الصیرفی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کسی مسئلہ میں اصحاب رسول مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم غور کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے درست قول کون سا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ کے اصحاب کے درمیان ایسا غور و فکر کرنا جائز نہیں (لا یجوز النظر بین اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) الصیرفی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ پھر کس کے قول پر عمل کیا جائے۔ احمد بن حنبل نے کہا کہ ان میں سے جس کی بھی چاہو اتباع کرلو (تقلّدَ ایھم شئت) جامع بیان العلم و فضلہ، ابن عبد البر ۲/۸۳

امام احمد بن حنبل کی یہ بات بجائے خود نہایت درست ہے۔ کیوں کہ ہم کسی صحابی کو صحیح اور کسی صحابی کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے لیے ہر صحابی قابل اتباع ہے۔ تاہم اس جواب میں اس بات کی علمی توجیہہ موجود نہیں ہے کہ ایسا مسلک کیوں درست ہے۔

اس کے بعد دوسرا مسلک وہ ہے جس کو فقہا کی ایک تعداد نے اختیار کیا۔ مثلاً امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ صحابہ کے اختلافات میں کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان میں کچھ نادرست ہیں اور کچھ درست ہیں، تو ان پر غور کر کے کسی کو اختیار کرو (خطأٌ وصواب فانظر فی ذلك) جامع بیان العلم و فضلہ

امام ابوحنیفہؒ نے اور زیادہ واضح طور پر یہی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں سے ایک قول خطا ہے۔ اور اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے (احد القولین خطأٌ والمأثم فیہ موضوع) جامع بیان العلم و فضلہ

یہ جواب بدایۃً درست نہیں ہے۔ کیوں کہ مختلف اقوال میں سے ہر قول جب کسی صحابی کی طرف سے ملا ہو تو ہم کو یہ حق نہیں کہ بطور خود ایک کو خطا اور دوسرے کو صواب کہیں۔ صحابہ کے مختلف اقوال کے سلسلے میں ہم مجبور ہیں کہ ہر ایک کو صواب سمجھیں۔ ان کے درمیان

امتیاز قائم کرنا ہمارے لیے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اس معاملہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دین کے دو حصے ہیں۔ایک اصول کا حصہ، اور دوسرے فروع اور جزئیات کا حصہ۔ مذکورہ تمام اختلافات فروع اور جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے، ان میں کوئی اختلاف نہیں۔مثلاً پنج وقتہ نماز یا نمازوں میں رکعات کی مختلف تعداد کے بارہ میں تمام اہل اسلام متفق ہیں۔ البتہ آمین بالجہر اور آمین بالسر جیسے کیثر مسائل ہیں جن میں ان کے یہاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس تقسیم کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو فیصلہ بہت آسان ہوجاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمام انبیاء کو ایک ہی الدین (الشوریٰ ۱۳) دیا گیا ہے۔ الدین سے مراد دین کے اصولی اور اساسی احکام ہیں۔ یہ اصولی اور اساسی احکام ابدی ہیں اور یکساں طور پر ہر پیغمبر کو دیے جاتے رہے ہیں۔ ان کے معاملہ میں ایک نبی اور دوسرے نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن کے مطابق، دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو شرعۃ اور منہاج (المائدہ ۴۸) کہا گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف رہا ہے۔

یہی فرق اسلام میں داخلی طور پر بھی پایا جاتا ہے۔ گویا قرآن اور اسی طرح حدیث کے اتفاقی اجزاء کی حیثیت الدین کی ہے۔ اور اس کے بعد جو اختلافی اجزاء ہیں وہ اس حصۂ دین سے متعلق ہیں جن کو قرآن میں شرعۃ اور منہاج کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود شارع کی اپنی اسکیم کے مطابق، دین کے ایک حصہ میں توحُّد مطلوب ہے اور دین کے دوسرے حصہ میں تنوع اور توسّع۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اساسات دین (مثلاً اخلاص للّٰہ) کی حیثیت اسپرٹ کی ہے اور فقہی احکام کی حیثیت فارم کی۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسپرٹ میں ہمیشہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مگر فارم میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی۔ مثلاً مکان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ شیلٹر کا کام دے۔ اس اعتبار سے ہر مکان یکساں ہوگا۔ مگر فارم کے اعتبار سے ہر مکان یکساں نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ مگر فارم کے اعتبار سے اس میں تنوع ہوتا ہے اور یہ تنوع کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ صحابہ کے اختلاف کی اصل حقیقت یہی ہے۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی ایک عظیم مثبت افادیت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی معاملہ میں جب اختلاف کا امکان ہو، اسی وقت اس میں ذہنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں اور اس طرح انسانی فکر کا مسلسل ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اگر اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو ذہنی سرگرمیاں بھی جاری نہ ہوں گی، اور پھر انسانی فکر کے ارتقاء کا عمل بھی رک جائے گا جس کا آخری نتیجہ ذہنی جمود ہوگا، اور ذہنی جمود اس دنیا میں ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔

اس عمل کے دوران لازماً اختلاف واقع ہوگا۔ کوئی عالم ایک رائے پر پہنچے گا، اور کوئی عالم دوسری رائے پر، اور کوئی عالم تیسری رائے پر۔ مگر رایوں کا اختلاف کوئی برائی نہیں۔ اصل قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ یہی واحد صورت ہے جس سے کسی گروہ کے اندر فکری سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں۔ اور پھر فکری سرگرمیوں کے ذریعہ تخلیقیت (creativity) جنم لیتی ہے اور ذہنی ارتقاء کے راستے کھلتے ہیں۔ اس معاملہ میں "اختلاف" کی حیثیت فطری کورس کی ہے، اور فکری سرگرمیوں کی حیثیت نتیجہ کی، اور اصل قابل لحاظ چیز نتیجہ ہے نہ کہ کورس۔

اس معاملہ کی ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ: فاعرض عنهم وتوكل على الله (النساء ۸۱) ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ دوسری طرف قرآن میں یہ حکم ہے کہ: يا ايها النبي جاهد الكفار والمنافقين (التوبہ ۷۳) اے نبی، کافروں اور منافقوں سے جنگ کرو۔

یہ دونوں آیتیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ایک آیت جن لوگوں سے اعراض کی تعلیم دیتی ہے، دوسری آیت انھیں لوگوں سے ٹکراؤ کا حکم دے رہی ہے۔ اس فرق واختلاف نے ذہنوں کو جھنجوڑا اور لوگوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔

اب ایک خیال یہ قائم کیا گیا کہ قتال کی آیت نے اعراض کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے:

(فاعرض عنهم) اى لا تعاقبهم۔ ويقال ان هذا منسوخ بقوله تعالى (يا ايها النبي جاهد الكفار والمنافقين) الجامع لاحكام القرآن للقرطبی ۵/۲۹۰

مگر ذہنی عمل یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے مزید کچھ لوگوں کے ذہن کو متحرک کیا۔ انھوں نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعراض کی آیت منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے

اس کو محکمات میں شمار کیا (القرطبی ۱۰/۲۰۲)

اب غور کیجیے، تو یہی دوسری رائے قرآن کی روح کے زیادہ مطابق نظر آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ اعراض ایک مستقل حکم ہے اور اس کا تعلق مومن کی عام اخلاقیات سے ہے۔ دعوت دیتے ہوئے، لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے، یا سفر کرتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ایک مستقل حکم ہے۔ مومن جاہلوں سے اعراض کر کے خلق عظیم کا ثبوت دیتا ہے جو دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک جہاد (بمعنی قتال) کا تعلق ہے، وہ دفاع کی مصلحت کے تحت ہے۔ جب کسی گروہ کی طرف سے عملاً جارحیت کا فعل کیا جائے تو اس وقت اس کی جارحیت کو فرو کرنے کے لیے اس سے مقابلہ کیا جائے گا۔ قتال ایک وقتی حکم ہے اور اعراض ایک مستقل حکم۔

معلوم ہوا کہ "الدین" میں کوئی اختلاف نہیں۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف شریعت میں ہے۔ یہ اختلاف دو قسم کا ہے۔ ایک، وہ جو عبادات سے متعلق ہے، اور دوسرا، وہ جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

عبادات میں جو اختلاف ہے وہ تمام تر اس کی ظاہری جزئیات میں ہے۔ اور اس نوعیت کا اختلاف یا فرق بالکل فطری ہے۔ کیوں کہ عبادت ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ یکساں کیفیت کے ساتھ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی آدمی کے اندر کیفیات زیادہ ہوں گی اور کبھی کم۔ یہی کیفی فرق عبادت کے ظاہری آداب میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ گویا عبادت کے اساسی اجزاء میں وحدت ہے اور عبادت کے ظاہری آداب میں تنوع اور توسع۔ اس معاملہ میں روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی تنوع کا ایک ریکارڈ ہے۔

ایک اور اعتبار سے یہی معاملات کی صورت بھی ہے۔ معاملات میں بنیادی احکام اگرچہ نہایت واضح ہیں۔ مگر وہ حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جن میں کسی حکم کا انطباق مطلوب ہے۔ اس لیے انطباق کے اعتبار سے احکام کی جزئیات و فروع میں اکثر فرق کرنا پڑتا ہے۔ معاملات کے بارہ میں حدیث اور فقہ میں جو اختلاف ہے وہ اسی فرق باعتبار انطباق کی مختلف مثالیں ہیں۔

فرقہ بندی

مشہور روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کے لوگ بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے لوگ تہتر فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوا ایک کے (کلھم فی النار الا واحدۃ) پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ ایک کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ طریقہ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (ما انا علیہ و اصحابی)

علماء اسلام نے "۷۲" گمراہ فرقوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً سید عبدالقادر جیلانیؒ نے غُنیۃ الطالبین میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور نام بنام ان کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً خارجیہ، شیعہ، معتزلہ، مرجیہ، مشبیہ، جہمیہ، ضراریہ، کلابیہ، وغیرہ۔ پھر ہر فرقے کے ذیلی فرقے۔ اس طرح انھوں نے اس تعداد کو بہتر اور تہتر تک پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر فرقے اب صرف کتابوں میں ہیں، عملی دنیا میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

تاہم ان تاریخی فرقوں کی اہمیت باعتبار حصر نہیں ہے بلکہ باعتبار علامت ہے۔ یعنی وہ علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ امت میں جب گمراہی آئے گی تو وہ کس طرح اور کس راستہ سے آئے گی۔ ان فرقوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تمام گمراہ فرقے اعتقادیات میں غیر ضروری خوض کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ اور یہی ان کی اصل گمراہی تھی۔ غور و فکر اسلام میں مطلوب ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کے نزول کا مقصد ہی تدبر بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح تدبر آدمی کی معرفتِ حق میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس منحرفانہ تدبر ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے، اور آخر کار گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

عقائد کا تعلق امور غیب سے ہے۔ غیب کے بارہ میں آدمی براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا تھا، اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں اتنے ہی پر قناعت کیا جائے جو بتا دیا گیا ہے ((ابھموا ما ابھمہ اللہ) اور نامعلوم کے دائرہ میں خیال آرائی کی کوشش نہ کی جائے۔ یہی اس معاملہ میں اصحاب رسول کا طریقہ تھا۔

جو آدمی اپنی غور و فکر کو معلوم کے دائرہ میں استعمال کرے وہ ما انا علیہ و اصحابی کا مصداق ہے، اور جو آدمی غیر معلوم یا ممنوعہ دائرہ میں خوض کرنے لگے وہ ہدایت کے دائرہ سے نکل گیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ اللہ ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (آل عمران ۷)

یہ آیت بتاتی ہے کہ غلط قسم کا غور وفکر کیا ہے۔ اور وہ کون سا غور وفکر ہے جو آدمی کو ہدایت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس آیت میں متشابہات سے مراد متماثلات ہے۔ یعنی تمثیلی اسلوب کلام۔ وہ باتیں جن کا تعلق غیبی حقیقتوں سے ہے ان کو قرآن میں تمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا کا ہاتھ تمثیل کی زبان ہے نہ کہ حقیقت کی زبان۔ اس طرح کی باتوں کو آدمی تعیین وتحدید کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان معاملات میں صحیح یہ ہے کہ مجمل علم پر قناعت کی جائے۔ اس سے زیادہ جاننے کی کوشش آدمی کو صرف فکری انتشار (confusion) تک پہنچائے گی۔ اور فکری انتشار ہی کے اگلے نتیجہ کا نام گمراہی ہے۔

محکم سے مراد وہ آیتیں ہیں جو براہ راست زبان میں ہیں اور جن سے قطعی دلالت حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم انسانی دائرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سنجیدہ غور وفکر سے آدمی کے علم ویقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہدایت کے راستہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جبر وقدر کا جو مسئلہ ہے وہ پورا کا پورا متشابہات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بارہ میں مجمل علم پر قانع رہنا ہی عقل کا تقاضا بھی ہے اور شریعت کا تقاضا بھی۔ اور یہی عین سائنسی نقطۂ نظر ہے۔

دوسری چیز وہ ہے جو عالم فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرنا۔ یہ غور وفکر عین مطلوب ہے۔ اس قسم کا غور وفکر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے۔ اس کی روحانیت کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کو ربانی شخصیت بناتا ہے۔ اس کو وہ اعلیٰ انسان بنا دیتا ہے جس کو عام زبان میں حقیقت شناس اور مذہبی زبان میں خدا شناس کہا جاتا ہے۔

اختلاف رائے

مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰-۱۸۵۱) تحریک خلافت کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) تحریک خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں کہتے ہیں:

"حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کئے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے، اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروانہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے۔"

ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ ۱۱۴

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علماء امت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہئے جس کو امام شافعی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ، دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمال صحت کے ساتھ۔

(رأئی صواب یحتمل الخطأ ورأئ غیری خطأ یحتمل الصواب)

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریق ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ ۵۰ فیصد اور ۵۰ فیصد کا ہے نہ کہ صد فی صد کا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۰

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

ایک آیت

قرآن (المائدہ ۴۴) میں ہے کہ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون)

ان الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بعض اعمال پر کفر کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر (مسلم کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) البخاری، کتاب الایمان

اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو لے کر کچھ اسلام پسند حضرات ان مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ما انزل اللہ پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت وہ بہت سے مسلم حکمرانوں کو مرتد اور کافر بتاتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ بدترین گمراہی ہے اور اس نے عالم اسلام میں خارجیت جیسے ایک فتنہ کو دوبارہ شدید تر صورت میں زندہ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان مسلمان کو قتل کر رہے ہیں، بلکہ خود اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کی ہو گئی ہے جو تشدد اور خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہو۔

اس قسم کی آیات و احادیث کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حبر الامت اور امام التفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس سے آدمی خارج از اسلام قرار پاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کُفرٌ دونَ کفرٍ ہے۔ یعنی کفر سے کمتر درجہ کا ایک کفر (الترمذی، کتاب الایمان)

قرآن و حدیث میں جہاں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فقہی یا قانونی مفہوم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسلوب کلام ہے۔ وہ دراصل زجر میں مبالغہ ہے۔ یہ شدت کلام کی ایک مثال ہے۔ اور ناصحانہ کلام میں ہمیشہ اس قسم کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کبھی ایک قسم کے الفاظ ہیں اور کبھی دوسری قسم کے الفاظ ہیں۔ یہ قانونی زبان اور ناصحانہ زبان کا فرق ہے نہ کہ فقہی معنوں میں مسلم اور کافر کا فرق۔

نصیحت اور تنبیہ کبھی سادہ الفاظ میں کی جاتی ہے اور کبھی شدید الفاظ میں۔ مذکورہ مثالیں اسی نوعیت کی شدید انداز کی مثالیں ہیں۔

اسلام کی شناخت

اسلام کی شناخت ملّی نہیں ہے بلکہ ربّانی ہے۔ مسلم کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کا کلچر الگ ہو۔ مسلم کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ اس کی شخصیت عام انسانوں سے مختلف ہو۔ دور اول کے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان یہ نہیں تھی کہ آپ کی زبان، آپ کا لباس، آپ کا رہن سہن دوسروں سے مختلف تھا۔ آپ کی پہچان یہ تھی کہ آپ الامین ہیں۔ بہت سے خداؤں کے دیس میں آپ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ : خِيَارُكُم الَّذِينَ إِذَا رُؤُوا ذُكِرَ اللهُ (ابن ماجہ، کتاب الزھد) یعنی تم میں بہتر وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں دیکھا جائے تو خدا یاد آئے۔

اسلامی شناخت کا صحیح تصور یہی ہے۔ سچا مومن وہ ہے جس کو دیکھنا اور جس سے ملنا آدمی کے لیے ایک ربانی تجربہ بن جائے۔ جس کا کلام خدا کی عظمت کا اعلان بنا ہوا ہو۔ جس کے سلوک میں حبِّ انسان کی خوشبو بسی ہوئی ہو۔ جس کا بولنا اس کے سننے والوں کو چپ کر دیتا ہو۔ اور جس کی خاموشی میں لوگوں کو تقریر کی کیفیت محسوس ہونے لگے۔

مومن وہ انسان ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی ہو۔ جس کا سینہ خدا کی یاد سے پھٹ پڑا ہو۔ جو دیکھنے سے پہلے خدا کو دیکھنے لگا ہو۔ ایسا انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی ایک نشانی بن جاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک آسمانی نور میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے لباس سے نہیں پہچانا جاتا۔ وہ اپنی اس اندرونی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے جو اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ اس کے لباس کو بھی ڈھک لیتی ہے۔

یہی ربانی شخصیت مومن کی اصل پہچان ہے۔ اس کو دیکھنا کسی گروہی امتیاز کو دیکھنا نہیں ہوتا۔ اس کو دیکھنا ایک ایسی ہستی کو دیکھنا بن جاتا ہے جو خدا کی یاد دلا دے، جو دیکھنے والے کے اوپر خدا کی حقیقتِ اعلیٰ کو منکشف کر دے۔

اسلامی شناخت یہ ہے کہ آدمی کا طرز فکر دوسروں سے مختلف ہو جائے۔ اس کے قول میں ایک نیا آہنگ پیدا ہو جائے۔ اس کا اخلاق دوسروں سے الگ دکھائی دینے لگے۔

زیادہ ثواب

قرآن کی سورہ النور میں ۶ھ میں پیش آنے والے اس واقعہ کا ذکر ہے جو اسلام کی تاریخ میں افک کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر مدینہ کے کچھ شرپسندوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ایک جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے نتیجہ میں پورے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وقتی طور پر مسلمانوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے (لا تحسبوه شراً لکم بل هو خیر لکم) النور ۱۱

اس قسم کا فتنہ یا اس قسم کی شرانگیزی کیوں اہل ایمان کے لیے خیر ثابت ہوتی ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ایسا ہر فتنہ سچے مومن کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ ایمانی عمل کا ثبوت دے جس کو قرآن میں ظن خیر کہا گیا ہے (النور ۱۲) افواہوں کی آندھی میں حسن ظن کا طریقہ اختیار کر کے وہ مزید ثواب کمائے، وہ زیادہ بڑا عمل کر کے اللہ کی نظر میں زیادہ مقبول بندہ بن جائے۔

مثلاً الزام تراشی کی اس مہم میں جو لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر شریک ہو گئے ان میں سے ایک حسان بن ثابت انصاریؓ بھی تھے۔ چنانچہ بعد کو جب متحقق ہو گیا کہ یہ پورا قصہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھا تو حسان بن ثابت کو ان کی غلطی پر کوڑے مارے گئے۔ مگر جہاں تک حضرت عائشہ کا تعلق ہے وہ کبھی حسان بن ثابتؓ سے متنفر نہیں ہوئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اس کو سخت ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حسان کو برا کہا جائے (قال عروة وكانت عائشة تكره ان يُسبّ عندها حسان) وہ حسان کے اشعار پڑھ کر کہا کرتی تھیں کہ حسان وہ ہیں جنھوں نے اسلام کی مدافعت میں ایسے اور ایسے اشعار کہے ہیں (التفسیر المظہری ۶/۴۷۳)

حضرت عائشہؓ کا یہ قول شرافت اور بلند اخلاقی کی نہایت عظیم مثال ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ ایسا ایک کلمہ آدمی کو جنت میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ مگر اس قسم کے جنتی کلام کا کریڈٹ کسی کو ٹھنڈے حالات میں نہیں مل سکتا۔ یہ تو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ اس کے خلاف شرانگیزی اور فتنہ پردازی کا طوفان کھڑا کیا جائے مگر وہ مشتعل نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ انصاف اور

خیر خواہی کی روش نہ چھوڑے۔ اس کے باوجود اس کی زبان سے دوسروں کے لیے خیر کا کلمہ نکلے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کا اعتراف کرے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے حق میں نیک دعا کرے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح منفی ردعمل سے بچائے اور ہر حال میں تقویٰ کی مثبت روش پر قائم رہے۔

اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں جب یہ بے ہودہ خبر پھیلی تو حضرت ابوایوب انصاریؓ اپنے گھر میں آئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ اے ابو ایوب، آپ نے سنا کہ عائشہؓ کے بارہ میں کیا کہا جارہا ہے۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ ہاں میں نے سنا۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کروگی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ ابو ایوب انصاریؓ نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے افضل ہیں۔ ان کی بیوی نے جواب دیا کہ ہاں، آپ نے صحیح کہا۔ (تفسیر قرطبی ۱۲/۲۰۲)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صفوان بن المعطل السلمی کا نام لیا جن کے ساتھ ظالموں نے حضرت عائشہ صدیقہ کو ملوث کیا تھا۔ ابو ایوب انصاری نے کہا کہ میں خود اپنے بارہ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت اگر میں صفوان کی جگہ پر ہوتا تو میرے دل میں اس طرح کا خیال تک نہیں آسکتا تھا۔ پھر صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے، وہ کیوں کر ایسا سوچ سکتا تھا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں قول سدید کہا گیا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے یہ کیا کہ ایک سادہ منطق کو استعمال کرکے اسے پہلے ہی مرحلہ میں رد کردیا۔ انھوں نے سوچا کہ کوئی بھی شریف انسان ایسا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ عائشہ صدیقہ جیسی شریف خاتون یا صفوان جیسا مخلص مومن اس قسم کی ذلیل بات کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہنگامی واقعہ اگر نہ پیش آتا تو ابو ایوب انصاری کو اس عظیم عمل کا انعام کیسے ملتا کہ ذہنی بھونچال کے وقت بھی انھوں نے اعتراف کا ثبوت دیا۔ ناموافق پروپگنڈوں کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو فکری اعتدال پر باقی رکھا۔ زلزلہ خیز حالات بھی اس میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ان کے قدم کو حق وصداقت سے ہٹادیں۔

حسن ظن ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے آدمی کو خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حسن ظن کو خدا کی نظر میں ایک عظیم عمل بنادیا ہے۔

ایمان وعمل

ابن ماجہ نے اپنی حدیث کی کتاب کے مقدمہ میں ایک صحابی کا قول نقل کیا ہے کہ ہم نے ایمان کو سیکھا، اس سے پہلے کہ ہم قرآن کو سیکھیں (جب ہم نے ایمان سیکھ لیا) تو پھر ہم نے قرآن سیکھا (فتعلّمنا الایمان قبل ان نتعلّم القرآن، ثم تعلّمنا القرآن)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایمان کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن سے الگ ہو۔ اور صحابہ کرام پہلے ایمان کو سیکھتے رہے۔ جب انھوں نے پوری طرح ایمان کو سیکھ لیا تو اس کے بعد قرآن کو سیکھنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہے۔ ایمان کو بھی انھوں نے قرآن ہی کے ذریعہ سیکھا تھا نہ کہ کسی اور ذریعہ سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قرآن ہی کے ذریعہ تبلیغ کرتے تھے۔ پھر جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ان کی مزید تربیت کا کام بھی قرآن ہی کے ذریعہ ہوتا (لتنذر به وذكرى للمومنين) مدینہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہجرت سے پہلے قرآن کے کچھ عالم وہاں بھیجے گئے جو مقری کہے جاتے تھے۔ یعنی قرآن کو پڑھ کر سنانے والے۔ چنانچہ یہ لوگ ایک طرف غیر مسلموں تک قرآن کے ذریعہ اسلام کا پیغام پہنچاتے تھے اور دوسری طرف اسلام قبول کر لینے والوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ صحابی کے مذکورہ قول میں "قرآن" کا لفظ علَم یا اسم خاص کے طور پر نہیں آیا ہے۔ بلکہ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی کوئی پڑھی جانے والی چیز۔ اپنے سیاق کے اعتبار سے یہاں قرآن کا لفظ ان آیات کے لیے بولا گیا ہے جن کا تعلق عملی احکام سے ہے۔

اس مفہوم کے لیے بہت سی تائیدی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف شدت کا انداز اختیار کیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قدر تیز گفتگو کر لی تھی۔

بعد کو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ معاہدۂ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد قافلہ میں ایک پکارنے والے کی آواز سنائی دی۔ میں ڈرا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی قرآن نہ اترا ہو

(لقد خشيتُ ان يكون نزل فيّ قرآن) فتح الباری ۸/۴۴۶

اس روایت میں "قرآن" سے مراد پورا مصحف نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد کوئی قرآنی حکم ہے۔ حضرت عمرؓ کو چوں کہ اپنی غلطی کا شدید احساس ہو چکا تھا اس لیے آواز سن کر وہ ڈر گئے کہ میرے بارہ میں کوئی حکم نہ اترا ہو۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ سورۂ فتح کی آیتیں تھیں۔ پکارنے والا دراصل سورہ فتح کی آیتیں بطور خوش خبری سنا رہا تھا۔

صحابی کے مذکورہ قول میں دونوں مرحلوں سے مراد قرآن اور غیر قرآن نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد خود قرآن ہی کے دو حصے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم نے قرآن کے ایمانی حصہ سے اپنے فکر و شعور کی تعمیر کی جس کا دوسرا نام معرفت ہے۔ اس کے بعد فطری ترتیب کے مطابق، ہم نے قرآن کے عملی احکام کو سیکھا اور اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ایمان کی پختگی بھی قرآن ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کے علاوہ دوسرے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا ایمان شریعت میں معتبر نہیں۔

یہ ترتیب فرد اور جماعت دونوں کے لیے ہے۔ جس طرح فرد کے اندر پہلے ایمانی شعور پیدا کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کو عملی احکام کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہی معاملہ جماعت یا معاشرہ کا بھی ہے۔

کسی مسلم معاشرہ میں جب اسلام کے احکام و حدود کو نافذ کرنا ہو تو پہلے اس کی ایمانی حالت کا اندازہ کیا جائے گا۔ اگر ایمانی حالت کے اعتبار سے وہ زوال کی حالت میں ہو تو ایسا کرنا ہرگز اسلام نہیں ہوگا کہ قانون اور اقتدار کے زور پر اس کے اندر احکام و حدود نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے پہلے معاشرہ کی ایمانی حالت کو درست کرنا ہوگا۔ جب وہ ایمان کی ضروری سطح پر پہنچ چکا ہو، اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا کہ اس کے اوپر اسلام کے اجتماعی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

پہلے ہم نے ایمان سیکھا، پھر ہم نے قرآن سیکھا ـــــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم نے قرآن کے حصۂ ایمان کو سیکھا، اس کے بعد ہم نے قرآن کے حصۂ احکام کو سیکھا۔ گویا پہلے مرحلہ میں شعور ایمان ہے اور دوسرے مرحلہ میں تعمیل احکام۔

دلیل نبوت

ابی سعید الخدری قال۔ قال ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : انّ اکثر ٭اف علیکم ما یُخرج اللہ لکم من ات الارض۔ قیل وما برکات الارض۔ قال رۃ الدنیا (فتح الباری ۱۱/۲۴۸)

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے اوپر میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ تمہارے اوپر زمین کی برکتیں نکال دے گا۔ پوچھا گیا کہ زمین کی برکتیں کیا ہیں۔ فرمایا: دنیا کی رونق۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الرقاق کے تحت درج کیا ہے۔ یعنی وہ باب جس میں دل کو ٭رنے والی باتیں ہیں۔ یہ بلاشبہ حدیث کا ایک پہلو ہے۔ اس کو پڑھ کر آدمی دنیا کے فتنہ کو سمجھتا ہے ٭اس کے اندر آخرت کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔

تاہم اسی کے ساتھ اس حدیث کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ٭ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ ایسا ہوگا کہ زمین کے اندر چھپی ہوئی برکتیں باہر آجائیں گی۔ اس کی رونق ٭اس کی چمک دمک کو دیکھ کر تم فتنہ میں پڑ جاؤ گے اور دنیا کی طرف دوڑ پڑو گے۔

زمین کے اندر کی یہ برکتیں صنعتی انقلاب کے بعد نکل کر آج سب کے سامنے آگئی ہیں۔ چودہ ٭سال پہلے ساری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ زمین کے اندر ایسی بارونق چیزیں ٭پی ہوئی ہیں، اس کو صرف پیغمبر ہی جان سکتا تھا جس کا رشتہ براہ راست خدا سے جڑا ہوا ہو اور ٭عالم الغیب سے معلومات لے کر بولتا ہو۔

یہ حدیث دراصل جدید صنعتی انقلاب کی پیشین گوئی ہے۔ اس انقلاب کے بعد جو پر رونق دنیا ٭امنے آئی ہے وہ تمام فتنوں سے زیادہ بڑا فتنہ ہے۔ اس کی دل فریبیاں تمام انسانوں کو اپنی طرف ٭ینچ رہی ہیں۔ یہ دنیا اتنی پرکشش ہے کہ ہر آدمی سب کچھ بھول کر اس کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ٭وش قسمت وہ ہے جو اس عظیم فتنہ سے بچ جائے۔ وہی وہ شخص ہے جس کو آخرت میں عظیم انعام ٭یا جائے گا۔ یہ حدیث مستقبل میں ہونے والے ایک واقعہ کو ماضی میں بتاتی ہے۔ وہ ایک نامعلوم کی ٭یشگی خبر ہے۔ اس اعتبار سے وہ آپؐ کے پیغمبر خدا ہونے کی دلیل ہے۔

جنگ کا قانون

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ ۱۹۰)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں کہنا یہ تھا کہ جو لوگ تمہارے خلاف لڑائی چھیڑیں ان سے دفاع کے لیے لڑو۔ مگر دفاع کو حذف کرکے فرمایا کہ ان سے اللہ کے راستہ میں لڑو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا دفاع بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ نے دفاع کرنے کی اجازت دی ہے۔ مومن کا ٹھہرنا بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اس کا چلنا بھی اللہ کے لیے۔

اسی ربانی جذبہ کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ مومن کی جنگ صرف دفاع کی حد تک محدود رہتی ہے۔ جہاں دفاع کا مسئلہ ختم ہوا وہیں اس کی جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مومن جنگ کے دوران ظالم نہیں بنتا۔ وہ صرف جنگجو افراد پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ وہ عورتوں اور بوڑھوں اور بچوں کو نہیں مارتا۔ وہ غیر مقاتلین کو اپنے انتقام کا نشانہ نہیں بناتا۔

"اور زیادتی نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم خود کسی کے خلاف جارحیت کرکے جنگ کا آغاز نہ کرو۔ القرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اور کہا گیا ہے کہ زیادتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو تم سے جنگ نہ کرے تم بھی اس سے جنگ نہ کرو (وقیل "لا تعتدوا" ای لا تقاتلوا من لم یقاتل) الجامع لاحکام القرآن ۲/۳۵۰

اسلام کے مطابق، اصل مطلوب چیز امن ہے نہ کہ جنگ۔ اگر کوئی جنگ پر آمادہ ہو تو پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جنگ کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا جائے۔ جب جنگ سے بچنے کی کوشش آخری حد تک ناکام ہو جائے اور فریق ثانی جنگ کا آغاز کر بیٹھے تو اس کے بعد آخری چارہ کے طور پر دفاعی جنگ کی جائے گی۔ مگر جہاں تک جارحانہ جنگ کا تعلق ہے، اسلام کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ فرد انسانی کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ یہ ایک تعمیری کام ہے جو صرف پر امن حالات ہی میں ہو سکتا ہے نہ کہ جنگ اور تشدد کے حالات میں۔

عوام و خواص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر قدیم مکہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک نام رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف کا ہے۔ وہ قریش کے پہلوانوں میں سے تھے۔ روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ میں کشتی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد رکانہ نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ کشتی کیسے ہوئی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ سے کہا: افرأیت ان صرعتك اتعلم ان ما اقول حق (اگر میں کشتی میں تم کو پچھاڑ دوں تو کیا تم جان لو گے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق ہے) البدایۃ والنہایۃ ۱۰۳/۳

دوسری روایت میں اس قول کو رکانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ان صرعتنی علمت انك صادق (اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو میں جان لوں گا کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں) الکامل فی التاریخ ۷۵/۲

رکانہ کی طرح عمر بن الخطابؓ بھی قدیم مکہ کے پہلوانوں میں سے تھے۔ مگر نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی میں پچھاڑنے کی بات کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایسا کہا۔ اس کے برعکس عمر فاروقؓ نے قرآن کو پڑھا۔ اس کو پڑھنے سے ان پر حقیقت منکشف ہوئی اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اصل یہ ہے کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک عوام اور دوسرے خواص۔ عوام وہ ہیں جو پیدائشی طور پر کم تر ذہنی سطح سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور خواص وہ ہیں جو بلند ذہنی سطح کے مالک ہوں۔ دونوں کی ذہنی ضرورتیں الگ ہیں اور دونوں کو ان کی ذہنی ضرورت یا ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام دیا جاتا ہے۔

رکانہ کا تعلق عوام کے طبقہ سے تھا۔ وہ کشتی کی ہار جیت سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ مگر عمر فاروق خواص کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے مالک تھے۔ اور اعلیٰ ذہن کے لوگ دلائل و حقائق سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ مذکورہ نوعیت کی کسی چیز سے۔

عوام وخواص یا کمتر ذہنی سطح اور اعلیٰ ذہنی سطح کی یہ تقسیم خود خالق فطرت کی قائم کردہ ہے۔ یہ فطری فرق تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کی دعوت دو سطح پر چلائی جائے۔ ایک عوام کی سطح پر جہاں قصے اور مثالیں اور فضائل کی زبان میں لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے۔

دوسری سطح خواص کی ہے۔ یہاں لوگوں کو اسلام کا پیغام دلائل و حقائق کی زبان میں دینا ہوگا۔ یہاں اسلام کی تعلیمات کو اعلیٰ عقلی اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا۔ اسی لیے ایک صحابی نے کہا کہ لوگوں سے ان کے عقلی معیار کے مطابق بات کرو (کلموا الناس علی قدر عقولهم)

اس تقسیم کو توڑا نہیں جا سکتا۔ عوام کے سامنے اگر منطقی اسلوب یا دلائل کی زبان میں بات کی جائے تو وہ ان کے ذہن کو اپیل نہیں کرے گی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے عاجز رہیں گے۔ اسی طرح اگر خواص کے سامنے عوام کی زبان میں بات کہی جائے تو وہ خواص کو متاثر کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔

اسلام کے احیاء کے لیے عوام اور خواص دونوں قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر خواص دین سے دور ہوں تو صرف عوام میں دین کا پھیلنا احیاء اسلام کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر عوام میں دین نہ پھیلا ہو تو صرف خواص کا اسلام پسند بن جانا کوئی حقیقی انقلاب لانے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایسی تحریکیں جاری ہوں جو دو طرفہ تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوں۔ ایک طرف وہ عوام کے اندر عمومی دینی فضا پیدا کریں۔ دوسری طرف خواص کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کر کے انھیں دین کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ دین کی گاڑی پہلے بھی انھیں دونوں پہیوں کی یکجائی سے چلی تھی اور آج بھی وہ اسی طرح چلے گی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ دین کی گاڑی کو چلانے والا نہیں۔

دین میں آسانی

قرآن (البقرہ ۱۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) دوسری جگہ (الحج ۷۸) فرمایا کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وما جعل علیکم فی الدین من حرج)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ھذا الدین یسر (البخاری، کتاب الایمان) یعنی یہ دین آسان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو: ان خیر دینکم الیسرہ (مسند احمد) آپ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ آسانی پیدا کرو، لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو (یسروا ولا تعسروا)

اسی لیے فقہ میں شریعت کے بارہ میں یہ اصولی مسئلہ وضع کیا گیا ہے کہ: المشقۃ تجلب التیسیر۔ یعنی مشقت آسانی لاتی ہے۔ حنفی عالم زین الدین ابن ابراہیم بن محمد مصری (م ۹۷۰ھ) جو ابن نجیم کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے اصول فقہ پر اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ایک بحث کا عنوان یہ قائم کیا ہے: القاعدۃ الرابعۃ، المشقۃ تجلب التیسیر (چوتھا قاعدہ اس بات پر کہ مشقت آسانی لاتی ہے)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین بذات خود کوئی سہولتوں اور آسانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ دین کے راستہ میں جب حالات کے تحت کوئی مشقت کی صورت پیدا ہو جائے تو وہاں لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈھکیلا جائے گا، بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی اصول کے تحت بیماری میں وضو کے بجائے تیمم ہے۔ سخت بارش میں مسجد کے بجائے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ سفر میں روزہ چھوڑ دینا ہے، وغیرہ۔

یہی اصول ملی زندگی کے لیے بھی ہے۔ جہاں اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں اعراض کی تعلیم ہے۔ جہاں اجتماعی مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو وہاں غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم ہے۔ جہاں سیاسی اصلاح کو نشانہ بنانے میں ہلاکت پیش آنے والی ہو وہاں انفرادی اصلاح پر اپنی کوششوں کو لگانا ہے۔ جہاں شور والے دین میں تباہی ہو وہاں خاموشی والا دین اختیار کرلینا ہے

دین میں آسانی کا یہ اصول صرف فرد کے لیے نہیں ہے، وہ جماعت اور قوم کے لیے بھی ہے۔ جس طرح انفرادی معاملات میں مشکل پیش آنے کی صورت میں فرد کے لیے شریعت کا حکم نرم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت کے لیے بھی سخت حالات میں شریعت اپنے تقاضے کو نرم کر دیتی ہے۔

دینی مقصد کے لیے اقدام کرنا بجائے خود ثواب کا ایک عمل ہے۔ مگر جہاں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں شریعت کا حکم بدل جائے گا۔ اب اقدام کے بجائے اعراض اہل اسلام کے لیے شریعت کا مطلوب عمل بن جائے گا۔

اسی طرح مثلاً شریعت کا ایک عمل ہے جس کو اجتماعی صورت میں کرنا مطلوب ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو تو وہاں حکم میں نرمی پیدا کر دی جائے گی اب مظاہراتی انداز کے بجائے غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک معاشرہ ہے جہاں سیاسی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ اگر سیاسی تبدیلی کو نشانہ بنا کر تحریک چلائی جائے تو ہلاکت کی صورت پیش آجائے گی تو ایسے معاشرہ میں لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے بجائے خود حکم کو بدل دیا جائے گا۔ اب وہاں یہ مطلوب ہو جائے گا کہ سیاسی انقلاب کے محاذ سے ہٹ کر انفرادی اصلاح کے میدان میں پرامن کوششیں کی جائیں۔

اسی طرح ایک موقع جہاں اعلان و اظہار ایک شرعی مطلوب نظر آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ یقین ہے کہ اگر لاؤڈ اسپیکر کی پرشور تقریر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا منفی ردعمل ہوگا اور اہل اسلام کے لیے شدید تر حالات پیدا ہو جائیں گے۔ تو ایسے حالات میں شور والا عمل ساقط ہو جائے گا، اور شریعت کا تقاضا ہو جائے گا کہ خاموش تدبیر کا انداز اختیار کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔

عُسر سے بچنا اور یُسر کا طریقہ اختیار کرنا یہ ہے کہ بوقت عمل یہ دیکھا جائے کہ موجودہ حالات میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں ہے۔ اور پھر ممکن دائرہ میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جائے، نہ کہ ناممکن دائرہ میں سر ٹکرا کر مزید اپنے نقصان میں اضافہ کر لیا جائے۔

خودکشی کی چھلانگ

دہلی کے روزنامہ ہندستان ٹائمس (۷ نومبر ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک باتصویر کہانی چھپی ہے۔ یہ ایک مُردہ کی کہانی ہے جو زندہ لوگوں کو دردناک سبق دے رہی ہے۔

دہلی کے مسٹر ایم این ارورا کی ۲۰ سالہ بھتیجی سارِیکا ہورا (Sarika Hora) پونہ میں انجینیرنگ کے تیسرے سال کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اکتوبر ۱۹۹۵ میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ دیوالی منانے کے لیے دہلی آئی۔ ۲۷ اکتوبر کو نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے وہ گوا اکسپرس پر سوار ہوئی تاکہ پونہ پہنچ کر وہ دوبارہ اپنے اکیڈمک سیشن میں شامل ہو سکے۔

ریلوے اسٹیشن پر اس کے گھر والوں نے اس کو رخصت کیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی طالب علم کے ہمراہ نہایت خوش وخرم اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس ٹرین کے ہر دو ڈبہ کے درمیان اندرونی گزر گاہ بنی ہوئی تھی۔ ٹرین گوالیار اور جھانسی کے درمیان تھی کہ پر شوق لڑکی اٹھی تاکہ ایک کوچ سے دوسری کوچ میں جا سکے۔ وہ کوچ کی دہلیز (vestibule) میں پہنچی۔ یہاں قاعدہ کے مطابق، دونوں کوچ کے درمیان گزرنے کی پلیٹ (stepping plate) ہونی چاہیے تھی۔ مگر کسی وجہ سے وہ وہاں موجود نہ تھی۔ لڑکی نے اس کی پروا نہ کی۔ اس نے چاہا کہ قدم بڑھا کر وہ اِس کوچ سے اُس کوچ میں پہنچ جائے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا پاؤں اگلی کوچ تک پہنچنے کے بجائے درمیان کی خالی جگہ پر پڑ گیا۔ اچانک وہ تیز دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے چلی گئی اور سکنڈوں میں اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

یہ صرف ریل کے سفر کی بات نہیں۔ زندگی کے وسیع تر سفر میں بھی بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ہمیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچنے کے لیے کسی گزرنے والی پلیٹ (stepping plate) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ ٹھہر کر دیکھا جائے کہ ہمارے لیے فی الواقع کوئی قابلِ اعتماد پلیٹ موجود ہے جس سے گزر کر ہم آگے کی طرف جا سکیں۔ ایسی قدم گاہ کی غیر موجودگی میں گزرنے کی کوشش کرنا خودکشی کی چھلانگ لگانا ہے نہ کہ ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر طے کرنا۔

کیا کوئی سبق لینے والا ہے جو اس واقعہ سے سبق لے۔

پوپ کے جواب میں

پوپ جان پال دوم کی ایک کتاب ۱۹۹۴ میں چھپی ہے۔ اس کا ترجمہ بہت سی عالمی زبانوں میں ش
ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان محمد (Muhammad) ہے۔ اس مختصر باب میں اس
پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

جو شخص بھی پرانے عہد نامہ اور نئے عہد نامہ کو جانتا ہے، اور پھر وہ قرآن کو پڑھتا ہے۔
واضح طور پر اس عمل کو دیکھتا ہے جس کے ذریعہ وہ مکمل طور پر خدائی اظہار کو گھٹا رہا ہے، یہ ناممکن
کہ آدمی اس کو نوٹ نہ کرے کہ قرآن کا بیان اس سے الگ ہے جو خدا نے اپنے بارہ میں کہا ہے، سب
سے پہلے پرانے عہد نامہ میں پیغمبروں کے ذریعہ، اور پھر آخری طور پر نئے عہد نامہ میں اپنے بیٹے کے
ذریعہ۔ خدا کے خود ظاہر ہونے کا قیمتی پہلو، جو کہ پرانے عہد نامہ اور نئے عہد نامہ کا حصہ ہے، وہ قطعی
طور پر اسلام میں بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ انسانی زبان کے کچھ بہت ہی خوب صورت نام قرآن ک
خدا کو دیے گئے ہیں لیکن آخری طور پر وہ دنیا سے باہر کا ایک خدا ہے۔ ایک ایسا خدا جو صرف عظ
ہے، وہ ایسا خدا نہیں جو ہمارے ساتھ ہو۔ اسلام ہرگز نجات کا مذہب نہیں (اصل عبارت نیچے ملاحظہ فرمائیں)

پوپ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں خدا کو ایک غیبی حقیقت کے طور پر مانا گیا۔
وہ ایک محسوس وجود کی صورت میں انسان کے پاس موجود نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مسیحی مذہب میں تجس
(incarnation) کا تصور ہے۔ یعنی خدا (کا بیٹا) انسان جیسے گوشت اور خون کی صورت میں انس

'hoever knows the Old and New Testaments, and then reads the Koran,
early sees the process by which it completely reduces Divine Revelation.
 is impossible not to note the movement away from what God said about
imself, first in the Old Testament through the prophets, and then finally with
ew Testament through His Son. In Islam all the richness of God's self-
:velation, which constitutes his heritage of the Old and New Testaments, has
efinitely been set aside. Some of the most beautiful names in the human
nguage are given to the God of the Koran, but He is ultimately a God outside
f the world, a God who is only Majesty, never Emmanuel, God-with-us. Islam
 not a religion of redemption.

rossing the Threshold of Hope, by Pope John Paul II
lfred A. Knopf, New York 1994, pp. 92-93.

کے پاس آیا۔ اس بنا پر پوپ کا دعویٰ ہے کہ مسیحی تصور خدا میں قربت کا پہلو پوری طرح موجود ہے، جب کہ اسلام میں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے اور خدا کے درمیان حقیقی قربت کا تجربہ کر سکے۔ اس سے پوپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نجات کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جو مذہب آدمی کو خدا سے نہ ملاتا ہو وہ اس کی نجات کا ذریعہ کیسے بنے گا۔

ا۔ پوپ کی اس بات کو زیر بحث لانے کے لیے سب سے پہلے یہ ثابت ہونا چاہیے کہ بائبل کا بیان زیادہ مستند ہے، مگر یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ بائبل (پرانا عہد نامہ، نیا عہد نامہ) کی تاریخی تحقیق کرنے والے تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ بائبل اپنی اوریجنل صورت میں موجود نہیں۔ بار بار کی تبدیلی اور الحاق نے اس کو تاریخی طور پر ایک غیر مستند کتاب بنا دیا ہے۔

ایسی حالت میں پوپ کا مذکورہ دعویٰ اپنے پہلے مرحلہ ہی میں رد ہو جاتا ہے جب بائبل قابل اعتبار کتاب نہیں تو اس کے کسی بیان پر استدلال کی عمارت کیسے کھڑی کی جا سکتی ہے۔

۲۔ اس سے قطع نظر، پوپ کی یہ بات ایک غلط مفروضہ پر اپنی عمارت کھڑی کرنے کے ہم معنی ہے جس کو منطق کی اصطلاح میں بنار فاسد علی الفاسد کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ ابتدائی مفروضہ ہی درست نہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان قربت کے لیے ضروری ہے کہ خدا خود انسان کے روپ میں ظاہر ہو۔ کیونکہ خدا اور انسان کی قربت کسی لمسِ جسمانی کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی قربت ہے جو مکمل طور پر نفسیات کی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بالفرض اگر خدا ہمارے سامنے موجود ہو تب بھی نفسیات کی سطح پر ہی اس سے ہماری قربت قائم ہوگی نہ کہ ظاہری جسم کی سطح پر۔

اتصال نام ہی ہے روحانی اتصال کا۔ خود انسانوں کے درمیان بھی تمام اعلیٰ اتصال روحانی اتصال ہوتے ہیں۔ مثلاً دوست کا دوست سے ملنا حقیقۃً دو جسموں کا ملنا نہیں ہوتا بلکہ دو روحوں کا ملنا ہوتا ہے۔ اسی لیے دو مُردہ دوست اگر پاس پاس رکھ دیے جائیں، تو اگرچہ ان کے جسم ایک دوسرے سے متصل ہوں گے، مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے دونوں اتصال کے تجربہ سے محروم ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور بندے کا اتصال دو اسٹیچو کا اتصال نہیں ہے، بلکہ وہ روح اکبر کے ساتھ روح اصغر کا اتصال ہے۔ اسی بنا پر اس کی اہمیت ہے۔ اگر وہ محض دو جسموں کا اتصال ہوتا تو سرے سے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہوتی۔

۳۔ پوپ جان پال دوم نے قربت خداوندی کی جو نوعیت بتائی ہے وہ مذہبی طور پر قطعاً غیر ثابت
دہ ہے۔ وہ تحریفات کے بعد بھی پرانے عہد نامہ یا نئے عہد نامہ (تورات و انجیل) میں موجود نہیں ہے۔
یم و جدید عہد نامہ کے پورے دفتر میں کوئی بھی عبارت ایسی نہیں ہے جو صراحت اور قطعیت کے
اتھ پوپ کے مذکورہ بیان کی تصدیق کرتی ہو۔ گویا کہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی کھلی
لیل خود کتب قدیمہ میں بھی موجود نہیں۔

اس سلسلہ میں کتب قدیمہ سے اگر کوئی حوالہ دیا جاتا ہے تو وہ استنباطی نوعیت کا ہے مثلاً
س سلسلہ میں اکثر یوحنا کی انجیل کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ اور کلام مجسم ہوا :

The Word became flesh. (John 1:14)

مگر اس عبارت میں پوپ کا مذکورہ نظریہ ہرگز موجود نہیں۔ وہ صرف استنباطی طور پر اس سے
کالا جاتا ہے۔ اور ایک ایسا نظریہ جس کو مسیحیت کا مرکزی اصول (central doctrine) کہا جاتا ہے، اگر وہ
ستنباط کے ذریعہ ثابت کیا جائے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ثابت ہی نہیں ہوا۔

کوئی شخص انجیل کی مذکورہ آیت یا اسی قسم کی کسی اور آیت سے استنباطی طریقہ پر اس کی تائید
کالے تو وہ تائید ہرگز کافی نہیں ہوگی۔ اتنا زیادہ بنیادی عقیدہ صرف اس وقت کسی کتاب سے ماخوذ
رار دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ براہ راست طور پر اس کے متن سے نکل رہا ہو۔ اگر اس کو تشریح و تعبیر کر کے
کالا جائے تو یقینی طور پر وہ نکلا ہی نہیں۔ اس طرح کے امور میں صرف براہ راست استدلال کارآمد
وتا ہے، بالواسطہ استدلال اس طرح کے امور میں کارآمد نہیں۔

۴۔ اگر اس بے بنیاد عقیدہ کو برائے بحث مان لیا جائے کہ خدا (یا خدا کا بیٹا) حضرت مسیح کے
وپ میں دنیا میں آیا تب بھی قربت خداوندی کا یہ عقیدہ ناقابل عمل قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ مسیح کی زندگی
ں بھی چند ہی لوگ اور وہ بھی محض کچھ لمحہ کے لیے جسمانی اعتبار سے مسیح کے قریب ہو سکے۔ اور اب حضرت
سیح کی غیر موجودگی میں تو تمام ہی لوگ مستقل طور پر قربت کے اس تجربہ سے محروم ہیں۔ آج اگر کسی کو مسیح کی
بت حاصل ہوگی تو وہ نفسیاتی سطح پر ہی حاصل ہوگی۔ پھر دونوں مذہبوں کے تصور قربت میں کیا فرق باقی رہا۔

۵۔ اسلام میں خدا کا جو تصور دیا گیا ہے وہ کوئی دور کا خدا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا خدا ہے جو
نسان سے بالکل قریب ہے (البقرہ ۱۸۶) قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب ایک سچا سجدہ کرتا

ہے تو وہ خدا سے آخری حد تک قریب ہو جاتا ہے (العلق ۱۹) اسی طرح حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو (تعبد اللہ کانک تراہ) اور یہ کہ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے (یناجی ربہ)

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں بتاتی ہیں کہ اسلام میں خدا کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان قربت کا تعلق نہیں ہے بلکہ صرف دوری کا تعلق ہے۔ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو اہل ایمان ہیں وہ خدا سے بہت زیادہ محبت کرنے والے ہوتے ہیں (البقرہ ۱۶۵) یہی واقعہ بتاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو خدا سے ملانے والا ہے۔ کیوں کہ آدمی جب تک قربت کا احساس نہ کرے، اس کو کبھی خدا کے ساتھ حب شدید کا تعلق نہیں ہو سکتا۔

۶۔ قرآن کے مطابق (حتیٰ کہ خود کتب قدیمہ کے مطابق) خدا سے قربت و اتصال غیر مرئی سطح پر ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں ذکر اور دعا اور غور و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ ذہنی یا قلبی اعمال دراصل اپنے اندر اعلیٰ روحانیت کو جگانے کے لیے ہیں۔ یہ اعلیٰ روحانیت جب کسی کے اندر جاگ اٹھے تو کسی تاخیر کے بغیر فوراً ہی اس کا اتصال خدا کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ وقت اور مقام کی کوئی شرط ہے اور نہ کسی قسم کے درمیانی واسطہ کی ضرورت۔

بندہ جب خدا کی یاد میں غرق ہوتا ہے۔ وہ اس کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ پکارتا ہے۔ جب وہ اپنی سوچ کو پوری طرح اپنے رب کی طرف مرتکز کر دیتا ہے تو فوراً ہی ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خداوند ذوالجلال کے ساتھ روحانی سطح پر انسان کا اتصال ہے۔

اس اتصال کی علامت کے طور پر انسان کا دل نرم ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں ایک آفاقی سکون اتر آیا ہے۔

یہی خدا اور بندے کا اتصال ہے۔ یہ اتصال سب سے زیادہ اسلام میں حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسلام انسان کو کسی ظاہری یا غیر متعلق چیز پہ نہیں اٹکاتا، بلکہ وہ اس کو براہ راست

خدا اوند عالم سے مربوط کرتا ہے ۔ وہ انسان کی لامحدود اندرونی شخصیت کو بیدار کرتا ہے ۔ اور جس انسان کی اندرونی شخصیت پوری طرح بیدار ہو جائے اس کا خدا سے اتصال اتنا ہی یقینی ہو جاتا ہے جتنا کہ کنکشن درست ہونے کے بعد بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان رشتۂ نور کا قائم ہو جانا ۔

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی ۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کردی جائے گی ۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے ۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا ۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے ۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

دو ہجرتیں

۱۹۲۰ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ نے ہجرت کا
فتویٰ دیا تھا۔ اخبار اہل حدیث امرت سر کے شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ میں یہ فتویٰ ان الفاظ میں
چھپا تھا :

" تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمۂ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر
ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہوگیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے
لئے بجز ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندستان میں
سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندستان سے ہجرت
کر جائیں" (تحریک خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲، صفحہ ۱۳۲)

اس فتوے کے مطابق بہت سے مسلمان ہجرت کرکے افغانستان چلے گئے۔ یہ سفر ان کے
لئے سفر ہجرت کے بجائے سفر بربادی بن گیا۔ بے پناہ تباہی کے بعد کچھ لوگ مر گئے، کچھ لوگ
مایوسی اور دل شکستگی کے ساتھ واپس آ گئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی)

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علما نے ہجرت کا یہ فتویٰ کیوں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ
۱۸۵۷ میں علما نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ ساٹھ سال سے زیادہ مدت
کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ جہاد یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ ایسی
حالت میں یہ سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ان علما نے سمجھا کہ اب انھیں ہجرت کرکے پڑوس کے
مسلم ملک میں چلا جانا چاہئے اور وہاں سے مدد حاصل کرکے اور مزید تیاری کرکے دوبارہ
ہندستان پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس طرح انگریزوں کو یہاں سے نکالنا چاہئے۔

یہ ان علما کی اجتہادی غلطی تھی۔ یہ اجتہادی غلطی ان سے اس لئے ہوئی کہ انھیں 'ہجرت'
کے لفظ سے صرف ایک ہی قسم کی ہجرت کا علم تھا۔ یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔ انھیں ایک
اور ہجرت کا پتہ نہیں تھا، صرف اس لئے کہ اس کا نام قدیم کتابوں میں ہجرت کے بجائے
حدیبیہ لکھا ہوا ہے۔

ہجرت بجائے خود ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ مگر ہجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مکانی ہجرت اور دوسرے تدبیری ہجرت۔ مکہ سے مدینہ جانا یہ مکانی ہجرت تھی اور حدیبیہ کا معاہدہ تدبیری ہجرت تھی۔ کیوں کہ اس معاہدہ میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اب تک دونوں فریقوں کے درمیان جو جنگ جاری تھی اس کو بند کر دیا جائے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرے اس طرح حدیبیہ نے میدان عمل کو بدل دیا۔

گویا کہ صلح حدیبیہ تشدد دانہ عمل (violent activism) سے غیر تشدد دانہ عمل (non-violent activism) کی طرف ہجرت تھی۔ اس صلح کے ذریعہ فریق ثانی کو عدم جارحیت کا پابند کر دیا گیا اور اس طرح اہل اسلام کے لئے پر امن دعوت یا غیر تشدد دانہ عمل کا راستہ کھل گیا۔

عجیب بات ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے علما کی سمجھ میں یہ دوسری ہجرت نہ آسکی۔ البتہ مہاتما گاندھی نے اس راز کو پالیا جنھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ میں جب کہ علما مسلمانوں کو ہجرت مکانی کی دعوت دے رہے تھے، عین اسی وقت مہاتما گاندھی نے اہل وطن کو ہجرت تدبیری کا پیغام دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک ہم تشدد کے ذریعہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد چلا رہے تھے۔ یہ طریقہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اب ہم کو تشدد کا طریقہ چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ پر اپنی تحریک چلانا چاہئے۔

عدم تشدد کے ہتھیار سے مراد تھا دلیل کا ہتھیار۔ یہ دوسرا ہتھیار ہندستانیوں کے حق میں نہایت مؤثر ثابت ہوا۔ تشدد کے طریقہ میں انگریزی حکومت زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہی تھی۔ اور ہندستانی لوگ اس کے مقابلہ میں کمزور فریق بنے ہوئے تھے۔ مگر جب عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا تو اچانک ہندستانیوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ کیوں کہ اب مقابلہ ہتھیار کے میدان کے بجائے نظریات کے میدان میں منتقل ہو گیا۔

مشینی انقلاب نے انگریزوں کو زیادہ بہتر ہتھیار دئے تھے۔ مگر دلیل اور نظریہ کے میدان میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس دوسرے میدان میں انگریزوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ باہر کے دیش سے آکر کیوں ہندستان میں حکومت کریں۔ جب کہ

ہندستانی لیڈروں کے پاس یہ مضبوط دلیل تھی کہ ہم اس ملک کے باشندے ہیں۔ اس لئے دنیا کے مسلمہ اصول کے مطابق ہم کو حق ہے کہ ہم اپنے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت بنائیں۔ انگریز کے پاس نظریۂ استعمار تھا اور گاندھی کے پاس نظریۂ خود اختیاری۔ پہلے کے مقابلہ میں دوسرا واضح طور پر برتر ثابت ہوا۔ اور انگریز کو یہاں سے نکل جانا پڑا۔

یہ ہجرت تدبیری مہاتما گاندھی کی سمجھ میں آئی مگر وہ علماء اسلام کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۰ سے پہلے کے دور میں آزادئ ہند کی تحریک میں علماء سیاسی اما کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مگر ۱۹۲۰ کے بعد کے دور میں اچانک وہ مقتدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب سے لے کر مولانا آزاد تک تمام علماء نے مہاتما گاندھی کو اپنا سیاسی قائد تسلیم کرلیا۔

آج دوبارہ یہی صورتحال ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کے کچھ نادان دوست مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ "مسلم کش" فسادات سے نجات کا راستہ ہجرت ہے۔ ان کا کہ ہے کہ ملک میں سازش کے تحت فرقہ وارانہ فساد کرایا جاتا ہے۔ مسلمان اگر ان فسادات میں دفاع کے اصول کے تحت مقابلہ کرتے ہیں تو عددی فرق کی بنا پر مسلمانوں کا دفاع غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کے اصول ہجرت کے تحت مسلمانوں کو اپنے مقامات سے ہجرت کر جانا چاہئے۔ اس سے ان کی مراد داخلی ہجرت ہے۔ یعنی مسلمان ملک کے اند اپنے علیحدہ پاکٹ بنائیں اور منتشر آبادیوں سے نکل کر ان مخصوص علاقوں میں آباد ہو جائیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ہندستانی مسلمانوں کی بے وقعتی کا راز، باوجود ۲۰ کروڑ کی آبادی کے یہ ہے کہ وہ گاؤں گاؤں اور شہر بہ شہر پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنی عددی قوت بڑھانے اور اکثریت میں تبدیل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہجرت کرکے بعض پہلے سے طے شدہ علاقوں میں منتقل ہو جائیں۔ یعنی مسلمان ملک کے اندر ہی نقل مکان کریں۔ جہاں مسلمانوں کا تناسب آبادی کم ہے، ان علاقوں کو غیر محفوظ قرار دے کر محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر جائیں (افکار ملی۔ دہلی، مارچ ۱۹۹۴، صفحہ ۶۲)

یہ اس نادانی کا اعادہ ہے جو ۵۷ سال پہلے کی گئی تھی۔ اس قسم کی ہجرت بلاشبہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ فکر کے اعتبار سے ابھی تک قبائلی دور میں جی رہے ہیں۔ قبائلی دور میں جب کوئی مقابلہ پیش آتا تھا تو وہ صرف دو فریقوں کے درمیان ہوتا تھا۔ مثلاً قدیم یثرب کی جنگ بعاث اوس اور خزرج کے درمیان تھی، مگر آج ہم منظم اسٹیٹ کے دور میں جی رہے ہیں۔ اب دو متحارب فریقوں کے علاوہ یہاں ایک تیسرا فریق بھی ہے، اور وہ پولیس ہے۔

مذکورہ انداز میں سوچنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم مسلمانوں کا علیحدہ پاکٹ بنا دیں گے تو ہم اس پوزیشن میں ہو جائیں گے کہ "ہندو حملہ آوروں" کا اجتماعی قوت سے دفاع کر سکیں۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے۔ کیوں کہ تیسرا فریق (پولیس) ایسے موقع پر غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً آجائے گا اور کرفیو کا قانون نافذ کر کے پورے علاقہ کو اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ اس کے بعد یہ تیسرا فریق وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ کرے گا جس سے بچنے کے لئے مسلم دانشور مسلمانوں کو علیحدہ پاکٹ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اسلام کی رو سے وہ اس لئے غلط ہے کہ اسلام میں ہجرت صرف اس وقت ہے جب کہ ہجرت کے سوا کوئی اور چارۂ کار سرے سے ممکن ہی نہ رہا ہو۔ ہندستان میں ایسی صورت ہرگز پائی نہیں جاتی۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد کا بالکل یقینی حل یہ ہے کہ مسلمان اعراض کا اصول اختیار کریں، وہ اشتعال انگیزی کے مواقع پر مشتعل نہ ہوں۔ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے تجربات موجود ہیں کہ جب بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا تو فساد نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں انتقال آبادی کی بات کرنا اصول اسلام کی خلاف ورزی ہے نہ کہ اصول اسلام کی تعمیل۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے ایک صورت کو اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت کو اختیار فرماتے تھے (ما خُیّر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما)

اس سنت رسول کی روشنی میں دیکھئے تو ہجرت کی مذکورہ تجویز سراسر سنت رسول کے خلاف ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ کا طریقہ انتخاب الیسر کا ہے۔ اور یہ نادان لوگ مسلمانوں کو انتخاب اعسر کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اعراض بلاشبہ آسان ہے اور ہجرت اس کے مقابلہ میں بلاشبہ مشکل۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کے لئے ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک اعراض کا اور دوسرے ہجرت کا۔ عقل اور تجربہ دونوں بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کو اعراض کے ذریعہ بخوبی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ پھر جو مسئلہ اعراض کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہو اس کے لئے ہجرت کی تجویز پیش کرنا کس قدر لغو اور کتنا زیادہ غیر اسلامی ہے۔

موجودہ مسلمانوں کو بلاشبہ ایک ہجرت کرنا ہے۔ مگر یہ مکانی ہجرت نہیں ہے بلکہ تدبیری ہجرت ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد سے اب تک مسلمان، کچھ نااہل لیڈروں کے مشورہ کے تحت جس اصول پر عمل رہے تھے وہ تھا ـــــ احتجاج، دفاع، مظاہرہ، ٹکراؤ۔ اب انھیں چاہئے کہ اس طریقہ کو وہ مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ اس کے بجائے وہ محبت، اخلاق، تحمل، اعراض اور حکمت کا طریقہ اختیار کریں۔ یہ ان کے لئے تدبیری ہجرت یا طریق کار میں ہجرت کے ہم معنی ہے اور اسی میں ان کی یقینی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

اسلام میں تیمم کی اجازت ہے۔ مگر تیمم کی اجازت اس وقت ہے جب کہ وضو کے لئے پانی موجود نہ ہو۔ اسی طرح اسلام کا ایک اصول ہجرت بھی ہے۔ مگر یہ اصول اسی وقت کے لئے ہے جب کہ دوسری کوئی ممکن صورت سرے سے موجود نہ رہے۔ ہندستان میں ہرگز کوئی ایسی ایمرجنسی کی صورت پائی نہیں جاتی۔ یہاں فرقہ وارانہ فساد کا جو مسئلہ ہے اس کو صبر و اعراض کے ذریعہ یقینی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہندستان میں آیت ہجرت مطلوب نہیں ہے۔ یہاں جو جو آیت مطلوب اور قابل انطباق ہے وہ قرآن کی یہ آیت ہے: و ان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً (آل عمران ۱۲۰)

تحمل کی ضرورت

مسلمانوں کے درمیان باہمی جھگڑے اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ آپ کسی بھی دن اور کسی بھی مقام پر اس کا نمونہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خبر پڑھئے:

نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۳ ——— حوض قاضی کے علاقہ کی گلی شاہ تارا میں ایک ہی گھر میں رہنے والے رشتہ داروں میں جھگڑا ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رشتہ داروں نے چاقو چلائے جس کے نتیجہ میں اشفاق نامی نوجوان کا قتل ہو گیا جب کہ اس کا بھائی شدید زخمی حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل ہے۔

پولیس اطلاع کے مطابق گزشتہ شب گلی شاہ تارا میں ایک ہی خاندان کے دو کنبوں کے درمیان پرانے تنازعے نے انتہائی بھیانک رخ اختیار کر لیا۔ اخلاق (۲۸) اور اشفاق (۲۵) سگے بھائی ہیں جن کے کنبے پہلی منزل پر رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر ان کے چچا محمد یاسین کا کنبہ رہتا ہے۔ کل یاسین کے گھر سے سیڑھیوں پر گندہ پانی پھینکا گیا جس پر اخلاق کے گھر والوں نے اعتراض کیا۔ اعتراض پر غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مبینہ طور پر مزید کوڑا اور پانی پھینکا گیا جس پر بات بڑھ گئی۔ محمد یاسین نے اخلاق کو دبوچ لیا اور فاضل اور اس کے بھائی عامل نے مبینہ طور پر چاقو سے اس پر حملہ کر دیا۔ اخلاق کو شدید زخمی حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ زیر علاج ہے۔ زاہد، ذاکر، صابر اور محمد یاسین اور عاشق بھی جھگڑے میں شامل تھے۔ مار پیٹ کے دوران زاہد اور عاشق نے اشفاق کو پکڑ لیا اور صابر اور ذاکر نے اس پر حملہ کیا۔ اس بار بھی چاقو کا استعمال کیا گیا جس سے اشفاق شدید طور پر زخمی ہو کر لہولہان ہو گیا۔ اسے بھی جے پرکاش نرائن اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے مردہ قرار دے دیا گیا۔ حوض قاضی پولیس نے بلوہ کرنے، اقدام قتل، قتل اور اسلحہ ایکٹ کے تحت کیس درج کر لئے ہیں۔ مقامی پولیس نے محمد عامل کو گرفتار کر لیا ہے جب کہ بقیہ ملزموں کی بڑے پیمانے پر تلاش کی جا رہی ہے۔

(قومی آواز ۲۳ جون ۱۹۹۳)

یہ ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کی ایک مثال تھی۔ اب اس معاملہ میں پاکستان کے مسلمانوں

کی ایک مثال لیجئے۔ وہاں کی ایک مطبوعہ خبر یہ ہے:

لاہور، ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ ـــــ اسلام پورہ کے علاقہ میں چار مسلح افراد نے شادی کے موقع پر پکنے والی دیگوں کا دھواں اپنے گھر آنے کی پاداشس میں اندھا دھند فائرنگ کرکے اپنے ہمسایہ میں مقیم دولہا کے ۵۵ سالہ والد نذیر احمد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس سے شادی کی تقریب میں شریک ہنستا بستا گھرانہ ماتم کدہ بن گیا اور جہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ نذیر احمد کے بیٹے گلزار احمد کی شادی کے موقع پر اسلام پورہ میں ان کے گھر کے باہر دیگیں پکائی جا رہی تھیں جن کا دھواں ساتھ والے گھر میں جا رہا تھا جہاں رہائش پذیر عارف ڈوگر باہر آیا اور نذیر احمد سے کہا کہ یہ سلسلہ بند کرو کیوں کہ میرے اہل خانہ پریشان ہو رہے ہیں۔ اس بات پر دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ تاہم محلہ داروں نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ عارف ڈوگر چلا گیا لیکن دل میں رنجش رکھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں، جاوید اقبال اور ظفر اقبال ڈوگر وغیرہ کے ساتھ مسلح ہو کر آیا اور گھر کے باہر کھڑے نذیر احمد پر فائرنگ کر دی جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ اسے میو اسپتال لایا گیا جہاں وہ دم توڑ گیا۔ اسلام پورہ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔ (نوائے وقت، لاہور، ۲۷ اپریل ۱۹۹۳)

ایک معمولی بات پر اتنا بڑا جھگڑا کیسے پیدا ہوتا ہے کہ خون اور قتل اور پولیس اور عدالت تک معاملہ پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے، اور وہ تحمل اور برداشت کی کمی ہے۔ ایک مقام پر جب دو خاندان یا دو گروہ رہتے ہوں تو ضرور مسائل پیدا ہوں گے۔ کبھی نہ کبھی ضرور ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچ جائے گی۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ مگر اس مسئلہ کا حل مسئلہ سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ مسئلہ کو برداشت کرنا ہے۔

یہاں آدمی کے لئے جو چوائس ہے وہ بے مسئلہ زندگی اور بامسئلہ زندگی کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ بامسئلہ زندگی اور بربادی کے درمیان ہے۔ آدمی کی عقلمندی یہ ہے کہ وہ چھوٹے مسئلہ کو برداشت کرلے تاکہ وہ بڑے مسئلہ میں پھنسنے سے بچ جائے۔

ایک صحابی کا قول اس معاملہ میں ساری باتوں کا خلاصہ ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو چند نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ تم چھوٹی برائی کو برداشت کرو تاکہ تم بڑی برائی

سے اپنے آپ کو بچا سکو۔ انھوں نے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ	جو شخص نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہیں ہو گا
یرضی بالکثیر	اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہر انسان کو آزادی عطا کی ہے۔ ہم کسی سے اس کی آزادی کو چھین نہیں سکتے۔ اس لئے یہاں پر امن زندگی کے حصول کی عملی تدبیر صرف یہ ہے کہ ناخوش گوار معاملات میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس دنیا میں آپ اگر پانی کو برداشت نہ کریں تو خون کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ دھوئیں کو برداشت نہ کریں تو آگ کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ کڑوے بول کو برداشت نہ کریں تو جان و مال کی ہلاکت کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہی دنیا ہے اور یہ دنیا خود خدا کی تخلیقی اسکیم کے تحت بنی ہے۔ جو آدمی دنیا کے اس نقشہ پر راضی نہ ہو اس کو ایک اور کائنات تخلیق کرنی چاہئے۔ کیوں کہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں تو اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں۔

زندگی نام ہے برداشت کا۔ برداشت سے کام لینے والا اس دنیا میں زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ اور جو لوگ آپس کے تعلقات میں بے برداشت ہو جائیں، ان کے لئے اس دنیا میں نہ ترقی ہے اور نہ زندگی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نااہل رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں برداشت کی صفت کھو دی ہے۔ وہ ہر معاملہ کو بس جہاد اور ٹکراؤ کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی اشتعال انگیز بات ان کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہے۔ حالاں کہ اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہونے ہی کا نام انسانیت ہے اور یہی دین کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ جو جھگڑے ہوتے ہیں، اس سے بہت زیادہ تعداد ان جھگڑوں کی ہے جو مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہے ہیں۔ مسلم۔ مسلم جھگڑے اخباروں میں بہت کم چھپتے ہیں۔ جب کہ ہندو اور مسلم کے درمیان جھگڑا ہو تو وہ تمام اخبارات کے صفحہ اول پر چھپ جاتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ مسلمان اور مسلمان کا جھگڑا دو آدمی یا

دو خاندان تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، اس لئے وہ بڑی خبر نہیں بنتا۔ جب کہ ہندو اور مسلمان کا جھگڑا فوراً دو فرقوں کا جھگڑا بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ بڑی خبر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جن مسلم لیڈروں نے تقسیم ملک کی تحریک چلائی ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے برداشت کے مسئلہ کو بٹوارہ کا مسئلہ سمجھا۔ کسی ہندو اور کسی مسلمان میں کبھی کسی بات پر نزاع ہو گئی تو وہ فوراً دو قومی نظریہ کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان مسلم لیڈروں نے کہا کہ یہ جھگڑے اور دنگے اس لئے ہوتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو قوم ہیں، وہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ مگر جب ملک بٹ کر علیحدہ پاکستان بن گیا تو وہاں بھی جھگڑے اور فساد بدستور پوری شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ جھگڑے ہندو اور مسلمان کے درمیان ہوتے تھے، اب وہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہونے لگے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگ مل جل کر رہیں تو ان کے درمیان بار بار کچھ ناخوشگوار باتیں پیش آجاتی ہیں۔ ان باتوں کا حل علیحدگی نہیں ہے بلکہ برداشت اور نظرانداز کرنا ہے۔ اگر انھیں برداشت نہ کیا جائے تو تقسیم کے بعد جب مسلمان اپنا علیحدہ ملک یا علیحدہ پاکٹ بنا لیں گے تو اصل حالت میں اس کے سوا کوئی اور فرق نہ ہوگا کہ پہلے جو ٹکراؤ دو فرقوں کے افراد کے درمیان ہو رہا تھا وہ اب خود ایک فرقہ کے افراد کے درمیان ہونے لگے گا۔ آج یہی سب کچھ پاکستان میں بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے علیحدگی پسند لیڈروں نے مسلمانوں کو جو ذہن دیا تھا، بدقسمتی سے وہی ذہن آج بھی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد رہنما اسی سابقہ ذہن کے تحت مسلمانوں کو فکری رہنمائی دینے میں مشغول ہیں۔ تقسیم کا ناکام تجربہ بھی ان کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ سے پہلے تقسیم پسند لیڈروں نے جغرافی علیحدگی کو ہندو مسلم مسئلہ کا حل بتایا تھا۔ آج کے مقلد لیڈر بھی کسی نہ کسی طور پر اسی علیحدگی کے طریقہ کو اس ملک میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل بتا رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنا کلچرل تشخص الگ قائم کریں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ کر کے اپنا علیحدہ پاکٹ بنائیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان دفاع کے اصول پر

چل کر ہندوؤں کو سبق سکھائیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنا کر اپنا تحفظ کریں۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتیں سراسر نادانی کی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ۱۹۴۷ سے پہلے بھی یہی تھا کہ وہ مل جل کر رہنا سیکھیں۔ اور آج بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ حتی کہ مسلمان اپنا الگ ملک بنوالیں تو وہاں بھی مسئلہ کا حل مل جل کر رہنا ہی ہوگا۔ اور اگر وہ اس ملک میں جگہ جگہ اپنی آبادیاں علیحدہ کرلیں تو اس علیحدہ آبادی میں بھی یہی اصول اختیار کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ ایک برباد انسانی گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ اور کبھی ترقی نہ کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت عجیب حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمان جو اپنے وطن میں آپس میں بھی لڑتے ہیں اور اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے بھی لڑتے ہیں، یہی مسلمان جب عرب ملکوں میں یا یورپ اور امریکہ میں جاتے ہیں تو وہاں وہ خوب صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتی کہ ہمارے علماء بھی جو اپنے ملک میں ایک نہ ایک اشو لے کر جلسہ جلوس کے ہنگامے برپا کرتے ہیں ہیں۔ یہی لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں اختلافی معاملات میں وہ بالکل خاموش رہتے ہیں۔ حالاں کہ عرب ملکوں میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود ہیں جو برصغیر ہند میں پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عوام و خواص اگر اس دوعملی کو ختم کر دیں۔ وہ صرف اتنا کریں کہ عرب ملکوں میں اور یورپ اور امریکہ میں وہ جس طرح صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنے ملک میں بھی رہنے لگیں تو اچانک ان کا اپنا ملک بھی ان کے لئے اتنا ہی اچھا ہو جائے گا جتنا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک انھیں اچھا نظر آتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اصل اہمیت خارجی سہولت کی نہیں ہے بلکہ ذاتی شوق کی ہے۔ آدمی کے اندر ذاتی شوق ہو تو وہ مشکلوں میں بھی اپنا راستہ بنا لے گا۔ اور اگر ذاتی شوق نہ ہو تو سہولتوں کی فراوانی بھی ایسے آدمی کے لئے بے فائدہ ثابت ہوگی۔

لندن سے حال ہی میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ تقسیم ہند کے واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے مصنف مسٹر اینڈر ریو رابرٹس ہیں:

Andrew Roberts, Eminent Churchillians

اس کتاب میں ہندستان کے آخری برٹش وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے لکھا ہے کہ آزادی کی تاریخ ابتداءً یکم جولائی ۱۹۴۸ مقرر کی گئی تھی۔ مگر ماؤنٹ بیٹن نے اچانک تاریخ بدل کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کر دی۔ اس جلد بازی کا نتیجہ پنجاب کے علاقہ کا خونی فساد (اگست۔ اکتوبر ۴۷) تھا۔ کیوں کہ اس وقت پنجاب میں بہت کم فورس تھی۔ کتاب میں سر جارج کننگھم کا قول نقل کیا گیا ہے:

The Punjab disturbances were the direct result of Mountbatten's unwisdom in accelerating the date of partition so suddenly.

اس وقت پنجاب میں ۲۲ ہزار پولیس فورس موجود تھی جس کو اٹھارہ ہزار بستیوں میں چودہ ملین انسانوں کو کنٹرول کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناکافی تھا اور وقت کی کمی کے باعث مزید فورس منگائی نہ جا سکی۔ مگر یہ ناگزیر تھا۔ کیونکہ جنگ کے نتیجہ میں برطانیہ کے پاس فورس باقی نہیں رہی تھی۔

لندن سے نکلنے والے ماہنامہ صراط مستقیم (نمبر ۲ - ۱۹۹۴) میں ایک سرخی تھی: برطانوی مسلمان طلبہ کی مشکلات۔ اس کے تحت درج تھا کہ ہفت روزہ "کیو نیوز" کی ایک رپورٹ کے مطابق سلاؤ شہر میں اسکول کے ایک ۱۳ سالہ طالب علم فیض شریف کو مخلوط رقص کی کلاس میں شرکت سے انکار پر دو ماہ کے لئے کلاس سے خارج کر دیا گیا۔ اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے فیض شریف کو اسکول سے خارج کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسلمان مقامی کلچر سے ہم آہنگ ہونا نہیں چاہتے۔ صراط مستقیم نے لکھا تھا کہ اس خبر کا یہ روشن پہلو ہے کہ مغربی معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی ایسے خاندان ہیں جو اپنے بچوں کو اسلامی بنیادوں پر تربیت دے رہے ہیں۔ مگر دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسے مسلمان بچوں

کا تعلیمی مستقبل اس ملک میں تاریک دکھائی دے رہا ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا اندیشہ یہ ہے کہ ایسے بچے جب بڑے ہوں گے اور دیکھیں گے کہ ناقص تعلیم کی بنا پر وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہو گئے تو وہ نہ صرف اپنے سرپرستوں کو بلکہ شاید اسلام کو بھی اپنے پچھڑے پن کا ذمہ دار ٹھہرا کر کسی منفی رجحان میں مبتلا ہو جائیں۔

لندن سے ایک عربی مجلہ البیان شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ/اگست۔ ستمبر ۱۹۹۴ء) میں دکتور نفیس احمد کے قلم سے ایک مضمون ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ اس کی جذباتی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی گئی تھی: وا اسلاماہ، ردّة بین مسلمی الهند، فماذا نحن فاعلون؟

اس طرح کے مضامین اور بیانات ہر روز مسلمانوں کے عربی، انگریزی اور اردو اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں جن میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مظلومیت کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر آج تک کسی بھی مسلم اخبار یا رسالے میں ایسا کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا جس میں ہندوؤں کی اس شدید تر مظلومیت کا ذکر ہو کہ وہ شرک اور الحاد اور غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آنے والے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت اگر قومی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو ہندوؤں کی موجودہ حالت سے ہمارے اندر دعوتی خیر خواہی کا شدید جذبہ ابھرنا چاہئے۔ مگر میرے علم میں ایسے افراد اتنے کم ہیں کہ اگر ان پر الشاذ کالمعدوم کا حکم عائد کیا جائے تو یقیناً ایسا کرنا بے جا نہ ہوگا۔

برطانیہ میں مقیم ایک مسلمان سے گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے شکایت کے انداز میں کہا کہ آجکل برطانیہ کی مساجد کی تعمیر کے لئے پلاننگ کی اجازت (planning permission) حاصل کرنا سخت مشکل ہو گیا ہے۔ ان کی گفتگو کا تاثر بظاہر یہ تھا کہ برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ مگر جب میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ تمام تر انتظام کا معاملہ ہے نہ کہ تعصب کا معاملہ۔

پندرہ سال پہلے یہ حال تھا کہ مسجد کی تعمیر کی اجازت یا اس کا نقشہ نہایت آسانی سے منظور ہو جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو مشکلات پیدا ہوئی ہیں وہ حال کی پیداوار ہیں نہ یہ کہ وہ پہلے سے موجود رہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ برطانیہ کی مسجدوں میں نہایت لغو قسم کی سیاست داخل ہو گئی ہے۔

مثلاً حال ہی میں لیوٹن کی ایک مسجد میں دو مسلم گروپ آپس میں الجھ گئے اور زبردست مارپیٹ کی نوبت آگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والے جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہو گئے۔ اس طرح کے واقعات متعدد مسجدوں میں پیش آئے۔ اور ان سب کے پیچھے عہدے اور گدی کی سطی سیاست کے سوا اور کچھ نہیں۔

انگریزوں کا احساس یہ ہے کہ مسجدیں برٹش کلچر کی روایات کو بگاڑ رہی ہیں۔ جب کہ یہی شکایت ان کو ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے بارہ میں نہیں۔ وہ مسجدوں کو انتظامیہ کے لئے "پرابلم" کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ نئی مسجد کی تعمیر سے متوحش ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

برطانیہ ایک انتہائی روایت پسند قوم ہے۔ اس کا ایک اندازہ برطانی مکانات سے ہوتا ہے۔ یہاں کے مکانات عام طور پر اسی مخصوص طرز کے ہوتے ہیں جو سیکڑوں سال سے ان کے یہاں چلا آرہا ہے۔ ذیل کی تصویر سے اس کا اندازہ ہوگا۔

لندن کا فیسٹول ۷ اگست تک چلنے والا تھا۔ ہندستانی ہائی کمشنر ڈاکٹر سنگھوی نے کہا کہ ٦ اگست کو وہ اپنی رہائش گاہ پر ڈنر کر رہے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اس میں شرکت کروں۔ مسٹر نٹور سنگھ

کا خصوصی پیغام ملا کہ اس ڈنر کے موقع پر میرا موجود رہنا ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ مانچسٹر میں کچھ عرب نوجوان اکٹھا ہوئے تھے۔ ان نوجوانوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ مانچسٹر میں کچھ وقت گزاروں۔ چنانچہ فیسٹول کے منتظمین اور ڈاکٹر سنگھوی سے معذرت کرتے ہوئے ۵ اگست کی سہ پہر کو میں لندن سے مانچسٹر کے لئے روانہ ہوا۔

یہ سفر دو عرب نوجوانوں کے ساتھ انٹرسٹی (Intercity) کے ذریعہ طے ہوا۔ ڈھائی گھنٹہ میں ہم لوگ مانچسٹر پہنچ گئے۔ راستے میں مختلف قسم کے مناظر نگاہ کے سامنے سے گزرے۔ ان کو دیکھ کر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ اس کو میں نے عرب نوجوانوں سے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

من ھو المؤمن۔ المؤمن ھو الذی یری الجنۃ فی کل جمال ویری جھنم فی کل قبیح

(مومن کون ہے۔ مومن وہ ہے جو ہر حسن میں جنت کا مشاہدہ کرے اور ہر قبیح میں جہنم کو دیکھ لے)

مانچسٹر میں میرا قیام ایک عرب نوجوان کی رہائش گاہ پر تھا۔ وہ یہاں تعلیم کی غرض سے مقیم ہیں۔ یہیں پر مختلف عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھیں میں سے ایک طارق الکردی تھے۔ وہ آئرلینڈ (ڈبلن) میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آئرلینڈ اور انگلینڈ میں دعوت کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر یہاں کے مسلمانوں کو دعوت کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی اور اس سلسلہ میں کئی واقعات بھی بیان کئے۔ انھوں نے ڈبلن میں ایک چھوٹا سا دعوتی سنٹر بھی قائم کیا ہے۔

مانچسٹر سے ایک عربی ماہنامہ صوت الغرباء شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۳ھ (دسمبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کے نام کے نیچے یہ حدیث درج تھی: بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا کما بدأ۔ فطوبی للغرباء۔ اس میں واشنگٹن میں مقیم دکتور جعفر شیخ ادریس کا انٹرویو پڑھا۔ یہ المسلمون (۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲) سے لیا گیا تھا۔ انٹرویور نے پوچھا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اشتراکی خطرہ کے زوال کے بعد مغرب کو ایک نئے دشمن کی ضرورت ہے۔ اس لئے اب وہ اسلام کو اپنے دشمن کے طور پر پروجکٹ کر رہا ہے۔ دکتور ادریس نے کہا کہ یہ خیال درست نہیں (ان ھذا لیس صحیحاً) انھوں نے کہا کہ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں امریکہ میں رہتا ہوں۔ میں روزانہ دو یا تین امریکی اخبار پڑھتا ہوں۔ مگر میں ان میں اسلام یا مسلمانوں کے خلاف کوئی چیز نہیں پاتا (انی اقرأ

صحيفتين او ثلاث صحف يوميا فلا اجد فيها طعنا في الاسلام او المسلمين)

انھوں نے کہا کہ مغرب کی سیاست کسی مذہب کے ساتھ دشمنی پر قائم نہیں ہے بلکہ خود اپنی مصلحت (interest) پر قائم ہے (ان سياسة الغرب لا تقوم على التعصب بل تقوم على المصلحة) انھوں نے کہا کہ اہل مغرب اپنے مزاج کے تحت کھلے دل سے اسلام کا مطالعہ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر ان کے عقلی معیار کے مطابق اسلامی لٹریچر ہمارے یہاں موجود ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مغربی تہذیب کے متعلق ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ بالکل سطحی ہوتا ہے جس پر یہ لوگ ہنستے ہیں۔ ہم گہرائی کے ساتھ نہ ان کے بارہ میں لکھتے ہیں اور نہ اپنے بارہ ہیں۔ جب کہ ان میں بہت سے ارباب فہم ہیں جو کھلے ذہن کے ہیں۔ وہ ہم سے سننا چاہتے ہیں اور ہمارے بارہ میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ حتی کہ خود اپنے خلاف تنقید کو بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری کتابیں کسی بھی درجہ میں ان کے لئے چیلنج نہیں ہیں (ان ما نكتبه عن هٰذه الحضارة شئ سطحي يثير ضحك هٰؤلاء الناس وربما سخريتهم فنحن لا نكتب بعمق عنهم او عن انفسنا ابداً۔ مع ان كثيرا من مفكريهم ذوي عقل متفتح يريدون ان يسمعوا منا ويقرأوا لنا حتى في باب النقد لهم ان كتاباتنا بصراحة لا تمثل تحديا فكريا للغرب على اى مستوى (صفحہ ۱۳)

۶ اگست کا دن مانچسٹر میں عرب نوجوانوں کے ساتھ گزرا۔ اگلے دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد میں اپنے کمرہ میں دیر تک کچھ پڑھتا لکھتا رہا۔ جب بخوبی دن نکل آیا تو میں اس کمرہ میں گیا جس میں چند عرب نوجوان سو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ صبح کو سویرے نہ اٹھنا ہر روز اپنا کئی گھنٹہ ضائع کرنا ہے۔ اور وقت ایسی چیز ہے جس کو عربی مثل میں تلوار سے تشبیہ دی گئی ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ وقت تلوار کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو تو وہ تم کو کاٹ ڈالے گا (الوقت كالسيف ان لم تقطعه قطعك)

اگست ۱۹۹۴ کی ۶ تاریخ ہے اور ساڑھے بارہ بجے کا وقت۔ بادلوں کے درمیان ہلکی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ موسم نہایت خوشگوار ہے۔ میں دو عرب نوجوانوں کے ساتھ مانچسٹر کے الگزینڈرا پارک میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے کہا کہ انگریزوں نے دنیا میں وسیع ترین سلطنت قائم کی حتی کہ شاید مسلم سلطنت سے بھی زیادہ بڑی۔ مگر اس وسیع سلطنت میں کبھی کسی انگریز نے رو دولٹ نہیں کیا، جبکہ

مسلمانوں کی پوری تاریخ رو ولٹ سے بھری ہوئی ہے۔ خلیفۂ اول کے زمانہ میں یمنی قبائل نے مرکز سے رو ولٹ کیا جس کو ردّہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ساری تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ جس شخص کو جہاں موقع ملا اس نے مرکز سے بغاوت کر دی اور اپنی چھوٹی سی حکومت الگ بنا کر بیٹھ گیا۔ موجودہ زمانہ میں پاکستان میں یہی ہوا جب کہ بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔

انھوں نے پوچھا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ میں اس سبب کو بیان کر رہا تھا اور عرب نوجوان ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص گزرا جو بظاہر افریقی تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ کوئی اخباری انٹرویو ہے۔

کچھ دیر کے بعد دو سفید فام نوجوان آئے۔ وہ ۱۴۔۱۵ سال کی عمر کے ہوں گے۔ وہ کسی قدر جھومنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ ان کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ ہم لوگ بھوکے ہیں۔ کیا آپ ہمیں کچھ پیسہ دے سکتے ہیں:

I am not cheating, but we are a bit hungary. Can you give us some change?

ایک عرب نوجوان نے سوال کیا کہ ابھی یہاں آتے ہوئے میں اپنی گاڑی میں قرآن کی تلاوت سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ قرآن کے مطابق، انسان کو جب اختیار دیا جاتا ہے تو وہ فساد برپا کرتا ہے۔ پھر جو لوگ جنت میں جائیں گے کیا ان سے اختیار سلب کر لیا جائے گا تاکہ وہ وہاں فساد نہ کر سکیں۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ کون لوگ جنت میں جائیں گے۔ جنت میں وہ لوگ جائیں گے جنھوں نے اس دنیا میں یہ ثابت کیا کہ وہ فساد کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ خواہ انھیں مکمل آزادی دیدی جائے۔ پھر جن لوگوں نے اس وقت فساد نہیں کیا جب کہ خدا حالت غیب میں تھا، وہ اس وقت کیسے فساد کریں گے جب کہ خدا حالت شہود میں آجائے گا:

من هم الذين سيدخلون الجنة في الآخرة۔ الذين أثبتوا في هذه الدنيا أنهم سوف لن يستعملوا حريتهم للإفساد ولو كانت عندهم حرية كاملة فالذين هم لم يفسدوا بالغيب كيف سيفسدون في الشهادة۔

ایک اور عرب نوجوان نے سوال کیا کہ قرآن کی آیت اذا تمنی القی الشیطان فی امنیعہ (الحج ۵۲) کے حوالہ سے ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ رسول کے کلام میں کبھی کبھی شیطان اپنی بات ملا دیتا تھا۔ مفسرین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا رسول بھی شیطان کی مداخلت سے محفوظ نہ تھے۔ میں نے کہا کہ امنیۃ کا لفظ یہاں تلاوت کے معنی میں ہے۔ یعنی پیغمبر نے جب تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں ملا دیا۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے وہ تلاوت کے بارہ میں ہے۔ مگر لوگوں نے اس کو وحی (نص کلام) سے متعلق کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تو وہی بات نکلی تھی جو آپ پر وحی کی گئی ہے۔ مگر جب آپ اس کی تلاوت کرتے اور وہ لوگوں کے درمیان شائع ہو جاتی تو کچھ فتنہ پسند لوگ آپ کے کلام کی غلط تاویل کر کے اس کے بارہ میں الٹی باتیں مشہور کرنے کی کوشش کرتے۔ گویا کہ یہ الہامی ملاوٹ نہیں تھی بلکہ تفسیری ملاوٹ تھی۔

عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ ایک نومسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھ سے بہت سے گناہ ہو گئے ہیں۔ کیا میری مغفرت ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام پچھلے اعمال کو ختم کر دیتا ہے (الاسلام یھدم ما قبلہ) ایک طرف آپ نے یہ خبر دی ہے۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کو نیا کرتے رہو (جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ)

اس میں ہمارے لئے ایک تسلی ہے۔ جب ایمان سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ایمان کی تجدید کا موقع بھی ساری عمر تک ہے، تو ہم کو چاہئے کہ ہم بار بار کلمۂ شہادت ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ خدایا، تیرے رسول کی خبر کے مطابق، میں اپنے ایمان کی تجدید کر کے پھر سے اسلام میں داخل ہوتا ہوں، تو میرے پچھلے تمام گناہوں کو میرے نامۂ اعمال سے حذف کر دے۔

۱۹۹۳ میں نیویارک سے قرآن کا ایک نیا انگریزی ترجمہ چھپا ہے۔ اس کے مترجم ٹامس کلیری (Thomas Cleary) ہیں۔ اس کا ایک نسخہ میں نے مانچسٹر میں دیکھا۔ یہ نہایت معیاری انداز میں چھپا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ اس کے انٹروڈکشن میں مترجم لکھتے ہیں کہ قرآن بلا تردید عظیم اہمیت کی کتاب ہے۔ حتی کہ غیر مسلموں کے لئے بھی، شاید آج اس کی اہمیت ہمیشہ سے زیادہ ہے:

The Qur'an is undeniably a book of great importance even to the non-Muslim, perhaps more today than ever.

ان الفاظ میں مترجم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں غیر مسلموں میں قرآن کے مطالعہ کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، اس بنا پر اسلام کا مطالعہ بھی آج زیادہ سے زیادہ لوگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی غالباً اس تاریخی عمل کا ایک جزء ہے جس کو حدیث میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔

تاہم کسی غیر مسلم کا ترجمہ خواہ مترجم کتنا ہی سنجیدہ ہو، وہ غلطیوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اس ترجمہ میں فالذین هاجروا (آل عمران ۱۹۵) کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

and as for those who have fled. (p. 28)

الجزائر کی سالویشن پارٹی (جبهة الانقاذ) سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان سے مانچسٹر میں ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی پارٹی کو فس (FIS) کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنی حکومت کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کے لئے اپنے حکمراں کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم انتخابات میں جیت رہے تھے۔ مگر ان حکمرانوں نے انتخابات کو منسوخ کرکے زبردستی ملک میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ میں نے کہا کہ یہ تو لڑائی کے لئے وجہ جواز نہیں۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ تم اپنے حکمراں کی اطاعت کرو، خواہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑا مارے اور خواہ وہ تمہارا مال چھین لے (وإن جلد ظهرك وأخذ مالك) پھر انتخابات کی منسوخی تو اس سے بہت چھوٹی زیادتی ہے۔ کیوں کہ انتخابات کی منسوخی کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے آپ کو سیاسی اقتدار تک پہنچنے کا راستہ روک دیا۔ مگر آپ کی پیٹھ اور آپ کا مال تو پھر بھی محفوظ تھا۔

انھوں نے کہا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ الجزائر میں کس طرح ہم کو مار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو انصاف سے کام لینا چاہئے۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا۔ آپ کے حکمرانوں نے آپ کو مارنے کا سلسلہ اس وقت شروع کیا جب کہ آپ نے ان کے خلاف سیاسی لڑائی چھیڑ دی۔ اگر شریعت کے مطابق آپ ان سے ٹکراؤ چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کو سیاست کے سوا دوسرے تمام میدانوں میں عمل کے لئے آزاد چھوڑ دیں گے، جیسا کہ موجودہ

سیاسی ٹکراؤ سے پہلے وہ آپ کو آزاد چھوڑے ہوئے تھے۔

۷ اگست کو میں مانچسٹر میں تھا کہ ۱۰ بجے ایک عرب نوجوان (عادل الریانی) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ پرسٹن میں اپنی انگلش بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ کچھ دیر تک مجھ سے لپٹ کر روتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ یکم اگست ۱۹۹۴ کو وہ پرسٹن کی مسجد قوت الاسلام میں گئے۔ اس وقت وہ مقفل تھی۔ اس کے منتظم سے انھوں نے کہا تو اس نے مسجد کا تالا کھول دیا۔ عادل الریانی نماز پڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ انھوں نے دیکھا تو ایک سفید فام نوجوان (تقریباً ۳۰ سال) کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ معاف کیجئے، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں:

Excuse me, I want to become a Muslim.

عادل الریانی نے فوراً مسجد سے نکل کر ایک اور مسلمان کو بلایا اور پھر کلمہ پڑھا کر اس کو اسلام میں داخل کیا۔ اس کے بعد وہ بہت زیادہ خوش ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام عمران ہے:

Imran Maynard, 42 Healthfield Drive,
Brookfield, Preston. (Tel. 0772-651991)

مسلمان صدیوں سے اسلامی دعوت کو چھوڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی طلب پیدا کر دی۔ اب وہ خود اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ عرب جو کافی عرصہ سے انگلینڈ میں رہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ انگریز لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے امن پسند ہیں۔ ان کا مخمور آدمی بھی حد کے اندر رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے کتے بھی مؤدب ہوتے ہیں۔ وہ لڑائی کو پسند نہیں کرتے، وہ کسی بھی جارحیت والی چیز کو پسند نہیں کرتے (هم لا يحبون الحرب هم لا يحبون اى شئ عدوانى)

میں نے خود اپنے تجربہ میں بھی کئی ایسی چیزیں دیکھیں جس سے محسوس ہوا کہ کم از کم فکری اعتبار سے یہاں کا پسندیدہ کلچر امن کلچر ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے دین کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ لوگوں سے لڑ کر ساری دنیا میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، سراسر غیر حکیمانہ ہے۔ ایسا مذہب ان لوگوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس سے قطع نظر کہ اسلام کی یہ سیاسی تعبیر صحیح ہے یا غلط، یہ اس حدیث

کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا لوگوں کو خوش خبری دو، ان کو متنفر کرنے والی بات نہ کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے۔

اخوانی فکر کے ایک عرب نوجوان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابن تیمیہ کا قول ہے کہ اللہ ظالم حکومت کو قیام عطا نہیں کرتا خواہ وہ مسلم ہو، اللہ عادل حکومت کو قیام عطا کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو (ان اللہ لا یقیم الدولۃ الظالمۃ ولو کانت مؤمنۃ ویقیم الدولۃ العادلۃ ولو کانت کافرۃ)۔ میں نے کہا کہ اس قول کی روشنی میں آپ لوگوں کے سیاسی احتجاجات بالکل بے معنی ہیں۔ آپ ہر جگہ یہ شکایت کر رہے ہیں کہ فلاں لوگوں نے آپ کو سیاسی اقتدار سے محروم کر دیا۔ مگر قرآن کے مطابق اقتدار خدا کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ جب اس نے آپ کو اقتدار نہیں دیا تو اس کو اپنی کوتاہی پر محمول کرتے ہوئے آپ کو اپنی اصلاح میں لگ جانا چاہئے نہ کہ غیر ضروری طور پر آپ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔

ایک عرب نوجوان نے عبد اللہ فہد النفیسی کی ایک عربی کتاب دی۔ اس کا نام تھا: عندما یحکم الاسلام (صفحات ۱۶۲)۔ میں نے کہا کہ اس کتاب کا نام صحیح نہیں۔ وہ تعجب میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کتاب کا نام کیسے غیر صحیح ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام حکومت نہیں کرتا بلکہ انسان حکومت کرتا ہے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں بھی حکمراں حیثیت انسان کی ہوتی ہے۔ بنو امیہ کے دور میں اسلامی قانون جاری تھا۔ لیکن نظام جب یزید کے ہاتھ میں تھا تو آپ جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہوا۔ مگر نظام جب عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ میں آگیا تو وہی نظام کچھ اور نظام بن گیا۔ اس لئے اصل مسئلہ اسلام کو حاکم بنانے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حاکم کو اسلامی بنایا جائے۔ حاکم کو اسلامی بنانے کے بعد ہی کوئی اسلامی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

پاکستان سے ایک پندرہ روزہ المنبر نکلتا ہے۔ ایک پاکستانی بزرگ کے یہاں اس کا شمارہ ۱۱ جون ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں مولانا علی میاں کی ایک تقریر تھی جو انھوں نے اسلام آباد میں کی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا: "دو تین سال کا واقعہ ہے کہ میں بیروت گیا۔ میرے ایک دوست مجھے اپنی گاڑی پر بیروت کی سیر کرا رہے تھے۔ انھوں نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا کہ مولانا، ممالک اسلامیہ میں آج جو ذہنی، فکری اور سیاسی بے چینی اور کشمکش پائی جاتی ہے یہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں

پائی جاتی۔ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ ہی کیوں مخصوص ہے (صفحہ ۸) مولانا علی میاں اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔

عجیب بات ہے کہ یہی سوال اس سے پہلے میں نے ایک مغربی پروفیسر سے کیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ اس کے بعد بولا ـــــ اس فرق کا سبب شاید یہ ہے کہ ہم اختلاف کا استقبال کرتے ہیں جب کہ مسلم معاشرہ میں اختلاف کو امر ممنوع سمجھا جاتا ہے:

Perhaps the reason is that here we welcome dissent. Whereas in Muslim societies dissent is always seen as a taboo.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواب نہایت درست ہے۔ مغربی دنیا میں اختلاف اور تنقید کو صحت مندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ مسلم دنیا کا حال یہ ہے کہ ہر شخصیت، ہر ادارہ، ہر جماعت، ہر سیاسی نظام تقریباً بلا استثناء، تنقید و اختلاف کو ایک ناقابل برداشت برائی کا درجہ دئے ہوئے ہے۔ اب چوں کہ طبیعتوں کے تنوع کی بنا پر اختلاف رائے بالکل ناگزیر ہے، مغربی دنیا میں اختلاف پر کھلی آزادی ہونے کی وجہ سے لوگوں کے جذبات کو نکاس ملتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلم دنیا میں اختلاف پر روک کی وجہ سے مسلسل ذہنی خلفشار موجود رہتا ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

پاکستان کے مشہور اردو روزنامہ نوائے وقت (۲۴ اگست ۱۹۹۴) میں ایک "تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ" کے قلم سے مضمون چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا: وحدت ملی کے لئے ناسور فرقہ واریت۔ اس مضمون میں انھوں نے کہا تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے تحریک پاکستان کے زمانہ میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ: "اصل مسئلہ اقتصادی ہے، مذہبی نہیں ہے اور اس میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ مگر مسلمان قوم نے اس بیان کو پر کاہ کے برابر وقعت نہ دی اور پوری طرح قائد اعظم کا ساتھ دیا۔"

مگر پاکستان بننے کے بعد ملینوں لوگ پاکستان سے بھاگ کر یورپ اور امریکہ پہنچ گئے کیا اس کا محرک مذہبی تھا۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس کا واحد سبب اقتصادی تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے مقابلہ میں برطانیہ اور امریکہ میں ان کے لئے زیادہ بہتر کمائی کے مواقع ہیں، وہاں وہ زیادہ بہتر

مادی زندگی بنا سکتے ہیں۔ اس لئے جس پاکستانی کو موقع ملا وہ پہلی فرصت میں پاکستان سے بھاگ کر وہاں پہنچ گیا۔ کتنا بڑا فریب تھا جس میں لوگ ۱۹۴۷ سے پہلے مبتلا ہوئے، اور کتنا بڑا فریب ہے جس میں وہ اب تک مبتلا ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ برطانیہ کے ایک اسلامک سنٹر کے مدیر (ڈائرکٹر) ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس زمانہ میں دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اسلامی دنیا میں ان کی سازشوں اور ان کے فتنوں کے توڑ کے لئے دعوت سب سے زیادہ اہم ہے، خواہ مسلم ملکوں کا معاملہ ہو یا دوسرے ملکوں کا (الدعوة فی عصرنا هذا اهي من اوجب الواجبات لمواجهة اعداء الاسلام ودفع مؤامراتهم ومكائدهم وشرورهم عن ديار الاسلام سواء داخل ديار المسلمين اوخارجها)

میں نے کہا کہ آخری نتیجہ کے اعتبار سے یہ دعوت کا ایک پہلو ہو سکتا ہے۔ مگر داعی کے اپنے ذہن کے اعتبار سے یہ کوئی درست بات نہیں۔ دعوت دراصل محبت اور خیر خواہی کا عمل ہے۔ اگر آپ دوسری قوموں کو دشمن اسلام کے خانہ میں ڈال دیں تو آپ کبھی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ان کے اوپر دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔ دعوت کے لئے ماں کا جذبہ درکار ہے، اور ماں کبھی اپنے بیٹے کو دشمن کے روپ میں نہیں دیکھتی، خواہ بظاہر وہ سرکشی کا فعل کیوں نہ کر رہا ہو۔

مانچسٹر کالج، آکسفورڈ سے ایک جرنل نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے فیتھ اینڈ فریڈم۔ اس کے نمبر ۱۳۴ (۱۹۹۲) میں جارج کریسیڈیز (George Chryssides) کا ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا مذہبی آزادی (Religious Freedom)۔ اس مضمون میں روزنامہ گارجین (The Guardian) کے شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۱ کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

کچھ لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے کہ انگلینڈ جیسے بظاہر آزاد سماج میں سب کچھ ٹھیک ہے اور وہاں مذہبی آزادی محفوظ ہے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سی مثالوں میں سے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کچھ مہینہ پہلے ایک انجینئرنگ فرم کے مینیجنگ ڈائرکٹر نے راتھرہم (Rotherham) میں ایک اسٹاف کے لئے اشتہار دیا۔ اس اشتہار میں یہ شرط درج تھی کہ مسلمان اس کے لئے درخواست نہ بھیجیں:

no Muslims need apply.

ڈائرکٹر کا خیال تھا کہ مسلمان جارح اور جنگ پسند ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن میں مسلمان کی تصویر اس غضب ناک بھیڑ کو دیکھ کر بنی تھی جو حال کے مظاہروں میں سلمان رشدی کی کتاب دی سیٹنک ورسز کے نسخے سڑکوں پر جلا رہا تھا (صفحہ ۴۹)

۷ اگست کو مانچسٹر سے بذریعہ ٹرین روانگی ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر طے کرنے کے بعد برمنگھم پہنچا۔ ایک عرب نوجوان میرے ساتھ تھے۔ ان سے پورے راستہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سوال کرتے اور میں جواب دیتا۔ اس کو وہ ساتھ ہی ساتھ ٹیپ پر ریکارڈ کرتے رہے۔

برمنگھم ریلوے اسٹیشن پر جناب شمشاد خاں صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ان کی رہائش گاہ پہنچا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔ شمشاد خاں صاحب کو قرآن کے مطالعہ کا بہت ذوق ہے۔ آج شام کا وقت زیادہ تر قرآن کے بارہ میں مذاکرہ میں گزرا۔ انھوں نے بتایا کہ عبد اللہ یوسف علی کا جو ترجمہ ملینوں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیلا ہے، اس کے تفسیری نوٹ میں غالباً اختصار کے خیال سے کئی چیزیں نکال دی گئی ہیں۔ مگر اختصار کی اس کوشش میں بہت سی نہایت اہم چیزیں بھی حذف ہو گئیں۔ مثلاً سورہ فاتحہ کی کمنٹری میں انھوں نے ایک بڑی قیمتی چیز لکھی تھی جو مروجہ نسخوں میں موجود نہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کیوں ایسا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو الفاظ ہیں وہ اس طرح ہیں جس طرح ہم اپنی زبان سے ان کو ادا کریں۔ یعنی وہ بندہ کی زبان میں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ جب ہم معرفت کے درجہ کو پہنچتے ہیں تو یہ الفاظ بے ساختہ طور پر ہمارے اندر سے نکلنے لگتے ہیں:

When we reach enlightenment, they flow spontaneously from us. (p. 14)

کمنٹری کا یہ جزء ایمانی کیفیت سے بھرا ہوا ہے لیکن مروجہ نسخہ میں اس کو نکال دیا گیا ہے۔

عبد اللہ یوسف علی صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن کا جو دیباچہ (Preface) ۱۹۳۴ کے اڈیشن میں شامل کیا تھا، اس کے آغاز میں انھوں نے لکھا تھا کہ قرآن کی تبلیغ ایک ایسا کام ہے جس میں ہر مرد و عورت بلکہ بچے بھی اپنی استعداد (capacity) کے مطابق حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ بات بے حد اہم ہے۔ اس کی ایک عملی مثال مجھے برمنگھم کے اس سفر میں معلوم ہوئی۔

شمشاد خاں صاحب کی چھوٹی صاحبزادی امینہ یہاں ایک اسکول میں پڑھتی ہیں۔ ایک روز ان

کی عیسائی ٹیچر نے بائبل کے مطابق بتایا کہ خدا نے چھ دن میں دنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔ امینہ نے ہاتھ اٹھایا۔ خاتون ٹیچر نے کہا کہ تم کو کچھ کہنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ٹیچر نے کہا کہ کہو: امینہ نے کہا کہ آپ کہتی ہیں کہ خدا نے آرام کیا۔ مگر میرے والدین نے تو مجھ کو بتایا ہے کہ خدا کو آرام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی:

My parents say that God Almighty does not need any rest.

ٹیچر لڑکی کی اس بات سے متاثر ہوئی۔ اس نے کہا کہ اچھا تم اسلامی لٹریچر لا کر ہمیں دو، ہم اس کو پڑھیں گے۔ اس کے بعد امینہ نے انھیں اسلامی کتابیں پہنچانا شروع کر دیا۔ امینہ کے بھائی اسد میاں نے دیکھا کہ بہن اسلام کی تبلیغ کر رہی ہے تو انھوں نے بھی اپنی کلاس میں اسی طرح کی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۸ اگست کی صبح کو چار بجے نیند کھل گئی۔ فجر کی نماز یہاں ۵ بجے تھی۔ شمشاد خاں صاحب اور ان کے صاحبزادہ اسد میاں کے ساتھ سنٹرل مسجد گیا اور وہاں فجر کی نماز ادا کی۔ مسجد کافی بڑی ہے۔ پہلی صف میں آدھی صف کے بقدر نمازی موجود تھے۔ راستہ میں شمشاد خاں صاحب نے کئی قصے بتائے۔

احمد دیدات صاحب اکثر انگلینڈ آتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر حاضر جوابی کی صفت بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ایک بار ایک عیسائی مبلغ سے ان کا ڈیبیٹ تھا۔ عیسائی نے کہا کہ آپ ایک افریقی ہیں۔ مگر آپ امریکہ کے جس شہر میں چاہیں جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مکہ کیوں نہیں جا سکتے۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر ملک میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ آپ ایک مقرر فارم پر کرتے ہیں۔ پھر آپ کو ویزا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ اس ملک میں داخل ہوتے ہیں، اسی طرح مکہ میں داخل ہونے کی بھی ایک سادہ سی شرط ہے۔ آپ کہئے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور پھر آپ جب چاہیں مکہ کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔

پھر عیسائی نے کہا کہ آپ امریکہ میں آئے ہیں۔ یہاں ہم اور آپ ایک جگہ بیٹھ کر ڈیبیٹ کر رہے ہیں۔ اسی طرح مکہ میں دو مذہبوں کے درمیان ڈیبیٹ کیوں نہیں ہو سکتا۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ یہ بھی بہت آسان بات ہے۔ آج ہم سٹلائٹ کے دور میں جی رہے ہیں۔ آج ڈیبیٹر کو سفر کر کے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج سٹلائٹ کے ذریعہ ہر جگہ اس قسم کے مشترک

ڈیبیٹ کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ایک سعودی شیخ نے احمد دیدات صاحب کے اس پروگرام کو ویڈیو پر دیکھا۔ اس جواب پر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے انھیں دو ملین ڈالر دے دیے۔

مغربی دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ٹی وی ہے۔ تقریباً سبھی لوگ اس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر تقریباً سبھی لوگ عملاً اس کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کا اثر بچوں پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ یہاں ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اس مسئلہ کا نہایت عمدہ حل نکال لیا ہے۔ پہلے ان کے گھر میں ٹی وی دیکھا جاتا تھا۔ اب انھوں نے اینٹینا نکال کر اس کا استعمال اپنے گھر کے اندر بالکل بند کر دیا ہے۔ جہاں تک خبروں کا تعلق ہے، وہ ان کو ریڈیو پر سن لیتے ہیں۔ بقیہ پروگرام کے لئے انھوں نے ایک صاحب کے ذریعہ یہ انتظام کیا ہے کہ ہر ہفتہ وہ چیک کر کے دیکھ لیا کریں کہ اس ہفتہ میں کون کون اسلامی پروگرام آرہا ہے یا کون سا مفید پروگرام ہے۔ ایسے پروگرام کو وہ ویڈیو پر ریکارڈ کر کے انھیں دے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کو وی سی آر پر دیکھ سکیں۔ اس طرح چوائس انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب وہ اور ان کے بچے ٹی وی پر آنے والے سارے پروگرام نہیں دیکھتے۔ وہ صرف وہی پروگرام دیکھتے ہیں جن کو وہ خود دیکھنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ مسلمان کے صاحبزادہ مسٹر اسد علی سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم کو کمی کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب ایسا احساس نہیں ہوتا۔ اب ہمارا تمام وقت تعلیم کی مصروفیات میں گزر جاتا ہے۔ سارا معاملہ یوز ٹو (Use to) ہونے کا ہے۔ آپ جس چیز کے عادی ہو جائیں وہی آپ کو ٹھیک معلوم ہونے لگے گا۔

برمنگھم کے اخبار ایوننگ میل (۲۰ جولائی ۱۹۹۴) میں ایک اشتہار تھا کہ دس ہزار پونڈ کی ایک کار جیتو (win a car) اس عنوان کے تحت جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ——— اپنے خواب کو پورا کرنے کا ایک موقع :

A chance to make dream come true.

یہ لاٹری کی قسم کا ایک معاملہ تھا۔ اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ اس سے بھی زیادہ بڑا موقع انسان کو یہ ملا ہے کہ وہ دنیا کی مختصر زندگی میں عمل صالح کا ثبوت دے اور آخرت کی ابدی کامیابی کا مستحق بنے۔ کار کا خواب بہت چھوٹا خواب ہے اور جنت کا خواب اس کے مقابلہ میں بہت بڑا خواب۔

قاہرہ کے اخبار ایجپشین گزٹ (The Egyptian Gazette) کے ایڈیٹر انچیف ایم علی ابراہیم (Tel. 2831040) نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان اور عالم اسلام کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان میں ڈیموکریسی ہے اور مکمل آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ یہاں مختلف اسلامی ادارے، بشمول اسلامی مرکز، آزادانہ طور پر اسلامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۲ نئی دہلی کے ہندی اخبار جے وی جی ٹائمس کے نمائندہ مسٹر شاہد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسجد کے امام کے بارہ میں شرعی احکام کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات بتائی گئیں۔

۳ ایجنسی فرانس پریس (A.F.P.) کے نمائندہ مسٹر ابھیک چندا نے ۲۳ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی سماجی اور تعلیمی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کوئی سیاسی پارٹی مسلمانوں کے مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان اپنی کمیوں کو دور کریں۔ یہ تفصیلی انٹرویو ٹیلیفون پر ریکارڈ کیا گیا۔

پرکھ ٹی وی ٹیم نے ۲۵ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اسلام میں عورتوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ مسلم سماج میں عورتوں کو جو مسائل پیش آرہے ہیں، ان کا سبب اسلام کا قانون نہیں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی مسلم عورتیں تعلیم میں پچھڑ گئی ہیں۔ موجودہ تمام مسائل اسی پچھڑے پن کے نتائج ہیں۔

انگریزی روزنامہ پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۶ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اپریل ۔ مئی ۱۹۹۶ کے الکشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس الکشن میں کسی ایک پارٹی کو مطلق اکثریت

نہیں مل سکتی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ملیشیا کے انداز کی مخلوط حکومت یہاں بنائی جائے۔

۶ سری شکل دھام (دہلی ۸) کے تحت ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ کو سرو دھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذہب کی حقیقت پر ایک تقریر کی۔

۷ جین مہا سبھا کی طرف سے فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں دلائی لاما بھی شریک تھے۔ اس کا موضوع تھا نان وائیلنس اور ٹالرنس۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۸ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس کے نمائندہ مسٹر پارسا وینکٹیشور نے ۸ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ آئندہ الکشن (نئی دہلی ۱۹۹۶) میں مسلمانوں کا ووٹنگ پیٹرن کیا ہوگا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر پولٹیکل شعور کی شدید کمی ہے، اس لئے بظاہر امید نہیں کہ وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکیں گے۔

۹ دہلی کے انگریزی ماہنامہ ڈپلومیٹک ایرا (Diplomatic Era) کے اڈیٹر مسٹر جے پرکاش نے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر الرسالہ مشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی سے ایک عرصہ تک اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو ایک قسم کی پرابلم کمیونٹی سمجھتے رہے۔ اسی طرح مسلمان ہندوؤں کو اپنے لئے پرابلم پڑوسی سمجھتے رہے۔ مگر اب دونوں اس وہم سے نکل آئے ہیں۔ اس فکری تبدیلی نے دونوں کے لئے ترقی کے نئے مواقع کھول دئے ہیں۔

۱۰ ہندی اخبار جن ستا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کمار ندر نے ۱۳ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آئندہ الکشن (اپریل۔مئی ۱۹۹۶) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ منفی ووٹ دینے کا طریقہ ختم کریں اور مثبت فیصلہ کے تحت اپنی رائے دینے کا حق استعمال کریں۔

۱۱ صدر اسلامی مرکز نے ۱۱۔۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو سردھنہ (میرٹھ) کا سفر کیا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ جین ٹی وی کی ٹیم (زیر قیادت مسٹر دھریندر ترپاٹھی) نے ۱۹ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ آنے والے الکشن میں مسلم ووٹر کا رجحان کیا ہوگا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اب مسلمان اپنے نام نہاد لیڈروں سے اتنا زیادہ بیزار ہو چکے ہیں کہ وہ ان کی کوئی بات سننے والے نہیں۔

۱۳ انگریزی اخبار ایشین ایج کی نمائندہ شیلا ریڈی نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اندازہ ہے کہ اس بار کے الکشن (اپریل۔ مئی ۱۹۹۶) میں مسلم ووٹر کسی کے کہنے سے کسی پارٹی کو ووٹ نہیں دے گا، وہ خود اپنی رائے کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

۱۴ نئی دہلی کے ہندی اخبار جے وی جی ٹائمس کے نمائندہ مسٹر شاہد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسجد کے امام کے بارہ میں شرعی احکام کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات بتائی گئیں۔

۱۵ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندے مسٹر پربھا گپتا اور ان کے ساتھی نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ مایوسی کی سوچ چھوڑ دیں اور مواقع کو استعمال کرکے بڑی بڑی ترقیاں حاصل کریں۔

۱ وشو اہمسا سماج کی طرف سے ۲۱ اپریل ۱۹۹۶ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع آفاقی انسان کی تیاری میں تعلیم کا رول تھا:

Role of education in creation of universal man

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تعلیم سے تنگ نظری ختم ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم آفاقی انسان بنانے میں مدد دیتی ہے۔

اُردو

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہور اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعہ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوار حکمت	–
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	25/-
عقلیات اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعدد ازدواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرتِ رسول	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam The Voice of Human Nature	30/-
Islam Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-

آڈیو کیسٹ	Rs
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسول	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۸

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ
امتِ وسط	۴	غیر اسلامی فعل	۱۲
صبر و تقویٰ	۵	باشعور افراد	۱۳
کامیابی کی شرط	۶	اتحاد کی شرط	۱۵
توبہ کا کرشمہ	۷	عزیمت کیا ہے	۱۷
تیار ذہن	۸	بھائی اور بہن	۱۹
فیصلہ کیجئے	۹	ایک اقتباس	۲۲
کامل تباہی	۱۰	سفرنامہ برطانیہ — ۴	۲۳
منصوبۂ تخلیق	۱۱	خبرنامہ اسلامی مرکز — ۱۱۵	۴۷

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel.4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

امت وسط

قرآن میں امت محمدی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنا دیا تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو (البقرہ ۱۴۳)

وسط کے معنی بیچ کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان ہو (وسط الشیئ مابین طرفیہ مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے کہ قبضتُ وسَطَ الحبْل (میں نے رسّی کے بیچ میں پکڑا) یا جلستُ وسطَ القوم (میں لوگوں کے درمیان میں بیٹھا) اموی حاکم حجاج بن یوسف نے کوفہ اور بصرہ کے بیچ میں ایک شہر بسایا تھا۔ اسی لیے اس کو واسط کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسا مقام تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع تھا (سموہ واسطا لانہ مکان وسَطٌ بین البصرۃ والکوفۃ) لسان العرب ۷/۴۲۶-۴۳۲

الطبری نے نقل کیا ہے کہ وسط سے مراد وہ چیز ہے جو دو کناروں کے بیچ میں ہو (الذی ھو بین الطرفین) ابن زید نے کہا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری قوموں کے درمیان ہے (ھم وسَط بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبین الامم) تفسیر طبری ۲/۶-۸

یہ آیت کوئی فضیلت یا اعزاز کی آیت نہیں ہے۔ وہ امت مسلمہ کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد یہ امت رسول اور ہم اپنی ہم عصر قوموں کے درمیان ہے۔ اس کو رسول سے لے کر دوسری قوموں تک پہنچانا ہے۔ دعوتی عمل میں اس کو درمیانی ذریعہ کا کردار ادا کرنا ہے۔

یہ ایک بے حد نازک کام ہے۔ کیوں کہ یہ گویا اہل عالم کے سامنے خدا کے رسول کی نمائندگی ہے۔ ایک طرف امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پہنچانے کا یہ کام ضرور کرے۔ اگر اس نے نہیں پہنچایا تو یہ اس کے حق میں ایک ناقابل معافی کوتاہی ہوگی۔ دوسری طرف اس کام میں انتہائی احتیاط برتنا ہے۔ یعنی دوسروں تک عین وہی بات پہنچانا ہے جو رسول کی بات ہے، اس میں کسی بھی قسم کا انحراف اس کے لیے جائز نہیں۔

امت محمدی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کو دین دار بنائے۔ اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ درمیانی کردار ادا کرتے ہوئے دوسروں کو دین کی دعوت دے۔

صبر و تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے (الذاریات ۴۹) یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا نتیجہ ظاہر نہیں کر سکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اسی کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلاتا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریق ثانی اگر "دوسرا ہاتھ" بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہل اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ :

وإن تصبروا و تتقوا لا يضركم كيدهم شيئا إن الله بما يعملون محيط (آل عمران ۱۲۰)	اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ——— دشمن کی سازش صرف ۵۰ فی صد کی حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ ۵۰ فی صد حصہ پورا کر دے۔ صبر و تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

کامیابی کی شرط

ایک شخص رات کے وقت سیڑھی سے نیچے اتر رہا تھا۔ اگرچہ وہ ایک بینا آدمی تھا۔ مگر سیڑھی پر روشنی نہ تھی۔ سیڑھی کا ایک زینہ کسی قدر ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ اس کو نہ دیکھنے کی وجہ سے اس پر ٹھیک سے اپنا قدم نہ جما سکا۔ اور پھسل کر گر گیا۔

دوسرا شخص سڑک پر چل رہا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ مگر چلنے والا اندھا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے مین ہول کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ وہ اندھا ہونے کی وجہ سے اس کو نہ دیکھ سکا۔ اور اس کا پاؤں گڑھے میں چلا گیا۔

اس دنیا میں راستہ طے کرنے کے لیے بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے —— آنکھ اور روشنی۔ اگر آنکھ ہو مگر روشنی نہ ہو، یا روشنی ہو مگر آنکھ نہ ہو، دونوں صورتوں میں انجام ایک ہوگا۔ آدمی گڑھے میں گر کر تباہ ہو جائے گا۔ وہ محفوظ طور پر اپنا راستہ طے نہیں کر سکتا۔

یہی معاملہ پوری انسانی زندگی کا ہے۔ زندگی میں کامیابی کے لیے بھی وہی اصول ہے جو مذکورہ دونوں واقعہ میں نظر آتا ہے۔ یعنی بیک وقت بینائی اور روشنی دونوں چیزوں کا حامل ہونا۔

ایک قوم ہے۔ اس کے افراد اللہ کا دیا ہوا دماغ رکھتے ہیں، مگر ان کے پاس علم نہیں، ایسی حالت میں گویا کہ ان کے پاس آنکھ ہے مگر روشنی نہیں۔ ایسے لوگ آنکھ رکھتے ہوئے بھی زندگی کے راستوں میں بھٹکتے رہیں گے۔

اسی طرح ایک قوم ہے۔ اس کے افراد تعلیم یافتہ ہیں، مگر ان کا ذہن بگڑا ہوا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں نفرت اور جھنجلاہٹ کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے پاس روشنی ہے مگر وہ آنکھ سے محروم ہے۔ یہ لوگ بھی کامیابی کے ساتھ زندگی کا راستہ طے نہیں کر سکتے۔ کسی نہ کسی موڑ پر وہ ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔

کسی قوم کی ترقی کے معاملہ میں یہی جڑ کی بات ہے۔ جو لوگ قوم کو اٹھانا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ یہاں محنت کریں، کسی اور میدان میں تقریریں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

توبہ کا کرشمہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــــ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (الفرقان ۷۰)

سیئات کا حسنات بن جانا کوئی پُراسرار واقعہ نہیں، یہ ایک معلوم نفسیاتی حقیقت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو، اس سے جب برائی کا کوئی فعل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر نہایت شدت کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ اس کی روح آخری حد تک تڑپ اٹھتی ہے۔ اس طرح اس کی برائی اس کے لیے بھلائی کا محرک بن جاتی ہے۔ ماضی کی غلطی کو نہ دہرانے کا احساس اس کے مستقبل کو شاندار طور پر درست کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی معاملہ کی ایک نہایت واضح مثال حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔

۹۳ھ میں عمر بن عبد العزیز اموی حکومت کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ان کو دمشق سے خلیفہ الولید کی یہ تحریری ہدایت ملی کہ خُبیب بن عبد اللہ بن الزبیر کو پچاس کوڑے مارو اور سخت جاڑے کے موسم میں ان کے سر پر ٹھنڈا پانی بہاؤ اور ان کو مسجد کے دروازہ پر کھڑا کر دو۔ عمر بن عبد العزیز نے اس حکم پر عمل کیا۔ اسی دن خُبیب کا انتقال ہو گیا۔ خبیب کی موت کے بعد عمر بن عبد العزیز کو خوف خدا کا شدید احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ اپنے کو غیر مامون سمجھنے لگے۔ ان کا حال یہ ہو گیا کہ اگر ان کو ان کے کسی کار خیر پر آخرت کے انعام کی بشارت دی جاتی تو وہ کہہ اٹھتے کہ کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے جب کہ خبیب میرے راستہ میں ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ کہتے کہ ایسا تو جب ہو گا جب کہ خبیب میرے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ پھر وہ اس عورت کی طرح چیخ پڑتے جس کا بچہ گم ہو گیا ہو۔ جب ان کی تعریف کی جاتی تو وہ کہتے کہ اگر میں خبیب سے بچ گیا تو میں بھلائی پر ہوں۔ اس واقعہ کے بعد وہ آخر عمر تک غم اور خوف میں مبتلا رہے۔ انھوں نے عبادت اور گریہ و زاری کی انتہا کر دی۔ (البدایہ والنھایہ ۹/۸۷)

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ ان کی طرف سے ایک لغزش تھی۔ مگر اس کے سبب سے ان کو بہت بھلائی ملی۔ یعنی عبادت اور گریہ و زاری اور غم اور خوف اور احسان اور عدل اور صدقہ اور نیکی اور غلاموں کو آزاد کرنا، وغیرہ۔

تیار ذہن

پاسچر (Louis Pasteur) دورجدید کا ایک ممتاز سائنس داں ہے۔ وہ ۱۸۲۲ء میں
رانس میں پیدا ہوا، اور ۱۸۹۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ علمی تیاری پر بہت زور دیتا تھا۔
س نے کہا کہ خوش قسمتی صرف ایک تیار ذہن کے حصہ میں آتی ہے :

Fortune favours a prepared mind.

اس قول میں ایک فطری حقیقت بیان کی گئی ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور دنیا کے ہر معاملہ سے ہے۔ سائنس کے میدان میں جس آدمی نے بھی کوئی ڈسکوری (دریافت) کی ہے، وہ وہی شخص ہے جو وسیع مطالعہ اور لمبے تجربہ کے نتیجہ میں اس قابل ہو چکا تھا مذکورہ دریافت کی علامتیں جب ظاہر ہوں تو وہ فوراً اس کو پہچان لے اور اس پر مزید تحقیق کرکے اس کو ایک مکمل فارمولا کی حیثیت دے سکے۔

اسی طرح معاشی ترقی کے میدان میں کوئی بڑی کامیابی اسی آدمی کو حاصل ہوتی ہے جو پہلے سے اس کے لیے ضروری تیاری کر چکا ہو۔ معاشی ترقی کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ مگر اس سے فائدہ وہی شخص اٹھاتا ہے جو پہلے سے اس معاملہ کی پوری معلومات رکھتا ہو اور پیش آمدہ موقع کو استعمال کرنے کی ضروری صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کر چکا ہو۔

ٹھیک یہی معاملہ دینی معرفت کا بھی ہے۔ خدا کی طرف سے ہر آن حکمت و معرفت کی بارش ہو رہی ہے مگر اس میں حصہ صرف اسی شخص کو ملتا ہے جو اپنے سینہ میں اس کا برتن فراہم کر چکا ہو۔

کائنات میں خدا کی تجلیات بکھری ہوئی ہیں مگر ان تجلیات کا مشاہدہ صرف وہ شخص کرپاتا ہے جو پہلے سے اپنے اندر تدبر و تفکر کا مزاج بنا چکا ہو۔ دنیا عبرتوں اور نصیحتوں سے بھر دی گئی ہے مگر کسی چیز سے عبرت اور نصیحت کا رزق لینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر توسم (الحجر ۷۵) کی صلاحیت پیدا کر چکا ہو۔ مناظر فطرت میں ہر طرف خدا کی عظمتیں نمایاں ہیں مگر ان عظمتوں کو محسوس کرکے تڑپ اٹھنا صرف اس انسان کے لیے مقدر ہے جو اپنی بڑائی کے ہر احساس سے اپنے ذہن کو خالی کر چکا ہو۔ یہی معاملہ ان تمام تجربات کا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

فیصلہ کیجئے

نٹشے (F.W. Nietzche) ایک مشہور جرمن فلسفی ہے۔ وہ ۱۸۴۴ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۰۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنا ایک احساس اس طرح تحریر کیا ہے ـــــــ گہری تہہ پر ہر آدمی خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ ایک انوکھی شخصیت ہے، وہ صرف ایک بار اس دنیا میں آیا ہے۔ اور کسی بھی غیر معمولی اتفاق کی بنا پر اس کے جیسا معجزاتی قسم کا متنوع انسان یہاں آنے کا دوسرا موقع نہیں پا سکتا:

At bottom every man knows well enough that he is a unique being, only once on this earth; and by no extraordinary chance will such a marvelously picturesque piece of diversity in unity as he is, ever be put together a second time. (*The book of Success*, p. 33)

انسان کتنا زیادہ قیمتی وجود ہے۔ مگر اس وقت وہ انتہائی بے قیمت معلوم ہونے لگتا ہے جب کہ یہ دیکھا جائے کہ انسان پیدا ہونے کے بعد صرف تھوڑی مدت کے لیے زمین پر ٹھہرتا ہے اور اس کے بعد اس طرح یہاں سے چلا جاتا ہے کہ پھر وہ دوبارہ اس زمین پر واپس نہیں آتا۔

یہ فلسفیانہ نقطۂ نظر ہے۔ مگر اس معاملہ کو جب مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ساری تصویر بدل جاتی ہے۔ اب انسان کے لیے یہ دروازہ کھل جاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ اپنے آپ کو بہتر انسان ثابت کرے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ اگلی دنیا میں شاندار تر انداز میں اپنے لیے ابدی زندگی حاصل کرے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر میں انسان کے لیے مایوسی اور تاریکی ہے۔ اس کے برعکس مذہبی نقطۂ نظر میں انسان کے لیے امید اور روشنی ہے۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر درست ہے، اور فلسفیانہ نقطۂ نظر صرف بے بنیاد قیاس آرائی۔

انسان بلاشبہہ حیرت ناک حد تک ایک قیمتی وجود ہے۔ مگر بیشتر انسان اپنی قیمتی صلاحیتوں کو وقتی تماشوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر پاتے۔ انسان مقام اعلیٰ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو مقام اسفل میں گرا لیتا ہے۔

کامل تباہی

ریمنڈ گرام سونگ (Raymond Gram Swing) کا ایک قول ہے۔ اس نے کہا کہ امن کا بدل جنگ نہیں ہے، امن کا بدل ہلاکت ہے:

The alternative to peace is not war.
It is annihilation.

یہ بات پچھلے زمانوں میں بھی صحیح تھی، مگر آج تو وہ آخری حد تک درست اور صحیح ہو چکی ہے۔ جدید ہتھیاروں نے اب اس کو بالکل ناممکن بنا دیا ہے کہ جنگ کے ذریعہ کوئی شخص یا قوم کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرے۔ اب جو لوگ جنگ کا انتخاب کریں انھیں پیشگی طور پر جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے لیے صرف موت کا انتخاب کر رہے ہیں نہ کہ زندگی اور ترقی کا۔

اگر آپ کسی مسئلہ سے دوچار ہیں تو صبر اور تحمل کے ساتھ اس کے ساتھ نباہ کیجئے اور جو بھی کوشش کیجئے لازمی طور پر امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے کیجئے۔ اس کے بجائے اگر آپ نے جنگ اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا تو آپ اپنے مسئلہ کو ختم کرنے میں کامیاب تو نہیں ہوں گے البتہ اپنے آپ کو مزید ناقابل حل مسائل اور ناقابل تلافی ہلاکت میں مبتلا کر لیں گے۔

مسئلہ آپ کے خیال کے مطابق، خواہ کتنا ہی گمبھیر ہو، آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ آپ کے لیے انتخاب صرف دو چیزوں میں ہے۔ یا تو صورت موجودہ کو گوارا کرتے ہوئے پرامن دائرہ میں اپنی کوشش جاری کیجئے، یا لڑ بھڑ کر اپنے کو ہلاک کر لیجئے۔ اس کے سوا دوسری کوئی ممکن صورت سرے سے آپ کے لیے موجود ہی نہیں۔

قدیم زمانہ میں جنگ کسی مسئلہ کو حل کرنے کا وسیلہ ہو سکتی تھی، مگر موجودہ زمانہ میں جنگ خود سب سے بڑا مسئلہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے۔ موجودہ زمانہ کی جنگ جو عمومی تباہی لاتی ہے وہ تمام تباہیوں سے زیادہ بڑی تباہی ہے۔ اس لیے اب آدمی کو صرف دو میں سے ایک کام کرنا ہے۔ یا تو وہ پرامن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی کوشش انجام دے، یا پھر خاموشی کا طریقہ اختیار کرلے۔

منصوبۂ تخلیق

قرآن گویا خدا کے تخلیقی منصوبہ کا اعلان ہے۔ قرآن کے ذریعہ خالق نے تمام انسانوں کو بتایا ہے کہ وہ کس خاص منصوبہ کے تحت زمین پر پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فکر و عمل کا وہ کون سا طریقہ ہے جس کو انھیں اپنی کامیابی کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ یہ منصوبہ قرآن میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک آیت یہ ہے: اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ عزیز و غفور ہے (الملک ۲)

قرآن کے اس بیان کے مطابق، تخلیق کا کلیدی نکتہ ابتلاء (امتحان) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت اعلیٰ اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ یہ جنت ابدی راحت اور ابدی سرفرازی کی جگہ ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی اس جنت میں داخلہ کا ایک امتحانی مرحلہ ہے۔ جو آدمی یہاں کا مقرر امتحان پاس کرلے اس کے لیے موت کے بعد ابدی جنتوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

یہ امتحان کس بات کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیب میں رہتے ہوئے آدمی اپنے خدا کو پہچانے اور اپنے دل و دماغ میں اس کو سب سے اونچی جگہ دے۔ وہ اپنے قول و عمل پر خود اپنے فیصلہ سے خدا کی لگام لگائے۔ بظاہر بااختیار رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں بے اختیار بنالے۔ وہ خدا کی اس تقسیم پر راضی ہو جائے کہ موجودہ دنیا اس کے لیے ذمہ داریاں ادا کرنے کی جگہ ہے، اور آخرت کی دنیا حقوق اور انعام حاصل کرنے کی جگہ۔

جنت میں داخلہ کا ٹکٹ اس انسان کو دیا جائے گا جو جنت کو دیکھے بغیر جنت کی معرفت حاصل کرلے۔ وہ آخرت کی نعمتوں کی خاطر دنیا کی نعمتوں سے بے رغبت ہو جائے۔ وہ آزادی رکھتے ہوئے اپنے آپ کو پابند بنالے۔ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کو دبائے اور اپنی ضمیر کی آواز کو اپنا رہنما بنائے۔ وہ بے اصولی کی زندگی کو چھوڑ کر ایک بااصول انسان جیسی زندگی اختیار کرے۔

جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں ان کے لیے خدا کے ابدی انعامات ہیں۔ اور جو لوگ اس میں پورے نہ اتریں ان کے لیے خدا کے یہاں نہ رحمت ہے اور نہ انعام۔

غیر اسلامی فعل

اصول فقہ کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے جس کو ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے : دَرْءُ المفسدۃ مقَدَّمٌ علی جلبِ المصلحۃ ۔ یعنی خرابی کو دور کرنا بہتری کے حصول پر مقدم ہے۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ مصلحت کے حصول کے لئے کی جانے والی ایک کارروائی اپنے عملی نتیجہ کے اعتبار سے خرابی میں اضافہ کا سبب بن جاتی ہے۔ مذکورہ شرعی اصول اسی نقصان سے بچنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، ایسے حالات میں مصلحت کو حاصل کرنے کے لئے اقدام نہ کرنا ہی سب سے بڑی شرعی مصلحت ہوتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں جس طرح اہل حق کو مواقع حاصل ہیں اسی طرح اہل باطل کو بھی یہاں مواقع حاصل ہیں۔ یہ مواقع خود خدا کی طرف سے دئے گئے ہیں۔ اس لئے کسی بھی شخص یا گروہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے مخالفین سے عمل کے مواقع چھین لے۔

ایسی حالت میں فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ جب آپ کوئی اقدام کریں تو صرف یہ نہ دیکھیں کہ آپ جو اقدام کرنے جا رہے ہیں وہ بظاہر ایک صحیح اقدام ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ لازمی طور پر اس کا بھی جائزہ لیں کہ جب آپ اپنا اقدام کریں گے تو دوسرے لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ اگر حالات بتاتے ہوں کہ دوسرے لوگ اس پوزیشن میں ہیں کہ آپ کے اقدام کو آپ کے اوپر الٹ دیں اور آپ کو مزید مشکلات سے دوچار کریں، تو ایسی حالت میں اقدام کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اقدام نہ کیا جائے۔

مثال کے طور پر سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے قتل کا جو فتویٰ دیا گیا، اس کے نتیجہ میں وہ لوگ قتل تو نہیں ہوئے۔ البتہ معاندین نے اس کو استعمال کر کے ساری دنیا میں اسلام کو بدنام کر دیا۔ بابری مسجد کے لئے جو دھواں دھار تحریک چلائی گئی وہ مسجد کو بچانے کا ذریعہ تو نہیں بنی البتہ مسلمانوں کی عزت اور جان و مال کی تباہی کا سبب بن گئی۔ وغیرہ۔ اسلامی اقدام وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو، جو حالات کو بہتر بنائے۔ اس کے برعکس جو اقدام بے نتیجہ ہو، اور حالات کو مزید ابتر کرنے کا ذریعہ بن جائے، وہ اسلامی عمل نہیں ہے۔ وہ نادانی کی اچھل کود ہے جس کا خدا اور رسول سے کوئی تعلق نہیں، خواہ بظاہر اس کو اسلام کے نام پر کیا گیا ہو۔

باشعور افراد

عبداللہ بن اُبی قدیم مدینہ کا سب سے بڑا سردار تھا۔ حتی کہ مدینہ کے باشندے اِس پر متفق ہوگئے تھے کہ اُس کو اپنا بادشاہ بنالیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آگئے تو آپ ہی کو مدینہ کے لوگوں نے بڑا مان لیا۔ مدینہ میں ابتداءً مہاجرین اقلیت میں تھے۔ مگر مختلف مقامات سے لوگ ہجرت کرکے آتے رہے، یہاں تک کہ مدینہ میں مہاجرین کی اکثریت ہوگئی اور انصار اقلیت میں ہوگئے جن کا عبداللہ بن ابی سردار چلا آرہا تھا (تفسیر ابن کثیر ۴/۳۷۰)

ان باتوں کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین سے سخت بغض ہوگیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو اور مہاجرین کو مطعون کرتا اور انھیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں عبداللہ بن اُبی اپنے قبیلہ کے بہت سے لوگوں کے ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک واقعہ سے فائدہ اٹھاکر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے خلاف دشنام طرازی کی۔ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہم لوگ مدینہ کے عزت والے لوگ ہیں۔ اگر ہم مدینہ پہنچ جائیں تو ہم لوگ اپنے شہر سے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے (المنافقون ۸)

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ قافلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہوا جو راوی کے الفاظ میں یہ تھا :

ان ابنہ عبداللہ وقف لابیہ عبداللہ بن ابی بن سلول عند مضیق المدینۃ فقال قِف فواللہ لاتدخلھا حتی یأذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک۔ فلما جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استأذنہ فی ذلک فاذن لہ	اس کے لڑکے عبداللہؓ اپنے باپ عبداللہ بن اُبی بن سلول کے لیے مدینہ کے دروازہ پر کھڑے ہوگئے۔ عبداللہ بن اُبی وہاں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ٹھہرو، خدا کی قسم تم شہر میں داخل نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دے دیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو عبداللہ بن اُبی نے آپ سے اجازت مانگی۔ آپ

فارسلہ حتی دخل المدینۃ نے اس کو اجازت دے دی۔ اس کے بعد عبداللہ نے اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مدینہ میں داخل ہو گیا۔ (البدایہ والنہایہ ۴/۱۵۸)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام اتنے دانش مند لوگ تھے کہ وہ بتائے بغیر باتوں کو جان لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ انھوں نے بطور خود یہ جان لیا کہ اس موقع پر انھیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ اس وقت موزوں ترین بات یہ تھی کہ عبداللہ بن ابی کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ ہو جائے کہ اب مدینہ کے بڑے تم نہیں ہو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بڑے اور مدینہ کے سردار ہیں۔

حضرت عبداللہ نے اس بات کے مظاہرہ کا انتہائی بروقت اور صحیح طریقہ اختیار کیا۔ اس کام کو کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ عبداللہ بن ابی کا بیٹا اسے انجام دے۔ حضرت عبداللہ نے اس حقیقت کو سمجھا اور عین وقت پر وہ مطلوبہ کردار ادا کیا جو اس موقع پر انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔

کسی مشن کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کو باشعور افراد کی ایک ٹیم مل جائے، اس طرح کی باصلاحیت ٹیم کے بغیر کوئی بھی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس ٹیم کے افراد میں دو صفت لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد اطاعت گزار ہو۔ اس سے جو کچھ کہا جائے وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کرے۔ وہ کسی عذر کو عذر نہ بنائے، خواہ وہ ذاتی عذر ہو یا خارجی عذر۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس ٹیم کے افراد اتنے باشعور ہوں کہ وہ کہے بغیر باتوں کو جان لیں۔ وہ بتائے بغیر صورت حال کو سمجھ لیں۔

اس دوسری صفت کی اہمیت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں بہت سی باتیں بتائی نہیں جا سکتیں۔ جب مشن پھیلتا ہے اور نئے نئے تقاضے سامنے آتے ہیں تو یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ لوگوں کو ساری ضروری باتیں بتا دی جائیں۔ ایسے وقت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی عقل سے باتوں کی گہرائی کو سمجھے، وہ خود ہر موقع پر اس کے موافق ضروری اقدام کر سکے۔ کوئی بھی دوسری چیز اس شعوری پختگی کا بدل نہیں بن سکتی۔

اتحاد کی شرط

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اجتماعیت ٹوٹ گئی اور لوگوں میں کثرت سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت ایک شخص نے حضرت علی سے پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا معاملہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں لوگ اختلافات میں پڑ گئے ہیں، جب کہ ابو بکر وعمر کے زمانہ میں یہ اختلافات نہ تھے۔ حضرت علی نے جواب دیا: لان ابابکر و عمر کانا والیین علی مثلی و انا الیوم والٍ علیٰ مثلک (یعنی اس کا سبب یہ ہے کہ ابو بکر وعمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں تھے، اور میں تمہارے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں ہوں۔

ابن خلدون نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دینی حکومت کے قیام کے لئے اس کے مطابق دینی رجحان (الوازع الدینی) کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر معاشرہ کی سطح پر غالب دینی رجحان موجود نہ ہو تو محض حاکم کے اسلامی ہونے سے کامیاب اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ حضرت علی کے اس جواب میں آپ کا اشارہ اسی دینی محرک اور رجحان کی طرف تھا۔ المامون کو دیکھو۔ جب اس نے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق کو اپنا ولی عہد نامزد کیا اور ان کو الرضا کا لقب دیا تو کس طرح عباسیوں نے اس پر شدید ناگواری ظاہر کی۔ انھوں نے ان کی بیعت کو توڑ کر المامون کے چچا ابراہیم بن المہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور اس کے رد عمل میں ایسا اختلاف پیدا ہوا اور بغاوت پر آمادہ شورش پسند گروہوں کی ایسی کثرت ہو گئی کہ قریب تھا کہ پورا حکومتی نظام کالعدم ہو جائے۔ یہاں تک کہ المامون پیش قدمی کر کے خراسان سے بغداد پہنچا اور علی الرضا کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے اپنے خاندانی شخص کو ولی عہد نامزد کیا۔

ابن خلدون نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ خلفاء راشدین ایسے زمانہ میں تھے جب کہ ملوکیت کا مزاج ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور معاشرہ پر دینی محرک اور رجحان کا غلبہ تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے اندرونی محرک کے تحت صرف ایسے ہی فرد کو خلافت کی ذمہ داری سونپی جو دینی اعتبار سے قابل قبول تھا اور اس کو دوسرے کے اوپر ترجیح دی۔ اس کے علاوہ

دوسرے افراد جن کی نگاہیں خلافت کی طرف اٹھ رہی تھیں انھیں ان کے اپنے رجحان اور محرک کے حوالہ کر دیا۔

تاہم اس کے بعد حضرت معاویہ کے زمانہ سے عصبیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اقتدار پر اسی مزاج کا تسلط ہو گیا۔ دینی رجحان کمزور پڑ گیا۔ اس کی جگہ ملوکیت اور گروہی رجحان کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا۔ چنانچہ اگر ایسے شخص کو اقتدار سونپا جائے جو گروہی عصبیت کے اعتبار سے ناقابل قبول ہو تو اس کو رد کر دیا جاتا، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حکومت انتشار کا شکار ہو جاتی اور جماعت میں اختلاف پڑ جاتا۔ جیسا کہ بعد کے زمانہ میں پیش آیا۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۲۱۱)

دور اول کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ملت میں اتحاد کس طرح آتا ہے، اور کن اسباب سے وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ ہے، ابن خلدون کے الفاظ میں، وازع دینی کا ہونا یا نہ ہونا۔ گویا اتحاد کبھی اتحاد کی اپیلیں کرنے سے نہیں آتا، بلکہ اس وقت آتا ہے جب کہ پورے معاشرہ میں اس کے موافق غالب دینی رجحان موجود ہو۔

اتحاد ملت کا کام دراصل اصلاح ملت سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معاشرہ میں دینی فضا پیدا کی جائے۔ لوگوں کو اس اعتبار سے باشعور بنایا جائے کہ تمھیں آخرت میں اپنے قول و عمل کا حساب اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔ لوگوں میں گہری آخرت پسندی پیدا کی جائے تاکہ وہ آخرت کے فائدے کے لئے دنیوی نقصان کو برداشت کر سکیں۔ لوگوں کو اسلام کے بارہ میں اس حد تک ایجوکیٹ کیا جائے کہ جب خدا اور رسول کا حکم سامنے آجائے تو وہ اپنی گردن جھکا دیں، خواہ وہ ان کے ذوق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں یہ مزاج ہو کہ اللہ کی خاطر وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو جائیں۔

کسی گروہ میں اتحاد پیدا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اتحاد ہمیشہ زیر اتحاد افراد کی قربانیوں سے قائم ہوتا ہے۔ رائے کی قربانی، مفادات کی قربانی، اپنے کو پیچھے کر لینے کی قربانی، اپنے اختلاف کو ختم کرنے کی قربانی۔ الفاظ رکھتے ہوئے چپ ہو جانے کی قربانی۔ اس لئے پہلے ذہن بنایا جاتا ہے، اس کے بعد اتحاد قائم ہوتا ہے۔

عزیمت کیا ہے

عزیمت کے لفظی معنی پختہ ارادہ کے ہیں۔ اللیث لغوی نے کہا: العزم ما عقد علیہ قلبک من امر انک فاعلہ (لسان العرب ۱۲/ ۳۹۹) عزیمت مومن صادق کی پہچان ہے۔ یہ اہل حق کی ایک نہایت اہم خصوصیت ہے۔ قرآن میں اللہ کے پیغمبروں کو اولوا العزم (الاحقاف ۳۵) کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں عزیمت کو جنگ اور ٹکراؤ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جنگی کارنامہ دکھانے والے شخص کو صاحب عزیمت سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس نظریہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن میں صبر اور تقویٰ اور عفو درگزر کی روش پر قائم ہونے کو عزیمت کہا گیا ہے (آل عمران ۱۸۶، الشوریٰ ۴۳) حدیث میں ہے کہ اے اللہ، میں تجھ سے رشد پر عزیمت کی دعا کرتا ہوں (واسئالك عزيمة الرشد)

پچھلی چند صدیوں سے مسلسل جس چیز سے اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے، وہ یہی عزیمت کا غلط تصور ہے۔ مسلمان صدیوں سے انتہائی بے فائدہ قسم کے ٹکراؤ میں مشغول ہیں۔ اس تباہ کن روش کو اسلامی عزیمت قرار دے کر اس کو خوب گلوریفائی کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ حال ہو چکا ہے کہ جو آدمی اقتدار وقت سے ٹکراؤ کرے وہ فوراً قوم کے اندر ہیرو بن جاتا ہے۔ اور جو آدمی صبر اور اعراض کی روش اختیار کرنے کی تلقین کرے وہ اس کے برعکس زیرو کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس غیر اسلامی اور غیر عقلی روش نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو بے حساب نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تمام تباہیاں جن کو ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ دشمنان اسلام کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہے، وہ سب کی سب بلاشبہ اسی غلط تصور اسلام کا نتیجہ ہیں۔

۱۔ اس غلط روش کا یہ اندوہناک نتیجہ ہوا کہ دور جدید کی مسلم نسلوں میں اسلامی تفکیر کا نشوونما بالکل رک گیا۔ تفکیر صحیح ہمیشہ مبنی بر حقیقت سوچ سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر عزیمت کے مذکورہ بالا تصور نے اسلامی فکر کو حقیقت سے منقطع کر دیا۔ حقیقت الگ ہو گئی اور اسلامی سوچ الگ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکیدی ہدایت حدیث کی کتابوں میں موجود ہے کہ حکمرانوں میں خواہ بگاڑ آ جائے مگر تم ان سے ٹکراؤ نہ کرنا۔ حکومتی بگاڑ سے براہ راست تعرض کیے بغیر تم دوسرے تعمیری اور اصلاحی شعبوں میں اپنی کوششیں جاری رکھنا۔ چنانچہ ان واضح ہدایات کی بنا پر علماء اسلام

نے اس پر اتفاق کر لیا کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، خواہ وہ بظاہر فاسق اور ظالم کیوں نہ ہو گئے ہوں۔

اس واضح اسلامی اصول کے باوجود مسلمانوں کا رہنما طبقہ صدیوں سے حکومتوں سے ٹکراؤ کرنے میں مصروف ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے عمل کی توجیہہ کرتا ہے۔ ان بنا پر ان مسلمانوں کے لیے اپنے عمل کی توجیہہ کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ حقیقی دلائل کے ساتھ اپنے عمل کو جائز ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لیے ایک ہی ممکن راستہ تھا۔ اور وہ غلط استدلال تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پوری تفکیر غلط استدلال پر قائم کر دی۔

موجودہ زمانہ میں جو بے فائدہ جنگی کارروائیاں کی گئیں، ان سب کے لیے عزیمت کے لفظ سے جواز فراہم کیا گیا ہے۔ مگر یہ ایک غلط انتساب تھا، اسی لیے امت کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ملا۔ اس نے صرف امت کی تباہی میں اضافہ کیا۔ اس کے برعکس اگر عزیمت کو صابرانہ عزیمت کے مفہوم میں لیا جاتا تو اس کا زبردست فائدہ مسلمانوں کو حاصل ہوتا۔ جیسا کہ دور اول میں اسی قسم کی عزیمت کے ذریعہ اہل اسلام کو حاصل ہوا تھا۔

اگر لوگوں میں صابرانہ عزیمت کا مزاج ہوتا تو وہ نقصان اٹھانے کے باوجود منفی نفسیات میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے استحکام نو کی تدبیر کرتے۔ وہ مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرتے۔ وہ غیر ضروری طور پر وقار کی جنگ چھیڑنے کے بجائے حکمت کی روش اختیار کرتے۔ وہ سیاسی محرومی کو برداشت کرتے ہوئے جدید علوم کے شعبوں میں دستگاہ حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو لگا دیتے۔

جنگی عزیمت انھیں صرف تباہی کی طرف لے گئی۔ صابرانہ عزیمت انھیں ترقی اور استحکام کی طرف لے جاتی۔ اگر سچی عزیمت کی یہ پالیسی اختیار کی جاتی تو پہلی ہی نسل میں وہ فائدہ مل جاتا جو کئی نسلوں کی قربانی کے باوجود ابھی تک ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔

بھائی اور بہن

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں زمین پر پھیلا دیں۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور خبردار رہو قرابت والوں سے، بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ (النساء ۱)

قرآن کی اس آیت میں اس حیاتیاتی حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے الگ مخلوق نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک ہی مادہ سے بنائے گئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے خونی بھائی اور خونی بہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ہی وسیع تر انسانی برادری کے ارکان ہیں۔ حیاتیات کے اعتبار سے جو عورت ہے وہی مرد ہے، اور جو مرد ہے وہی عورت ہے۔

تمام انسان، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، پیدائش کے اعتبار سے ایک ہیں۔ آخر کار ایک ہی عورت اور ایک ہی مرد سب کے ماں اور باپ ہیں جن کو حوا اور آدم کہا جاتا ہے۔

اس حقیقت کا فطری تقاضا ہے کہ ہر مرد دوسرے مرد کو اپنا بھائی سمجھے، ہر عورت دوسری عورت کے ساتھ بہن کا سا معاملہ کرے۔ تمام مرد اور تمام عورتیں اپنے اپنے دائرہ میں ایک مشترک گھرانے کے افراد کی طرح مل جل کر رہیں۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کریں۔

پھر اس وسیع انسانی برادری میں جو براہ راست رحمی رشتے ہیں ان میں نسلی اتحاد کا یہ پہلو اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ اس لئے قریبی رحمی رشتوں میں حسن سلوک کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ جو آدمی قریبی رشتوں میں اچھا سلوک نہ کرے وہ دور کے رشتوں میں بھی اچھا سلوک نہیں کر سکے گا۔

مردوں اور عورتوں کے درمیان اس باہمی حسن سلوک کی اہمیت صرف اخلاقی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کا خود اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ کیوں کہ تمام عورتوں اور مردوں کے اوپر

عظیم و برتر خدا ہے۔ وہ آخر میں ہر ایک سے حساب لینے والا ہے۔ ہر ایک دنیا میں جیسا عمل کرے گا اسی کے مطابق آخرت میں اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس لئے ہر عورت اور ہر مرد کو چاہئے کہ کسی سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو وہ محض ایک انسان کا معاملہ نہ سمجھے بلکہ اس کو اللہ کا معاملہ سمجھے۔ وہ اللہ کی پکڑ سے ڈرے اور قول و عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس روش کا پابند بنائے جو اس کو اللہ کے یہاں کامیابی دینے والی ہو۔

قرآن زمین کے اوپر ایک وسیع انسانی سماج بنانا چاہتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں ہر طرف انسانی برابری کی فضا ہو، ہر طرف انسانی خیر خواہی کا ماحول ہو۔ اور وہ فضا اور ماحول ختم ہو جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو شک اور نفرت اور رقابت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

جب لوگوں کے ذہن سے یہ حقیقت نکل جاتی ہے تو انسانی دنیا جنگل کی مانند ہو جاتی ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ہر ایک یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دوسری عورت یا دوسرا مرد میرے راستہ کی رکاوٹ ہے۔ اس لئے مجھے اس کو اپنے راستہ سے ہٹانا ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا نہیں سمجھتا بلکہ وہ دوسروں کو غیر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سوچ جب زیادہ بڑھ جائے تو دنیا امن کے بجائے بدامنی کا گہوارہ بن جاتی ہے، یہاں پیار کے چشمے بہنا رک جاتے ہیں۔ اس کے بجائے نفرت کی گرم ہوائیں ہر طرف چلنے لگتی ہیں۔

قرآن چاہتا ہے کہ تمام عورتوں اور مردوں کو ان کی اصل حقیقت یاد دلائی جائے۔ ہر ایک کے اندر یہ ذہنی بیداری لائی جائے کہ وہ اپنی اصل سے آگاہ ہو کر اپنی سوچ کو اس کے مطابق بنالیں۔ لوگ آج بھی اسی طرح بھائی اور بہن کی طرح مل جل کر رہنے لگیں جس طرح وہ زندگی کے آغاز میں رہ رہے تھے۔

یہ ذہن جب لوگوں میں نہ رہے تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے کی ترقی پر آپ کو جلن ہوگی، کیوں کہ دوسرے کو آپ نے اپنا نہیں سمجھا بلکہ غیر سمجھا۔ دوسرا آگے بڑھے تو آپ چاہیں گے کہ اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈال کر اس کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ ایک عورت گھر کے اندر یہ چاہے گی کہ وہی ہر چیز کی مالک بن جائے اور دوسروں کے قبضہ میں کچھ نہ رہنے دے۔ حالاں کہ اگر وہ گھر کے دوسرے ارکان کو اپنا سمجھے تو اس قسم کا احساس اس کے اندر نہیں پیدا

ہو سکتا۔ کیوں کہ ایسی حالت میں وہ اپنی چیز کو دوسروں کی چیز سمجھے گی، اور دوسروں کی چیز بھی اس کو اپنی نظر آئے گی۔

سب کو اپنا جانیے اور اپنے کو سب کا سمجھئے، یہی اچھا گھر بنانے کا سب سے آسان طریقہ ہے اور یہی کسی سماج کو اچھا سماج بنانے کا طریقہ بھی۔

حدیث میں آیا ہے کہ اِن العبادَ کلهم اِخوۃ (ابو داؤد) یعنی خدا کے تمام بندے آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ عالمی اخوت کا یہ تصور اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ظاہری طور پر انسانوں میں بہت سے فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ کا فرق، صورت کا فرق، قد کا فرق، اسی طرح جنس اور نسل کا فرق، وغیرہ۔ ان فروق کی بنا پر قدیم زمانہ میں طرح طرح کے تفریقی نظریے بنا لئے گئے۔ کسی نے برتر نسل اور کمتر نسل کا نظریہ بنایا۔ کسی نے انسانیت کو حاکم طبقہ اور محکوم طبقہ میں بانٹا۔ اس طرح ایک اور دوسرے کے درمیان مختلف قسم کی تفریقیں وجود میں آگئیں۔

مگر اسلام نے ان تمام تفریقی دیواروں کو گرا دیا۔ اس نے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا۔ خواہ وہ ایک رنگ کے ہوں یا دوسرے رنگ کے۔ خواہ وہ ایک طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے طبقہ سے۔ خواہ وہ مرد کی جنس سے ہوں یا عورت کی جنس سے۔

اسلام نے صرف نظریاتی اعلان نہیں کیا۔ بلکہ اسی اصول مساوات کی بنیاد پر ایک پورا سماج عملی طور پر قائم کر دیا۔ تاکہ ہر دور کے انسانوں کے لئے وہ نمونہ کا کام دے۔ قیامت تک کے تمام لوگ اس سے مساوات انسانی کا نظریاتی سبق بھی لیں، اور اسی کے ساتھ اس کے عملی نمونہ کو دیکھ کر اس کے قابل عمل ہونے کا یقین بھی حاصل کریں۔

ایک اقتباس

سعودی عرب کے مشہور اخبار المسلمون میں ایک بڑے سعودی عالم کے حوالہ سے ایک سوال وجواب چھپا ہے۔ یہ سوال وجواب اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

اهل السنة يشترطون للخروج على الحاكم قدرة التغيير دون إحداث ضرر، ولكن هناك فريقا في هذه الايام يرى ان هذا المنهج متخاذل ولا يصلح لهذا العصر ما رايك؟

-هذا من كلام الشيطان.. الذين يقولون ان التغيير لاتشترط معه القدرة فهم ليسوا متخاذلين فحسب، بل لقد املاهم الشيطان اقوالا ويريدون ان يؤمن بها الناس، وعموما لا يوجد شيء اسمه ثورة اسلامية الا اذا كان هناك ما يسمى "كباريه شرعي". الاسلام نصيحة وليس انقلابا. (المسلمون (جدة) — ٢٨ ابريل ١٩٩٥م)

ترجمہ

س: حاکم وقت کے خلاف خروج کے سلسلہ میں اہل سنت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نقصان برپا کیے بغیر تبدیلی لانے کی قدرت کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن آج کل ایک فریق کا خیال ہے کہ یہ بے ہمتی کا طریقہ ہے اور موجودہ زمانہ کے لائق نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔

ج: یہ ایک شیطانی بات ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تبدیلی کے لیے اس کی قدرت کی شرط نہیں ہے وہ خود نہ صرف بے ہمت ہیں، بلکہ شیطان نے ان کے ذہنوں میں کچھ باتیں ڈال دی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ بھی ان پر ایمان لے آئیں۔ دنیا میں ایسی کسی چیز کا مطلق وجود نہیں جس کا نام اسلامی انقلاب ہو الّا یہ کہ یہاں کوئی ایسی چیز پائی جائے جو "شرعی کیبرے" کے نام سے موسوم ہو۔ اسلام نصیحت ہے نہ کہ کوئی انقلاب۔

"اسلام نصیحت ہے نہ کہ انقلاب" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام انقلاب نہیں ہے، وہ صرف نصیحت ہی نصیحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی عمل کا آغاز نصیحت وتلقین سے ہوتا ہے نہ کہ انقلابی اکھیڑ پچھاڑ سے۔ نصیحت کے ذریعہ پہلے افراد کے ذہن کو بدلا جاتا ہے۔ ان کے اندر آمادگی پیدا کی جاتی ہے۔ جب یہ کام بڑے پیمانہ پر ہو چکا ہو، اس کے بعد فطری طور پر وہ وقت آجاتا ہے کہ وہ اجتماعی نتیجہ رونما ہو جس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔

برمنگھم کے ایک اسٹور میں داخل ہوا۔ یہ فیرفیکس روڈ پر واقع ہے۔ اس میں ہر قسم کی گھریلو چیزیں برائے فروخت موجود تھیں۔ اس اسٹور کا نام تھا ڈومیسٹکس (Domestiks) مذکورہ قسم کے اسٹور کے لئے یہ نام بہت موزوں معلوم ہوا۔ میں نے سوچا کہ ڈومیسٹکس جیسا ایک لفظی نام اردو میں بناؤں۔ مگر کوئی مناسب لفظ سمجھ میں نہ آیا۔ اسی طرح یہاں چوکر سمیت گیہوں کا بسکٹ بنایا جاتا ہے جو کھانے میں بہت ہلکا اور مفید ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے (Whole Wheat biscuit) اس کو بھی میں نے اردو میں کہنا چاہا۔ مگر کوئی لفظ میں وضع نہ کر سکا۔ اردو میں شاعرانہ ترکیبیں بنانا آسان ہے، مگر سائنٹفک ترکیبیں بنانا بہت مشکل ہے۔

۸ اگست کو کارڈف (cardiff) میں پروگرام تھا۔ شام کو چار بجے برمنگھم سے کارڈف کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ بذریعہ کار دو گھنٹہ کا سفر تھا جو ویلس (Wales) کے علاقہ سے گزرا۔ یہ یہاں کا بہت خوبصورت علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف سبز پوش پہاڑیاں اور ہرے بھرے میدان دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ مگر سر میں چکر کی کیفیت کی وجہ سے میں کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا اور راستہ کے ان خوبصورت مناظر کو دیکھ نہ سکا۔ دنیا میں آدمی کو اگر تمام سامان راحت مل جائے تب بھی اپنی محدودیت کی وجہ سے کسی کے لئے یہاں کی راحتوں سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں۔

کارڈف میں داخل ہو کر پہلے ہم لوگ جناب اقبال احمد صاحب کی رہائش گاہ پر کچھ دیر کے لئے ٹھہرے۔ انھوں نے بتایا کہ کارڈف شہر میں مسلمانوں کے تقریباً آٹھ ہزار خاندان آباد ہیں۔ مسجدیں چھ ہیں۔ مغرب کے قریب تک اقبال احمد صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ نہایت باصلاحیت آدمی ہیں اور اسی کے ساتھ گہرا دینی جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ یہاں ایک اچھی سروس میں ہیں۔ مگر اب پیشگی رٹائرمنٹ لے کر "دعوہ ورک" میں مشغول ہونا چاہتے ہیں۔

مغرب کی نماز کناٹ روڈ (Connaught Road) کی مسجد میں پڑھی۔ اسی مسجد میں خطاب کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ کافی لوگ موجود تھے۔ بہت سے لوگ دور دور سے آئے تھے۔ نماز کے بعد میں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ایک عالمی پیغام ہے (لیکون للعالمین نذیرا) آخر عمر میں حجۃ الوداع کے موقع پر جب تمام صحابہ جمع تھے، آپ نے فرمایا کہ جو

لوگ موجود ہیں وہ غیر موجود کو یہ پیغام پہنچادیں (فلیبلغ الشاھد الغائب) چنانچہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ عرب سے نکل کر تمام ملکوں میں پھیل گئے اور اسلام کی عالمی اشاعت کی۔

دوراول کا یہ کام دعوتی منصوبہ کے تحت ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں صنعتی انقلاب (industrialisation) نے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکالا اور دوبارہ ان کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ یہ بھی ایک منصوبۂ الٰہی ہے۔ وہ اس لئے ہے تاکہ مسلمان موجودہ انسانی نسلوں تک اسلام کا پیغام پہنچادیں۔ ہم کو اس خدائی منصوبہ کا شعور ہی ادراک ہونا چاہئے تاکہ ہم اس کے مطابق خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرسکیں۔ اس کے بعد میں نے صحابہ کرام اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا تقابل کرتے ہوئے بتایا کہ صحابہ میں وہ کون سی صفات تھیں جس کی وجہ سے وہ "انصار اللہ" بن سکے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں وہ کون سی کمیاں ہیں جن کو ہمیں دور کرنا ہے تاکہ ہم خدائی منصوبہ کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کرسکیں۔ اور خدا کی طرف سے دنیا و آخرت میں اس کا انعام پائیں۔ تقریر کے بعد لوگوں نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا اور کہا کہ یہاں ایک اور پروگرام رکھا جائے۔ مگر وقت کی کمی کی بنا پر مجھ کو معذرت کرنی پڑی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ آپ نے ہمارے جذبات کو زبان بخش دی۔

مسجد میں ڈاکٹر فقیر محمد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کارڈف کی تبلیغی جماعت کے امیر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دو سال پہلے وہ ایک جماعت لے کر نیویارک گئے۔ نیویارک ایئرپورٹ پر اترے تو نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ ان لوگوں نے وہیں اذان دی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ ایک سفید فام امریکی اس منظر کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ آخر میں وہ ان لوگوں کے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم اسلام کے مطابق خدا کی عبادت کر رہے تھے۔ اس کا تجسس دیکھ کر جماعت والوں نے اس کو اپنے پاس بٹھایا اور اس کو اسلام کے بارہ میں بتانا شروع کیا۔ وہ متاثر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسی نشست میں اس نے کلمۂ شہادت ادا کرکے اسلام قبول کرلیا۔

ایک صاحب جو بیج (seed) سے متعلق تحقیقی ادارہ میں کام کرتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہم ہر چیز کے بیج کو خوردبین کے شیشے کے نیچے رکھ کر دیکھتے ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صرف انسان

ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا کا ہر ذرہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مثلاً سیب کے دس ہزار بیج کو لیا جائے اور خورد بین میں اس کو بڑا کرکے دیکھا جائے تو ہر بیج ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دے گا۔ نیچر (فطرت) میں اتنا زیادہ تنوع ایک طرف ارتقاء کی تردید ہے، کیوں کہ مفروضہ ارتقائی عمل یکسانیت کو چاہتا ہے نہ کہ تنوع کو۔ اور دوسری طرف وہ بتاتا ہے کہ کتنا عجیب قدرت والا ہے وہ خدا جس نے اتنی بڑی کائنات بنائی اور اس کو اس طرح بنایا کہ اس کی ان گنت چیزیں سب کی سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

۸ اگست کی دوپہر کو برمنگھم کے مضافات میں گیا جس کو یہاں کی اصطلاح میں کنڑی سائڈ کہا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں کنڑی سائڈ نہایت خوبصورت ہوتا ہے۔ جناب شمشاد خاں صاحب کا یہاں بہت بڑا مکان ہے۔ یہاں وہ دس سال تک رہے ہیں۔ اب وہ اس کو چھوڑ کر شہر میں نسبتاً چھوٹے مکان میں رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس کو دیکھ کر کہا: آپ اتنا اچھا گھر چھوڑ کر کیسے چلے گئے۔ میں نے کہا کہ آپ اچانک اس گھر کو دیکھ رہے ہیں اس لئے وہ آپ کو پرکشش معلوم ہو رہا ہے۔ اگر آپ گھر کو حاصل کرلیں اور اس میں رہنے لگیں تو کچھ ہی دنوں بعد آپ کے لئے اس کی جاذبیت ختم ہو جائے گی۔ اس دنیا میں کوئی چیز اسی وقت تک پرکشش ہے جب تک وہ ملی نہ ہو۔ ملنے کے بعد ہی آدمی کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی کشش ختم ہوگئی۔

کارڈف میں پاکستان سے آئے ہوئے ایک مسلمان رہتے ہیں۔ ان کا نام مسٹر انور شیخ ہے۔ انھوں نے ۱۹۹۰ میں ایک کتاب چھاپی ہے جس کا نام ابدیت (Eternity) ہے۔ ۳۸۳ صفحہ کی کتاب میں اسلام کے بارہ میں نہایت باغیانہ قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ پہلے میں کٹر مسلمان تھا۔ پھر پاکستان میں میں نے دیکھا کہ اسلام ایک مذاق بن گیا ہے۔ وہ سیاستداں کے لئے ذریعہ قوت ہے اور ملا کے لئے ذریعہ معاش۔ شفاعت کے عقیدہ کی وجہ سے کوئی بھی اچھے اخلاق کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ محمد عربی ہماری سفارش کر دیں گے اور ہم سیدھے جنت میں چلے جائیں گے۔

مصنف سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ان کی کتاب میں نے دیکھی۔ اس کتاب کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ خدا انسان ہے اور انسان خدا ہے (God is man and man is God)

اس کتاب کے بارہ میں ان کا ایک انٹرویو لندن کے ماہنامہ کردار (مارچ ۱۹۹۴) میں دیکھا۔ اس میں انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ "قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جن سے میرے دعویٰ کی دلیل ملتی ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت ہے کہ قیامت کے دن اللہ میاں مسند انصاف پر بیٹھے گا اور اس کے دائیں طرف محمد عربی بیٹھیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہیں" (صفحہ ۳۹)

ہر شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ ایسی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے۔ دنیوی علوم میں کوئی مصنف اس قسم کی بے بنیاد بات نہیں کہے گا۔ مگر مذہب کے معاملہ میں لوگ اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں کہ وہ جو چاہیں لکھیں۔ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنے بارہ میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے والے لوگ ہیں۔

انگلینڈ میں اور پورے یورپ میں بڑی تعداد میں مسلمان اور دوسرے ایشیائی اور افریقی لوگ بستے ہیں۔ جن کو یہاں نسلی قومیتیں (ethnic communities) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں بھی یہ لوگ بڑی تعداد میں ہیں۔ مگر دونوں مقامات میں ایک فرق ہے۔ امریکہ میں منتخب ہجرت (selective migration) ہوئی۔ اس لئے وہاں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ پہنچے۔ جب کہ انگلینڈ وغیرہ میں لوگ بلا امتیاز آئے۔ اسی لئے یہاں زیادہ تر مزدور طبقہ داخل ہوا۔

اس فرق کے مظاہر ہر سطح پر پائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں بسنے والے مسلمان اور دوسرے ایشیائی لوگ زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ معیاری زندگی گذارتے ہیں جب کہ یہاں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مثلاً لندن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہت بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں جن میں ہندی اور اردو مقررین پر جوش تقریریں کرتے ہیں۔ امریکہ میں ایسا نہیں۔ امریکہ کے اجتماعات ہال کے اندر کانفرنس کے انداز میں ہوتے ہیں۔ جب کہ یہاں اسی طرح پارکوں میں بڑے بڑے عوامی جلسے ہوتے ہیں جیسا کہ ہندستان یا پاکستان میں نظر آتے ہیں۔

۱۹ اگست کی صبح کو میں شمشاد خاں صاحب کے مکان پر اپنے کمرہ میں تھا۔ مکان سے ملحق گارڈن اور میرے کمرہ کے درمیان صرف شیشہ کی دیوار حائل تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک سفید فام نوجوان آتا ہے اور آتے ہی فوراً اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس نے مشین کے ذریعہ لان کی گھاس کاٹی۔ پودوں کو درست کیا۔ پورے گارڈن کی صفائی کی۔ وہ آٹھ گھنٹہ تک لگاتار اپنے کام میں مشغول رہا۔ نہ بیٹھا، نہ

کسی سے بات کی۔ نہ ادھر اُدھر دیکھا۔ حتی کہ چائے پیتے ہوئے بھی اپنا کام جاری رکھا۔ وہ اس طرح کام کرتا رہا جیسے کسی مشین کا بٹن دبا دیا جائے اور وہ بند کئے جانے تک مسلسل چلتی رہے۔ اس کا نام بلی (Billy) تھا۔ وہ ہفتہ میں دو بار یہاں آتا ہے اور ایک بار کا ۳۰ پونڈ لیتا ہے۔

یورپی قوموں میں یہ صفت ان کے معمولی ورکر سے لے کر اعلیٰ عہدیداروں تک پائی جاتی ہے۔ ان کا یہی قومی کردار ان کی ترقی کا راز ہے، نہ کہ کوئی سازش جس کا انکشاف ہمارے دانشور اکثر عارفانہ انداز میں کیا کرتے ہیں۔

برمنگھم میں اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل (IPCI) دعوت کے میدان میں بہت عمدہ کام کر رہا ہے۔ میں نے اس کا مرکز دیکھا۔ یہ مرکز اپنی ترتیب اور اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے پورے طور پر یورپی معیار کے مطابق ہے۔

انھوں نے انگریزی میں بہت سا لٹریچر شائع کیا ہے۔ ایک پمفلٹ کا ٹائٹل یہ ہے کہ بائبل محمدؐ کے بارہ میں کیا کہتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بائبل کا جو قدیم عبرانی اڈیشن ہے، اس میں آج بھی "محمدؐ" کے نام سے پیغمبر آخر الزماں کی پیشین گوئی موجود ہے۔ اس پمفلٹ میں عبرانی نسخہ کے اصل الفاظ شائع کئے گئے ہیں۔ پمفلٹ میں بتایا گیا ہے کہ محمدؐ کا ذکر اپنے نام کے ساتھ امثال سلیمان میں موجود ہے۔ عبرانی لفظ جو اس میں استعمال کیا گیا ہے وہ محمدم ہے:

Muhammad is mentioned my name in the Song of Solomon (5:16) The Hebrew word used there is Mahammuddim, translated as 'altogether lovely' in the authorised version of the Bible or 'The Praised One' i.e. Muhammad.

اخبار جنگ کا لندن اڈیشن (۹ اگست ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے درمیانی صفحہ پر جناب خرم مراد صاحب کا مضمون تھا۔ اس میں پاکستان کی بربادی کی ذمہ داری پاکستان کے سیاسی لیڈروں کے اس غلط فیصلہ پر ڈالی گئی تھی کہ انھوں نے امریکہ سے تعلق قائم کر لیا (جو کہ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن تھا)" اکتوبر اور نومبر ۱۹۵۳) میں جنرل ایوب کی واشنگٹن یاترا کے بعد ۱۹ مئی ۱۹۵۴ کو پاکستان کی فوجی امداد کی درخواست قبول کر کے امریکہ نے امریکہ۔ پاکستان باہمی دفاعی معاہدہ پر دستخط کر دئے۔"

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم دانشور اسی قسم کے انکشافات میں مشغول ہیں۔ کوئی اس

واقعہ کو دریافت نہ کرسکا کہ مذکورہ قسم کا شدید تر معاہدہ امریکہ اور جاپان کے درمیان دوسری عالمی جنگ کے بعد ہوا۔ مگر یہ معاہدہ جاپان کو ترقی سے نہ روک سکا۔ پھر ایسا نسبتاً ایک کمتر معاہدہ پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ کیسے بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی ترقی ان کی داخلی طاقت پر منحصر ہے نہ کہ کسی قسم کے بیرونی معاہدہ پر۔

لندن کے اردو روزنامہ جنگ (۹ اگست ۱۹۹) میں مسٹر مقیم احمد کا بیان چھپا ہوا تھا کہ " بتھنل گرین کے علاقہ میں ایشیائی تاجروں کا تناسب ۳۵ فی صد سے زائد ہے۔ مگر ان تاجروں کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا جا رہا ہے"۔ اس سلسلہ میں میں نے ڈاکٹر تصدیق حسنی سے بات کی جو یہاں ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ سے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ کے سفید فام باشندے ہم لوگوں سے امتیاز برتتے ہیں۔ ہم کو ہائر جاب نہیں دیا جاتا۔ اور اگر کوئی آدمی سروس میں پہنچ جائے تو اس کو پروموشن نہیں ملتا۔ البتہ یہ نمایاں صورت میں نہیں ہے۔ اس کو آپ مخفی امتیاز (hidden discrimination) کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے امتیاز کے کئی ذاتی تجربے بتائے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ اگر ان مسلمانوں سے ملئے تو وہ طرح طرح کی شکایتیں بیان کریں گے۔ لندن کے ایک مسلم دانشور نے برطانی مسلمانوں کا ایک اجتماع کیا اور اس میں "مسلم پارلیمنٹ" بنانے کا اعلان کر دیا جو برطانی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرے گی۔ برٹش میڈیا نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ ایک ملک میں دو پارلی منٹ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد یہاں کے مسلمان اس تحریک سے بے تعلق ہو گئے اور مسلم پارلی منٹ کی بات ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ ہندستان کے مسلمان بھی اگر اپنے جذباتی لیڈروں کے ساتھ یہی معاملہ کریں تو یہاں بھی جھوٹی لیڈری کی جڑ کٹ جائے اور فرقہ وارانہ جھگڑے اپنے آپ ختم ہو کر رہ جائیں۔ کیوں کہ یہی جذباتی لیڈر ہیں جو اپنے حقیر مقاصد کے لئے فرقہ وارانہ جھگڑے کھڑا کرتے ہیں۔ اور کسی جذباتی لیڈر کو طاقت ہمیشہ مسلمانوں کے سپورٹ سے حاصل ہوتی ہے۔

برطانیہ میں ایک برٹش نیشنل پارٹی ہے۔ ان لوگوں کا نعرہ ہے کہ برطانیہ برطانیوں کے لئے۔ وہ ایشیا اور افریقہ سے آنے والے تمام لوگوں کو اپنے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ چند

سال پہلے ان کا ایک لیڈر اینک پاویل (Enoch Powel) منتخب ہو کر پارلی منٹ میں پہنچ گیا تھا وہاں وہ اشتعال انگیز تقریریں کرتا رہا۔ برطانی لوگوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ چنانچہ اس بار وہ الکشن میں ہار گیا۔ اور دوبارہ پارلی منٹ میں نہ پہنچ سکا۔ یہی اگر ہندستان میں ہو تو یہاں بھی تمام تخریب پسند تحریکوں کی جڑ کٹ جائے۔

۹ اگست کو مغرب کی نماز اسپارک بروک کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد یہاں خطاب ہوا۔ خطاب میں میں نے اس حدیث کو موضوع بنایا: ایاکم والظن فان الظن آکذب الحدیث میں نے کہا کہ بدگمانی کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہے واقعہ کو غلط رخ سے دیکھنا۔ ہمیشہ غلط رخ سے دیکھنے ہی کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور آدمی الٹی رائے قائم کر لیتا ہے جس کو بدگمانی کہا جاتا ہے۔ یہ سخت گناہ کی بات ہے۔ دور صحابہ کی مثالوں سے بتایا کہ غلط رخ سے دیکھنے میں کس طرح مقدس شخصیتوں کی تصویر بھی بگڑ جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کسی کے بارہ میں رائے قائم کرتے ہوئے سخت احتیاط سے کام لیا جائے۔

۱۰ اگست کی صبح کو اخبار جنگ کے نمائندہ مسٹر عباس ملک آگئے۔ ان سے دیر تک موجودہ زمانہ کے مسلم مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ وہ اس کو انٹرویو کی شکل میں اخبار جنگ میں شائع کرینگے۔

انھوں نے کہا کہ ایک قصہ ہے کہ ایک بزرگ کا قافلہ چل رہا تھا۔ اس نے ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا۔ کچھ عرصہ کے بعد فاختہ کے غول وہاں آگئے اور درخت کے اوپر اپنی بولی بولتے ہوئے منڈلانے لگے۔ بزرگ نے پوچھا تو فاختہ کی جماعت کے لیڈر نے کہا کہ ہمارا ایک جوڑا ایک درخت پر پتیوں کے سایہ میں آرام کر رہا تھا کہ آپ کے ایک ساتھی نے غلیل مار کر ایک فاختہ کو گرا لیا اور ذبح کر ڈالا۔ بزرگ نے اس آدمی سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ حضرت، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہ جانور تو ہماری خوراک ہیں اور وہ ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ بزرگ نے فاختہ کے لیڈر تک یہ جواب پہنچا دیا۔ اس نے کہا کہ ہماری شکایت یہ نہیں ہے۔ ہماری شکایت تو یہ ہے کہ آپ لوگ یہاں صوفی کے روپ میں آئے مگر آپ نے شکاری والا کام کیا۔ آپ کو صوفی کے روپ میں دیکھ کر ہم مطمئن تھے کہ آپ سے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ شکاری کے روپ میں ہوتے تو ہم نے بھی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا ہوتا۔

یہ اگرچہ ایک کہانی ہے۔ مگر وہ صوفیا، اور بادشاہوں کے فرق کو بہت اچھی طرح بیان کر رہی ہے۔ صوفیا بے ضرر بن کر لوگوں کے سامنے آئے اس لئے لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ بادشاہ لوگ شکاری کے روپ میں آئے اس لئے لوگ ان سے متوحش ہو گئے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ پاکستان جیسے ملکوں میں جو جھگڑا فساد ہے اس کا سبب ڈیموکریسی ہے۔ ڈیموکریسی نے ہر آدمی کو سیاسی حوصلہ مند (ambitious) بنا دیا ہے۔ آپ تقابلی طور پر دیکھئے کہ جو انتشار پاکستان میں ہے وہ سعودی عرب میں کیوں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب میں تمام لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاسی گدی تو صرف شاہی خاندان کو ملے گی۔ اس لئے لوگ سیاست سے نظریں پھیر کر اپنے کھانے کمانے میں لگے رہتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ڈیموکریسی ہے۔ اس لئے یہاں ہر آدمی سمجھتا ہے کہ میں بھی کوئی سیاسی عہدہ حاصل کر سکتا ہوں۔ اس لئے ہر آدمی حتی کہ علماء تک سیاست کے میدان میں قسمت آزمائی کے لئے نکل پڑے ہیں۔

جمہوری نظام میں اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے لوگوں کے اندر منٹل ڈسپلن ہونا۔ یہ منٹل ڈسپلن یا تو تعلیم کے ذریعہ آتا ہے یا تقویٰ کے ذریعہ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی ڈیموکریسی صالح ڈیموکریسی بنے تو آپ کو یہی کرنا ہوگا کہ وہاں کے سماج کو یا تو برطانیہ کی طرح تعلیم یافتہ سماج بنائیں یا دور اول کے اسلام کی طرح متقی سماج۔

لندن کے اخبار جنگ (۹ اگست ۱۹۹۴) میں ایک دلچسپ نیوز آئٹم دیکھنے کو ملا۔ اس کا عنوان تھا: سلمان رشدی اپنے قلم سے اپنا دفاع کرے۔ اس عنوان کے تحت حسب ذیل خبر درج تھی ــــ ملعون مصنف سلمان رشدی کی حفاظت پر سرکاری اخراجات پر عوام میں اختلافات دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ سلمان رشدی کو اپنی حفاظت خود کرنی چاہئے۔ قلم کا وار تلوار سے زیادہ کاری ہوتا ہے تو رشدی کو بھی اپنے قلم سے اپنا دفاع کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۱۲)

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ اگر رشدی ایسا کہے تو اس کا کیا جواب ہوگا کہ تم لوگوں نے تو میرے قلم کے جواب میں تلوار اٹھائی اور مجھ کو مشورہ دے رہے ہو کہ تمہاری تلوار کا جواب میں قلم سے دوں۔

یہاں ایک کتاب دیکھی۔ ۲۳۷ صفحہ کی اس کتاب کا نام تاریخ برطانیہ (British History) تھا

اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانی تاریخ میں کوئن وکٹوریہ کے زمانہ سے لے کر پہلی عالمی جنگ تک کے دور کو دی ایج آف امپائر کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں برٹش امپائر سب سے زیادہ وسعت (greatest extent) تک پہنچی جب کہ دنیا کے لینڈ ایریا کا تقریباً ⅕ (one-fifth) حصہ اس کے قبضہ میں آ گیا۔ یہ اس وقت کی عالمی آبادی کا تقریباً چوتھائی حصہ تھا۔ چونکہ یہ پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ شہنشاہیت جس میں سورج غروب نہیں ہوتا:

the Empire on which the Sun never sets. (p. 162)

آگے اسی کتاب کے باب دی ماڈرن ورلڈ میں درج تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانی شہنشاہیت ختم ہو گئی۔ جو ممالک اس میں شامل تھے وہ ۱۹۷۰ تک آزاد ہو گئے:

After the Second World War Britain's Empire disappeared, the countries belonging to it were almost all independent by 1970. (p 190)

برطانی شہنشاہیت کی یہ مدت تقریباً سوا سو سال ہوتی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں تمام سلطنتوں کو عروج کے بعد زوال ہوا ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی قوم کے لئے ابدی اقتدار مقدر نہیں۔ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار آزمائش کے لئے ہوتا ہے۔ یہ آزمائش ہر ایک کی ہونی ہے، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم کو ابدی طور پر سیاسی اقتدار کا مالک بنا دیا جائے۔ انگریز قوم کی یہ دانش مندی ہے کہ اس نے تاریخ کے اس فیصلہ کو بخوشی قبول کر لیا۔

برمنگھم میں حضرت سلطان باہو کے نام پر ایک مرکز ہے۔ ۱۰ اگست کی شام کو مغرب کی نماز یہاں کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد خطاب کا پروگرام تھا۔ میں نے اس آیت کو موضوع بنایا کہ وما ارسلناك الا رحمة للعالمين۔ میں نے کہا کہ اسلام امن اور رحمت کا دین ہے۔ اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے۔ یہ اس کی ابدیت کا ثبوت ہے۔ اسلام اگر جنگ کلچر کا علمبردار ہوتا تو موجودہ زمانہ میں اس کی اہمیت ختم ہو جاتی۔ کیوں کہ جدید ہتھیاروں کے ظہور میں آنے کے بعد جنگ صرف تباہی کے ہم معنی بن کر رہ گئی ہے۔ تلوار کے دور میں جنگ کا کچھ فائدہ ہو سکتا تھا۔ مگر بموں کے دور میں یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ جنگ کے ذریعہ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ حاصل ہو سکے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ کی جنگ دو طرفہ تباہی بن کر رہ گئی ہے۔

ان خیالات کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا: آپ نے ہمارے جذبات کو زبان دیدی۔ مرکز کے ذمہ داروں نے دوبارہ پروگرام رکھنے پر اصرار کیا۔ تقریر کے بعد سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ برائی کے خلاف اقدام صرف اس وقت جائز ہے جب آپ کے پاس برائی کو ختم کرنے کی طاقت موجود ہو۔ ایسا اقدام جس کے نتیجہ میں شدید تر برائی پیدا ہو جائے وہ اسلام میں ہرگز جائز نہیں۔

۱۱ اگست کی شام کو لندن میں پروگرام تھا۔ جناب شمشاد خاں صاحب کے ساتھ برمنگھم سے بذریعہ کار روانہ ہوا۔ دو گھنٹہ کا سفر کرکے ہم لوگ لندن پہنچے۔ پہلے کچھ دیر کے لئے جناب محمد اسحاق صاحب کے مکان (گیری روڈ) پر کچھ دیر کے لئے قیام کیا گیا۔ یہاں عصر کی نماز پڑھی گئی۔ کچھ مقامی لوگوں سے تبادلہ خیال ہوا جو یہاں اکٹھا ہو گئے تھے۔

مغرب کی نماز پاکستان کمیونٹی سنٹر (ولزڈن گرین) کی مسجد میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد اس کے ہال میں خطاب ہوا۔ یہ خطاب سیرت کے موضوع پر تھا۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔ سنٹر کے چیئرمین نے آخر میں بولتے ہوئے کہا کہ آج ایسی ہی تقریروں کی ضرورت ہے۔ مسلمان اگر اس کے مطابق عمل کریں تو ان کے تمام مسائل انشاء اللہ حل ہو جائیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ کب ایسا ہوگا کہ مسلمان دوبارہ اسلامی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ جب وہ اس کی شرطیں پوری کر دیں گے۔ قرآن کے مطابق، یہ شرط ایمان باللہ اور عمل صالح ہے (النور ۵۵)

رات ہی کو ہم لوگ دوبارہ برمنگھم واپس آ گئے۔ مذکورہ پروگرام اور اسی طرح برطانیہ میں ہونے والے تمام پروگرام ویڈیو ریکارڈ کئے جاتے رہے۔ ریکارڈنگ کا انتظام اسلامک پروپیگنڈہ سنٹر انٹرنیشنل نے کیا تھا۔

۱۱ اگست کی رات کو جب ہم لوگ پروگرام سے فارغ ہو کر مکان واپس آئے تو یہاں گھر کے اندر دو سفید فام پولیس کے آدمی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ جناب شمشاد خاں صاحب کے مکان کے اوپر کے حصہ میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے راستہ سے کچھ چور اندر گھس آئے۔ ایک بیگ میں کچھ پونڈ اور کچھ جوئلری رکھی ہوئی تھی اس کو لے کر بھاگ گئے۔ گھر کی خاتون نے پولیس کو ٹیلیفون کیا۔

۔امنٹ کے بعد پولیس آئی۔ اس وقت تک چور بھاگ چکے تھے۔

معلوم ہوا کہ چوری کے واقعات یہاں عام ہیں۔ حتی کہ یہ چور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ چوری کرتے ہیں۔ چوں کہ پڑوس میں یہاں لوگ ایک دوسرے سے بے تعلق ہوتے ہیں، اس سے چوروں کو مزید موقع مل جاتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک روز کسی مکان کے سامنے ایک بڑی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ گھر کا تالا کھول کر اس کا قیمتی سامان گاڑی پر لادا جا رہا تھا۔ پڑوسی نے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے اس کو دیکھا تو کہا —— کیا آپ یہاں سے جا رہے ہیں:

Are you moving.

حالاں کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ چور تھے جو بند مکان کا سامان لے کر فرار ہونے والے تھے۔ مگر پڑوسی اتنا بے خبر تھے کہ انھوں نے سمجھا کہ یہ خود گھر والے ہیں جو اپنا سامان لے کر کہیں اور جا رہے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کے ایک لیڈر نے ایک کمپنی سے اپنی پارٹی کے لئے چندہ لیا۔ یہ چندہ رواج کے خلاف تھا۔ اس کے کچھ سال بعد وہ کمپنی دیوالیہ ہوگئی۔ کمپنی کے ذمہ داروں نے جائزہ کے بعد ایک رپورٹ شائع کی جس میں وہ اسباب بتائے گئے تھے جن کی وجہ سے کمپنی فیل ہوئی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کمپنی کے کچھ افسر کرپٹ ہو گئے تھے اور اس کے ثبوت میں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے کنزرویٹو پارٹی کو مذکورہ عطیہ دیا۔

یہ رپورٹ چھپی تو کنزرویٹو پارٹی کے ذمہ داروں نے اس مسئلہ پر میٹنگ کی۔ غور و فکر کے بعد انھوں نے دو فیصلے کئے۔ ایک یہ کہ مذکورہ رقم کمپنی کو واپس کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ جس لیڈر نے چندہ لیا اور جو اس وقت حکومت میں وزیر تھا۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے عہدے سے استعفا دیدے۔

یہی کرپشن کو دور کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ اگر اوپر کے لوگ ایسا کریں کہ وہ خود کرپشن میں مبتلا ہوں۔ حتی کہ وہ یہ قانون بنوالیں کہ ان کے اوپر خود ان کی اجازت کے بغیر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ البتہ وہ جلسوں میں آکر دوسروں کو نصیحت کریں کہ وہ کرپشن سے بچیں تو اس طرح کبھی کرپشن کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

ایک مسلمان مقیم برطانیہ نے کہا کہ انڈیا کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے اوپر

تہذیبی حملہ (cultural onslaught) ہے جو ہندستان میں ٹی وی اور دوسرے ذرائع سے جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے اثر سے مسلمان ہندو تہذیب کو قبول کر رہے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کی شادیوں میں ہندو طریقے رائج ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ چیزیں تو ہندستانی مسلمانوں سے زیادہ پاکستانی مسلمانوں میں آ رہی ہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کی شادیوں میں بڑے پیمانہ پر ہندو طریقہ کی نقل کی جا رہی ہے۔ انھوں نے اس کا اعتراف کیا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ ہندو کلچر کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ تماشا کلچر کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اپنی بڑھی ہوئی مادیت کی بنا پر تماشا پسند ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ اس قسم کی تماشائی رسموں کو اختیار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ فعل ہندو تہذیب کی تقلید کے طور پر نہیں ہے بلکہ تماشا تہذیب کی تقلید کے طور پر ہے۔ تماشے کی رسمیں چوں کہ اسلام میں موجود نہیں تھیں، انھوں نے ان کو باہر سے درآمد کر لیا۔

مختلف ملکوں کے جو مسلمان برطانیہ میں آباد ہیں ان کی مجموعی تعداد ڈیڑھ ملین ہے۔ ان میں پاکستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً آٹھ لاکھ ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو آزاد کشمیر (ہندستانی زبان میں مقبوضہ کشمیر) سے آئے ہیں۔ ایک پاکستانی مسلمان جو برمنگھم میں رہتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ برمنگھم میں ۸۰ ہزار پاکستانی آباد ہیں۔ ان میں ۶۰ ہزار وہ لوگ ہیں جو آزاد کشمیر کے علاقہ سے آئے ہوئے ہیں۔

برطانیہ میں مقیم کچھ کشمیری مسلمانوں سے گفت گو ہوئی۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں آپ جو جنگجویانہ تحریک چلا رہے ہیں، اس کا مقصد آپ کے اعلان کے مطابق کشمیر کو آزاد کرنا ہے۔ یہ مقصد آپ اس حصہ میں بالفعل حاصل کر چکے ہیں جس کو آپ خود آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ پھر جب آپ کا ڈریم لینڈ یا آپ کا مطلوب کشمیر جزئی طور پر آزاد کشمیر کے علاقہ میں عملاً بن گیا تو اس کو چھوڑ کر دوبارہ آپ لوگ برطانیہ کی "غلامی" میں کس لئے آ گئے۔ آپ کی یہ روش بتاتی ہے کہ آزادیٔ کشمیر کی تحریک چلانے میں آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔

میں نے کہا کہ اصحاب رسول کو جب مدینہ میں ایک آزاد اسلام لینڈ مل گیا تو سارے لوگ وہاں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ مدینہ میں چوں کہ مادی آرام نہیں تھا وہ اس کو چھوڑ کر شام اور عراق اور فلسطین چلے جاتے، کیوں کہ وہاں مادی راحت موجود تھی۔ آپ لوگ زبان

سے تو اپنے آپ کو اسلام پسند کہتے ہیں مگر حقیقۃً آپ مادہ پسند ہیں۔

۱۲ اگست کو جمعہ کا دن تھا۔ حضرت سلطان باہو ٹرسٹ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ جمعہ سے پہلے ۲۰ منٹ کا خطاب ہوا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اتحاد کی اہمیت بتائی۔ آخر میں کہا کہ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو برداشت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اتحاد کے ساتھ متحد ہونے کا۔ کیوں کہ ایسا اتحاد تو کبھی دنیا میں وجود میں آنے والا نہیں۔

ٹرسٹ کے چیرمین صاحب نے خطاب کے بعد کہا کہ آپ کی ضرورت سب سے زیادہ انگلینڈ میں ہے۔ یہاں اسی طرح کی باتوں کی ضرورت ہے۔ مگر ایسی باتیں کرنے والا یہاں کوئی نہیں۔ آپ نے ہمارے جذبات کو الفاظ دیدئے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں ہم آپ کے لئے سارا انتظام کریں گے، آپ اب یہیں رہ جائیں، انڈیا نہ جائیں۔ خطاب کے بعد ایک صاحب الگ سے ملے انھوں نے کہا کہ مجھے معاف کیجئے۔ آپ کے بارہ میں میرے دل میں بدگمانیاں تھیں۔ مگر اب ساری بدگمانی ختم ہوگئی۔

شام کو مغرب کی نماز مرکز اہل حدیث کی مسجد میں پڑھی۔ یہاں مغرب کے بعد ایک خطاب ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ سنت رسول سے موجودہ زمانہ میں کس طرح رہنمائی حاصل کی جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ معروف سنتوں کے سوا بھی بہت سی سنتیں ہیں جو نہایت اہم ہیں۔ مگر وہ لوگوں کے لئے اجنبی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت تیسیر العسر ہے۔ یعنی مشکل کو آسان بنانا، اپنے مائنس کو اپنے پلس میں تبدیل کرنا۔ تقریر کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی وجہ سے یہاں ایسے تعلیم یافتہ حضرات آگئے جو عام طور پر دینی اجتماعات میں نہیں آتے۔

آخر میں سوالات کئے گئے جن کا جواب دیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اب جہاد بالسیف منسوخ ہوچکا ہے۔ اب صرف جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ جہاد کو منسوخ کہنا خود اپنی جہالت کا اعلان کرنا ہے۔ پھر کون ایسی حماقت کرے گا۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ جہاد کی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جہاد کرنا جائز نہیں۔ یہ شرطیں آپ فقہ کی کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ غزوۂ بدر میں کوئی تیاری نہیں تھی۔ مگر بے سروسامانی کے باوجود

جہاد کیا گیا۔ میں نے کہا کہ غزوۂ بدر کی تیاری تو اتنی بڑی تھی کہ اس سے بڑی تیاری ممکن نہیں۔ حالت یہ تھی کہ تیاری نہ ہونے کی وجہ سے اصحاب رسول جہاد کرنے میں متردد تھے۔ اس وقت قرآن میں یہ یقین دہانی نازل کی گئی کہ تم لوگ میدان جنگ کی طرف بڑھو، تمہاری مدد کے لئے فرشتے اتارے جائیں گے۔ پھر جس گروہ کا ساتھ دینے کے لئے فرشتے آجائیں وہ تو اتنی طاقت ور ہوجائے گی کہ ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی اس کو زیر نہ کر سکیں۔

مرکز اہل حدیث کے اجتماع میں تقریر کے بعد بہت سے تحریری سوالات آئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ —— آجکل نظام خلافت کے احیاء کا بڑا چرچا ہے۔ قریب میں لندن میں حزب التحریر نے اس موضوع پر ایک کامیاب کانفرنس منعقد کی تھی۔ کیا اسلامی خلافت کا احیاء (موجودہ زمانہ میں) ممکن ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق، خلافت (اقتدار ارض) احیاء کا مسئلہ نہیں ہے، وہ اعطاء کا مسئلہ ہے۔ یعنی خلافت کسی گروہ کو خدا کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ کسی تحریکِ خلافت کے ذریعہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ قرآن کے مطابق صحیح طریقہ یہ ہے کہ احیاء کی کوشش افراد ملت پر کی جائے۔ افراد ملت میں جب زندگی آجائے گی تو اس کے بعد خدا کی طرف سے اس کے حق میں خلافت وحکومت

Wembley Arena, London

مؤتمر الخلافة

کا فیصلہ بھی کر دیا جائے گا۔

ایک اور سوال یہ تھا کہ ـــــ آپ نے کہا ہے کہ مشکل کو آسان سمجھنا چاہئے، کیوں کہ یہ بھی رسول اللہ کی سنت ہے۔ "کشمیر بنے گا پاکستان" ایک مشکل عمل ہے بقول بعض، پھر کیا ہم اس کو آسان سمجھیں اور اس کے لئے کوشش کریں تو یہ سنت رسول ہوگی۔

میں نے جواب دیا کہ جو بات میں نے کہی وہ یہ تھی کہ عسر میں یسر کو دیکھنا اور اس کو استعمال کرنا یہ بھی ایک سنت رسول ہے۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ یسر کے پہلو کو چھوڑ دیتے ہیں اور عسر سے اپنا سر ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے کشمیر کے مسئلہ کو دیکھئے تو آپ لوگوں نے سنت کے برعکس طریقہ اختیار کیا ہے۔ ۱۹۸۹ میں جب آپ نے موجودہ مسلح تحریک شروع کی تو کشمیر میں عسر کے ساتھ یسر پوری طرح موجود تھا۔ وہ یہ تھا کہ سیاسی شکایات کو نظر انداز کرتے ہوئے تعلیم، اقتصادیات اور دعوت جیسے میدانوں میں کشمیری قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے پر امن کوشش کی جائے۔ مگر آپ لوگوں نے اس موقع کو استعمال نہیں کیا۔ اس کے بجائے آپ نے عسر کی سیاسی چٹان سے لڑنا شروع کر دیا۔ یہ سنت رسول کے سراسر خلاف ہے۔

ایک سوال یہ تھا ـــــ فتنۂ قادیانیت ایک نئے روپ میں برطانیہ میں خصوصاً پھیل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی کوئی نصیحت ہو تو بتائیں کہ ہم اس فتنہ کا مقابلہ کس طرح کریں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں ہندستان میں قادیانیت پیدا ہوئی۔ اسی کے قریب زمانہ میں امریکہ کی بلیک مسلم تحریک بھی پیدا ہوئی۔ دونوں کا کیس بالکل ایک تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بلیک مسلم تحریک کا فتنہ جلد ہی ختم ہو گیا اور قادیانیت کا فتنہ ابھی تک باقی ہے اور بڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ بلیک مسلم تحریک کے فتنہ کو خاموش تدبیر سے حل کیا گیا۔ جب کہ قادیانی فتنہ کو شور وغل کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور شور وغل سے کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔

بلیک مسلم تحریک الیجا محمد (۱۸۹۷-۱۹۷۵) نے شروع کی۔ انھوں نے دعوا کیا کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں۔ چنانچہ ان کے تمام پیروان کو پیغمبر خدا مانتے تھے۔ مگر ۱۹۷۵ میں ان کے انتقال کے بعد ان کا لڑکا وارث دین محمد ان کا جانشیں ہوا۔ بیٹے کا رجحان یہ تھا کہ ان کے والد پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ

ایک ریفارمر تھے۔ امریکہ کے مسلمانوں نے اس کو خوب استعمال کیا۔ یہاں تک کہ بلیک مسلم اصلاح یافتہ ہوکر بہت بڑی تعداد میں عالمی مسلم امت کا جز بن گئے۔

ٹھیک یہی معاملہ قادیانیت کا ہوا۔ ۱۸۸۹ میں غلام احمد قادیانی نے اس کی تشکیل کی۔ اس کے بعد اس نے دعوی کر دیا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے۔ مگر ۱۹۱۴ میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مرزا البشیر الدین محمود کو جانشین بنایا گیا۔ بیٹے نے اعلان کر دیا کہ اس کا باپ پیغمبر نہیں تھا۔ وہ صرف ریفارمر تھا۔ یہاں موقع تھا کہ دوبارہ بیٹے کو استعمال کرکے قادیانی فتنہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر عداوت کی نفسیات کی بنا پر یہاں کے مسلمان نہ اس راز کو سمجھ سکے اور نہ اس کو استعمال کر سکے۔ چنانچہ یہ امکان بالکل غیر استعمال شدہ رہ گیا۔ یہاں تک کہ شور و غل کی سیاست نے قادیانی فتنہ کو وہاں پہنچا دیا جہاں آج آپ اس کو دیکھ رہے ہیں۔

برطانیہ کے زمانہ قیام میں مسلسل لوگوں سے، خاص طور پر اہل علم سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور ان سے اسلام اور ملت اسلام کے مسائل پر تبادلۂ خیال جاری رہا۔

ڈاکٹر خالد علوی یہاں ایک یونیورسٹی میں سینئر پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ڈیڑھ سال پہلے ان کی ایک ملاقات برطانی پارلی منٹ کے ڈپٹی لیڈر رائے ہرٹلے (Roy Hertley) سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ برمنگھم میں کم از کم دو ایسے انتخابی حلقے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر پارلیمنٹ کے انتخاب میں کبھی کوئی مسلم یہاں سے کامیاب ہوکر نہیں آتا۔ آپ لوگ مسلمانوں کو ٹکٹ دیتے ہیں۔ ہرٹلے نے جواب دیا کہ جب ایک مسلمان مسلمان کی حیثیت سے منتخب ہوکر ایم پی بنے گا تو وہ برٹش پارلی منٹ کے خاتمہ کا دن ہوگا:

When a Muslim on the basis of being Muslim is elected as M.P. that will be the end of British Parliament.

پروفیسر اینڈرسن (Anderson) سے ڈاکٹر علوی کی بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ مسلمانوں کے ساتھ غیریت برتتے ہیں، حالاں کہ مسلمان مسیح کو پیغمبر سمجھتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس یہود کو آپ اپنا سمجھتے ہیں حالاں کہ انھوں نے مسیح کو سولی پر چڑھایا اور ان کو جھوٹا بتایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کو ذہن میں رکھئے کہ مسیح ایک یہودی تھے:

Keep in mind that Jesus was a Jew.

اس قسم کی بے شمار غیر موافق باتیں ہیں، اس کے باوجود مسلمان یہاں کے ماحول سے موافقت کرکے رہتے ہیں۔ یہی موافقت زندگی کا راز ہے، خواہ کوئی مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔

ایک صاحب سے پرنس چارلس کے اس خطبہ کا ذکر ہوا جو انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں دیا تھا۔ اور جس میں اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ خطبہ یہاں کے فارن آفس نے تیار کیا تھا۔ اور اس کے پیچھے سیاسی مقصد تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی پرنس چارلس مڈل ایسٹ کے دورہ پر جانے والے تھے۔ چنانچہ عین اندازہ کے مطابق، وہاں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔

انھوں نے کہا کہ البتہ اس سے زیادہ بڑی بات وہ تھی جو پرنس چارلس نے ایک انٹرویو میں کہی۔ برطانیہ کا بادشاہ روایتی طور پر (مسیحی) مذہب کا ڈیفنڈر سمجھا جاتا ہے۔ مگر چارلس نے کہا کہ اس ملک میں کئی مذاہب ہیں، اس لئے میں ہر مذہب کا ڈیفنڈر بننا پسند کروں گا نہ کہ کسی خاص مذہب کا:

I want to be defender of faith not the faith.

آٹھ سال پہلے ایک انگریزی کتاب چھپی۔ اس میں خدا کے وجود پر شبہ ظاہر کیا گیا تھا:

Hugh Monte Fiore, The Probability of God.

اس کتاب پر بی بی سی نے ایک مباحثہ کا انتظام کیا تھا۔ اس کا ویڈیو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ہر مذہب کے لوگ تھے۔ انھوں نے مختلف باتیں کہیں۔ ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ خدا محبت اور حسن ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ خالق کو کس نے پیدا کیا (who created the Creator) ایک صاحب نے کہا کہ کیا خدا نے انسان کو پیدا کیا یا انسان نے خدا کو پیدا کیا:

Man created God or God created man?

احمد دیدات صاحب بھی حاضرین میں موجود تھے۔ خاتون کنڈکٹر نے سوال کیا کہ اسلام میں جنگ کی تعلیم ہے۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ ہاں اسلام میں دفاع کے لئے جنگ کی اجازت ہے اور میں آپ کو قابل احترام سمجھتا ہوں (I take my hat off to you) کہ دوسری عالمی جنگ میں

جب ہٹلر نے آپ کے ملک پر حملہ کیا تو آپ نے مسیح کی تعلیم کے مطابق ایسا نہیں کیا کہ جو ایک گال پر ما
اس کو دوسرا گال بھی پیش کر دو بلکہ آپ نے اسلام کی تعلیم کے مطابق اس کی جارحیت کا دفاع کہ
اس مباحثہ کا ویڈیو ٹیپ اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل میں موجود تھا۔ اس کو میں نے وی سی
پر دیکھا۔

یورپ میں اور برطانیہ میں فلاحی ریاست (ویلفیر اسٹیٹ) کا بہت چرچا ہے۔ مگر اس
تجربہ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوا۔ پورے یورپ میں سویڈن کو سب سے زیادہ کامیاب فلا
ریاست سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بچہ ابھی پیٹ میں ہوتا ہے کہ اس کا الاؤنس (ternity allowance
جاری ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پیدائش سے لے کر موت تک ہر قسم کی ضرورتوں کی ذمہ د
ریاست ہوتی ہے۔ مگر اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ خودکشی کی شرح سب سے زیادہ سوی
میں پائی جاتی ہے۔

اس دنیا میں انسان کی اصل ضرورت راحت نہیں ہے بلکہ چیلنج ہے۔ راحت زندہ انس
کو مردہ بناتی ہے اور چیلنج مردہ انسان کو زندہ کر دیتا ہے۔

۱۳ اگست کی شام کو برسٹل میں پروگرام تھا۔ ساڑھے تین بجے برمنگھم سے روانگی ہو
دونوں شہروں کے درمیان بہت عمدہ چوڑی سڑک ہے جس کو یہاں کی زبان میں موٹر وے کہا ج
ہے۔ سڑک کے دونوں طرف نہایت سرسبز مناظر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ درمیان میں ایک
ویلکم بریک (Welcome break) کے نام سے سڑک کے کنارے بہت کشادہ جگہ تھی۔ آنے جا
والے یہاں کار پارک کر کے ٹھہرتے ہیں۔ یہاں باتھ روم، ٹیلیفون، ریستوران اور سروس وغیرہ
سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ہر چیز اعلیٰ معیار پر نظر آئی۔

دو گھنٹہ سفر کر کے ہم لوگ برسٹل میں داخل ہوئے۔ یہ شہر بہت خوبصورت دکھائی دیا۔ یہا
جناب امداد علی احمد صاحب کے مکان پر کچھ دیر کے لئے ٹھہرے۔ یہاں کچھ لوگ موجود تھے جن سے گفتگ
ہوتی رہی۔ برسٹل میں تقریباً چھ ہزار مسلمان ہیں۔ اور چار مسجدیں ہیں۔ مغرب کی نماز یہاں
جامع مسجد میں پڑھی۔ یہ مسجد ایک گرجا کو خرید کر بنائی گئی ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ مغرب ک
نماز کے بعد خطاب ہوا۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں جو انقلاب لائے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو ملا کر کل ۱۰۲۰ لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس انقلاب کو غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے غیر خونی انقلاب بھی رسول اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ اسلام کے نام پر خونیں انقلاب لانے کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں۔ مگر اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا وقفہ تھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ حضرت عمر ایک بار بائبل کا ایک حصہ لائے اور اس کو پڑھنے لگے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ پھر کیا مسلمانوں کے لئے بائبل کو پڑھنا جائز نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ وقتی بات تھی۔ جس زمانہ میں قرآن اتر رہا تھا، اس زمانہ میں حدیث کو بھی لکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے ساتھ کوئی دوسرا کلام خلط ملط نہ ہونے پائے۔ مگر جب قرآن مدون ہو گیا تو بعد کو علماء نے بڑے پیمانہ پر بائبل کا مطالعہ کیا اور اس کے بارہ میں کتابیں لکھیں۔ مثلاً ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح۔ اسپین میں مسلمانوں نے بائبل پر اتنی مہارت پیدا کی کہ عیسائی لوگ مسلم علماء کے یہاں بائبل کا درس لینے کے لئے آتے تھے۔ وغیرہ

برطانیہ کے زمانۂ قیام میں میں نے یہاں کی مختلف مسجدوں میں نماز پڑھی۔ ہر جگہ میں نے دیکھا کہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر مسجد کے اندر اذان دی جاتی ہے۔ موذن مسجد کی چھت پر بھی اس کے لئے کھڑا نہیں ہوتا۔ مؤذن کی آواز صرف مسجد کے اندرونی حصہ میں سنائی دیتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہر کے ملکوں میں مسلمان کس طرح وہاں کے نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں۔

لندن کے اردو اخبار جنگ (۱۳ اگست ۱۹۹۴) میں صفحہ اول کے نیچے یہ خبر تھی کہ نسل پرست غنڈوں نے جرمنی میں ایک مسجد کو آگ لگا کر شہید کر دیا ہے۔ آگ جرمنی کے جنوب میں واقع سنگن شہر میں لگائی گئی جس سے وہاں کی مسلم آبادی میں سخت تشویش پھیل گئی ہے۔ جرمنی میں نسل پرستوں کے حملوں میں گزشتہ دو سال میں تشویشناک اضافہ ہو گیا ہے۔ سٹٹ گارڈ پولیس نے بتایا کہ مسجد میں آگ لگانے کا واقعہ ایک نواحی قصبہ میں ایک اسلامی ثقافتی مرکز میں آتش زدگی

کے ایک روز بعد ہوا۔ بتایا گیا کہ دونوں واقعات میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔ البتہ بھاری مالی نقصان ہوا ہے۔ آگ رات کے وقت لگائی گئی جب کہ دونوں ادارے بند تھے۔ گزشتہ چھ ماہ کے کے دوران ترکوں کے کاروباری اداروں اور ثقافتی مراکز پر ۱۸ حملے ہوئے ہیں جن میں چھ افراد زخمی ہو گئے ہیں۔ جرمنی میں ترکوں کی آبادی ۱۸ لاکھ ہے جن میں ایک چوتھائی کرد ہیں۔ اس طرح کے واقعات یورپ میں ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں ان کے خلاف کسی احتجاجی مہم کا کوئی وجود نہیں۔

صفحہ آخر کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ بنگلہ دیش کی متنازعہ تسلیمہ نسرین اس وقت سویڈن میں ہے۔ اس نے یہاں ایک محفوظ جگہ رہائش اختیار کی ہے۔ خبر کے مطابق تسلیمہ نسرین جب سویڈن پہنچی تو سویڈن کی خاتون وزیر خارجہ مارگریتھ نے ایئر پورٹ پر اس کا استقبال کیا۔ تسلیمہ نسرین ایک گمنام اور غیر اہم خاتون تھی۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف شور و غل کر کے اس کو انٹرنیشنل اہمیت دیدی۔

مسٹر نذر ملک پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۴ اگست کی ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادتی ہوتی ہے۔ ان کو گورنمنٹ سروس نہیں دی جاتی۔ میں نے کہا کہ یہ بعض انفرادی واقعات کا جنرلائزیشن ہے۔ اور اس طرح کے انفرادی واقعات ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا اس وقت کثیر تعداد میں مسلمان گورنمنٹ سروس میں موجود تھے۔ مگر اس وقت یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں ملازمین اور تعلیم یافتہ اصحاب انڈیا چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ اس کمی کو پاکستانی علاقہ سے آنے والے ہندوؤں نے پر کیا۔ اس طرح اچانک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ اور اس طرح کا خلا جب ایک بار پیدا ہو جائے تو دوبارہ اس کے پر ہونے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ پاکستان میں بھی ہم ٹھیک اسی صورت حال کا تجربہ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں لوگ کہتے ہیں کہ اردو اسپیکنگ مہاجرین سروسوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ پاکستان سے ہندو ملازمین جب انڈیا چلے گئے تو ان جگہوں کو انڈیا سے آنے والے مسلم مہاجرین نے پر کیا۔ اس طرح سابقہ توازن ٹوٹ گیا۔

۱۴ اگست کو برمنگھم کی جامع مسجد میں سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ ظہر کی نماز اس مسجد میں پڑھی۔

نماز کے بعد سیرت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کے لئے میں نے اس آیت کو موضوع بنایا: عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا۔ اس جلسہ میں برمنگھم کے لارڈ میر بھی آئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اسلام کے بارہ میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔

شام کو نماز عصر کے بعد جناب شمشاد محمد خاں صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ عورت اور مرد جمع ہوئے۔ اس میں ایک مفصل تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جدید علمی اور تاریخی حقائق نے دوسرے مذاہب کی صداقت کو مشتبہ کر دیا ہے۔ مگر یہ حقائق اسلام کی صداقت کو ری اسٹیبلش کر رہے ہیں۔ اس نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے لئے نئے زیادہ طاقت ور مواقع پیدا کر دئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو استعمال کیا جائے۔ تقریر کے بعد دیر تک سوال وجواب کا پروگرام رہا۔

ایک سوال یہ تھا کہ قرآن میں اصحاب رسول کے بارہ میں ہے کہ فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا مگر حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ اس کی تردید کرتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ استثنا (exception) کے ذریعہ عموم (rule) کو کاٹ رہے ہیں اور یہ طریقہ سراسر غیر علمی ہے۔ اس دنیا کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں ہر عموم میں استثنا موجود ہوتا ہے۔ جو بیان (اسٹیٹمنٹ) دیا جاتا ہے وہ ہمیشہ عموم کے پیش نظر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک معہود ذہنی ہے کہ اس میں استثنا بھی پایا جائے گا۔ اس لئے نہ اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور نہ اس سے عموم کی تردید ہوتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ دوسری مذہبی کتابیں محرف ہیں اور قرآن غیر محرف۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی تفسیریں میں بے شمار اختلافات موجود ہیں۔ کیا یہ اختلافات اس کی تردید نہیں ہیں کہ قرآن بھی اب محفوظ کتاب نہیں رہا۔ میں نے کہا کہ آپ متن اور تفسیر میں خلط مبحث کر رہے ہیں۔ دوسری مذہبی کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ اصل متن میں تحریفات ہو گئی ہیں۔ جبکہ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا متن مکمل طور پر محفوظ ہے۔ البتہ تفسیر وتشریح میں لوگوں نے اپنے خیالات شامل کر دئے ہیں۔ مگر اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیوں کہ متن محفوظ رہنے کی وجہ سے ہمارے پاس وہ کسوٹی موجود ہے جس کے ذریعہ تفسیر وتشریح کے اختلافات کو جانچ کر ان کی

صحت معلوم کی جا سکے۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم نواز شریف نے اگست ۱۹۹۴ میں برطانیہ کا دورہ کیا۔ ۳۰ اگست کو لندن کے ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر تھی، ٹاؤن ہال میں برطانیہ میں مقیم پاکستانی مسلمان بڑی تعداد میں جمع تھے۔ نواز شریف صاحب جب ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے تو ہال نعروں سے گونج اٹھا:

ایٹم بم کس نے دیا ، نواز شریف نے

انڈیا کو کس نے ڈرایا ، نواز شریف نے

پاکستان کا ہر آدمی پاکستان کی شناخت اسلام بتاتا ہے، مگر اس قسم کے نعرے سراسر اسلام کی ضد ہیں۔ اگر واقعۃً پاکستان ایک اسلامی ملک ہوتا اور نواز شریف حقیقی معنوں میں اس کے اسلامی حکمراں رہے ہوتے تو ٹاؤن ہال کے نعرے یہ ہوتے:

پاکستان کو اسلامی معاشرہ کس نے بنایا ، نواز شریف نے

انڈیا سے پرامن تعلقات کس نے قائم کئے ، نواز شریف نے

مذکورہ نعرے بلاشبہ قومی جاہلیت کے نعرے ہیں نہ کہ اسلامی اصول پسندی کے نعرے۔ قوم پرستی نفرت کلچر پیدا کرتی ہے، اور خدا پرستی اس کے برعکس رحمت کلچر۔

۱۵ اگست کو واپسی کا دن تھا۔ جناب شمشاد محمد خاں صاحب کے ساتھ برمنگھم سے لندن کے لئے روانہ ہوا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچا۔ جناب شمشاد صاحب میرا ٹکٹ لے کر کھڑکی پر گئے تاکہ بورڈنگ کارڈ اشو کرائیں۔ مگر وہاں ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ کلرک نے کہا کہ اس کے اندر واپسی کی سلپ موجود ہی نہیں۔ کسی غلطی سے وہ دہلی ایئرپورٹ پر کھوئی گئی تھی۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں، یہ لوگ بہت ہلپ فل ہوتے ہیں"۔ شمشاد صاحب نے کہا اور فوراً وہ اس کاؤنٹر پر گئے جو ٹکٹ کے مسائل کے لئے مخصوص تھا۔ وہاں ایک معمر خاتون کھڑکی کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرا ٹکٹ لیا اور کچھ کہے بغیر فوراً کمپیوٹر پر اپنی انگلیاں چلانے لگی۔ اس طرح وہ دیر تک اس کو جانچتی رہی۔ آخر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ ایک جینوئن کیس ہے۔ اس کے بعد اس نے مزید کارروائی کر کے نئی سلپ ہمیں دیدی۔ اس کی بنیاد پر ہم کو بورڈنگ کارڈ مل گیا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ یہی حادثہ اگر کسی مسلم ملک کے ایئرپورٹ پر پیش آتا تو شاید وہ ٹکٹ پھینک دیتا اور کہتا کہ جاؤ ہم کو پریشان

مت کرو۔

ابھی وقت کافی تھا، ہم لوگ ایئر پورٹ کے ہوٹل میں چلے گئے۔ جس میز پر بیٹھ کر ہم نے چائے پی وہاں ہوٹل کے مینیجمینٹ کی طرف سے ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ اگر آپ یہاں کوئی چیز خریدیں اور اس کے بعد آپ اس سے مطمئن نہ ہوں تو ہم آپ کی رقم آپ کو لوٹا دینگے:

We'll refund your money if you're not happy with anything you buy. And 'that's guaranteed.

ہوٹل میں ایک ہندستانی نوجوان ملازم تھا۔ وہ میز کرسی وغیرہ درست کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں دس سال سے ہے۔ اس کی تنخواہ ہندستانی معیار سے تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ ہے۔ اس طرح کا ایک معمولی ورکر ۲۵ ہزار روپیہ مہینہ انڈیا میں حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے وطن سے بھاگ کر یہاں چلے آرہے ہیں۔ جن لوگوں کے خلاف ہندستانیوں نے آزادی کی لڑائی لڑی تھی، انھیں کی غلامی میں دوبارہ وہ خود اپنے آپ کو دے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں سیاست سے زیادہ اہمیت اقتصادیات کی ہے۔

جناب شمشاد صاحب سے رخصت ہو کر ایئر پورٹ کے اندر داخل ہوا۔ یہاں اسکرین پر مختلف ہوائی جہازوں کے اوقات بتائے جارہے تھے۔ ہانگ کانگ کی پرواز بالکل تیار تھی۔ چنانچہ اس کے نام کے آگے روشن حروف میں بار بار آرہا تھا کہ آخری کال (last call) میں نے سوچا کہ انسانوں کے لئے بھی اسی طرح "آخری کال" آتی ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو آخری کال کی اس آواز کو سن سکیں۔

لندن سے برٹش ایئرویز کی فلائٹ ۲۵ا کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں برٹش ایئرویز کا انفلائٹ میگزین ہائی لائف (high life) کا شمارہ اگست ۱۹۹۴ پڑھا۔ اس کے ایک مضمون میں مشہور کھلاڑی لن فورڈ کرسٹی (Linford Christie) کے حالات بتائے گئے تھے۔ ایک صفحہ پر مذکورہ کھلاڑی کی ہنستی ہوئی تصویر تھی۔ اسی کے ساتھ اس کی ایک اور تصویر تھی جس میں وہ بھاری وزن اٹھائے ہوئے تھا اور اس کے چہرہ پر مشقت کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے یہ جملہ لکھا ہوا تھا کہ فاتحانہ مسکراہٹ سخت تربیت کے بعد حاصل ہوتی ہے:

Hard training brings the smile of success.

یہ صرف کھیل کی بات نہیں ہے۔ یہ پوری زندگی کے لئے فطرت کا قانون ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کی خوشی صرف وہ آدمی حاصل کرتا ہے جو محنت و مشقت کی صعوبت کو برداشت کرکے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنائے۔

۱۶ اگست ۱۹۹۴ کی دوپہر کو ہمارا جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اس وقت ہندستان کی گھڑیوں میں گیارہ بج رہے تھے جبکہ لندن میں اس وقت ساڑھے ۶ بجے کا وقت تھا۔ جب میں دہلی سے لندن پہنچا تو میں نے ساڑھے چار گھنٹے کھو دئے تھے۔ لیکن جب میں لندن سے واپس ہوکر دہلی آیا تو میں نے ساڑھے چار گھنٹے دوبارہ حاصل کر لئے۔ یہی اس دنیا کا نظام ہے۔ یہاں ہر کھونے کے ساتھ پانا بھی جڑا ہوا ہے۔ اگر آپ کو کھونے کا تجربہ ہو تو آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ سادہ طور پر صرف انتظار کی پالیسی اختیار کرلیں۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کھویا تھا اس کو دوبارہ آپ نے پالیا ہے، اور اکثر مزید اضافہ کے ساتھ۔

الترمذی، کتاب الدعوات کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: افضل العبادة انتظار الفرج (کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے) اس حدیث کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مسئلہ پیش آنے کے وقت انسان اگر بے صبر نہ ہو، وہ معاملہ کو اللہ پر ڈالتے ہوئے انتظار کا طریقہ اختیار کرلے تو عنقریب وہ دیکھے گا کہ جہاں بظاہر تنگی تھی وہیں اللہ نے اس کے لئے کشادگی کا امکان بھی رکھ دیا تھا۔

۱۔ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمایندہ مہندر پرتاپ سنگھ نے ۲۶ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر الکشن کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پارٹیوں کو چاہیے کہ وہ نیشنل اشو کو اشو بنائیں، چھوٹے چھوٹے اشو کو ابھارنے میں ملک تباہ ہو جائے گا۔

۱۔ مرکز تلیفون الشرق الاوسط (Middle East Broadcasting Centre) کے نمایندہ مصری صحافی رفعت یحییٰ (کرسپانڈنٹ ساوتھ سنٹرل ایشیا) ۲۵ اپریل ۱۹۹۶ کو اپنی ٹیم کے ساتھ مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی اور تعلیمی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ الکشن (اپریل۔ مئی ۱۹۹۶) میں خواہ کوئی بھی پارٹی جیتے، مسلمانوں کے معاملات خود اپنی تعمیری کوشش سے درست ہوں گے نہ کہ کسی پارٹی کو ہرانے یا جتانے سے۔

۱۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کے زیر انتظام ۱۴ مئی ۱۹۹۶ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس کا موضوع تھا: سوشل ورک اینڈ والنٹری ایکشن۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر مذہبی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا۔

۴۔ امریکی روزنامہ لاس اینجلیز ٹائمس کے نمایندہ مسٹر امید شرما نے ۱۶ مئی ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلامی مرکز سے لے کر مسلمانان ہند کے مسائل تک تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کو کسی بیرونی دشمن کا خطرہ نہیں ہے۔ ان کا مسئلہ صرف تعلیم ہے اور اب مسلمان اس محاذ پر یکسوئی سے لگ رہے ہیں۔

۵۔ ایسوسی ایشن آف پیپلس آف ایشیا اور اکھل بھارت رچناتمک سماج کے زیر انتظام ۱۵۔۱۷ مئی ۱۹۹۶ کو وائی ایم سی ہال (نئی دہلی) میں انڈیا اور پاکستان دوستانہ اجتماع (Indo-Pak Amity Meet) کا انعقاد ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی اہمیت پر تقریر کی۔

۶- فرنچ نیوز ایجنسی (نئی دہلی) کے نمایندہ مسٹر ابھیک کمار چندا نے ۱۶ مئی ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت بننے سے مسلمانوں کے لیے کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ آزادی اور جمہوریت اور اقوام متحدہ کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں کوئی حکومت کسی کمیونٹی کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی۔

۷- جرمنی کی ایک خاتون برونس جولیا ایکرٹ (Julia Eckert) ہندو مسلم تعلقات نیز مسلم اور غیر مسلم تعلقات پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ وہ ۱۷ مئی ۱۹۹۶ کو مرکز میں آئیں اور اس موضوع پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات کے بگاڑ کا سبب اسلام کی تعلیمات نہیں ہیں۔ یہ صرف نا اہل مسلم رہ نماؤں کی غلط رہ نمائی کا نتیجہ ہیں۔

۸- دور درشن کی ٹیم نے ۲۳ مئی ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ محرم کے تعلق سے یہ انٹرویو امام حسینؓ کے تاریخی کردار کے بارہ میں تھا۔ اس سلسلہ میں علماء اسلام کے نقطۂ نظر کو بتایا گیا۔

۹- ہندی اخبار ہمالیہ درپن کے نمایندہ سندیپ سوربھ نے ۲۴ مئی ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملک کے موجودہ سیاسی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان یہ مانتے ہیں کہ اس ملک میں ڈیموکریسی ہے۔ اس لیے ہر پارٹی کو برابر کا سیاسی حق حاصل ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ دستور ہند کی پابند ہو اور رفیر الکشن کے ذریعہ اوپر آئی ہو۔

۱۰- امام حسینؓ کی شہادت اور ان کے تاریخی رول کے موضوع پر صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۹ مئی ۱۹۹۶ (۱۰ محرم) کو آل انڈیا ریڈیو (ہندی وارتا) سے نشر کی گئی۔

۱۱- کناڈا کی خاتون اسکالر روتھ لا ملائے (Ruth Lor Malloy) انڈین گائڈ کے نام ایک کتاب تیار کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۳۰ مئی ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں

تھا۔ مختلف پہلوؤں سے انھیں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں معلومات دی گئیں۔

۱۲۔ ہندی روزنامہ جن ستہ کے نمایندہ (Mr Jyotirmay) نے ۱۰ جون ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اجودھیا کے مسئلہ کو آربٹریشن ایکٹ کے تحت حل کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ خاتون جرنلسٹ ٹی این بھارتی نے ۱۴ جون ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نوبھارت ٹائمس کے لیے تھا۔ زیادہ تر سوالات کا تعلق نئی مرکزی حکومت کے بارہ میں مسلم ردعمل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مرکز میں کوئی بھی حکومت آئے، وہ مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی حکومت نہ لامحدود اختیار کی مالک ہوتی اور نہ لامحدود مدت کی۔ مختلف قسم کے ملکی اور غیر ملکی حالات ہر حکومت کو عملی طور پر معتدل بنا دیتے ہیں۔

اُردو

کتاب	Rs
تذکیرالقرآن جلد اول	200/-
تذکیرالقرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

کتاب	Rs
تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیات اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

کتاب	Rs
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/

ھنـدی

کتاب	Rs
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتتی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

Title	Rs.
God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam The Voice of Human Nature	30/-
Islam Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۶ شمارہ ۲۳۹

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کردی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطور خود اور مقامی اصحاب خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-469733

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

میرٹھ کا سفر

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو دہلی سے میرٹھ (سردھنہ) کا سفر ہوا۔ یہ سفر بذریعہ کار تین گھنٹہ میں طے ہوا۔ میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی اور حکیم محمد کلیم صاحب شریکِ سفر تھے۔

دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے جگہ جگہ دکھائی دیا کہ صفائی کا کوئی اہتمام نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے تمام متعلق محکموں کے نام حکم جاری کیا تھا کہ وہ دہلی میں صفائی کا اعلیٰ اہتمام کریں اور اس کو خوب صورت شہر بنائیں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس ذیل) مگر دہلی آج بھی مجھے ویسی ہی نظر آئی جیسی وہ عدالت عالیہ کے اس حکم سے پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام اور سرکاری عملہ دونوں میں قانون کی تعمیل کا جذبہ موجود نہیں۔ پھر حکم جاری کرنے سے کیا فائدہ۔

عدالتِ عالیہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ گھروں گھروں میں پلاسٹک کی تھیلیاں فراہم کی جائیں۔ لوگ ان تھیلیوں میں اپنے گھر کا کوڑا ڈال کر اسے سڑک پر رکھ دیں اور صبح کو صفائی کرمچاری اسے اٹھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کوڑا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں اس کی سوسائٹی نے ایک سال پہلے اپنی کالونی کے لیے یہی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ گھر والے اپنا کوڑا

New Delhi, March 1: The Supreme Court today ordered all civic agencies to have Delhi cleaned and scavenged every day and directed both the state and the Union government to make it a "greener, cleaner place to live in". The directions were passed by a division bench comprising Mr Justice Kuldip Singh and Mr Justice Saghir Ahmed on a public interest litigation filed by a lawyer, B. L. Wadhera. The court approved an experimental scheme of the Municipal Corporation of Delhi and the New Delhi Municipal Committee for distribution of polythene bags for garbage disposal to the citizens of selected localities. The court directed that these garbage disposal bags should be collected in cleaned receptacles provided by the civic agencies to prevent garbage from being spread all over the garbage collection centres and on the nearby roads. The Central Pollution Control Board and the Delhi Pollution Committee will have the responsibility to ensure that this garbage disposal system works efficiently by deputing inspection teams and reporting the situation to the apex court every two months.

The Times of India, New Delhi, March 2, 1996.

پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کر کے سڑک پر رکھنے لگے۔ مگر جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کیوں کہ ردی پلاسٹک اکٹھا کرنے والے لڑکے یہ کرتے تھے کہ وہ کوڑا سڑک پر الٹ دیتے اور تھیلی لے کر بھاگ جاتے۔

کچھ عرصہ سے ہندستان میں ایک چیز کی بڑی دھوم ہے۔ اس کو جوڈیشیل ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔ اخباروں میں ہر روز اس کے بارہ میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ اس کے دفاع میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اے ایم احمدی نے دہلی میں ایک تفصیلی لکچر دیا۔ یہ لکچر دو قسطوں میں جوڈیشیل ایکٹوزم (Judicial Activism) کے عنوان سے ٹائمس آف انڈیا ۲۷ - ۲۸ فروری ۹۶ء میں چھپ چکا ہے۔

اس طویل تحریر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوڈیشیل ایکٹوزم یا عدالت کا جارحانہ رول (aggressive role) دستوری طور پر درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ قانونی نہیں ہے بلکہ عملی ہے۔ بہتر سماج یا بہتر سماج کی تشکیل میں قانون کا رول بہت جزئی ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ عوام کے اندر احساس ذمہ داری ہو اور انتظامی عملہ دل سے اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے آمادہ ہو۔ اس لیے پہلا کام اصلاح افراد کا ہے نہ کہ اصلاح حکومت کا۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ اسلام کے نام پر انقلابی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عام طور پر اسلامی بیداری (صحوۃ اسلامیہ) کہا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہیں اور ہر جگہ "اسلامی قانون نافذ کرو" کے مطالبہ کا ہنگامہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے وہ اسی طرح بے سود ہے جس طرح ہندستان کا موجودہ جوڈیشیل ایکٹوزم۔

ہندستان میں عدالتی فیصلوں کے نفاذ کے لیے اس کے موافق حالات موجود نہیں ہیں۔ اس لیے فیصلوں کے باوجود عملاً ان کا نفاذ نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں کسی بھی مسلم ملک میں وہ موافق سماجی فضا موجود نہیں ہے جو اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے بالفرض اگر کسی ملک میں نام نہاد اسلام پسندوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ حکومتی اداروں کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ شروع کر دیں تو وہاں اسلام کا قانون تو نافذ نہیں ہوگا،

البتہ اسلام لوگوں کی نظر میں مضحکہ ضرور بن جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد ہماری گاڑی دہلی سے نکل کر یوپی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اسی کے ساتھ ہم لوگ ایک اور ذہنی سفر میں مشغول ہو گئے۔ پورے راستہ میں سوال وجواب کی صورت میں مختلف موضوعات پر ہماری گفت گو جاری رہی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے موجودہ زمانہ میں انسان کو ایسی خود کار سواریاں دے دی ہیں کہ آدمی سفر بھی کرے اور عین اسی وقت وہ اپنا دوسرا کام بھی جاری رکھے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ آج کل سفر بہت آرام دہ ہو گیا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سفر میں کبھی کبھی طبیعت چاہتی ہے کہ قصر کرنے کے بجائے مکمل نماز پڑھی جائے تاکہ شکر ادا کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں گنجائش بھی ہے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قصر ایک رخصت ہے، اور مکمل نماز پڑھنا افضل ہے۔ پھر سفر میں پوری نماز پڑھنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں اس کی بابت آیا ہے کہ تلك صدقة تصدّق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (یہ اللہ کی طرف سے ایک صدقہ ہے، پھر تم اللہ کے صدقہ کو قبول کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جو تقابل ہے وہ رخصت اور افضل کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ رخصت اور صدقہ کے درمیان ہے۔ یعنی آپ اگر رخصت پر عمل نہ کریں تو آپ افضل کو نہیں لیں گے بلکہ خدا کے ایک عطیہ کو لینے سے انکار کریں گے۔ اور خدا کے عطیہ کو نہ لینا نعوذ باللہ خدا کی ناقدری ہے نہ کہ کوئی افضل عمل۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بیشتر اقدامات تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کا سبب غلط تقابل کی یہی فکری غلطی تھی۔ مثلاً پچھلے دو سو سال میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں جہاد کے نام پر بار بار ٹکراؤ کیا۔ لیکن ہر بار صرف تباہی اور بربادی ان کے حصہ میں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جہاد کا تقابل فرار سے کیا۔ وہ سمجھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ فرار کو چھوڑ کر جہاد کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ حالاں کہ ایسے تمام مواقع پر اصل تقابل جہاد اور اعداد میں تھا۔ یعنی ٹکراؤ نہ کرکے ان کے لیے پر امن تعمیر کے میدان میں سرگرم ہونے کا موقع تھا۔ لیکن غیر ضروری طور پر وہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پر امن تعمیر کے نہایت

قیمتی مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں عبادت گزاری بڑھ رہی ہے۔ مگر اخلاقیات میں تنزل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ایک دین داری وہ ہے جو معرفت کی سطح پر ہو۔ دوسری دین داری وہ ہے جو عادت کی سطح پر ہو۔ آج کل کے لوگ زیادہ تر عادت کے تحت عبادت گزار بن گئے ہیں۔ لیکن اخلاق میں تبدیلی عارفانہ عبادت گزاری سے پیدا ہوتی ہے اس کو آپ شعوری عبادت گزاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ عادت کے تحت جو عبادت گزاری کی جائے اس سے ایک قسم کی نفسیاتی تسکین تو مل سکتی ہے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ آدمی کے اندر اخلاقی انقلاب پیدا کر سکے۔

ایک سوال یہ تھا کہ تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تنقید وہ ہے جو متعلق شخص کے اعلان کردہ یا ثابت شدہ موقف پر ہو۔ اور تنقیص وہ ہے جس کا خود آدمی نے اعلان یا اقرار نہ کیا ہو۔ اس مفہوم میں تنقید پوری طرح جائز ہے، اور تنقیص مکمل طور پر ناجائز۔

مثلاً الرسالہ میں صبر و اعراض کی پالیسی پر زور دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صبر و اعراض کا نام لے کر الرسالہ پر تنقید کرے تو یہ اپنے طریقہ کے اعتبار سے ایک جائز تنقید ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص الرسالہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ "الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے" اور پھر اس پر تنقید کرے تو یہ تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہوگی۔ کیوں کہ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ مسلمان بزدلی کی روش اختیار کر لیں۔ یہ دوسروں کی گھڑی ہوئی بات ہے نہ کہ ہمارا اپنا اعلان کردہ موقف۔

انھوں نے دوبارہ کہا کہ غیبت کی تعریف حدیث کی کتابوں میں یہ آئی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جائے۔ یہی تعریف خود تنقید پر بھی صادق آتی ہے، کیوں کہ تنقید میں بھی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جاتی ہے، حالاں کہ غیبت حرام ہے اور تنقید کو جائز ہونا چاہیے۔ پھر دونوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے۔

میں نے کہا کہ محض غیر موجودگی کی بنا پر کوئی تنقید غیبت نہیں بن جاتی۔ ہمارے مدارس میں اپنے امام کے سوا دوسرے اماموں کے مسلک پر تنقید کی جاتی ہے۔ حالاں کہ زیر تنقید امام وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مگر کوئی بھی اس کو غیبت نہیں قرار دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیبت کا تعلق اس

برائی سے ہے جو آدمی کا اپنا اعلان کردہ مسلک نہ ہو۔ جب کہ تنقید کا تعلق اس مسلک سے ہوتا ہے جس کا آدمی نے پہلے ہی علی الاعلان اقرار کر رکھا ہے۔ پھر اس کو غیبت کیسے کہا جائے گا۔

جو لوگ تنقید کو برا مانتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ہمارے مسلک کا ذکر کیوں کیا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مسلک پر تنقید کیوں کی۔ اگر ان کے مسلک کا صرف تذکرہ کیا جائے تو وہ خوش ہوں گے۔ البتہ جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ ناخوش ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کی ناخوشی تذکرۂ مسلک پر نہیں ہے بلکہ تنقید مسلک پر ہے۔ جب کہ غیبت وہ ہے جس میں خود تذکرہ ہی آدمی کے لیے ناخوشی کا باعث بن جائے۔

"جو لوگ پیغامِ حق سننے سے پہلے مر گئے ان کا انجام کیا ہوگا" ——— اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں، اور ہم غیب کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے مکلف نہیں۔ میں نے کہا کہ پچھلے زمانہ میں لوگوں نے اس طرح کے سوالات پر بہت زیادہ بحثیں کیں۔ مگر یہ تمام تر فلسفہ کے زیر اثر تھا نہ کہ اسلام کے زیر اثر۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ تم کو علم قلیل (الاسراء ۸۵) دیا گیا ہے، اس لیے تم ان پر بحث نہ کرو۔ مگر قدیم فلسفہ کا موقف چوں کہ یہ تھا کہ انسان علم کلی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے زیر اثر لوگ اس طرح کے سوالات میں تعمق کرنے لگے۔

مگر موجودہ زمانہ کا غالب علم سائنس ہے۔ اور سائنس نے اس قسم کے تمام سوالات کا آخری جواب دے دیا ہے۔ سائنس نے بتایا کہ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر علم کلی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کو اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہیے۔ اس تحقیق کے بعد اب قرآن کا موقف ہی خود علمی اعتبار سے بھی واحد صحیح موقف بن گیا ہے (تفصیل کے لیے: مذہب اور سائنس)

جب بھی بذریعہ روڈ میں کسی سفر پر جاتا ہوں تو ایک منظر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہ سڑک کے کنارے الٹی ہوئی گاڑیاں ہیں۔ اس سفر میں بھی ایک ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ یہ منظر خود دہلی کے اندر تھا۔

اس طرح کے روڈ ایکسیڈنٹ پہلے زمانہ میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف جدید مشینی دور کی خصوصیت ہے۔ سست رفتار سواریوں کا دور اس قسم کے حادثات سے تقریباً خالی تھا۔ جب

دنیا میں تیز رفتار سفر کا زمانہ آیا تو ساری دنیا کی سڑکوں پر ایکسیڈنٹ ہونے لگے۔ ہر چیز کے کچھ ایڈوانٹج ہیں اور کچھ ڈس ایڈوانٹج۔ موجودہ دنیا میں معیاری زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

سواریوں کو گزارنے کے لیے سڑک کا طریقہ بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً موریہ سلطنت جس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے، اس کے حکمرانوں نے ایسی سڑکیں بنائی تھیں جن کے ذریعہ وہ اپنی پوری سلطنت میں سفر کر سکیں۔ واضح ہو کہ ان کی سلطنت ایک طرف دریائے سندھ سے دریائے برہم پترتک اور دوسری طرف ہمالیہ پہاڑ کے کناروں سے لے کر وندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم جدید طرز کی پختہ (hard-sūrfaced) سڑکیں اس وقت بنائی گئیں جب کہ صنعتی انقلاب آیا اور مشینی سواریاں انسانوں کو لے کر دوڑنے لگیں۔

انڈیا میں سڑکوں (یا ریل کی پٹریوں) کا معیار ابھی ترقی یافتہ ملکوں کے معیار سے بہت کم ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں اور قصبات میں جو سڑکیں میں نے دیکھی ہیں ویسی سڑکیں یہاں دہلی اور بمبئی میں بھی ابھی تک پائی نہیں جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا میں نہ ریل زیادہ تیز چلائی جا سکتی ہے اور نہ کار۔
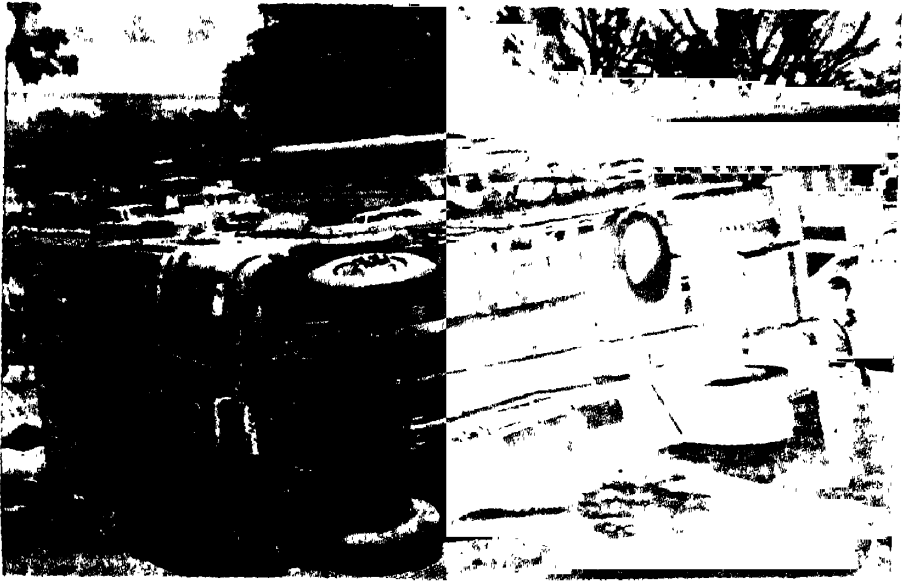
راستہ میں ہمیں میرٹھ سے گزرنا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ اور میرٹھ کے کچھ افراد سے ملاقاتیں کیں۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب کونسلر (Tel. 24610) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کچھ مسلمان بدظن ہیں اور وہ آپ کو بھاجپا کا آدمی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ لکھنؤ کے ایک بھاجپائی مسلمان کی دعوت پر لکھنؤ گئے اور وہاں ان کے زیر انتظام گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر کی۔

یہ ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کی بات ہے۔ محمد یامین صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ اتفاق سے اس وقت وہ لکھنؤ میں تھے اور وہ گنگا پرشاد میموریل ہال کے مذکورہ پروگرام میں شریک ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر تو فیصلہ بہت آسان ہے، آپ بتائیے کہ وہاں میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ انھوں نے کہا کہ شروع سے آخر تک سب آپ نے قرآن و حدیث کی باتیں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہاں اسٹیج پر نہ بھاجپا کا بینر تھا اور نہ اس کا اور کوئی نشان موجود تھا۔

میں نے کہا کہ پھر یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ وہاں کے اسٹیج سے لوگوں کے سامنے قرآن و حدیث کی بات پیش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مشرکوں کے بلانے پر ان کے یہاں گئے۔ مدینہ میں آپ یہود کے بلانے پر ان کے پاس گئے۔ یہی ہمیشہ علماء کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور جہاں اور جس اسٹیج پر بھی اسلام کی بات کہنے کا موقع ملے گا وہاں اس کو پیش کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل قدر بات ہے نہ کہ قابل اعتراض بات۔

محمد یامین صاحب نے میلہ نوچندی میگزین (۱۹۹۳) کی ایک کاپی دی۔ اس میں میرٹھ کے بارہ میں کئی مضامین تھے۔ مگر سب کے سب ادبی زبان میں تھے۔ کوئی بات بھی محدد انداز میں نہ تھی۔ اس لیے میں ان سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

یہ صرف ایک میگزین کی بات نہیں۔ یہی اردو زبان کا عام مزاج ہے۔ بدقسمتی سے اردو زبان کا مزاج اقبال جیسے شاعروں اور ابوالکلام آزاد جیسے ادیبوں نے بنایا ہے۔ یہ لوگ لفاظی اور حقیقت نگاری کا فرق نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حقیقت کو بھی لفظی گل کاری کے انداز میں بیان کیا۔ یہی روایت اردو زبان میں عام طور پر قائم ہو گئی۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص نے کہا: الرسالہ پہلا پرچہ ہے جو اردو زبان میں سائنٹفک اسلوب کو رواج دے رہا ہے۔

اردو کا مسئلہ غلط رول ماڈل کا مسئلہ ہے۔ انگریزی زبان میں نیوٹن سے پہلے شاعروں اور ادیبوں کو رول ماڈل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد جب سائنس کا غلبہ ہوا تو سائنس داں رول ماڈل بن گئے۔ اس طرح انگریزی زبان ادبی اسلوب کے دور سے نکل کر سائنسی اسلوب کے دور میں داخل ہوئی۔ اردو میں اس قسم کا انقلابی عمل پیش نہیں آیا۔ کچھ شاعر اور ادیب جو ایک بار اردو میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، سائنسی انقلاب جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آنے کی بنا پر، آج بھی وہی اشخاص لوگوں کا رول ماڈل بنے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کو بدلے بغیر اردو کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سردھنہ پہنچے جو کہ ضلع میرٹھ کا ایک قصبہ ہے۔ سب سے پہلے ہماری گاڑی تحصیل والی مسجد پر رکی۔ یہاں عصر کی نماز تیار تھی۔ چنانچہ یہاں عصر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے جو قصبہ کے بیرونی حصہ میں واقع ہے۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ سردھنہ میں ۳۶ مسجدیں ہیں۔

کسی نئی بستی میں داخل ہونے کا یہی اسلامی طریقہ ہے۔ اگر وقت ہو گیا ہو تو پہلے مسجد میں داخل ہو کر مقامی مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اور اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو دو رکعت سنت پڑھ کر اپنے لیے اور بستی والوں کے لیے دعا کریں، اس کے بعد بستی کے اندر جائیں۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ روانہ ہو کر جناب تسلیم احمد خان ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پہنچے جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۱ میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے بار بار وہ مجھے سردھنہ آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ پانچ سال بعد اب اس کی تکمیل ہوئی۔

یہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آج کل ہر انسان پریشانی میں ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں خاموش تھا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: اس لیے کہ وہ پڑوسی کو سُکھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

تسلیم احمد صاحب کے اندر ایک عجیب صفت ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں وہ ان کو مستقل طور پر یاد ہو جاتا ہے۔ سردھنہ کے ہزاروں آدمیوں کے نام ان کو مع ولدیت کے یاد ہیں۔

اس قسم کے حافظہ کو انگریزی میں فوٹوگرافک میموری کہا جاتا ہے۔ ایک صاحب سے ایک بار بات ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران مولانا آزاد کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ ان کو تو فوٹوگرافک میموری حاصل تھی۔ انھوں نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا: فوٹوجینک میموری۔ انھوں نے انگلش لٹریچر سے فرسٹ کلاس ایم اے کیا تھا۔ وہ سمجھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے میں خاموش رہا۔ چند دن کے بعد انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ تصویری حافظہ کے لیے فوٹوجینک کا لفظ نہیں ہے۔ اس کے لیے فوٹوگرافک میموری ہی ہے، جیسا کہ آپ نے کہا تھا۔

" انگریزی داں " طبقہ میں اس طرح کا اعتراف عام ہے۔ لیکن " عربی داں طبقہ " میں یہ اعترا اتنا کم ہے کہ کم از کم میں نے ابھی تک اس کا تجربہ نہیں کیا۔

تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی یادداشت ایسی ہے کہ ملاقات ہوتے ہی انھوں نے کمپیوٹر کی طرح ہر بات تاریخ وار بتانا شروع کر دیا ——— ۱۹۸۷ سے میں مسلسل الرسالہ کا قاری ہوں آپ سے میری پہلی ملاقات ۵ مئی ۱۹۹۱ کو دہلی میں ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات پونہ میں ۲ اکتوبر ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ تیسری ملاقات ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ کو دہلی میں ہوئی۔ اس ملاقات میں آپ نے سردھنہ آنے کے لیے ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ مگر چند دن بعد آپ کا خط آگیا کہ آپ اس تاریخ کو نہ آسکیں گے۔

انھوں نے اور بھی کئی باتیں یاد دلائیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ پونہ کی مجلس میں آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ لاتور کے علاقہ میں جو زلزلہ آیا ہے، کیا وہ عذاب الٰہی ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ وہ عذاب نہیں ہے بلکہ تنبیہ ہے۔ شرعی اصطلاح میں عذاب آنے کے لیے اہل حق کی ہجرت شرط ہے۔ مشترک آبادی میں کبھی عذاب مستاصل نہیں آتا۔

مغرب کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھی گئی۔ اس کا نام مسجد کمرہ نوابان ہے۔ بوڑھے امام صاحب نے یہ آیت تلاوت کی: والسماء بنیناها بأیید وانا لموسعون (الذاریات ۴۷)

اس آیت میں پھیلتی ہوئی کائنات کی فلکیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (تذکیر القرآن ۲/۱۳۰-۶۲۹) تاہم اس میں ایک بالواسطہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو توسیع پسند ہے نہ کہ جمود۔ مگر اس توسیع سے مراد سیاسی یا جغرافی توسیع نہیں، ہے بلکہ فکری توسیع

یعنی غور و فکر کے ذریعہ آدمی اپنے ذہن کو مسلسل وسیع کرتا رہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ کی وہ حالت نہ آئے جس کو فکری جمود کہا جاتا ہے۔

جناب تسلیم احمد ایڈووکیٹ کے مکان پر دیر تک نشست رہی۔ اس میں مختلف موضوعات پر گفت گو ہوئی۔

مسجد کرہ نوابان کے امام مولانا بدرالاسلام قاسمی نے بتایا کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد وہاں جو لڑائی ہوئی، اس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں موجود تھے۔ اس زمانہ میں مصری حکومت نے عربی زبان کے دو استاد دیوبند بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک شیخ عبدالمنعم النمر تھے۔ وہ آئے تو ان کے چہرہ پر داڑھی نہیں تھی۔ دیوبند کی فضا میں انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو دہلی ہوائی اڈہ پر پہنچ کر انھوں نے اپنی داڑھی منڈوادی۔ اور اس کا بال اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: خذوا لحیتکم یا اهل الهند (اے ہندستان والو، یہ اپنی داڑھی لو)

امام صاحب قاری محمد طیب صاحب کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قاری طیب صاحب نے ایک بار کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس ایک شخص آیا اور سوال کیا کہ حضرت، یزید کیسا تھا۔ مولانا نانوتوی نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: شاعر بہت اچھا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو انگریزی میں ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے جس کا براہ راست جواب دینا کسی وجہ سے مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے موقع کے لیے جواب کا یہ طریقہ بہت موزوں اور مفید ہے۔

ایک اور صاحب نے بتایا کہ ایک بار الکشن کے زمانہ میں کانگرس والوں کو معلوم ہوا کہ فلاں حلقۂ انتخاب میں تبلیغ والے بہت ہیں۔ اور اگر مولانا یوسف صاحب (سابق امیر تبلیغ) کہہ دیں تو تمام تبلیغی لوگ کانگرس کو ووٹ دے دیں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہو جو مولانا یوسف صاحب سے یہ بات کہے۔ کسی کانگرسی نے بتایا کہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں آدمی مولانا حسین احمد مدنی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ کچھ لوگ مولانا حسین احمد مدنی کے پاس جائیں اور ان سے

درخواست کریں کہ وہ مولانا یوسف سے یہ بات کہہ دیں۔

یہ خبر تبلیغی مرکز میں پہنچ گئی۔ یہاں مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ مولانا یوسف صاحب تبلیغی سفر پر باہر چلے جائیں تاکہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے ان کی ملاقات ہی نہ ہو سکے۔ مولانا یوسف صاحب نے کہا کہ اس کے بجائے کیوں نہ ہم لوگ مل کر دعا کریں کہ اللہ ہمیں اس آزمائش سے بچا لے۔ اس کے مطابق لوگ دعا میں مشغول ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا وفد جب دیوبند جاکر مولانا حسین احمد مدنی سے ملا اور مذکورہ درخواست کی تو انھوں نے وفد کو یہ جواب دے دیا : بھائی، مولوی یوسف ایک کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم کیوں ان کے کام میں خلل ڈالیں۔

دعا مخصوص اوقات میں کچھ یاد کیے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں، دعا ایک عمل اور ایک طریق زندگی ہے۔ دعا بجائے خود ایک تدبیر ہے۔ آدمی جب کسی معاملہ میں دعا کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنے اس یقین کو پختہ کرتا ہے کہ اس دنیا کا اصل مالک خدا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اسی کے اذن سے ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر یہاں کچھ ہونے والا نہیں۔ دعا ایک پکار ہے جو اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ کے عجز کی تلافی کے لیے اس کا خدا اس کی حمایت پر آجائے۔

اسی کے ساتھ یہ کہ آدمی جب اپنے کسی معاملہ میں دعا کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان بناتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو مثبت سمت میں متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو خارج رخی سوچ بنانے کے بجائے اس کو داخل رخی سوچ بناتا ہے۔ اس طرح دعا آدمی کی اندرونی قوتوں کو جگاکر اس کو پہلے سے زیادہ طاقت ور انسان بنا دیتی ہے۔

زیادہ عمر کے ایک صاحب نے بتایا کہ میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں کہ یا اللہ، تو میرے بیٹے کو دولت دینا تو پہلے اس کے استعمال کا سلیقہ دینا۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے زمانہ کی ماؤں کا طریقہ تھا۔ آج کے ماں باپ کا حال یہ ہے کہ وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا خوب دولت کمائے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کے بارہ میں نہ انھیں کوئی خبر ہے اور نہ کوئی تڑپ۔

ایک صاحب نے بعض اردو اخبارات کے حوالے سے عالمی سیاست پر ایک تیز و تند

تبصرہ کیا۔ میں نے کہا کہ محض اردو اخبارات پڑھ کر عالمی سیاست کے بارہ میں اس طرح کی رائے قائم کرنا درست نہیں، کیوں کہ اردو اخبارات نہایت ناقص ہیں۔ محدود اقتصادی ذرائع کی بنا پر وہ زیادہ لائق افراد کو اپنے ادارہ کے لیے حاصل نہیں کر پاتے۔ تمام اردو اخبارات میں تیسرے درجہ کے کارکن بھرے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اردو اخبارات ناقص خبر رسانی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ ابھی چند دن پہلے دہلی کے سب سے بڑے اردو اخبار کے شمارہ ۴ اپریل میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر چھپی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ برطانیہ میں بنائے گئے اس جہاز کی پرواز سات سال بعد شروع ہوگی۔ میں حیران ہوا کہ جب جہاز بن کر تیار ہو چکا ہے تو آخر وہ اتنی زیادہ دیر کے بعد کیوں اپنی پرواز شروع کرے گا۔ اس کے بعد یہی خبر جب ٹائمس آف انڈیا میں دیکھی تو اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ اگلے صفحہ پر دونوں اخباروں کی تصویر مع کیپشن نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس میں مدارس کے طرزِ تعلیم کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مفسر طنطاوی جوھری (۱۳۵۸-۱۲۸۷ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن میں فقہی نوعیت کے مسائل کے بارہ میں صرف ۱۵۰ آیتیں ہیں۔ جب کہ کائنات میں غور و فکر کے بارہ میں ۷۵۰ آیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے دینی تعلیم کے مدارس میں علوم کائنات کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ مدارس میں علوم کائنات سرے سے پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ جب کہ فقہی مسائل کا یہ حال ہے کہ وہی پورے تعلیمی نظام پر غالب آگئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں قرآن و حدیث کو بھی فقہ کے تابع کر دیا گیا ہے۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر شاندار گھر بنائے تو وہ اس کے اوپر لکھ دیتا ہے کہ ھذا من فضل ربی۔ مگر یہ قرآنی آیت کا ادھورا استعمال ہے۔ اگر کوئی لکھے تو اس کو پوری آیت لکھنا چاہیے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا تھا، اس پر آپ نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا میں ناشکری کرتا ہوں (النمل ۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی نعمت حقیقۃً فضل کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ ابتلاء (آزمائش)

SUPERJUMBO: An artist's view of the Airbus A3XX which will be capable of carrying 600 passengers. It could be in service within the next seven years, it was announced in London on Wednesday.

کے لیے ہوتی ہے۔ دنیوی نعمت کو پاکر آدمی کے اندر ناز کی کیفیت پیدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے اندر مسئولیت کا احساس مزید اضافہ کے ساتھ جاگنا چاہیے۔

قرآن کی اس آیت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا جو معاملہ ہے وہی اقتدار کا معاملہ بھی ہے۔ اقتدار بھی بطور نوازش نہیں ملتا بلکہ بطور ابتلاء ملتا ہے۔ اگر آج آپ کے پاس دولت ہے، اور کل دوسرا آدمی دولت مند ہو جائے تو آپ اس کو غاصب قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار نہیں کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس بھی دولت خدا کی طرف سے آئی تھی اور اس کے پاس بھی دولت خدا ہی کی طرف سے آئی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اقتدار کا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار یا زمینی خلافت کسی قوم کا ابدی حق نہیں، جس طرح دولت کسی گروہ کا ابدی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ مصلحت امتحان کے تحت خلافت ارضی کبھی ایک قوم کو دیتا ہے اور کبھی دوسری قوم کو۔ سیاسی اقتدار بھی بہت سے امتحانی پرچوں میں سے ایک پرچہ ہے۔ جس طرح دوسرے پرچے باری باری سب کو دیے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسی پرچہ بھی ایک کے بعد دوسرے کو ملتا ہے، اور اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا۔

یہ تبدیلی کسی صلیبی یا صہیونی سازش کے تحت نہیں ہوتی بلکہ براہ راست خدائی قانون کے تحت ہوتی ہے (آل عمران ۲۶) اس بنا پر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کو قبول کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ خلافت ارضی جب ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہو تو محروم گروہ ایسا نہ کرے کہ اس کو سازش اور غصب کا معاملہ قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دے۔ ایسا کرنا محرومی پر ہلاکت کے اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ اس کے بجائے محروم گروہ کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس کو خدا کا فیصلہ مان کر اس پر راضی ہو جائے۔

اس معاملہ میں خدائی فیصلہ کو مان لینا محروم قوم کے لیے عبادت کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر حقیقت پسندی پیدا ہوگی۔ اس کے اندر مثبت فکر جاگے گا۔ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے میں لگ جائے گا۔ اس کے افراد سیاست کے سوا دوسرے خالی میدانوں میں سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ اس کی یہ روش عین ممکن ہے کہ خدا کی رحمت کو دوبارہ متوجہ کرے اور دوبارہ اس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سردھنہ کے سید برہان الدین صاحب (ایم اے معاشیات) کی عمر اب ۶۵ سال ہو چکی ہے
انھوں نے پاکستان سمیت بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات بتاتے
ہوئے کہا: مسلمانوں کو نہ یہود سے خطرہ ہے، نہ عیسائیوں سے اور نہ ہندوؤں سے۔ مسلمانوں
کو خطرہ صرف اپنی ذات سے ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار رہتا
ہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مجلس میں کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی خاص
کمزوری کیا ہے جس نے انھیں دوسری قوموں سے پیچھے کر دیا۔ مولانا محمد رضوان قاسمی نے کہا
"میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب شعور کی کمی ہے" یہ دور مقابلہ کا دور ہے۔ مگر مسلمان اپنی
بے شعوری کی وجہ سے اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بس دوسروں کی شکایت کرنے میں اپنا
وقت ضائع کرتے رہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں زیادہ تر غیر مسلموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ
بات آپ تجربہ کے تحت نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ کسی سے سن کر کہہ رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ
اپنے پاس سے کوئی رسالہ نکال لیے۔ یہ بات خود ان کے گھر پر ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ گھر کے اندر سے
الرسالہ کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ لے کر آئے۔

اس کی ورق گردانی کی تو اس میں غیر مسلموں کے دو حوالے تھے۔ مثلاً صفحہ ۸ پر پروفیسر
مارگولیتھ کا وہ حوالہ جس میں انھوں نے اصحاب رسولؐ کو ہیروؤں کی قوم کہا ہے۔ میں نے کہا
الرسالہ میں غیر مسلموں کے حوالے غیر مسلموں کے خیالات کی تبلیغ کے لیے نہیں ہوتے، وہ
اسلام کی صداقت بیان کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا ایک مثل ہے کہ فضیلت وہ
ہے جس کی گواہی دشمن دیں (الفضل ما شهدت به الاعداء)

میں نے کہا کہ اس اعتبار سے غیر مسلموں کا حوالہ تو ایک خوبی کی بات ہے، اور ماضی سے
لے کر حال تک کے تمام علماء اسلام اس قسم کے حوالے دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تو خوشی کی بات
ہے، نہ یہ کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

سردھنہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۰ ہزار ہے۔ مگر ان کا اپنا کوئی قابل ذکر تعلیمی ادارہ

نہیں۔ جب کہ جینیوں کی تعداد صرف چار ہزار ہے۔ اس کے باوجود وہ تعمیری و تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں، یہاں ان کے تین تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ لڑکیوں کا انٹر کالج، لڑکوں کا انٹر کالج، اور جونیر ہائی اسکول۔ اس کے علاوہ جین ہاسپٹل ہے جس میں آپریشن وغیرہ کا معقول انتظام ہے۔ ان حضرات کی باقاعدہ ایک سوسائٹی "جین ملن سوسائٹی" کے نام سے ہے جس کے تحت یہ تمام تعمیری کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہی حال عیسائی حضرات کا ہے وہ بھی تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار بھی کافی اونچا ہے۔

جین فرقہ اور عیسائی فرقہ کے خلاف ملک میں کوئی تعصب کی فضا نہیں۔ جبکہ مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بڑے پیمانہ پر تعصب پایا جاتا ہے۔ اس کی کم ازکم ایک وجہ یہ ہے کہ جین اور عیسائی جہاں ہیں وہاں وہ لوگوں کے لیے نفع بخش بن کر رہتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ مزاج نہیں پایا جاتا۔ دونوں کے معاملہ میں فرق کا اصل سبب یہی ہے۔

میرٹھ کے ایک گاؤں کا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہاں ایک خاندان ہے، اس کا مزاج یہ ہے کہ نہ کسی سے کچھ لو اور نہ کسی کو کچھ دو۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ان لوگوں نے اپنی زمینوں میں محنت کرکے کافی پیسہ کمایا۔ مزید زمینیں خریدیں۔ نیا مکان بنایا۔ بستی میں ان کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہوگئی۔ گاؤں کے ماحول میں وہ شہر کی طرح رہنے لگے۔

اس کے نتیجہ میں گاؤں والوں میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے مگر دوسرے انھیں تکلیف دینے کے درپے ہو گئے۔ پہلے یہ کیا کہ ان کے ٹیوب ویل سے موٹر نکال لے گئے۔ ان کا ٹریکٹر غائب کر دیا۔ اس طرح کی حرکتوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑا تو اب یہ کیا کہ خود اپنے اندر کے ایک بوڑھے کو قتل کرکے مذکورہ خاندان کے تمام لوگوں کو فوجداری کیس میں پھنسا دیا۔ حتیٰ کہ اس خاندان کے ایک ہونہار نوجوان کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ۔

یہ بلاشبہ کمینہ پن ہے۔ مگر اس طرح کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی تعمیر کے ساتھ ایک اور تدبیر یہ کرنا چاہیے کہ وہ شر پسندوں کے شر سے کس طرح بچے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی جہاں رہے وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن کر رہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ انھیں اپنا احسان مند بنائے رہے۔ لوگوں کے شر سے بچنے کا یہ سب سے زیادہ آسان اور موثر طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں دونوں فریق کے درمیان جو جھگڑے ہوئے اس میں دونوں کا ملا کر تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ ہندستان کی کوئی بستی یا کوئی شہر نہیں جہاں مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے نزاعات نہ پائے جاتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے شمار جماعتیں، ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو مسلمانوں کے ان باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کر رہی ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کے نام پر ہر جگہ دھوم مچی ہوئی ہے، مگر اسلام کے لیے کسی گہرے اور دوررس کام کا کہیں وجود نہیں۔

مولانا محمد رضوان قاسمی یہاں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ دیا۔ اس پر سردھنہ کے ایک صاحب کا تاثر حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا تھا :

"الرسالہ پڑھنے کے بعد تمثیل احمد خاں نے کہا کہ مولانا صاحب یہ کام تنہا نہیں کرتے بلکہ ایک ٹیم ہے جن کو مولانا نے مختلف میگزین اور کتابیں پڑھنے پر مامور کیا ہے۔ کسی کا کام اردو اخبار پڑھنا ہے۔ کسی کا کام عربی چیزیں پڑھنا۔ اور کسی کا کام انگریزی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا۔ یہ لوگ حسب ہدایت واقعات کی تعیین کر کے مولانا کو پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا ان واقعات کو مذہب پر منطبق کر کے الرسالہ کے لیے مضامین تیار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کام تنہا ایک آدمی نہیں کر سکتا۔ البتہ کمپوٹر کر سکتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسلسل چالیس سالہ مطالعہ کے بعد مولانا نے الرسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن نہیں ہوئے انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں اس قدر معیاری کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا اور ترتیب دینا ایک آدمی کا کام ہی نہیں"

ایک اور صاحب تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ الرسالہ تو سب کا سب سرقہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اتنی باتیں نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے یقین ہے کہ وہ ادھر اُدھر سے سرقہ کر کے ان کو مرتب کر دیتا ہے

میں نے کہا کہ الرسالہ دعا کی طاقت سے نکل رہا ہے مگر لوگ دعا کی طاقت کو نہیں جانتے۔ عام طور پر لوگ صرف رسمی دعاؤں سے واقف ہیں۔ یا وہ کسی بزرگ کے دعائیہ جلسہ میں شریک ہو کر آمین کہنے کو دعا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دعا اس سے بلند تر ایک شے ہے۔ دعا دراصل خدا کی یافت ہے۔ دعا معرفت حق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ دعا انسان کا حقیقتِ اعلیٰ کے ساتھ

اتصال ہے۔ دعا گویا خزانۂ قدرت تک ایک انسان کی رسائی ہے۔ دعا جب اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو انسان کا سینہ تجلیاتِ الٰہی کا مہبط بن جاتا ہے۔ یہ دعا جب وجود میں آتی ہے تو کسی انسان کے لیے وہ لمحہ آجاتا ہے جس کی بابت حضرت مسیح نے فرمایا : مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔

ایک صاحب نے اپنا قصہ بتایا کہ سڑک پر میں ایک سواری کی زد میں آکر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ اٹھا تو میں اسپتال میں تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہندوؤں نے مجھ کو زخمی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی گاڑی میں لٹا کر انھوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میری ہر طرح مدد کی۔ یہ قصہ بتا کر انھوں نے کہا : انسانیت ابھی زندہ ہے۔ شر پسندوں میں کچھ خیر پسند بھی موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ بہت سے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وہ جب ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہوتا ہے کہ بروں کی بھیڑ میں کچھ اچھے افراد بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح بات نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ غیر مسلم سب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی دشمن نہیں ہے تو وہ استثناء ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے۔ ہر ایک کے اندر انسانیت موجود ہے۔ فسادات کا سبب دشمنی نہیں۔ فسادات کا سبب وقتی اشتعال ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ جذباتی قسم کے لوگ اپنی کسی نادانی سے ایک بھیڑ کے نفس امارہ کو جگا دیتے ہیں۔ اور وہ بھڑک کر فساد پر اتر آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جذباتی لوگوں میں صبر و تحمل کی صفت پیدا کر دیں تو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے فسادات کا خاتمہ ہو جائے۔ اور ہر آدمی خیر پسند دکھائی دینے لگے۔

ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ میں نے اس کی ڈائری میں حسب ذیل نصیحت لکھ دی : زندگی کا راستہ ہموار راستہ نہیں۔ یہاں اونچ نیچ دونوں ہی آتے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر ہمت نہ ہارے، جو ہر حال میں یکساں عزم کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔

۱۱ اپریل کو عشاء کی نماز سردھنہ کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں نماز کے بعد تقریر کا پروگرام

تھا، نماز کے بعد بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ نماز کی اصل اسپرٹ کیا ہے اور ملت کی تعمیر میں اس کا رول کیا ہے۔

تقریر کے بعد دیر تک مصافحہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ مصافحہ کے بعد لوگ چلے جائیں گے۔ مگر کافی لوگ اس کے بعد دوبارہ بیٹھ گئے۔ چنانچہ سوال و جواب کی صورت میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران کئی اخبار کے رپورٹر آگئے۔ ان میں ہندی اخبار کے رپورٹر بھی تھے اور اردو کے رپورٹر بھی۔ آخر میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ زندگی کا ایک سادہ اصول یہ ہے کہ جتنی محنت اتنی کامیابی۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے بڑی اخلاقی صفت اپنے خلاف سوچنا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں میں سرے سے موجود نہیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو یہاں میں نے جو تقریر کی تھی، اس کی رپورٹ اس علاقہ کے اخبارول میں بھی چھپی۔ اس وقت کچھ اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے جنھوں نے تقریر کے آخر میں سوالات کیے۔ چوں کہ ۲۷ اپریل کو اور پھر ۳، ۷ مئی ۱۹۹۶ کو لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے الکشن ہونے والے ہیں، اس لیے الکشن کی بابت بھی سوالات کیے گئے۔ اگلے صفحہ پر ہندی روزنامہ امر اجالا (۱۲ اپریل ۱۹۹۶) کی شائع شدہ رپورٹ نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس تھی۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ہر ایک سے سوال کرکے اس کے اپنے میدان کے تجربات پوچھ رہا تھا۔ اس درمیان میں محمد حنیف صاحب نے سوال کیا کہ الرسالہ آپ اکیلے ہی لکھتے ہیں، یا اور بھی کچھ لکھنے والے لوگ ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں اکیلا ہی لکھتا ہوں۔ مگر اس کی تیاری میں بہت لوگ شامل ہیں۔ حتی کہ آپ لوگ بھی اس میں شریک ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ نے دیکھا، میں ہر ایک سے اس کے دائرہ کی معلومات لیتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرے پاس بہت سے لوگوں کے تجربات اکٹھا ہو جاتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ الرسالہ کو مرتب کرتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ اگرچہ ایک شخص کے قلم سے لکھا جاتا ہے مگر اس میں تنوع اتنا زیادہ

وتا ہے کہ وہ ۲۰ سال سے نکل رہا ہے۔ مگر آج تک لوگوں کی دل چسپی اس سے ختم نہیں ہوئی۔
س کا نیا پن مسلسل باقی ہے۔

رات ہوئی تو سردھنہ کے آسمان پر ستارے جگمگاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کسی شخصیت
ی بڑائی بتانا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا تھا جیسے ستاروں کے درمیان سورج۔ مگر یہ صرف ایک
دبی اسلوب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سورج خود بھی ایک ستارہ ہے۔ مزید یہ کہ فلکیاتی تقسیم
یں سورج نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ سمجھا جاتا ہے:

The Sun is classified as a dwarf star.

سمان کے بیشتر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ معلوم کیا گیا ہے کہ ان کی جسامت
(Volumes) سورج کے مقابلہ میں ایک ملین سے لے کر دس ملین گنا تک زیادہ ہے۔

رات کے وقت ستاروں کا خوب صورت منظر اب دہلی جیسے شہروں میں گویا معدوم
ہو گیا ہے۔ دہلی میں فضائی کثافت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ وہاں اب نہ سانس لینے کے لیے

मौलाना वहीदुद्दीन खान ने सरधना में कहा: समृद्धि का आधार मेहनत है, आरक्षण नहीं

अमर उजाला ब्यूरो, सरधना, १२ अप्रैल। जाने-माने विचारक मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि आरक्षण की अपेक्षा मेहनत त्याग के बल पर अर्जित सफलता आत्मिक, सामाजिक, आर्थिक समृद्धि प्रदान करती है। नगर के बुध बाजार स्थित जामा मस्जिद में आज इशा की नमाज के बाद अकीदतमंदों को खिताब करते हुए उन्होने नमाज की विस्तृत व्याख्या भी की। उन्होंने कहा कि नमाज सदर बनने के जज्बों से बचाती है। उन्होंने इत्तेहाद पर बल देते हुए कहा कि यह सबसे बडी ताकत है और इसमें जिस प्रकार नमाज के दौरान हम एक इमाम के पीछे सभी मुकतदी होते हैं, उसी प्रकार हमें सदर बनने की होड से स्वयं को उबारना चाहिए। बाद में मुस्लिम बुद्धिजीवियों व पत्रकारों के सवालों का जवाब देते हुए उन्होने कहा कि इस्लाम यह सिखाता है कि दुश्मन से भी अच्छा सुलुक करो। जो आज दुश्मन है, कल वह मित्र बन जाएगा। भाईचारा कायम करने के मिशन पर निकले मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि इस्लाम के मुताबिक हम दुनिया भर में फैले हैं, अपनी बात को रखने के दो माध्यम हैं। एक दादागिरी, दूसरा दाई (देने वाला)। दादागिरी के बल पर कोई मिशन कामयाब नहीं हो सकता। आरक्षण सबंधी प्रश्न के उत्तर में मौलाना ने कुरान और हदीस की रोशनी में कहा कि हम तुमसे कोई अज्र नहीं मांगते। मांगना अपने आप को हकीर बनाना है। तरक्की का राज मेहनत है, आरक्षण नहीं। इंसान अपनी ताकत को पहचाने। हदीस में आया है कि रिजक का नब्बे फीसदी हिस्सा तिजारत में है। सीताराम केसरी (कल्याण मंत्री) के मुस्लिमों को आरक्षण देने की सिफारिश पर टिप्पणी करते हुए उन्होंने कहा कि 'वो बेवकूफ बना रहे हैं और हम बेवकूफ बन रहे हैं।' उन्होंने और कुरेदने पर कहा कि वे (कांग्रेस) १९४७ से लगातार हुकूमत कर रहे हैं, अब से पूर्व आरक्षण क्यों नहीं दिया गया। मौलाना ने आर्थिक मजबूती के लिए सहकारी समितियां बनाकर सहयोग का आह्वान किया। चुनाव के दौरान किस पार्टी का समर्थन किया जाए, सवाल के जवाब में उन्होंने कहा कि सही मायने में हालात ये है कि यदि चुनाव अच्छे-बुरे में हो तो बेशक अच्छे को चुनने के लिए कहा जा सकता है, लेकिन यहां तो चुनाव 'मिस्टर करप्ट' व 'श्री भ्रष्ट' के बीच है।

خالص ہوا ہے، اور نہ دیکھنے کے لیے فطرت کے آسمانی مناظر۔

موجودہ دنیا میں انسان دو مسئلے کے درمیان ہے۔ اگر تمدنی ترقی حاصل کی جائے تو فطرت کا حسن رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اگر فطرت کا ماحول اختیار کیا جائے تو وہ صرف تمدنی ترقیوں سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دونوں خوبیاں اپنی کامل اور معیاری صورت میں جنت کے سوا کہیں اور ملنے والی نہیں۔

۱۲ اپریل کو نماز فجر سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ صبح کی چائے جناب محمود علی خان صاحب کے مکان پر ہے۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ چنانچہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

محمد حنیف ملتانی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، راستہ میں نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے جگہ بنا کر نماز ادا کی۔ ایک ہندو مسافر نے دیکھ کر کہا کہ آپ تو بڑے دھارمک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ بھی تو پورے دھارمک ہیں۔ دیکھئے، آپ ہردوار سے گنگا جل لیے چلے آرہے ہیں، اور جب پانی پینا ہوتا ہے تو اسی کو پیتے ہیں۔ اس کے بعد مذہب پر گفتگو ہونے لگی۔

محمد حنیف صاحب نے کہا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی قیمتی چیز میں ساجھا گوارا نہیں کرتا۔ پھر خدا تو سب سے زیادہ قیمتی ہے، اس میں ساجھا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔ اس طرح مثالوں کے ذریعہ انھوں نے شرک اور توحید کا فرق بتایا۔ اور کہا کہ شرک کا عقیدہ فطرت کے خلاف ہے اور توحید کا عقیدہ عین فطرت کے مطابق۔ مذکورہ ہندو مسافر نے بڑے دھیان سے سنا اور آخر میں کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاط کس طرح بجائے خود اشاعتِ اسلام کا ذریعہ ہے۔ کسی بھی طرح اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اختلاط بڑھ جائے تو دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد میرٹھ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد ہوتا رہا ہے۔ سردھنہ اس سے صرف ۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، مگر یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ میں نے لوگوں سے اس

کی بابت گفتگو کی۔ بظاہر یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب عمومی اختلاط ہے۔ سردھنہ کی آبادی ۶۰ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان ہیں۔ یہاں کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ بار بار دونوں فرقہ کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اس طرح تقریباً سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، یہی سماجی اور کاروباری میل ملاپ اس فرق کا اصل سبب ہے۔

میں نے کہا کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اختلاط مانع فساد ہے۔ اگر صرف اتنا ہو جائے کہ دونوں فرقوں کا اختلاط بڑھ جائے تو فساد کے اسباب اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۱۹۸۷ میں میرٹھ میں بہت بڑا فساد ہوا۔ اس کے بعد سردھنہ میں کسی نے شرارت کی اور مسجد میں خنزیر کا گوشت ڈال دیا۔ اس طرح کے کچھ واقعات کیے گئے تاکہ سردھنہ میں بھی فساد برپا ہو جائے۔ مگر یہاں کے لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ وہ مشتعل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے لوگ اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا، اب اس کو آگے بڑھنے نہیں دینا ہے۔ چنانچہ یہ چنگاری آغاز ہی میں بجھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرٹھ میں سخت نقصان ہوا۔ مگر سردھنہ میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہاں کے مسلمان آج ترقی کر رہے ہیں بزنس اور تعلیم دونوں میدانوں میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں میرٹھ فساد کے موقع پر سردھنہ کے تین مسلمانوں کو قریب کے گاؤں کساولی میں مار ڈالا گیا جب کہ وہ وہاں باغ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ مگر سردھنہ کے مسلمان اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ اس طرح ایک طرف مجرمین کو قانونی سزا ملی اور دوسری طرف سردھنہ فساد کی مصیبت سے بچ گیا۔

۱۲ اپریل کی صبح کو شیخ محمد حنیف ملتانی (۵۱ سال) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ غیر رسمی انداز میں دیر تک لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ سردھنہ میں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر بزنس کے میدان میں ہیں۔ تاہم ایک صاحب کے الفاظ میں "مسلمان تو زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں۔ ہندو بزنس میں ہم سے بہت آگے ہیں"۔ میں نے سبب پوچھا تو ایک صاحب نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب صرف علم کی کمی ہے۔

ایک صاحب سے اس پر گفتگو ہوئی کہ کافر کون ہے۔ میں نے کہا کہ کافر کسی نسلی گروہ کا نام نہیں۔ یہ ایک انفرادی رویہ ہے۔ کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس سے مراد وہ انسان ہے جو اتمام حجت کے باوجود حق کا انکار کرتا رہے، یہاں تک کہ انکار ہی کی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔

قرآن (البقرۃ ۱۶۱) میں ہے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ کافر ہی مر گئے تو وہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنۃ اللہ الخ)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا منکر وہ شخص ہے جو موت کے آخر وقت تک کافر بنا رہے۔ اب چوں کہ کوئی انسان کسی کے بارہ میں یہ جان نہیں سکتا کہ اس کا خاتمہ آخر کار کس چیز پر ہوا ہے، یہ وہ چیز ہے جو صرف خدا کو معلوم ہے۔ اس لیے ہمیں یہ حق نہیں کہ پیشگی طور پر ہم کسی کو کافر قرار دے دیں۔ ہمیں دوسروں کو صرف غیر مسلم کہنا ہے۔ یا انسان یا برادرانِ قوم جیسے الفاظ سے انھیں خطاب کرنا ہے۔ اور اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر دینا ہے کہ آخری طور پر اس کی موت کس حال میں ہوئی۔ کافر وہ ہے جو خدا کے نزدیک کافر قرار پائے نہ کہ انسانوں کے نزدیک۔

سردھنہ کا تعارف سب سے پہلے مجھے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس کے شمارہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۸ کے ذریعہ ہوا۔ اس میں مسٹر شوچی بنسل (Shuchi Bansal) کے قلم سے ایک باتصویر مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــــ سردھنہ، بیگم کا مامن :

Sardhana: The Begum's Haven

اسی وقت سے یہ خواہش تھی کہ سردھنہ کو دیکھا جائے۔ مگر ہر کام اپنے مقرر وقت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ آٹھ سال کے بعد یہ وقت آیا اور میں سردھنہ کو دیکھنے کی خواہش پوری کر سکا۔

سردھنہ ریلوے لائن پر نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ انڈیا کے سیاحتی نقشہ (ٹورسٹ میپ) پر نہیں ہے۔ تاہم اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ پورے ہندستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عیسائی حضرات اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس کے بارہ میں اخباروں میں رپورٹیں بھی چھپتی رہتی ہیں۔ مذکورہ انڈین اکسپریس کے علاوہ دہلی کے ہفت روزہ انڈین کرنٹس

(۷ مارچ ۱۹۹۶) میں ایک معلوماتی مضمون مسز گلشن نہرا کے قلم سے چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ بیگم سمرو کی سرزمین میں :

In the land of Begum Samru

۱۲ اپریل کو جمعہ سے پہلے ہم لوگ سردھنہ کا مشہور سینٹ میری چرچ (St. Mary's Church) دیکھنے کے لیے نکلے۔ یہ سفر جناب علاؤالدین صاحب کی گاڑی میں طے ہوا۔ اس چرچ کا ذکر پہلی بار میں نے مذکورہ اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ ایک وسیع حصار بند علاقہ ہے جو گویا سردھنہ کے اندر ایک عظیم تر سردھنہ ہے۔ تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی یہ وسیع دنیا ایک خاتون نے بنوائی تھی جو عام طور پر بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہیں۔ عظیم چرچ کے گیٹ کے اوپر حسب ذیل فارسی قطعہ لکھا ہوا ہے :

با مدادِ خدا فضلِ مسیحا بسالِ ہجدہ صد عشرین واثنا
بدل زیب النسا، عمدہ اراکین بنا فرمود عالی شان کلیسا

چرچ کے ایک کتابچہ سے معلوم ہوا کہ بیگم سمرو کا اصل نام فرزانہ تھا۔ ان کے باپ کا نام لطیف علی خان تھا۔ وہ میرٹھ ضلع کے ایک گاؤں کوتانہ میں ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی عمر چھ سال تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ذریعہ معاش کی تلاش میں ان کی ماں انھیں لے کر دہلی آگئیں۔ ان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہوسکی۔ چنانچہ انھوں نے رقص وسرود کا پیشہ اختیار کرلیا۔

جب ان کی عمر پندرہ سال تھی، ایک فرانسیسی افسر (Walter Reinhardt) نے ان کو ایک رقص پارٹی میں دیکھا۔ وہ اس کو پسند آگئیں اور اس نے ان سے نکاح کرلیا۔ ۱۷۶۵ء میں بیگم کا نکاح مسٹر سمرو سے خالص اسلامی روایات کے مطابق ہوا۔

مذکورہ فرانسیسی افسر کا اصل نام والٹر رین ہارٹ تھا۔ مگر وہ سیاہ فام تھا، اس بنا پر اس کے یورپی ساتھی اس کو سومبرے (Le Sombre) کہنے لگے جس کے معنی تاریک کے ہیں۔ یہ لفظ بول چال میں بگڑ کر سُمرو (Sumru) بن گیا۔ اس طرح یہ فرانسیسی افسر سُمرو کہا جانے لگا۔ اور جب اس کا نکاح مذکورہ خاتون سے ہوا تو وہ بھی بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہوگئیں۔

مذکورہ فرانسیسی ابتداءً راجہ جواہر سنگھ (بھرت پور) کی فوج میں افسر تھا۔ اٹھارویں صدی

کے آخر میں دہلی کی برائے نام مغل سلطنت پر شاہ عالم ثانی تخت نشین تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں بغاوت ہوگئی۔ شاہ عالم کو دہلی سے بھاگنا پڑا۔ اس بغاوت کا سردار زبتہ خان تھا۔ شاہ عالم نے بغاوت کو فرو کرنے کے لیے والٹرین ہارٹ کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ایک فوجی ماہر تھا، وہ بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد شاہ عالم ثانی نے والٹرین ہارٹ کو مظفر نگر سے علی گڑھ تک کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔

۱۷۷۸ میں والٹرین ہارٹ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت بیگم سمرو اس کے نکاح میں آچکی تھیں۔ مگر ابھی تک انھوں نے عیسائیت قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے بیگم سمرو کو وارث کے طور پر مان لیا۔ اس طرح بیگم سمرو مذکورہ ریاست کی حاکم بن گئیں جس کی راجدھانی سردھنہ تھی۔ والٹرین ہارٹ کے انتقال کے تین سال بعد ۷ مئی ۱۷۸۱ کو بیگم سمرو نے مذہب تبدیل کرکے باقاعدہ عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔

اس زمانہ میں بیگم سمرو کی فوج میں ایک یورپی افسر جارج ٹامس (George Thomas) تھا۔ اس کو بیگم سے دلچسپی ہوگئی۔ وہ بیگم سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر بیگم نے انکار کیا۔ اس کے بجائے انھوں نے ایک اور فرانسیسی فوجی افسر لاویسیا (Le Vaisseau) سے نکاح کرلیا۔

اس کے بعد بیگم سمرو کے مصیبت کے دن شروع ہوتے ہیں۔ بیگم سمرو کے سوتیلے لڑکے ظفریاب خان نے جارج ٹامس کو ساتھ لے کر بغاوت کردی۔ بیگم کو سردھنہ چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ اس سلسلہ میں بہت لمبی کہانی ہے جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔

۶۵ ایکڑ کے رقبہ میں یہاں جو مسیحی دنیا ہے اور جس میں چرچ وغیرہ شامل ہیں وہ سب انھیں بیگم سمرو کی بنوائی ہوئی ہیں۔ بیگم نے اسپتال کے نام سے ایک رقم چھوڑی تھی۔ چنانچہ ان کے بعد یہاں ایک اسپتال بنایا گیا جو اب تک قائم ہے۔ یہ اسپتال ۱۸۱۸ میں تیار ہوا تھا۔

اس مسیحی احاطہ کے اندر چرچ کے بعد جو سب سے بڑی اور شاندار عمارت ہے وہ بیگم سمرو کا محل ہے۔ اب وہ ایک انٹر کالج کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بیگم سمرو کی قدیم رہائش گاہ میں ایک پرائمری اسکول قائم ہے۔ اس کی ایک جھلک اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بیگم سمرو کا تعلق اپنے پہلے فرانسیسی شوہر والٹرین ہارٹ سے ۱۷۶۵ میں ہوا تھا۔ پھر

دوسرے سے۔ مگر کتابچہ میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بیگم سمرو اپنے فرانسیسی شوہروں سے بات کس زبان میں کرتی تھی۔ آیا اس کے شوہروں نے اردو یا فارسی سیکھ لی تھی یا خود بیگم نے فرانسیسی زبان میں بقدر ضرورت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بیرونی شخصیتوں سے تو وہ ترجمان کے ذریعہ بات کر سکتی تھی۔ مگر اپنے شوہر سے بات کرنے کے لیے تو ضروری ہے کہ دونوں براہ راست گفتگو کر سکیں۔ مگر اس سوال کا جواب مذکورہ کتاب میں موجود نہیں۔

چرچ کے گیٹ پر لکھا ہوا تھا : (St. Mary's Church) یہ بلند و بالا چرچ بیگم سمرو نے اٹلی کے معماروں کے ذریعہ بنوایا تھا۔ ہم لوگ اندر داخل ہو کر دیکھنے لگے۔ اس وقت چرچ کے اندر سروس (مسیحی عبادت) ہو رہی تھی۔ مگر اس میں اتنے کم آدمی تھے کہ وسیع چرچ کے اندر وہ ہمیں دکھائی نہیں دیے۔ مقامی مسیحی گائڈ جو ہمارے ساتھ تھا، اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے بعض ساتھی آپس میں بولنے لگے۔ ان کی آواز گونج کی وجہ سے زور زور سنائی دینے لگی، تاہم میں حسب عادت بالکل خاموش تھا اور کچھ بھی بولے بغیر چپ چاپ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

آواز سن کر ایک بھاری بھرکم خاتون اندر سے نکلی۔ اس نے غصہ کے انداز میں کہنا شروع کیا کہ یہاں سروس ہو رہی ہے اور یہ پتہ نہیں کون لوگ ہیں جو اس طرح یہاں آکر زور زور سے بول رہے ہیں۔ میں دوبارہ حسب عادت کچھ بھی جواب دیے بغیر باہر آگیا۔ اتنے میں گائڈ اندر

سے آیا۔ اس نے کہا کہ چلئے، آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ مگر میں نے دوبارہ اندر جانے سے قطعی
انکار کر دیا۔ اس کے بعد بڑے پادری کو خبر ہوئی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر خود آگیا اور معذرت کرکے
ہم لوگوں کو دوبارہ اندر لے گیا۔ وہ اگرچہ ایک خاص پروگرام میں مصروف تھا۔ لیکن پروگرام چھوڑ
کر وہ آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہا۔ اور وسیع احاطہ کے مختلف شعبے ہمیں دکھائے اور ہر ایک
کا تعارف کرایا۔

وسیع پھیلے ہوئے چرچ کے اندر ایک خاص کمرہ ہے جو سال میں صرف دو بار مخصوص تاریخ
پر کھولا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے اور برکت لینے کے لیے لاکھوں عیسائی یہاں جمع ہوتے ہیں۔ فا
نے اس کمرہ کو خصوصی طور پر آج ہمارے لیے کھلوا دیا۔ چرچ میں داخلہ کے وقت جو ناخوش گو
واقعہ پیش آیا تھا، یہ غالباً اسی کا ایک خوش گوار نتیجہ تھا۔

اس کمرہ میں کچھ مسیحی تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ اور سامنے دیوار پر قد آدم مسیح کا اسٹیچ
صلیب پر لٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا نقشہ اس طرح ہے کہ موت کے بعد سر ایک طرف لٹکا
ہے۔ ہاتھ اور پاؤں میں کیل گاڑنے کا خونی نشان ہے۔ سینہ پر بھالا مارنے کی وجہ سے خون بہ
رہا ہے۔ غرض یہ کامل طور پر ایک بے بس انسان کی تصویر تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں "بے بس خدا" کو ماننے وا
ساری دنیا میں حرکت و عمل کا طوفان بن گئے۔ مگر "طاقت ور خدا" کو ماننے والے اپنی بے عم
کے نتیجہ میں ساری دنیا میں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم بنے ہوئے ہیں۔

اس مصلوب مجسمہ کے اوپر لکھا ہوا تھا انری (INRI)۔ میں نے پادری صاحب سے
پوچھا کہ اس کا فل فارم کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ لکھ کر دیے:

Iesus Nazarenus Rex Iudeorum

یہ لاطینی زبان ہے۔ اس کا مطلب ہے —— یسوع ناصری، یہودیوں کا بادشاہ:

Jesus, The Nazarene, King of the Jews

یہ ۱۲ اپریل کو ساڑھے دس بجے دن کا وقت تھا۔ ایک سن رسیدہ مسٹر طے نے آکر اس
کا تالا کھولا اور کہا، مجھ کو ہندی بہت نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ آپ انگلش میں بتائیے۔ چنانچہ وہ انگر

یں تعارف کراتی رہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ سسٹر، آپ کا شکریہ (Thank you, Sister)
اس نے جواب میں کہا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں :

We all are children of one Father.

میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کے اندر آپ نے جو اخلاق دیکھا اس کا راز کیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اس کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ——— مشنری اسپرٹ۔

چرچ کے بڑے پادری (Fr. John Monteiro) کی طرف سے انگریزی میں ۸۰ صفحہ کا ایک کتابچہ ہمیں دیا گیا جس میں اس مسیحی سنٹر کے بارہ میں تاریخی تفصیلات درج تھیں۔

۸۰ صفحہ کے کتابچہ میں بہت سی تفصیلات ہیں۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیگم فرزانہ جب ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوئی تھی تو اس نے کیوں مسیحیت قبول کر لیا۔ کتابچہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فادر گریگوری (Fr Gregory) ایک پرجوش مشنری (zealous missionary) تھے۔ وہ اٹلی میں ۲۲ نومبر ۱۷۴۳ کو پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرہ آئے۔ یہاں غالباً انھوں نے ہندستانی زبان سیکھی۔ اس کے بعد وہ سردھنہ منتقل ہوئے۔ ۷ مئی ۱۷۸۱ کو انھوں نے بیگم فرزانہ کو مسیحیت میں داخل کیا۔ ان کا نیا نام یوہانہ سمرو (Yohanna Sumru) رکھا گیا۔ فادر گریگوری کا انتقال دہلی میں ۲۹ مئی ۱۸۰۷ کو ہوا۔ دہلی میں رہتک روڈ پر اب بھی ان کی قبر موجود ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے بیگم سمرو سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ وہ ہندستانی زبان کے علاوہ فارسی زبان اچھی جانتی تھی۔ اس بنا پر علماء اس سے بہت اچھی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ مگر غالباً کسی بھی عالم کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اس طرح مسیحی پادری کو یک طرفہ طور پر یہ موقع مل گیا کہ وہ خاتون پر کوشش کرے اور اس کو بیگم فرزانہ سے بیگم یوہانہ بنا دے۔

مذکورہ کتاب میں یہ درج ہے کہ ——— اس میں شک نہیں کہ اس سفید پوش اطالوی راہب کو بیگم کی تبدیلیٔ مذہب کے لیے بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ اس نے بیگم کو اور اس کے سوتیلے لڑکے (ظفریاب خان) کو آگرہ کے قدیم اکبر چرچ میں ۱۷۸۱ء میں بپتسمہ دیا۔ بارہ سال بعد اسی نے بیگم کا نکاح ایک فرانسیسی افسر سے کیا :

Undoubtedly this Italian Carmelite must have had a lot to do with the begum's conversion. He baptised her in the old Akbar Church of Agra along with Sumru's son in 1781. 12 years later he blessed her marriage with the Frenchman, Le Vaisseau. (p. 64)

یہ مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا جس نے دہلی سلطنت پر ۱۷۵۹ سے لے کر ۱۸۰۶ تک حکومت کی۔ خود بیگم سمرو کی جاگیر یا ریاست اسی سلطنتِ دہلی کے ماتحت تھی۔ اس اعتبار سے مسلم علماء کے لیے اس معاملہ میں دخل دینے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا اتنا بڑا واقعہ ہوا جس کا تعلق سردھنہ سے لے کر آگرہ تک سے تھا، اور جس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ لیکن اس مدت میں کوئی ایسا عالم سامنے نہیں آیا جو بیگم سمرو سے ملاقات کرکے اس کو اسلام کی اہمیت بتائے۔ بیگم سمرو صرف اردو اور فارسی زبان جانتی تھی مگر فرنچ اور انگریزی کے علماء سے تو اس کا ربط قائم ہوا، لیکن اردو اور فارسی کے علماء سے اس کا ربط قائم نہ ہو سکا۔

یہ وہ وقت ہے جب کہ دہلی میں شاہ عبدالعزیز صاحب (۱۸۲۳-۱۷۶۲) موجود تھے۔ انھوں نے ۱۸۰۶ء میں فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ علماء "حرب" کے معاملہ میں تو ضرورت سے زیادہ باخبر تھے، مگر "دعوت" کے معاملہ میں وہ کسی باخبری کا ثبوت نہ دے سکے۔ ورنہ شاید آج سردھنہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

عین اسی زمانہ کا ایک اور ملتا جلتا قصہ ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر حرب بوائنے (Benoit de Boigne) ہندستان آیا تھا۔ وہ ۱۷۵۱ء میں چیمبری (Chambery) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ ہندستان میں وہ گوالیار کے راجہ مادھوجی سندھیا کی فوج میں افسر مقرر ہوا۔ جہاں وہ ۱۷۸۴ سے ۱۷۹۴ تک رہا۔

بوائنے نے شاہ عالم دوم کے ایک ایرانی افسر کی لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام علی بخش تھا۔ علی گڑھ میں موجودہ مسلم یونی ورسٹی جس زمین پر قائم ہے وہ پہلے اسی فرانسیسی مہم باز (French Adventurer) کی ملکیت تھی۔ ۱۸ سال ہندستان میں رہ کر ۱۸۱۲ میں جب وہ فرانس واپس چلا گیا تو اس کے بعد یہ زمین کچھ اور لوگوں کو ملی۔ یہاں تک کہ

پھر وہ مسلم یونی ورسٹی کے حصہ میں آئی۔

بیگم سمرو کی زندگی اس دور کے ہندستان کو بتاتی ہے جو یہاں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت کسی سلطنت کے تین اہم شعبے ہوتے تھے ــــــ زراعت، انتظام حکومت اور فوج۔ ان میں بھی فوج کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ کیوں کہ اقوام متحدہ سے پہلے دنیا میں کوئی بین اقوامی قانون نہیں تھا اور اس قسم کے معاملات کو طے کرنے والی واحد طاقت صرف فوج تھی۔

اُس زمانہ میں حوصلہ آزما افراد کے لیے سب سے بڑی چیز فوجی سردار یا فوجی جنرل بننا تھا۔ چنانچہ اکثر راجہ اور مہاراجہ کے یہاں یورپ کے لوگ بڑے بڑے فوجی عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح افغانی سردار یہاں آکر مسلم بادشاہوں اور ہندو راجاؤں، دونوں کے یہاں اعلیٰ فوجی عہدہ حاصل کرتے تھے۔ گویا کہ آج جس طرح مغربی ملکوں کے ٹکنکل ماہرین ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح پچھلے زمانہ میں یورپ کے فوجی ماہرین یہاں کی فوجوں میں عہدے حاصل کیے ہوئے تھے۔ آج کے ماہرین ہوائی جہازوں پر سفر کر کے آتے ہیں، اُس زمانہ کے ماہرین پانی کے جہازوں پر سفر کر کے یہاں پہنچتے تھے۔

سردھنہ کے عظیم چرچ کے اندر بہت سے اسٹیچو ہیں۔ وہ سب سنگ مرمر کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کو اٹلی کے فنکاروں نے بنایا ہے۔ ایک سیاح کے الفاظ میں، وہ تعجب خیز حد تک خوب صورت (breathtakingly beautiful) ہیں۔ بیگم سمرو کا ایک مجسمہ ہے جس میں وہ چہرے پر لمبا گھونگھٹ نکالے ہوئے ہے۔ اور ہاتھ میں سانپ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے وہ ایک شرمیلی خاتون تھیں۔ لیکن مجرمین کو سزا دینے کے لیے وہ سانپ بن جاتی تھیں۔ یہ اسٹیچو پورا ایک ہی پتھر کا ہے۔ اس کو اتنی مہارت سے بنایا گیا ہے کہ وہ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔

ایک بڑی عمارت کے سامنے لکھا ہوا تھا سینٹ جان کی سیمنری (St. John's Seminary) اس کے اندر کچھ نوجوان پڑھتے ہوئے نظر آئے۔ سیمنری اس عیسائی مدرسہ کو کہا جاتا ہے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کا خالص مقصد یہ ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ فادر اور

عہدے دار تیار کیے جائیں جو چرچ کے نظام کو سنبھال سکیں۔
سردھنہ کا یہ مسیحی مرکز (کیتھولک مشن) تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ کتابچہ میں بتایا گیا تھا کہ بیگم سمرو کے انتقال کے بعد ان کی اسٹیٹ حکومت برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ مگر مذکورہ ۶۵ ایکڑ کا علاقہ بیگم کی ذاتی ملکیت تھا، چنانچہ وہ محفوظ رہا۔ اس کے بعد وہ مختلف مراحل سے گزرا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۷ میں آگرہ کے آرچ بشپ نے اس کو ۲۵ ہزار روپے میں خرید لیا۔
سردھنہ کے اس مسیحی مشن کا آرکیٹکٹ ایک اطالوی میجر انیتھونی (Major Anthony Reghelini) تھا۔ وہ یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ اس کا رہائشی مکان اب بھی یہاں موجود ہے جو انیتھونی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اب یہ عمارت بچوں کے اسکول کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ کیتھولک مشن کی طرف سے مجھ کو جو تعارفی کتاب دی گئی اس کا نام تھا:

Sardhana: its Begum, its Shrine, its Basilica

۸۰ صفحہ کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھ کو سب سے زیادہ جس بات پر حیرت ہوئی وہ یہ کہ اس مشن کی تاریخ دو سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں اس کے ساتھ طرح طرح کے نشیب و فراز پیش آئے۔ ملک کے سیاسی حالات میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ سردھنہ اور آگرہ سے لے کر اٹلی اور فرانس تک کے مختلف لوگ اس سے وابستہ رہے۔ حتیٰ کہ خود بیگم سمرو کو خودکشی کا اقدام کرنا پڑا، اگرچہ وہ بچ گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔
طرح طرح کے اونچ نیچ پیش آنے کے باوجود ادارہ نہ ٹوٹا اور نہ تقسیم ہوا۔ اور نہ اپنے مقصد کے اعتبار سے اس میں کوئی خلل واقع ہوا۔ وہ بدستور ترقی کے راستہ پر چلا جا رہا ہے۔
یہی ساری دنیا کے ہزاروں مسیحی اداروں کا حال ہے۔ میں نے خود کئی ایسے ادارے دیکھے ہیں جو سیکڑوں سال سے پر سکون طور پر چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو اس طرح تسلسل کے ساتھ چلا جا رہا ہو۔
یہ فرق روایات کی وجہ سے ہے۔ مسیحی قوموں میں روایات کا انتہائی احترام پایا جاتا ہے۔ کسی روایت کو توڑنے والے ہمیشہ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر مسیحی لوگوں کی اطاعت کیتنی کا

یہ حال ہے کہ ان کا کوئی بڑا آدمی کبھی کسی روایت کو نہیں توڑتا۔ وہ اپنے آپ کو روایت کے تابع رکھتا ہے، نہ کہ روایت کو اپنا تابع بنانے لگے۔ اور تاریخ کا تجربہ ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ روایات کے تحت چلتا ہے۔ جس سماج میں روایات توڑ دی جائیں وہاں کوئی قانون یا کوئی حکومتی اقتدار اس کا بدل نہیں بن سکتا۔

پیغمبر اسلام ؐ کے لائے ہوئے انقلاب میں اس حقیقت کا کامل شعور پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو احیاء اسلام، صفحہ ۶۰-۶۳) مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کو اس کا مطلق شعور نہ تھا۔ چنانچہ ہر مسلم لیڈر جوش جہاد میں روایتوں کو توڑتا رہا۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب عالمگیر نے انتہائی بے دردی کے ساتھ اپنے زمانہ کی تمام قیمتی روایات کو توڑ ڈالا اس وقت سے آج تک مسلمان ایک ایسی قوم بنے ہوئے ہیں جن کے درمیان کوئی روایت ہی نہ ہو۔ جب کہ روایت کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اس کو توڑنا آسان ہے۔ لیکن دوبارہ روایت قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ایک پوری تاریخ کا عمل درکار ہوتا ہے :

It requires a lot of history to make a little tradition.

میں نے معلوم کیا کہ سردھنہ میں کیا ان لوگوں کی کوشش سے کچھ مسلمانوں نے عیسائیت قبول کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں صرف ایک خاندان ہے جس کے چھ افراد عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کے سوا کسی اور مسلمان نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا۔

یہی صورت حال ساری دنیا میں ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے بڑے پیمانہ پر اپنا تبلیغی عمل جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرلے۔ دوسری طرف دیگر مذاہب کے لوگ ساری دنیا میں ہر روز بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اسلام دین محفوظ ہونے کی وجہ سے فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب نے تحریف کی بنا پر فطرت سے اپنی مطابقت کھو دی ہے۔

سردھنہ میں، میرے خیال سے زیادہ بڑی کمی تعلیم کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر اسکول یا مدرسہ نہیں۔ تاہم مولانا محمد رضوان قاسمی تعلیم کے میدان میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی کوششوں سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا ہے۔ اور اس کو اعلیٰ معیار پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ ادارہ ترقی کرے گا۔ اور وہ سردھنہ کے مسلمانوں کی اس کمی کو پورا کرنے کا باعث بنے گا۔

میں نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ سردھنہ میں ایک لائبریری بنائیں۔ لائبریری صرف کتابوں کا ایک کمرہ نہیں، وہ دراصل لوگوں کو باشعور بنانے کی ایک خاموش تحریک ہے۔ اور اس کو ہر بستی اور ہر مقام پر ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں لائبریریوں کا عام رواج تھا۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی قائم کی ہوئی لائبریریوں میں بسا اوقات ایک لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہوتی تھیں۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ جن کتابوں کے ذریعہ ظہور میں آئی، اس کا بڑا حصہ مسلم کتب خانوں میں جمع شدہ عربی کتابوں سے حاصل ہوا تھا جن کو لے کر یورپی زبان میں ان کا ترجمہ کیا گیا (۱۵/ ۶۴۶)

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم اور کتب خانوں کا یہ بڑھا ہوا ذوق پیغمبر اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے پیرؤوں سے کہا کہ تم علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے کچھ قیدیوں کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ان میں کا جو شخص مخصوص تعداد میں بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے تو وہ رہا کر دیا جائے گا (۱۵/ ۶۴۵)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا کوئی ایک سبب بتانا ہو تو یقیناً وہ یہی تعلیمی پچھڑاپن ہوگا۔

چرچ سے واپسی کے بعد کچھ دیر جناب عمران الزماں صاحب کے مکان پر ٹھہرے۔ انھوں نے چائے کے ساتھ ایک پورا دستر خوان بچھا دیا تھا جس پر کھانے کی مختلف چیزیں موجود تھیں۔ میں نے کہا کہ بھائی، میں ان مولویوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے سفر ناموں میں لکھتے ہیں کہ پر تکلف کھانے کا انتظام تھا، ڈٹ کر کھایا" میرا اصول اس کے برعکس یہ ہے: کم کھانا، اور سادہ زندگی گزارنا۔

باہر خوانچہ والا آواز لگا رہا تھا: چیکو میٹھے، چیکو میٹھے۔ میں نے کہا کہ چیکو میٹھے ہی ہوتے ہیں۔ پھر وہ بار بار میٹھا کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ دراصل اس کے جوش تجارت کی بنا پر ہے۔ اس کو صرف چیکو کہہ کر اطمینان نہیں ہوا۔ اس لیے اس نے اس میں مزید الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ یہ گویا عملِ مزید ہے۔ اور اس کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ لوگوں کے اندر حقیقی تڑپ ہو تو دین میں بھی اس عملِ مزید کے مظاہر دکھائی دینے لگیں گے۔

الرسالہ کے ایک قاری سے میں نے پوچھا کہ آپ کو اس سے کتنا اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا کہ ۹۰ فی صد۔ میں نے پوچھا کہ بقیہ ۱۰ فی صد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی تلقین کرتے ہیں، اور اس سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ صبر و اعراض تو خالص قرآنی تعلیم ہے، پھر کیا آپ کو قرآن سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن سے کس مسلمان کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے قرآن کے نظریۂ صبر سے نہیں بلکہ الرسالہ کے نظریۂ صبر سے اختلاف ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں کا فرق مثال کے ذریعہ بتائیے۔ مگر وہ کوئی فرق نہ بتا سکے۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر صبر و اعراض کی بات کو قبول نہیں کر پاتے۔ ان کو ٹکراؤ والا عمل تو معلوم ہے مگر انھیں صبر والا عمل معلوم نہیں۔ وہ ٹکراؤ کو عمل سمجھتے ہیں اور صبر کو بے عملی۔ اب چونکہ ان کے اندر قرآن سے اختلاف کی جرأت نہیں، اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں قرآن والے صبر سے نہیں بلکہ الرسالہ والے صبر سے اختلاف ہے۔ اس معاملہ میں ان کی غیر سنجیدگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان سے جب دونوں کا فرق پوچھا جائے تو وہ فرق بتانے سے عاجز ثابت ہوتے ہیں۔

دوسری بات میں نے یہ کہی کہ صبر کوئی الرسالہ کی بات نہیں، وہ فطرت کا قانون ہے۔ صبر اس دنیا میں جینے کی قیمت ہے۔ اس لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ صبر کرنا ہے یا نہیں۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آپ کو یہاں جینا ہے یا نہیں جینا ہے۔ اگر صبر نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ اس لیے یہ نہ کہیے کہ ہمیں صبر نہیں کرنا ہے، بلکہ یہ کہیے کہ ہمیں جینا نہیں ہے، ہم کو تو صرف برباد ہونا ہے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے اپنا ایک تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ "چند سال پیشتر آپ کے خلاف
ر کی غلطی نامی کتاب چھپی تھی۔ وہ میری نظر سے گزری۔ پڑھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ مصنف
نے آپ کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے مشترک بنیادی فکر کی نشان دہی کی ہوگی۔
ر اس بنیادی فکر کو قرآن وحدیث کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن کتاب
ڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف خود تبصرہ وتنقید کے اصول سے ناواقف ہیں۔ اپنی کتاب
ں تبصرہ وتنقید کا جو انداز انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی غلطی اسی سے ثابت ہے کہ اگر اس
بصرہ کا معیار مان لیا جائے تو حدیث کی تمام کتابوں پر بھی بعینہٖ یہی تبصرہ صادق آئے گا جو انھوں
نے فکر وحید پر چسپاں کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے تعارض کی مثال دی ہے۔ جب کہ حدیث کے
ر بھی بظاہر اسی قسم کے تعارضات موجود ہیں۔ حالاں کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے کہ
یث میں تعارض کا دعویٰ کیا جائے۔ تبصرہ نگار نے ایک اور بڑی غلطی یہ کی ہے کہ ایک جزئی
ر وقتی حالات سے متاثر کیفیت کو قاعدۂ کلیہ مان کر نتیجہ اخذ کیا ہے"۔

قرآن میں ہے کہ ——— اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کی خبر پاتا ہے
وہ اس کو مذاق بنالیتا ہے (واذا علم من آیاتنا شیئا اتخذھا ھزوا) الجاثیہ ۹
یہاں یہ سوال ہے کہ قرآن تو مکمل طور پر ایک برحق کتاب ہے۔ پھر کوئی شخص
ن میں کس طرح ایسی شئ (چیز) پالیتا ہے جس کا وہ مذاق اڑا سکے۔ جواب یہ ہے کہ
ل استہزا رشے کتاب میں نہیں ہوتی بلکہ غیر سنجیدہ آدمی کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے۔
ں بھی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔ آدمی کے اندر سنجیدگی
ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی الٹی بات نکال کر اس کا مذاق اڑانے لگے گا۔ یہی وجہ ہے
ہدایت یابی کے لیے تقویٰ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی پابندی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے
رات بتاتے ہوئے کہا: "صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو دین کی بے آمیز دعوت پر اٹھائی
ئے۔ اور الرسالہ کو میں اسی معیار پر پاتا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ الرسالہ جو حقیقت پسندی اور
ہری نظر پیدا کرنا چاہتا ہے، آج اسی کی ضرورت ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ صفات پیدا نہ ہوں

تو اس دنیا میں وہ آخرت کی کمائی کرنے والا نہیں بن سکتا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الرسالہ لٹریچر ہی عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہے اور الرسالہ بلاشبہ عصر حاضر میں اسلامی تجدید کا کام انجام دے رہا ہے۔"

سردھنہ میں نوابوں کا ایک خاندان ہے۔ ہندستان میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے بعد انھیں بہت نوازا۔ ان نوازشوں کا فائدہ اب تک انھیں مل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارے رہنما دو سو سال سے بتا رہے ہیں کہ انگریز ایک مسلم دشمن اور اسلام دشمن قوم ہے۔ اور اس کے ثبوت میں بتاتے ہیں کہ اس نے ہزاروں مسلمانوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مگر تعرف الاشیاء باضدادھا کے اصول پر سوچنا چاہیے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی انگریز سردھنہ میں (نیز دوسرے علاقوں میں) مسلمانوں کے ساتھ نوازش کا معاملہ کر رہے ہیں۔

اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اصل معاملہ مسلم دشمنی کا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے دشمنی کا ہے جو مفاد کے راستہ میں حائل ہو۔ دوسرے تمام لوگوں کی طرح، انگریز اپنے دشمن کا دشمن اور اپنے دوست کا دوست ہے۔ جس مسلمان کو اس نے اپنا مخالف پایا اس کو اس نے اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور جس مسلمان نے اس سے موافقت کی اس پر اس نے نوازشیں کیں۔

دہلی واپس آنے کے بعد ۱۳ اپریل ۱۹۹۶ کو میں نے سردھنہ کے نواب صاحبان کا قصہ عطاء اللہ صاحب (بنگلور) کو بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا ہی واقعہ ہماری ریاست کرناٹک میں ہوا ہے۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے کافی کے باغات ہیں۔ ان کے مالک پہلے انگریز تھے۔ جب وہ اپنے ملک واپس جانے لگے تو انھوں نے بالقصد اپنے باغات مسلمانوں کو دیے۔ ہندو زیادہ قیمت دینے کے لیے تیار تھے، مگر انھوں نے کم قیمت پر اسے مسلمانوں کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس کا سبب بھی یہی ہے کہ جنوب کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اس وعیرت کا باغیانہ سلوک نہیں کیا جو شمال کے مسلمانوں نے کیا۔ اس لیے انھوں نے جنوب

کے مسلمانوں کو نوازا اور شمال کے مسلمانوں کو انھوں نے سزائیں دیں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو قومیں مسلمانوں کے اوپر غالب آئیں یا آج غالب ہیں، ان سب کے بارہ میں ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ سو سال سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اسلام دشمن لوگ ہیں اور سازش کے تحت انھوں نے غلبہ حاصل کیا ہے۔ مگر یہ تصور لغویت کی حد تک غلط ہے۔

خدا کی اس دنیا میں کوئی گروہ محض دشمنی اور سازش کے ذریعہ سے کسی کے اوپر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ غلبہ کے لیے خدا کا قانون واضح ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس گروہ میں انسانی اوصاف زیادہ ہوں گے وہی گروہ یہاں غلبہ اور اقتدار حاصل کرے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب قوموں کے اندر انسانی اوصاف مسلم قوموں سے زیادہ تھے، اسی لیے وہ ان کے اوپر غالب آئے۔ اس کا ایک سادہ ثبوت یہ ہے کہ جن ملکوں کو مسلم قائدین اپنے اعلان کے مطابق، دشمن اسلام قرار دیے ہوئے ہیں، خود ان کے بیٹے اور پوتے پہلی فرصت میں بھاگ کر انھیں ملکوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں سٹل ہو سکیں۔

سردھنہ میں مجھے ایک مسلمان کے گھر میں دعا کے لیے لے جایا گیا۔ صاحب خانہ حال میں چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اب گھر میں ان کی بیوہ اور تین چھوٹے بچے ہیں۔ مرحوم نے اپنے بعد جائداد اور مکان وغیرہ چھوڑا ہے۔ اب کچھ لوگ ظالمانہ طور پر ان جائدادوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بیوہ کے اوپر فرضی مقدمات قائم کیے ہیں اور طرح طرح سے ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ حتی کہ بیوہ کے وکیل صاحب گھبرا کر یہ کہنے لگے ہیں کہ تم دوسرا وکیل کر لو۔ کیوں کہ وہ لوگ میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے ہر روز ہندو ظلم پر لکھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن اگر مسلم آبادیوں کا جائزہ لیا جائے تو برعکس طور پر معلوم ہو گا کہ ہندو کا ظلم مسلمان پر اگر ایک فیصد کے درجہ میں ہے تو مسلمان کا ظلم مسلمان پر ۹۹ فی صد کے درجہ میں ہے۔

سردھنہ کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں مجھے دوسرے قصبوں کے مقابلہ میں زیادہ صفائی نظر آئی۔ صفائی کا وہ معیار جو یورپ کے قصبات میں پایا جاتا ہے، اس سے

اگرچہ سردھنہ ابھی بہت دور ہے۔ تاہم ہندستان کے دوسرے قصبات کے مقابلہ میں ضرور وہ زیادہ صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر شمالی ہند کے قصبات کے مقابلہ میں۔

ایک مجلس میں مختلف سوالات ہوئے۔ ان کا تعلق اسلام سے بھی تھا اور مسلمانوں سے بھی۔ چند سوال و جواب یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جناب نبیل الرحمن صاحب پرنسپل انٹر کالج کی ایک تحریر مجھے دستی طور پر ملی۔ اس میں موصوف نے لکھا تھا:

"غرض یہ ہے کہ میں نے آپ کے مضامین اخبار و الرسالہ وغیرہ میں پڑھے لیکن میں ان سے پوری طرح متفق نہیں تھا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کو سردھنہ تشریف لائے۔ عشار بعد اور جمعہ بعد دونوں تقریر آپ کی سنی الحمدللہ بہت پسند آئیں سب خدشات دور ہو گئے۔

میری صاحبزادی میڈیکل لائن اختیار کرنا چاہتی تھی میں اس بارے میں مذبذب تھا۔ کسی محقق عالم دین کی جو دور جدید کے تقاضوں سے بھی واقف ہو، تلاش میں تھا یہ اوصاف آپ کی شخصیت میں نظر آئے۔ آپ نے بچی کے متعلق تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ دعا کی بھی تاکید کی کہ بچی کے بارے میں دعا کرتے رہو۔ اس سے طبیعت میں جو ایک قسم کی کھٹک تھی وہ دور ہو گئی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے"

ایک سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں کے یہاں کھانا پینا مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ کھانے پینے کے معاملہ میں جو فرق ہے وہ مسلم دسترخوان اور غیر مسلم دسترخوان کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ خود کھانے اور پینے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جس چیز کو کھانا یا پینا جائز ہے وہ ہر جگہ جائز ہے۔ اور جس چیز کو کھانا یا پینا حرام ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں یہ قاعدہ بتایا جاتا ہے کہ عدد ہمیشہ خاص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خاص لفظ کے معنی میں کمی یا زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ پھر احادیث میں عدد کی تعیین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے جو ارشادات ہیں، مثلاً تین سانس میں پانی پینا، تو آیا اس سے تعیین مراد لیا جائے گا یا تیسیر۔

میں نے کہا کہ چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کمیاتی نوعیت کی، اور دوسرے کیفیاتی نوعیت

کی۔کمیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا ذکر ہو تو وہ متعین صورت میں مراد ہوگا، جیسے کعبہ کا سات بار طواف۔ لیکن کیفیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا لفظ محض تفہیم کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً "ایمان کے ستر شعبے ہیں" کا مطلب متعین مفہوم میں ستر نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب سادہ طور پر کثرت سے ہے۔ کیوں کہ ایمانی کیفیات کے اظہار کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک تین سانس میں پانی پینے کی بات ہے وہ تیسیر کے لیے ہے نہ کہ تحدید کے لیے۔

ایک فاضلِ دیوبند نے یہ سوال کیا کہ حدیث میں تجدید دین کے بارے میں روایتیں آئی ہیں کہ ہر سو سال کے بعد ایک مجدد آئے گا وہ تجدید دین کرے گا، تو اس حساب سے اب تک ۱۴۰۰ مجدد ہونا چاہیے۔ حالاں کہ مجددوں کی فہرست کے اندر اتنے نام نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ تجدید دین سے مراد، جزءِ دین کی تجدید ہے یا کل دین کی۔ اگر کل دین کی تجدید مراد ہے۔ تو ایسا کوئی مجدد اب تک نظر نہیں آیا جس نے کل دین کی تجدید کی ہو۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے لیکن تاریخ اسلام میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس نے دعوت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

میں نے کہا کہ حدیث میں "سو سال" کا لفظ اعتباری ہے۔ اس کی مدت کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ بھی۔ دوسری بات یہ کہ جزئی تجدید کی ضرورت حالات کی تبدیلی کے تحت پیش آتی ہے۔ کیوں کہ حالات ہمیشہ بار بار بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں تک کلی تجدید کا تعلق ہے وہ دور کی تبدیلی پر آتی ہے۔ کلی تجدید کی ضرورت پہلی بار صرف موجودہ زمانہ میں پیش آئی ہے آج کا زمانہ ہر اعتبار سے ایک بدلا ہوا زمانہ ہے، اس لیے وہ کلی تجدید دین کا تقاضا کرتا ہے۔ ماضی میں کلی تجدید کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ایک سوال یہ تھا کہ کبر میں اور جرأت مندی میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ کبر کے پیچھے ذات کی برتری کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور جرأت مندی کے پیچھے حق کی برتری کا جذبہ۔

ایک سوال یہ تھا کہ تواضع اور احساس کمتری میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تواضع کی کیفیت خدا کو بلند و برتر ماننے سے ابھرتی ہے۔ اور کمتری کا احساس انسان کو بلند و برتر سمجھنے سے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مصلحت پسندی میں اور مداہنت میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ مصلحت کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ اور مداہنت ہمیشہ ذاتی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

کون آدمی دینی مصلحت پر ہے اور کون آدمی ذاتی مداہنت پر، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جو آدمی دینی مصلحت کی بنا پر ایک طریقہ اختیار کرے، اس کی زندگی میں تضاد نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جو آدمی ذاتی مداہنت کی روش پر ہو، اس کی زندگی میں لازماً تضاد پیدا ہو جائے گا۔

مثلاً آپ ایک دولت مند ملک میں ہیں۔ وہاں آپ کو بہت بڑی تنخواہ مل رہی ہے اور آپ دفتر کے نظام میں حد درجہ موافقت کر کے رہتے ہیں۔ اب اگر آپ کی موافقت اصول کی بنا پر ہو تو اپنے گھر کے اندر بھی آپ اس نظام کی تعریف کریں گے جس طرح آپ دفتر میں کرتے ہیں۔ اور اگر آپ با اصول نہ ہوں تو آپ کا حال یہ ہوگا کہ دفتر کے اندر نظام کے حق میں اچھے الفاظ بولیں گے اور گھر کے اندر اس کے حق میں برے الفاظ۔ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ انسان بن کر رہ جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصلحتِ دینی ایک با اخلاص عمل ہے، اور مداہنت سرتاسر ایک منافقانہ عمل۔ ایک عمل سے انسان کی شخصیت بلند ہوتی ہے، جب کہ دوسرا عمل آدمی کی شخصیت کو کثیف بنا کر رکھ دیتا ہے۔

۱۲ اپریل کو جمعہ تھا۔ سردھنہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے، اندر سے باہر تک نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ موجودہ مسلمانوں سے جو سب سے بڑی چیز اٹھ گئی ہے وہ شکر خداوندی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ ایک مسجد کے ساتھ کسی وجہ سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو ہر زبان اور ہر قلم اس کے پر جوش تذکرہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مگر اسی ملک میں لاکھوں مسجدیں شاندار طور پر آباد ہیں اور اس کے تذکرہ میں کوئی رطب اللسان نہیں۔

جمعہ کے بعد میری تقریر کا اعلان ہوا۔ بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں علم کی اہمیت بیان کی۔ میں نے کہا کہ قرآن میں پہلی آیت اقرأ (پڑھ) کا اترنا بتاتا ہے کہ علم سفرِ اسلام کا

آغاز ہے۔ اس سلسلے میں تاریخی مثالیں دیتے ہوئے بتایا تھا کہ علم سے مراد سند اور سرٹیفکٹ والا علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ علم ہے جو آدمی کو باشعور بنائے۔ جو مومن کو صاحب فراست انسان بنا دے۔ جو عسر میں یسر دیکھنے کی نظر پیدا کرے۔ جس کا یہ نتیجہ ہو کہ آدمی پہاڑوں کو دیکھ کر اس سے تقویٰ اور خشیت کی غذا لینے لگے۔

سفر کے آخر میں مولانا محمد عرفان قاسمی (استاذ حدیث) نے اپنا تاثر تحریری صورت میں لکھ کر دیا۔ یہ انھیں کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

" اسلامی تاریخ میں بے شمار دُعاۃ و مبلغین پیدا ہوئے ہیں، لیکن صاحب الرسالہ اپنی نوعیت کے پہلے داعی ہیں جنھوں نے اسلام کے دعوتی پہلو کو نمایاں کیا ہے، موصوف نے دین کے اساسی اصول کو مرکز توجہ بنایا ہے، حق تعالیٰ نے آنجناب کو عصر حاضر میں تجدید دین و احیاء اسلام کے لیے مبعوث فرمایا۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں جہاں دین کے اندر غیر دین کی آمیزش ہو گئی تھی، وہیں احیاء اسلام کے لیے موافق اسباب بھی جمع ہو گئے تھے، حضرت مولانا نے نہ صرف دین کو بے آمیز بنایا بلکہ موافق اسباب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ، اس کو بھرپور استعمال کی کوشش کی، تاکہ فکر اسلامی کو دنیا کے اندر غالب فکر کا مقام عطا ہو سکے، سچ تو یہ ہے کہ دعوت دین کی تحریک کو جس پیغمبرانہ طریقہ پر چلایا، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے آنجناب واحد حقیقی مصداق ہیں "

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو جمعہ کی نماز اور تقریر کے بعد ایک صاحب کے مکان پر چائے کی نشست ہوئی۔ یہاں دوبارہ مختلف موضوعات پر گفت گو ہوئی۔

آج کے اخبار میں "ضلع میرٹھ" کا خبرنامہ چھپا ہوا تھا۔ اس میں قتل یا حادثاتی موت کے آٹھ واقعات درج تھے۔ کسی دیہات میں گھریلو جھگڑوں میں ایک آدمی نے دوسرے کو مار ڈالا۔ کہیں سڑک پر دو سواریوں کی ٹکر میں کوئی شخص ہلاک ہو گیا۔ وغیرہ۔ (قومی آواز ۱۲ اپریل ۱۹۹۶)

میں نے کہا کہ دیکھئے، میں دو دن سے میرٹھ کے علاقہ میں ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات میرے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ گویا کہ چار ملین آبادی کے ضلع میں یہ محض استثنائی واقعات ہیں نہ کہ عمومی واقعات۔ لیکن اگر میں میرٹھ سے دور ہوتا اور صرف اخبار ہی میرے لیے میرٹھ ضلع کو جاننے کا ذریعہ

ہوتا تو یہی استثنائی واقعات میرے لیے کل واقعات بن جاتے۔ میں انھیں سے میرٹھ ضلع کی تصویر بناتا۔ پھر میں سمجھ لیتا کہ میرٹھ تو صرف قتل اور موت کا ایک علاقہ ہے۔

میں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں ہزار سال سے امن اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ سو سال پہلے جب یہاں اخبار کا دور آیا اسی وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کی مصنوعی تصویر دکھانے لگے۔ پچھلے زمانہ میں باہمی اختلاط ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ تھا، اب اخبارات ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر سردھنہ میں دونوں فرقے باہم مل کر رہتے ہیں۔ مگر یہ بات اخبار میں نہیں چھپے گی۔ البتہ کبھی کسی ہندو اور کسی مسلمان میں لڑائی ہو جائے تو وہ فوراً اخبار میں چھپ جاتا ہے۔ اس قسم کی منفی رپورٹنگ دونوں طرف ہو رہی ہے۔ ہندی اخبار اس قسم کی ادھوری رپورٹنگ کے ذریعہ ہندوؤں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ اسی طرح اردو اخبار اسی قسم کی ناقص رپورٹنگ کے ذریعہ مسلمانوں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ یہی غیر فطری ذہن کبھی کسی اتفاقی سبب سے بھڑک اٹھتا ہے تو وہ فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہو کر دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ سردھنہ سے گزر کر ہماری گاڑی میرٹھ کے بازار میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں سرگرم طور پر مختلف تجارتوں میں مشغول ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مسلمان اس نظریہ کو رد کر رہے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ اسی طرح ہندو اس پروپگنڈے سے باہر نکل آئے ہیں کہ مسلمان ان کے لیے ایک غیر مطلوب فرقہ ہیں۔ اب دونوں از سر نو ایک دوسرے کو قبول کر رہے ہیں۔ مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے مواقع سے بھرا ہوا ایک ملک ہے۔ ایک عرصہ تک وہ نااہل لیڈروں اور بے بصیرت دانش وروں کے بہکاوے میں رہے۔ اب وہ اس فریب سے باہر آ گئے ہیں۔

اسی طرح ہندو جو بعض پروپگنڈوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو "بابر کی سنتان" کے روپ میں دیکھنے لگا تھا، اب وہ ان کو فرزندان وطن کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ ان کو ہندستان کی

متحدہ قومیت کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھ رہا ہے۔ وہ ان کو اپنے بھائی کے روپ میں دیکھ رہا ہے نہ کہ رقیب اور حریف کے روپ میں۔ یہ صورت حال جو آج ہر جگہ دکھائی دے رہی ہے وہ بلاشبہ ایک صحت مند سماج کی علامت ہے، اور وہ یقینی طور پر ملک کے لیے ایک نئے اور بہتر مستقبل کی آمد خبر دے رہی ہے۔

ضلع میرٹھ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقی کے وافر مواقع موجود ہیں۔ مگر میرٹھ کو، خاص طور پر یہاں کے مسلمانوں کو جتنی ترقی کرنا چاہیے تھا، اتنی ترقی وہ نہ کر سکے۔ اس کا سبب غالباً یہاں کے لوگوں کا وہ مزاج ہے جو ۵۹-۱۸۵۷ کی بغاوت میں شرکت کے نتیجہ میں فطری طور پر بنا۔

میرٹھ سے آگے ایک نہر ہے جس کے اوپر پل بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ گنگا نہر ہے۔ ۱۹۸۷ کے فساد میں پچاس سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو گولی مار کر اس نہر میں ڈال دیا گیا تھا اس واقعہ کی ضروری تفصیل الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۳۴-۳۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جب گنگا نہر کے بہتے ہوئے پانی پر میری نگاہ پڑی تو میں نے سوچا کہ کیا یہ پانی نو سال پہلے ہونے والے واقعہ کی تفصیل بتائے گا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ وہ پانی اب یہاں کہاں ہے۔ وہ وہ تو بہہ کر سمندر میں جا چکا۔ پھر خیال آیا کہ وہ پانی اب سمندر میں بھی نہیں ہوگا۔ وہ بھاپ بن کر فضا میں چلا گیا ہوگا اور پھر بادل بن کر کہاں کہاں برسا ہوگا، اب کسی کو بھی یہ معلوم نہیں۔

مگر خدا کے علم میں یہ ساری باتیں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کی قدرت میں ہے کہ وہ حکم دے اور تمام چیزیں دوبارہ اکٹھا ہو کر پورے واقعہ کو ٹھیک اسی طرح سنا دیں جس طرح وہ ۲۳ مئی ۱۹۸۷ کو پیش آیا تھا۔ اس دن کون ظالم ثابت ہوگا اور کون مظلوم قرار دیا جائے گا، اس کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں۔

راستہ میں ہم مودی نگر سے گزرے۔ یہاں ایک شوگر مل ہے۔ اس کے پاس دور تک سڑک کے کنارے گنّا لانے والوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی، کسان اپنا اپنا گنا ٹریکٹر پر لاد کر یہاں لائے تھے اور اب اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

سب سے پہلے یہ منظر میں نے مشرقی یوپی میں شاہ گنج کی مل میں دیکھا تھا۔ اس وقت

کسان اپنا گنا بیل گاڑیوں پر لاد کر لاتا تھا۔ اس کے بعد کرایہ کے ٹرک کے اوپر لدے ہوئے گنے سڑکوں پر دکھائی دینے لگے۔ اب کسان اپنا گنا اپنے ٹریکٹر پہ لاد کر لاتا ہے۔ یہ ملک میں کسان کی ترقی کا ایک علامتی واقعہ ہے۔ بیل گاڑی کے بعد کسان کرایہ کے ٹرک استعمال کرتے تھے، اب انھوں نے خود اپنے ٹریکٹر خرید لیے ہیں جو پیداوار حاصل کرنے کا کام بھی کرتا ہے اور فصل کو لاد کر بازار بھی پہنچاتا ہے۔

مودی نگر پہلے میرٹھ ضلع کا ایک حصہ تھا۔ اب وہ انتظامی اعتبار سے غازی آباد میں شامل کردیا گیا ہے۔ یہاں ۲۷ اپریل کو ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ یوپی روڈ ویز کی ایک بس جو دہلی سے رڑکی جارہی تھی، وہ مودی نگر پہنچی تو اس کے اندر ایک بم پھٹا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن آدمی مرگئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں گیارہ مہینہ کا ایک بچہ بھی شامل تھا۔ بم بس کے اگلے حصہ میں ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ باہر کی دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ہندستان ٹائمس (۲۹ اپریل) کے مطابق، کشمیر کے ایک عسکری گروہ اسلامی حرکت المومنین نے اس بم دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ (تباہ شدہ بس کی تصویر نیچے ملاحظہ فرمائیں)

The mangled remains of the ill-fated UP Roadways bus (UP-15A-6693)

موجودہ زمانہ میں ناراض عناصر اس قسم کی وحشیانہ کارروائیاں ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہے کہ ان کا کوئی آدمی جب ایسا فعل کرتا ہے تو اس کا عمل جہاد قرار پاتا ہے۔ اور وہ خود مجاہد کا لقب پاکر اپنی قوم کے درمیان ہیرو بن جاتا ہے۔

راستہ میں ایک جگہ ریلوے کراسنگ تھی، کوئی ٹرین آرہی تھی، اس لیے دونوں طرف کے گیٹ بند کر دیے گئے تھے۔ ہماری گاڑی کھڑی ہو گئی۔ میں نے اتر کر دیکھا تو دونوں طرف سڑک کے اوپر دور تک گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر کوئی کہے کہ صرف ایک ٹرین کو گزارنے کے لیے اتنی زیادہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ٹریفک کا یہ اصول بالکل غیر منصفانہ ہے تو یہ جملہ قواعد کے لحاظ سے درست مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوگا۔ کیوں کہ یہ کم تعداد اور زیادہ تعداد کا مسئلہ نہیں، یہ ترجیح اور تنظیم کا مسئلہ ہے۔ اور جہاں اس طرح کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کم ہے اور کون زیادہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ کو دیکھنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے، اور دوسرا غلط رخ۔ فرق کی اس حکمت کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کسی معاملہ میں ایک فیصلہ کرے گا۔ اپنی جگہ پر وہ سمجھے گا کہ میں درست ہوں۔ حالاں کہ وہ سراسر غلطی پر ہوگا۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہوگی کہ وہ معاملہ کو غلط رخ سے دیکھ رہا ہوگا۔

مثلاً آج کل دنیا بھر کے مسلم علماء اور دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر متحد ہو گئی ہیں۔ یہود و ہنود اور صہیونی طاقتیں اور صلیبی طاقتیں سب کی سب چاہتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دیں۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ پھر ایک بے بنیاد بات پر مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے کیوں اس طرح متفق ہو گئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک واقعہ کو وہ غلط رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا بھر میں غیر موافق حالات کا تجربہ پیش آرہا ہے۔ مگر اس معاملہ کا تعلق قانون فطرت سے ہے نہ کہ انسانوں کی مخالفانہ کارروائیوں سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کا نظام اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں انسانوں

کے درمیان مقابلہ ہو۔ یہاں ترقی کا عمل مقابلہ اور مسابقت کے ذریعہ جاری رہتا ہے۔ جو کبھی کبھی عداوت تک پہنچ جاتا ہے (بعضکم لبعض عدو) ہمارے علماء اور دانشوروں کی غلطی یہ ہے کہ جس واقعہ کو انھیں قانونِ فطرت کے رخ سے دیکھنا چاہیے تھا اس کو وہ انسانی سازش اور انسانی عداوت کے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ معاملہ کو قانونِ فطرت کے رخ سے دیکھتے تو موجودہ صورت حال کو ایک چیلنج سمجھ کر اس کے حل کی تدبیر ڈھونڈتے۔ مگر جب انھوں نے اس کو انسانی سازش کی نظر سے دیکھا تو ان کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ مفروضہ دشمنوں کی سازش اور عداوت کا انکشاف کریں اور سمجھیں کہ ہم ایک کام کر رہے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو ہم سے بھی زیادہ سازش اور مخالفت کا سامنا پیش آیا۔ مگر وہ تمام سازشوں اور مخالفتوں کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ شعوری اور کرداری طاقت کا ہے۔ وہ لوگ شعور اور کردار میں طاقت ور تھے اس لیے کوئی سازش انھیں نقصان نہ پہنچا سکی۔ موجودہ مسلمان شعور اور کردار کے اعتبار سے بے جان ہو چکے ہیں اس لیے وہ بآسانی ہر سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب میں دہلی واپس آ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ سردھنہ کے سفر سے مجھ کو کیا ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سردھنہ کے دو روزہ قیام کے دوران میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا وہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ بظاہر اس غیر اہم مقام پر بہت سی ایسی باتیں میرے علم میں آئیں جو اس سفر سے پہلے مجھے معلوم نہ تھیں۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے "معلوم" ہی کو وہ سب کچھ سمجھ لے۔ عین ممکن ہے کہ یہاں اور بھی بہت سے باتیں ہوں جو آدمی کے لیے ابھی تک لامعلوم ہوں، حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے اسی دنیا میں وہ پوری طرح موجود ہوں۔

یہ بات انسان کے لیے بھی ہے اور دوسری چیزوں کے لیے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے سلسلہ میں ہمیشہ حسن ظن کی تاکید کی گئی ہے۔ حسن ظن آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ کسی کے بارہ میں ایسی رائے قائم کر لے جو بطور واقعہ درست نہ ہو (الحجرات ۶)

یہی معاملہ دوسری چیزوں کا ہے۔ آدمی سفر میں نئے نئے مقامات دیکھتا ہے اور

نئی نئی باتیں سیکھتا ہے۔ اسی لیے سیاحت کو قرآن میں مومن کی ایک صفت بتایا گیا ہے۔
امام رازی نے سائحون اور سیاحت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: السائحون فی الارض لطلب العلم۔ السیاحۃ هی الذهاب فی المدن للعظۃ والاعتبار۔ اگر آدمی کے اندر توسّم (الحجرہ ۷۵) کی صفت موجود ہو تو ہر سفر اس کے لیے ایک عظیم درس عبرت بن جائے گا۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو مغرب کے وقت میں دہلی واپس آگیا۔ زندگی پوری کی پوری اسی قسم کا ایک وسیع تر سفر ہے۔ آدمی اپنی قیام گاہ سے نکل کر کہیں جاتا ہے اور دوبارہ اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا ہے۔ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا، یہاں تک کہ انسان اپنی آخری منزل، آخرت تک پہنچ جائے۔

جب میں دہلی پہنچا تو کل کے دن مکان کے جس گیٹ سے نکل کر میں گاڑی میں بیٹھا تھا، آج گاڑی سے نکل کر دوبارہ اسی گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت مجھے یہ دعا یاد آئی:
رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنك سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل ۸۰)
کچھ سیاسی ذوق رکھنے والوں نے لفظی مشابہت کی بنا پر یہاں سلطان کو سیاسی اقتدار کے معنی میں لے لیا ہے۔ یہ اس کی معنویت کو غارت کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں سلطان سے مراد نصرت لدنی یا نصرت الٰہی ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر حضرت موسیٰ کے لیے فرمایا: سنشد عضدك باخيك ونجعل لكما سلطانا فلا يصلون اليكما (القصص ۳۵) یہ مدد کی وہ قسم ہے جو خصوصی طور پر داعیٔ حق کو ملتی ہے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔
اس دعا کا تعلق مدخل اور مخرج دونوں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا، نکلنے میں بھی تو میری مدد فرما اور داخل ہونے میں بھی تو میری مدد فرما۔ ہر وقت اور ہر لمحہ کے لیے تو میرا طاقت ور مددگار بن جا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۶، شمارہ ۲۴۱

فہرست

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-46973

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-258343

مرغوباتِ دنیا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : لوگوں کے لیے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی، یہ سب دنیوی زندگی کے سامان ہیں، اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے (آل عمران ۱۴)

خواہشوں کی محبت (حب الشہوات) بہت عام لفظ ہے۔ اس میں دور قدیم کی مرغوب چیزوں سے لے کر موجودہ صنعتی دور کی مرغوب اشیاء تک ہر چیز شامل ہے۔ ان دنیوی چیزوں کی چمک دمک آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ آیت کے مطابق، یہ ایک پیدائشی جذبہ ہے، کوئی بھی شخص اس جذبہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ایسی حالت میں ایک مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا بہترین جواب حضرت عمرؓ کی وہ دعا ہے جو صحیح البخاری میں بطور تعلیق روایت کی گئی ہے۔ اس کے مطابق، حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے قرآن کی مذکورہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے کہا : اللّٰھم انا لا نستطیع الا ان نفرح بما زینتہ لنا۔ اللّٰھم انی اسئلک ان انفقہ فی حقہ (فتح الباری ۱۱/۲۶۳) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں : لا نستطیع الا ان نحب ما زینت لنا، فقنی شرہ وارزقنی ان انفقہ فی حقک (صفحہ ۲۶۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ، یہ ہمارے بس میں نہیں کہ ہم ان چیزوں پر خوش نہ ہوں جن کو تو نے ہمارے لیے مزین کر دیا ہے۔ اے اللہ، میں تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہوں کہ ان چیزوں کو میں ان کے حق میں صرف کروں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہیں ہے کہ مرغوبات دنیا کو دیکھ کر آدمی متاثر نہ ہو۔ اگر وہ متاثر نہ ہو تو پھر اس کا امتحان کس چیز میں ہوگا۔ آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر متاثر ہو مگر وہ اس میں لت پت نہ ہو جائے۔ وہ اپنے قلبی تاثر کو عملی روش بننے سے بچائے۔ وہ ظاہری مرغوبیت سے گزر کر اس کے اندرونی غیر مرغوب پہلو کو دیکھ لے۔ دنیا اسے اپنی طرف کھینچے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کھینچ کر خدا کی طرف لے جائے۔

چار دور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دور رسالت ۲۳ سال ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو مکی دور اور مدنی دور میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم صرف مکانی پہلو کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ مرحلۂ نبوت کے اعتبار سے آپؐ کی ۲۳ سالہ مدت مزید کئی دوروں میں تقسیم ہوتی ہے۔ وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے اس کو چار دور کہا جا سکتا ہے۔ دو دور مکہ میں، اور دو دور مدینہ میں۔

مکی زندگی کا پہلا دور (نصف اول) وہ ہے جب کہ آپ خفیہ انداز میں دعوت دیتے تھے۔ نماز بھی چھپ کر پڑھی جاتی تھی۔ قرآن کے نازل شدہ حصوں کی تلاوت بھی چھپ کر کی جاتی تھی۔ اس کو دور اسرار کہا جا سکتا ہے۔

مکی زندگی کا دوسرا دور (نصف ثانی) وہ ہے جب کہ آپؐ نے اعلان کے ساتھ توحید کی دعوت دینا شروع کیا۔ نماز اور تلاوت بھی کسی حد تک کھل کر کی جانے لگی۔ اس دوسرے دور کو سمجھنے کے لیے ہم اس کو دور اعلان کہہ سکتے ہیں۔

مدنی زندگی کا پہلا نصف دور (یا نبوت کا تیسرا دور) وہ ہے جب آپ نے "صحیفۂ مدینہ" کے ذریعہ مومنین اور مشرکین اور یہود کے درمیان حلیفانہ تعلق قائم کیا۔ اس میں ہر فریق کو اپنے مذہب اور اپنی روایات پر قائم رہنے کی ضمانت تھی۔ اس تیسرے دور کو دور مصالحت کہا جا سکتا ہے۔

مدنی دور کا دوسرا نصف حصہ وہ ہے جو فتح مکہ کے بعد شروع ہوا۔ اس دور میں پورے علاقہ میں اسلام کا غیر مشترک غلبہ قائم ہو گیا۔ یہ نبوت کا چوتھا اور آخری دور تھا۔ اس کو عمومی تفہیم کے لیے دور اقتدار کہا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کو جو قرآن دیا گیا اس کا کچھ حصہ پہلے دور میں اترا، کچھ دوسرے دور میں، کچھ تیسرے دور میں اور کچھ چوتھے دور میں۔ ہر دور میں آپؐ پر جو احکام اترے اس وقت آپ انھیں احکام کے مکلف تھے نہ کہ بعد کو اترنے والے احکام کے۔ ان چار دوروں میں جو باہمی نسبت ہے وہ آغاز اور تکمیل کی نہیں ہے۔ یہ دراصل چار مختلف نوعیت کے حالات کی مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو ان میں سے کسی دور میں پائیں تو وہاں وہ کس طرح رہیں۔

ایک حدیث

ابن ماجہ اور الترمذی (کتاب الزھد) میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے (ازھد فی الدنیا یُحبك اللہُ وازھد فیما عند الناس یُحبك الناس)

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو ذہنی یکسوئی عطا کرتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حقائق مادی سے اوپر اٹھ کر حقائق معنوی کو اپنی ساری توجہات کا مرکز بنا سکے۔ یکسوئی کا یہ عمل اس کی زندگی میں جاری رہتا ہے۔ وہ مسلسل مادیت سے روحانیت کی طرف سفر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شخصیت مکمل طور پر ایک روحانی شخصیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک ارتقا یافتہ شخصیت بن سکے۔ یہی ارتقا یافتہ شخصیت وہ چیز ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ آدمی عبد رہتے ہوئے اپنے مزاج اور اپنے شاکلہ کے اعتبار سے خدا کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو خدا کی قربت میں جگہ ملے، وہ خدا کا پسندیدہ بندہ بن جائے۔

جب آدمی کے دل میں خدا کی محبت بیٹھتی ہے تو فطری طور پر وہ غیر متعلق چیزوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام زھد ہے۔ یہ زھد ہی خدا سے قریب ہونے کی قیمت ہے۔ زھد نہیں تو خدا کی قربت بھی نہیں۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہونا کیوں آدمی کو لوگوں کے لیے قابل قدر اور قابل محبت بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا آدمی لوگوں کی نظر میں ایک بلند انسان بن جاتا ہے۔ لوگوں کی چیزوں میں رغبت رکھنے والا آدمی لوگوں کو اپنے برابر کا انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس کے حق میں لوگوں کے اندر قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ نہیں جاگتا۔ اس کے برعکس جو آدمی لوگوں کو بے نیاز دکھائی دے اس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھیں گے ـــــ خدا کا محبوب بننے کا راز خدا کا طالب بننا ہے، اور لوگوں کا محبوب بننے کا راز لوگوں سے بے نیاز ہو جانا۔

روایت کو توڑنا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد امت کو سب سے زیادہ جس فتنہ سے ڈرایا تھا وہ باہمی لڑائی کا فتنہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کسی بھی عذر کو لے کر باہمی لڑائی نہ کرنا۔ کیوں کہ میری امت میں اگر ایک بار تلوار اٹھ گئی تو قیامت تک وہ دوبارہ میان میں نہیں جائے گی (اذا وُضع فی امتی السیف لم یرفع عنھم الی یوم القیامۃ) مسند احمد

ایک عرب عالم اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگوں نے جب خلیفہ عثمانؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس میں ایک بڑا سوراخ کر دیا اور جب انھوں نے امام حسینؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس کو پھاڑ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا (حین قتلوا عثمان احدثوا خرقا واسعا فی ثوب الاسلام وحین قتلوا الحسین مزّقوا الثوب تمزیقاً)

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی سماج ہمیشہ روایات کے اوپر چلتا ہے۔ کوئی صحت مند روایت کسی سماج میں نہایت مشکل سے قائم ہوتی ہے۔ اور جب کسی سماجی روایت کو کھلم کھلا توڑ دیا جائے تو دوبارہ اس کو قائم کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سماجی روایت کو توڑنا سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں انسانی احترام کی روایت قائم کی تھی۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے مقدس شہر میں خلیفۂ راشد کو بے دریغ قتل کیا۔ اور جب دوبارہ ایک مسلم گروہ نے نواسۂ رسولؐ کو کھلے عام قتل کر دیا تو انھوں نے انسانی جان کے احترام کی روایت کو آخری حد تک توڑ ڈالا۔ اس کے بعد کسی کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس روایت کو دوبارہ قائم کرے۔ چنانچہ رسولؐ کی پیشین گوئی کے مطابق، وہ پوری مسلم تاریخ میں جاری و ساری ہو گئی۔

کوئی شخص اگر کسی ظلم کو مٹانا چاہتا ہے تو بطور خود وہ خواہ کتنا ہی مخلص ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ روایات کو توڑے بغیر اپنا کام کرے۔ ورنہ ظلم کے خلاف اٹھنے والا خود سب سے بڑا ظالم قرار پائے گا۔

جماعت صحابہ

صحیح مسلم (کتاب الجہاد والسیر) میں یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بیان کیا کہ جب بدر کا دن تھا۔ اور دونوں گروہ ایک میدان میں آمنے سامنے جمع تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار مسلح افراد تھے۔ اور دوسری طرف آپ کے اصحاب صرف ۳۱۳ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھاکر اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ، تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما —— اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کی اس جماعت کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی :

اللّٰھمَّ اِن تُھلِك ھٰذہِ العِصابۃَ من اھل الاسلام لا تُعبَد (بعدھا) فی الارض (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۲/۸۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بلا مبالغہ درست تھے۔ آپ کے یہ اصحاب جن کو حالات نے میدان بدر میں اکٹھا کیا تھا، وہ خیار انسانیت تھے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام (تمہارے جو افراد جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہوں گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرب میں جو لوگ اکٹھا ہوئے تھے، وہ پوری بشری تاریخ کے بہترین لوگ تھے، وہ لمبے تاریخی عمل کے دوران بن کر تیار ہوئے اور پھر انھیں یہ موقع ملا کہ وہ خاتم الرسل کا ساتھ دے کر وہ انقلاب برپا کریں جو ہزاروں سال سے اللہ تعالے کو مطلوب تھا۔ مگر اب تک وہ وقوع میں نہیں آیا تھا۔

یہ وہ قیمتی گروہ تھا جو تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھا۔ وہ ایک طرف خیار انسانیت تھا اور دوسری طرف خیار اسلام۔

بے ضرر ہونا

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (البخاری) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہی بات دوسری روایت میں اس طرح آئی ہے کہ: المسلم من سلم الناس من لسانہ (احمد) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان (اور جس کے ہاتھ) سے لوگ محفوظ رہیں۔

ان دونوں روایتوں میں سے ایک میں "مسلم" کا لفظ ہے اور دوسری میں "لوگ" کا۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک عام ادبی اسلوب ہے کہ کبھی کلام میں لفظی اعتبار سے بظاہر خصوص ہوتا ہے مگر اس سے عموم مراد ہوتا ہے، اور کبھی باعتبار الفاظ عموم ہوتا ہے اور اس سے خصوص مراد ہوتا ہے۔ یہ اسلوب بہت سی حدیثوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک روایت ہے کہ المسلم اخو المسلم (البخاری) یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ یہی بات دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ: إن العباد کلھم اخوۃ (ابوداؤد) یعنی تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

مسلم وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے۔ جو خدا کی عظمتوں کا اس طرح ادراک کرے کہ اپنا وجود اس کو ہر اعتبار سے غیر عظیم دکھائی دینے لگے۔ ایسے انسان کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں اسی کا ایک پہلو وہ ہے جو مذکورہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

ایسا انسان ہر لمحہ اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر ایسی شخصیت کی تخلیق کرتا ہے جو دوسروں کے لیے کامل طور پر بے ضرر ہو۔ اس کی زبان کسی کے خلاف نہیں کھلتی۔ اس کے ہاتھ سے کسی کو دکھ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ گویا اس کے لیے نااہل ہو جاتا ہے کہ اس کی طاقت اور صلاحیت کبھی بھی اور کسی حال میں بھی کسی کے خلاف استعمال ہو۔

مومن و مسلم انسان کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنتا اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاتا۔ خدا کی عظمت و جلال کا احساس اس کو ایک ایسے درخت کی مانند بنا دیتا ہے جس کا کانٹا توڑ دیا گیا ہو اور اب اس میں صرف پھول ہی پھول باقی رہ جائیں۔

مومن وہ ہے جو لوگوں کے درمیان نو پرابلم انسان بن کر رہے۔

یہ انسان

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ کوئی شخص سیادت نہیں کر سکتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کے کچھ محبین ہوں جو اس کی مدح کریں اور کچھ حاسدین ہوں جو اس کی مذمت کریں (لاَ یَسُودُ سَیِّد بِدُونِ وَدُودٍ یَمدَحُ وحسودٍ یَقدَحُ)

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس دنیا میں جو واقعہ ہوتا ہے اس میں امتحان کی مصلحت لازمی طور پر شامل رہتی ہے۔ یہی معاملہ کسی صاحبِ سیادت شخص کا ابھرنا ہے۔ ایک سچا انسان جب اللہ کی توفیق سے سیادت و قیادت کے میدان میں ابھرتا ہے تو وہ پورے معاشرہ کے لیے امتحان کا ایک پرچہ بن جاتا ہے۔

اب جو لوگ طالبِ حق ہیں، جن کے اندر سچائی کو پانے کی خواہش موجود ہے۔ جو حق کو سب سے بڑا درجہ دیے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ۔ وہ پیشگی طور پر نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ ابھرنے والے قائد کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے درمیان وہ محبوب کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ وہ اپنے بہترین الفاظ اور بہترین جذبات اس کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی ذاتی بڑائی میں جی رہے ہوں۔ جو حق کے طالب نہ ہوں بلکہ اپنی خواہش نفس کے طالب ہوں۔ ایسے لوگ جب کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ فوراً حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص کے قد کا بڑھنا گویا میرے قد کا چھوٹا ہونا ہے۔ یہ لوگ حسد کی آگ میں بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے باہر ابھرنے والے شخص کی مذمت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ وہ اس کو نیچا دکھانے کے لیے ہر وہ پست حرکت کرنے پر تُل جاتے ہیں جو ان کے بس میں ہو —— ہر صاحب سیادت آدمی ایک امتحان ہے۔ اس امتحان میں ایک قسم کے لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ ناکام۔

خاموشی کی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ آپ دیر دیر تک خاموش رہتے تھے : فکان طویل الصمت (مسند احمد) آپ نے فرمایا کہ تم لوگ خاموشی کا طریقہ اختیار کرو : فعلیکم بالصمت (الدارمی) الترمذی، الدارمی، مسند احمد میں ہے آپ نے فرمایا کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من صمت نجا)

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک اہم پہلو وہ ہے جو طریق کار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شور وغل کا طریقہ اختیار کرنے والا اس دنیا میں ناکام ونامراد رہتا ہے۔ اور جو آدمی خاموش تدبیر کا طریقہ اختیار کرے، اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوگی کہ قوانین فطرت اس کا ساتھ دیں گے اور وہ کامیابی کی مطلوب منزل تک پہنچ کر رہے گا۔

لاویٹر (Johann Kaspar Lavater) ۱۷۴۱ میں زیورک میں پیدا ہوا، ۱۸۰۱ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ فطرت کے اسی قانون کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ وہ شخص بولنا نہیں جانتا جو چپ نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے اور بھی کم واقف ہے کہ زیادہ موثر طور پر کوئی کام کس طرح کیا جائے :

He knows not how to speak who cannot be silent;
still less how to act with vigor and decision.

چپ رہنے والا سوچتا ہے، اور جو آدمی سوچے وہی اس لائق ہوتا ہے کہ بہتر اور موثر انداز میں کام کرسکے۔ اسی طرح جو آدمی چپ رہتا ہے وہ اپنے ذہن میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ منصوبہ بند انداز میں اپنے عمل کا خاکہ تیار کرتا ہے، اور جو آدمی منصوبہ بند صورت میں اپنا عملی اقدام کرے، اس کا یہ فطری حق ہے کہ خدا کی اس دنیا میں وہ لازماً کامیاب ہو۔

خاموشی زیادہ بہتر کلام ہے۔ خاموشی زیادہ گہرے انداز میں عمل کرنا ہے۔ خاموش رہنے والا اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز طور پر استعمال کرسکے۔

قانون فطرت

ولیم پن (William Penn) ۱۶۴۴ میں لندن میں پیدا ہوا، ۱۷۱۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک ایسا لیڈر تھا جس نے مذہب اور سیاست دونوں میں حصہ لیا۔ وہ مذہبی رواداری کا زبردست حامی تھا۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ کبھی وہ خود حکومت کریں گے اور کبھی ان کے اوپر حکومت کی جائے گی :

Let the people think they govern and they will be governed.

ولیم پن نے یہ بات تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہی۔ مگر یہ سادہ طور پر محض تاریخ کی بات نہیں، وہ فطرت کا ایک عالم گیر قانون ہے جس کو خود خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق اس دنیا میں قائم کیا ہے۔ خداوند عالم کا مقرر کیا ہوا یہ فطری قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے :

وتلك الايام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰) یعنی ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

یہاں ایام یا دن سے مراد فتح وشکست اور غلبہ اور مغلوبیت کے دن ہیں۔ اس دنیا میں جس طرح دوسری تمام چیزیں امتحان اور آزمائش کے لیے ہیں، اسی طرح سیاسی اقتدار بھی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے۔ چنانچہ وہ باری باری ہر گروہ کو دیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی جانچ ہو سکے۔ اس دنیا میں حاکمیت کی حالت بھی برائے امتحان ہے اور محکومیت کی حالت بھی برائے امتحان۔

آدمی کو چاہیے کہ جب اس کو حاکم بنایا جائے تو وہ فخر و ناز کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو۔ اور جب وہ اپنے آپ کو محکومیت کی حالت میں پائے تو وہ منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ دونوں حالتوں کو وہ خدائی فیصلہ کے طور پر لے۔ دونوں حالتوں میں اس کی نگاہ خود اپنی ذمہ داری کی ادائگی پر ہو نہ کہ دوسروں کے صحیح یا غلط رویہ پر۔

یہ ایک عظیم اصلاحی عقیدہ ہے جو لوگوں کو منفی نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں سے بچاتا ہے، وہ لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ضیاع سے بچائیں۔ اور ہمیشہ مفید اور نتیجہ خیز عمل میں مصروف رہیں۔ حکومت کا چھننا خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرنا خدا کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔ اور کون ہے جو خدا کے خلاف احتجاج میں کامیاب ہو۔

اخلاقی پستی

سرسید احمد خاں کو ان کے مخالفین نے انگریز کا پٹھو کہا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے مخالفین نے ہندوؤں کا ایجنٹ بنایا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مخالفین نے دیکھا کہ انگریز سرسید احمد خاں کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دیکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندوؤں کے درمیان ایک قابل احترام حیثیت حاصل ہے۔ یہ مخالفین اپنے عناد کی وجہ سے یہ اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے کہ غیرمسلموں کے درمیان انھیں جو احترام ملا ہے، وہ ان کی کسی ذاتی خوبی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ان شخصیتوں کو مذکورہ قسم کے القاب دے دیے تاکہ یہ ظاہر کرسکیں کہ انھوں نے یہ درجہ محض اپنی ابن الوقتی کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ اپنی کسی واقعی لیاقت کے ذریعہ۔

اس قسم کا قول بظاہر ایک تنقید ہے، مگر حقیقۃً وہ کمینگی ہے، اور کمینگی بلاشبہ تمام غیر اخلاقی حرکتوں میں سب سے زیادہ بری اور ذلیل حرکت ہے۔

تنقید ہر آدمی کا فطری حق ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے آدمی میں کوئی غلط بات دیکھے تو برملا اس کا اظہار کرے۔ مگر یہ حق مدلل اختلاف رائے کے لیے ہے نہ کہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے لیے۔ جو لوگ اختلاف کے وقت کمینگی کی سطح پر اتر آئیں وہ خود اپنے بارہ میں زیادہ شدت کے ساتھ وہی الزام ثابت کر رہے ہیں جس کو وہ دوسرے کے اوپر چسپاں کرنا چاہتے تھے۔

کردار کی یہ قسم ہر دور میں پائی گئی ہے۔ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں بھی ایسے پست افراد موجود تھے، آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں، اور وہ بدستور اسی طرح باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے جب کہ لوگوں سے یہ موقع ہی چھن جائے گا کہ وہ کسی کے اوپر جھوٹا الزام لگائیں یا کسی کی کردار کشی کریں۔

صحت مند اختلاف سراپا خیر ہے مگر الزام تراشی سراپا شر ہے۔ جس سماج میں الزام تراشی کا رواج ہو۔ لوگ ایک دوسرے کو برا القاب دینے لگیں، وہ سماج کمینہ اخلاقیات کی تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ اور کسی سماج کے لیے اس سے زیادہ بری حالت اور کوئی نہیں۔

شرافت کی طاقت

سابق وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا محمد ہدایت اللہ صاحب (۱۹۰۵-۱۹۹۲) کا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ان کے پی اے مسٹر اطہر صدیقی ایم اے نے مجھے بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار پنجاب کے سکھ پیشواؤں کا ایک وفد ہدایت اللہ صاحب سے ملنے کے لیے نئی دہلی آیا۔ وہ لوگ اپنی روایات کے مطابق، کرپان لگائے ہوئے تھے۔ وائس پریسیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ پر سیکوریٹی کے جو لوگ تھے، انھوں نے سکھوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنی یہ کرپانیں باہر ہمارے پاس رکھ دیں۔ اس کے بعد وائس پریسیڈنٹ سے ملنے کے لیے اندر جائیں۔ وہ لوگ اپنی کرپانیں باہر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اب بات بڑھی۔ سیکوریٹی افسر نے ٹیلی فون کے ذریعہ وائس پریسیڈنٹ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کیا اور صورت حال بتائی۔ سکریٹری نے آرڈر دے دیا کہ انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر مت جانے دو، اور اگر وہ اس طرح اندر جانے پر اصرار کریں تو ان کو گرفتار کر لو۔

اطہر صدیقی صاحب نے بتایا کہ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ چنانچہ میں فوراً اندر گیا اور ہدایت اللہ صاحب سے مل کر انھیں بتایا کہ یہاں اس قسم کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اور سیکوریٹی افسر اور سکریٹری کا رویہ سراسر حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ملٹری افسر سے براہِ راست کہہ دیں کہ وہ ان لوگوں کو نہ روکیں اور انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر آنے دیں۔ ہدایت اللہ صاحب معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اور اس کے مطابق ٹیلی فون پر سیکوریٹی افسر کو ہدایت دے دی۔

اس کے بعد سکھ وفد اپنی کرپانوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ہدایت اللہ صاحب کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے اپنی کرپانوں کو اتار کر ہدایت اللہ صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم کمینہ پن کریں گے کہ یہاں آکر آپ کے اوپر ان کرپانوں سے حملہ کر دیں۔ آپ ہمارے لیے باپ کے برابر ہیں۔ ہم تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔

حکمت سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر آپ حکمت کا طریقہ اختیار کریں تو مسلح دشمن بھی اپنے ہتھیاروں کو پھینک دے گا اور آپ کی انسانیت کے اعتراف میں آپ کے قدموں پر گر جائے گا۔

نوپرابلم انسان

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن الذی لا یأمن جارہ بوائقہ (البخاری، کتاب الادب) خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور پڑوسی کو ستانا دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان ہوگا تو پڑوسی کو ستانا نہیں ہوگا، اور جہاں پڑوسی کو ستایا جا رہا ہو وہاں ایمان موجود نہ ہوگا۔

اگر کسی مقام پر پھول ہو تو آس پاس کے لوگوں کو خوشبو مل رہی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول تو موجود ہو مگر ماحول کو اس سے بدبو کا تحفہ ملے، اسی طرح مومن خدا کا زندہ پھول ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو خوشبودار سلوک کی نعمت دے رہا ہوگا۔ اور اگر کسی ماحول میں لوگوں کو بدبودار سلوک کا تجربہ ہو رہا ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہاں نہ ایمان ہے اور نہ وہاں مومن کا کوئی وجود ہے۔

ایمان کیا ہے، ایمان شخصیت کی تعمیر ہے۔ ایمان ایک انسان کو عام انسان کے درجہ سے اٹھا کر خاص انسان بنا دیتا ہے۔ اب وہ ایک محتاط انسان بن جاتا ہے۔ اب وہ صرف اپنے آپ میں نہیں جیتا بلکہ دوسروں کی رعایت کو بھی وہ اپنے لیے لازم قرار دے لیتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کی سرگرمیاں دوسرے کے لیے تکلیف کا سبب تو نہیں بنیں گی۔ اس کی اس محتاط روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے پڑوسیوں کو اس کی طرف سے کسی برے تجربہ کا سابقہ پیش نہیں آتا۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، اس کو لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ مومن ایک نوپرابلم انسان ہوتا ہے۔ وہ خواہ جہاں بھی ہو، ہر جگہ اس کے پاس کے لوگوں اور اس سے تعلق رکھنے والوں کو اس سے راحت ملتی ہے، کسی کے لیے بھی وہ مسئلہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

ایمان کا اول درجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے لیے نفع بخش بنیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ لوگوں کو آپ اپنے ضرر سے بچائیں۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

مجرم کی گرفت

۱۷ جون ۱۹۹۶ کے اخباروں میں برطانیہ کی ایک خبر اس عنوان کے ساتھ چھپی ——
کیمرہ نے بم سے بھری ہوئی گاڑی کا فوٹو لے لیا :

Cameras captured bomb-laden van

قصہ یہ تھا کہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ کو مانچسٹر کے ایک شاپنگ سنٹر میں ایک وین (گاڑی) آکر کھڑی ہوئی۔ وہ طاقت ور بموں سے بھری ہوئی تھی، دو آدمی اس کو لے کر آئے۔ انھوں نے گاڑی وہاں کھڑی کی اور پھر اتر کر بھاگ گئے۔

کچھ دیر کے بعد اس کے بم زور دار دھاکہ کے ساتھ پھوٹ گئے۔ عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ دو سو سے زیادہ آدمی زخمی ہوگئے۔ کئی آدمی مر گئے۔ ایک میل کے دائرہ میں افراتفری پھیل گئی۔ لوگ چاروں طرف بدحواسی کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ اس حادثہ میں بم والی گاڑی مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ بظاہر اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

مگر اس شاپنگ سنٹر میں ویڈیو کیمرے (security video cameras) لگے ہوئے تھے۔ مذکورہ گاڑی جب اس مقام پر داخل ہوئی تو فوراً ہی ان کیمروں نے اس کے فوٹو لینا شروع کر دیے۔ حتی کہ اس کو لانے والے جب گاڑی سے اتر کر بھاگے تو ان کے فوٹو بھی اس نظام نے کھینچ لیے۔

اس کے نتیجے میں پولیس کو گاڑی کی قسم، اس کا نمبر، اس کا رنگ اور اس کے ڈرائیور، سب کی بابت معلومات ہوگئیں۔ اس کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ آئرش ری پبلکن پارٹی (IRA) کے لوگوں نے یہ کارروائی کی ہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ لوگ پکڑ لیے گئے۔

یہ واقعہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح اس دنیا میں خدا نے نگرانی کا نظام قائم کر رکھا ہے جو ہر آن اور ہر لمحہ انسان کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔ حتی کہ جرم کے آثار مٹنے سے پہلے وہ جرم کا ریکارڈ محفوظ کر لیتا ہے۔ کسی بھی حال میں کسی انسان کے لیے اپنے آپ کو خدا کی نظر سے چھپانا ممکن نہیں لوگ اس نظام کو نہیں دیکھتے۔ مگر یہ نظام ہر آن لوگوں کو دیکھ رہا ہے اور ہر لمحہ ان کا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔

پاور کا جھگڑا

کسی گھر میں ساس اور بہو کا جھگڑا کیوں ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو کھانا کپڑا اور ضروریات زندگی دونوں میں سے ہر ایک کو پوری طرح ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ پھر جھگڑا کس بات کا۔ یہ جھگڑا صرف پاور کا ہوتا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر کا سارا اختیار میرے پاس رہے۔ اختیار یا پاور چوں کہ غیر مشترک چیز ہے، وہ کسی ایک ہی کے پاس رہ سکتا ہے۔ اس لیے دونوں میں مستقل جھگڑا قائم ہو جاتا ہے۔

مسجد اور مدرسہ میں جھگڑا کیوں ہوتا ہے۔ وہاں بھی ہر ایک کو عبادت اور تعلیم یا ادارہ کی خدمت کے یکساں مواقع ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر جھگڑا کیوں۔ یہ جھگڑا بھی صرف پاور کا ہے۔ کچھ افراد چاہتے ہیں کہ سارا اختیار میرے ہاتھ میں رہے، اس پر ان لوگوں سے ان کا جھگڑا ہو جاتا ہے جو انھیں کی طرح خود بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہ تنہا سارے اختیارات کے مالک ہوں۔

اسی طرح کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، برما، فلپائن، فلسطین اور دوسرے مقامات کا جھگڑا کیوں ہے۔ یہ تمام جھگڑا بھی پاور کا جھگڑا ہے۔ جھگڑا برپا کرنے سے پہلے ہر جگہ کے مسلمانوں کو زندگی کی ضروریات بفراغت ملی ہوئی تھیں۔ دینی اور تعلیمی اور اقتصادی کام کے مواقع بھی انھیں پوری طرح حاصل تھے۔ اس کے باوجود ہر جگہ خونی جنگ کیوں برپا ہوگئی، صرف پاور کے لیے۔

مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ پاور کی یہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ مثلاً پاکستان میں ہندو سے اور افغانستان میں کمیونسٹوں سے پاور کی جنگ ختم ہوئی تو دوبارہ وہی جنگ مزید اضافہ کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ کیوں کہ پاور اشتراک کو قبول نہیں کرتا۔ جب کہ اس کے خواہش مند کئی ہوتے ہیں، اس لیے پاور ہنگری سماج میں پاور کی جنگ ابدی طور پر جاری رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاور ایک دردِ سر ہے۔ دردِ سر کو دوسروں کے حوالے کر کے ضروریاتِ زندگی اور مواقع حیات پر قانع بن جائیے، اور پھر سماج میں جنگ اور ٹکراؤ کی حالت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ پاور کے لیے وہ لوگ لڑتے ہیں جن کو کوئی کام کرنا نہ ہو۔ کیوں کہ کام کرنے کا موقع تو ہر حال میں ہر انسان کے لیے موجود رہتا ہے۔

فرضی اندیشے

۲۱ جولائی ۱۹۹۶ کو بنگلور (سبرا ئیم پورہ) میں ایک عبرت انگیز واقعہ ہوا۔ ایک لڑکا جی ہریش بابو دیویکا نند ہائر پرائمری اسکول میں فورتھ اسٹینڈرڈ (چوتھے درجہ) کا طالب علم تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں اپنے کو بند کرکے اپنے اوپر مٹی کا تیل (کروسین) انڈیل لیا اور اپنے کپڑوں کو آگ لگالی۔ اس طرح وہ جل کر مر گیا۔ اخباری رپورٹ کے الفاظ میں، اس کا سبب، امتحان میں ناکام ہوجانے کا اندیشہ تھا :

Fear of failure in examinations.

لڑکے کے باپ جی گوپی ناتھ نے بتایا کہ ہریش حسب معمول اپنے اسکول سے واپس آیا۔ اس نے اپنی ماں لیلا سے کہا کہ اس کی ٹیچر اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے مطابق لیلا اسکول چلی گئی۔ اس کے بعد ہریش نے کچن میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور اپنے آپ کو آگ لگالی۔ آواز سن کر پڑوسی دوڑ پڑے۔ مگر جب کچن کا دروازہ توڑ کر لڑکے کو نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جل کر مر چکا ہے۔

لڑکے کی ماں لیلا جب اسکول پہنچی تو وہاں اس کو نتیجہ کا پرچہ (marks card) دیا گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کیوں کہ اس کے لڑکے نے ۶۰۰ میں ۴۷۹ نمبر حاصل کیے تھے۔ مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کی خوشیاں غم میں تبدیل ہوگئیں۔ کیوں کہ اس نے دیکھا کہ اس کا لڑکا خودکشی کر کے اپنی جان دے چکا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ جولائی ۱۹۹۶)

ہریش بابو اگر چند گھنٹے اور انتظار کر لیتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اس کا اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ امتحان میں وہ اچھے نمبر لا کر پاس ہو چکا تھا، مگر وہ فرضی اندیشے میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خوف کے تحت اپنی جان دے دی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حالات کا غلط اندازہ کر کے آدمی اندیشوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل بتاتا ہے کہ وہ اندیشے سرے سے پیش آنے والے ہی نہ تھے۔

جو چیز آج نہ مل رہی ہو اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔ بجائے اس کے کہ اس کو نہ ملنے والی چیز سمجھ کر آپ مایوسی اور بے ہمتی کا شکار ہو جائیں

صبر کی اہمیت

صبر دین کا خلاصہ ہے۔ صبر ہر قسم کی نیکیوں کی بنیاد ہے۔ صبر دنیا میں کامیابی کا زینہ ہے اور آخرت میں وہ جنت کی کنجی ہے۔ قرآن میں صبر کے بارہ میں ایک ایسی آیت ہے جو کسی بھی دوسرے عمل کے بارہ میں نہیں۔ فرمایا کہ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما اُعطی احد عطاء خیراً و اَوسَعَ مِن الصبر۔ یعنی صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا کوئی عطیہ انسان کو نہیں دیا گیا۔ ابن حجر العسقلانی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبر تمام اعلیٰ اخلاقیات کا جامع ہے (الصبر جامع لمکارم الاخلاق)

احادیث و آثار میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اپنی زندگی کا خیر صبر ہی کے ذریعہ حاصل کیا ہے : وجدنا خیر عیشنا بالصبر (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۱/ ۳۰۹ - ۳۱۱) ابن جوزی نے لکھا ہے کہ عاقبۃ الصبر الجمیل جمیلۃ (صید الخاطر ۳۹۹) یعنی صبر جمیل کا انجام بھی جمیل ہے۔

ابن منظور نے لکھا ہے کہ اصل الصبر الحبس، والصبر نقیض الجزع۔ یعنی صبر کی اصل حبس ہے، صبر جزع کا الٹا ہے (لسان العرب ۴/ ۴۳۸) راغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ الصبر الامساک، والصبر حبس النفس علی ما یقتضیہ العقل والشرع۔ یعنی صبر کی حقیقت امساک ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی عقل اور شریعت کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روکے (المفردات فی غریب القرآن ۲۷۳)

صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ موجودہ دنیا کی صورت حال ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اسی امتحان یا آزمائش کی مصلحت کی بنا پر یہاں ہر شخص کو پوری آزادی دی گئی ہے۔ یہ انسانی آزادی خود خدا کے منصوبہ کے تحت ہے، اس لیے کوئی بھی اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔

اس دنیا میں انسان آزاد ہے کہ وہ خدا کو مانے یا اس کا انکار کر دے۔ وہ خدا کے پیغمبر کا اعتراف کرے یا اس کو گالی دے اور اسے پتھر مارے۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں نیکی کا طریقہ اختیار کرے یا ظالم اور ناانصاف اور غلط کار بن جائے۔

اسی آزمائشی آزادی نے موجودہ دنیا میں صبر کو اتنا زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ زندگی گزارے جس کو ربانی زندگی کہا گیا ہے۔ مگر اس ربانی زندگی کو اختیار کرنے میں بار بار رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس معیار انسانیت پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے کہ جو مخالفانہ ماحول کے باوجود اس پر قائم رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

صبر آدمی کے اندر یہی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ آدمی کے اوپر خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے، اس وقت وہ صبر کر کے اپنے آپ کو خواہشات کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ لوگ اس کو ستاتے ہیں اور اس کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ اس وقت وہ صبر کرتا ہے تاکہ اس کی حالتِ روحانی بھنگ نہ ہونے پائے۔ لوگ اس کے خلاف دشمنانہ کارروائی کرتے ہیں، اس وقت وہ صبر کے ذریعہ اپنے کو تھامتا ہے تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں جلدبازی کا کوئی اقدام نہ کرے بلکہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ سمجھ کر منصوبہ بند انداز میں ان کا موثر جواب دے۔

صبر بظاہر کسی انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس لیے آدمی فوراً صبر کرنے کو اپنے لیے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے صبر کیا تو یہ دوسرے شخص کے مقابلہ میں ہار ماننا یا اپنے آپ کو بے عزت کرنا ہوگا۔ یہی خاص نفسیات ہے جس کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی صبر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ صبر کا تعلق انسان سے نہیں ہے بلکہ خدا سے ہے۔ آدمی جب صبر کرتا ہے تو گویا کہ وہ کہتا ہے کہ میں خدا کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ یہ خود خدا ہے جس نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ وہاں صبر کے بغیر کوئی کام نہ ہو سکے۔ اس لیے اس دنیا میں صبر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نظام قدرت کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ وہ قدرت کے نقشہ کو بدلے بغیر اس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا رہا ہے۔ صبر خدا کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی محکومی کا اقرار ہے۔ صبر ایک عبادت ہے بلکہ سب سے بڑی عبادت۔

تاریخی پس منظر

انسان کو زمین پر اس لیے بسایا گیا تھا کہ وہ ایک خدا کا پرستار بنے اور اس کا شکر کرتے ہوئے یہاں زندگی گزارے۔ مگر بہت جلد ایسا ہوا کہ انسان مخلوقات کی پرستش کرنے لگا۔ وہ خالق کا شکر گزار بننے کے بجائے مخلوقات کی شکر گزاری کرنے لگا۔ روشن سورج، اونچا پہاڑ، رواں دریا اور دوسری مخلوقات کی عظمت میں وہ اتنا گم ہوا کہ اللہ کی عظمت اسے یاد نہ رہی۔

اس طرح انسان توحید کے راستہ کو چھوڑ کر شرک کے راستہ پر چل پڑا۔ پوری انسانی تہذیب شرک کے رنگ میں رنگ گئی۔ پیدائش اور موت کی رسموں سے لے کر زندگی کے اجتماعی نظام تک ہر چیز پر مشرکانہ تصور غالب آگیا۔ بادشاہ بھی بہت سے خداؤں میں سے ایک خدا بن گئے جو مقدس سیاسی حق کے تحت لوگوں پر حکومت کرنے لگے۔ اس زمانہ میں ساری دنیا میں مطلق شہنشاہیت (monarchical absolutism) کا دور دورہ ہوگیا۔ چند افراد یا چند خاندان بادشاہت کے خدائی حقوق (divine right of kings) حاصل کر کے لوگوں کے اوپر ایسے حکمراں بن گئے جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہ نہیں ہوا کہ انسان وحدت حق کی نعمت سے محروم ہوگیا۔ بلکہ اس کا شدید تر نقصان یہ ہوا کہ ساری دنیا میں وہ جارحانہ برائی رائج ہوگئی جس کو مذہبی ایذا رسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ چوں کہ بادشاہت کا پورا نظام شرک کے تصور پر قائم تھا، اس لیے توحید کی کوئی بات بادشاہوں کو اپنے حق حکمرانی کے خلاف براہِ راست چیلنج دکھائی دینے لگی۔ وہ ایسی دعوت کے لیے آخری حد تک بے برداشت (intolerant) ہوگئے۔ جب کہیں کوئی داعی توحید کا پیغام لے کر اٹھتا، اس کو فوراً سیاسی طاقت کے زور پر کچل دیا جاتا۔

اس صورت حال کے مسلسل جاری رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ وتہذیب میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اب جو بھی مرد یا عورت پیدا ہوتے وہ اسی مشرکانہ ماحول میں پیدا ہوتے اور ماحول اور نظام کے اثر سے وہ مکمل طور پر اسی کے رنگ میں رنگ جاتے۔ اس طرح شرک

محض ایک خارجی عقیدہ نہ رہا بلکہ وہ خود شاکلۂ انسانی کا جزرِ اعظم بن گیا۔ اب یہ ناممکن ہو گیا کہ قائم شہروں اور آبادیوں میں پیدا ہونے والا آدمی شرک کے تسلط سے نکل سکے۔

پھر اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا عقیدہ صرف انفرادی عقیدہ کے درجہ میں رہا۔ وہ عمومی انسانی انقلاب کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ کیوں کہ عمومی انقلاب برپا کرنے کے لیے انسانوں کی ایک قابل لحاظ ٹیم درکار تھی، اور مروجہ مشرکانہ تہذیب میں اس کا امکان ہی ختم ہو گیا کہ بڑی تعداد میں لوگ توحید کو اختیار کریں اور پھر وہ ٹیم وجود میں آسکے جو جدوجہد کر کے مشرکانہ نظام کو ختم کرے اور موحدانہ انقلاب دنیا میں برپا کرے۔

تاریخ جب یہاں تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہوا کہ خصوصی تدبیر کے ذریعہ انسانوں کی ایک نئی جماعت تیار کی جائے۔ اسی منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو عرب کے صحرا میں لے جا کر بسا دیں تاکہ وہاں کے غیر آباد علاقہ میں ایک ایسی قوم تیار ہو جو خالص فطرت کے ماحول میں پرورش پا کر نکلی ہو۔ اور اس کے لیے دین فطرت کو اختیار کرنا آسان ہو جائے۔

تمدن سے دور عرب کے صحرا میں خالص فطرت کے ماحول میں یہ قوم بنا تیار ہوئی۔ توالد و تناسل کے فطری نظام کے تحت اس قوم (بنو اسماعیل) کو بننے میں تقریباً ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ جب یہ قوم پوری طرح تیار ہو چکی تو اس کے اندر مکہ میں نبی آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کی بعثت ہوئی۔ اس قوم کے تمام منتخب افراد آپ کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اور پھر آپؐ کی رہنمائی میں انھوں نے وہ تاریخی جدوجہد کی جس نے انسانیت کا نقشہ یکسر بدل دیا۔

یہی وہ جماعت ہے جس کو قرآن میں خیر امت کہا گیا، اور یہی وہ جماعت ہے جس کو غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العصابہ فرمایا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر تمام اعلیٰ بشری اوصاف کامل ترین صورت میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ حق کو اس کی مجرد صورت میں دیکھیں اور کھلے طور پر اس کا اعتراف کریں۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور انھیں جو کرنا تھا وہی بولتے تھے۔ ان کی زندگی اصولوں کے تابع تھی نہ کہ مفادات کے تابع۔ وہ اختلاف کے باوجود متحد رہتے تھے، وہ قابل پیشین گوئی کردار کے حامل تھے۔ وہ مکمل انسان تھے اور مکمل موحد۔

دو عظیم کردار

ایک روایت کے مطابق، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے علم حدیث محفوظ کیا تھا، پھر میں نے اس کو خوب پھیلا دیا (فبثثتہ) فتح الباری ۲۶۱/۱

یہ بثّ حدیث یا حدیثِ رسولؐ کو آپ کے بعد لوگوں تک پہنچانا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک عظیم منصوبۂ الٰہی تھا جس کی تکمیل خاص طور پر دور اول کی دو اسلامی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پائی۔ ایک ابوہریرہؓ (عبدالرحمٰن) بن صخر، اور دوسرے عائشہ بنت ابی بکر الصدیقؓ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک خاص زمانہ میں ہوئی۔ مگر آپؐ خاتم النبیین تھے۔ اس لیے آپ کی تعلیمات کو اگلی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کامل صورت میں محفوظ رہیں۔ تحفظ سنت کا یہ کام دور پریس سے پہلے کے حالات میں صرف زندہ انسان ہی انجام دے سکتے تھے۔ جو آپؐ کی ہر چیز کو براہ راست دیکھ کر اور سن کر محفوظ کر لیں۔ اور پھر لمبی مدت تک لوگوں کو اسے سناتے اور بتاتے رہیں۔ تاکہ بعد کو آنے والی نسلیں اس سے محروم نہ رہیں۔

اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دوسری ضروری صلاحیتوں کے ساتھ کم عمر بھی ہوں۔ تاکہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد وہ لمبے عرصہ تک باقی رہیں۔ رسول اللہؐ کا ہم عمر آدمی اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کیوں کہ آپ کے ساتھ اس کی بھی وفات ہو جاتی اور پھر اچانک روایتِ حدیث کا تسلسل ختم ہو جاتا۔

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وہ دو تاریخی شخصیتیں ہیں جن کو خدا نے خاص طور پر اس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ ایک کو آپ کے صحابی کی حیثیت سے اور دوسرے کو آپ کی اہلیہ کی حیثیت سے۔ یہ دونوں کم عمری میں رسول اللہؐ سے وابستہ ہو گئے۔ اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد دونوں تقریباً پچاس سال تک دنیا میں باقی رہے۔ اور آپ کے حق میں زندہ ٹیپ ریکارڈر کا کام کرتے رہے۔

رسول اللہؐ کی وفات ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہ کی وفات ۵۸ھ (۶۷۸ء) میں اور حضرت ابوہریرہ کی وفات ۵۹ھ (۶۷۹ء) میں۔ آپؐ کے بعد ان دونوں

کے ذریعہ جو احادیث امت کو ملیں ان کی تعداد حسب ذیل ہے :

روایات عائشہ ۲۲۱۰ ، روایات ابوہریرہ ۵۳۷۴

حضرت ابوہریرہؓ کا کام اصلاً احادیث رسولؐ کو یاد رکھنا اور ان کو امت تک منتقل کرنا تھا۔ اس کام کے لیے جو خاص صلاحیت درکار تھی وہ حافظہ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ اس معاملہ میں خود شناس تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں اسلام کی تاریخ میں کیا کردار ادا کرنا ہے اور اس کے لیے ان کو کون سی صلاحیت درکار ہے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میں آپ کی باتیں سنتا ہوں مگر ان میں سے بہت سی باتیں بھول جاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کے لیے دعا کرو۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے دعا کی اور کہا : (اللّٰھم انی اسئالك علماً لا ینسی) (اے اللہ، میں تجھ سے نہ بھولنے والا علم مانگتا ہوں) حضرت ابوہریرہؓ نے جب یہ دعا کی تو رسول اللہؐ نے اس پر آمین کہی۔ یعنی اے اللہ، تو ابوہریرہ کی اس دعا کو قبول فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کوئی سنی ہوئی بات کبھی فراموش نہیں کی (فما نسیتُ شیئاً بعد) فتح الباری ۱/۲۶۰ - ۲۵۹)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس کے بعد میں نے آپؐ کی جو بات بھی سنی وہ مجھے پوری طرح یاد ہو گئی (فو الذی بعثہ بالحق ما نسیت (بعد ذلك) شیئاً سمعتہ منہ) صفحہ ۲۶۰

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ کی مدد سے حضرت ابوہریرہ کو وہ چیز حاصل ہو گئی جس کو آج کل کی زبان میں تصویری حافظہ (photographic memory) کہا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ رسول اللہؐ کی ہر سنی ہوئی بات انھیں یاد رہے اور آپؐ کی وفات کے بعد وہ تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو علم نبوت پہنچاتے رہیں۔ دور پریس سے پہلے حدیث کی حفاظت اور اشاعت کی یہی واحد ممکن صورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ کو خصوصی طور پر اس مقصد کے لیے استعمال فرمایا۔

۲۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق ہجرت سے ۹ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ روایات

کے مطابق رسول اللہ ؐ سے ان کا نکاح ہوا تو ان کی عمر اس وقت تقریباً چھ سال تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ رسول اللہ ؐ کی صحبت میں رہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ؐ کی وفات ہوگئی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت عائشہ پیدائشی طور پر نہایت زیرک تھیں۔ وہ بلاشبہ ان استثنائی شخصیتوں میں سے تھیں جن کو تخلیقی ذہن (creative mind) کہا جاتا ہے۔ ان کی یہی اعلیٰ صلاحیت وہ اصل سبب تھا جس کی بنا پر وہ زوجیتِ رسول ؐ کے لیے چنی گئیں۔

اس نکاح کا اصل مقصد ایک ذہین خاتون کو اس کا موقع دینا تھا کہ وہ رسول ؐ کے ساتھ رہ کر علم نبوت کو بھرپور طور پر اخذ کرے اور آپ کے بعد اسے لمبے عرصہ تک لوگوں تک پہنچاتی رہے۔ اس مقصد کے اعتبار سے بلاشبہ کم عمری کا نکاح ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔

نفسیاتی تحقیق کے مطابق ۱۰ سال تک کی عمر کا زمانہ کسی مرد یا عورت کے لیے تشکیلی زمانہ (formative period) ہوتا ہے۔ اس عمر میں آدمی جیسا بن جاتا ہے وہ ہمیشہ ہی ویسا رہتا ہے۔ چنانچہ حکمتِ ربانی سے اسی اہم مرحلۂ عمر میں حضرت عائشہ کو پیغمبر اسلام سے وابستہ کر دیا گیا۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر حضرت عائشہ کے لیے معروف معنوں میں صرف ازدواجی گھر نہ تھا بلکہ فن تعلیم کی اصطلاح میں وہ ان کے لیے ایک مدرسۂ تیاری (preparatory school) تھا۔ یہاں اٹھارہ سال کی عمر تک رہ کر وہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ تیار کی گئیں تاکہ اس کے بعد وہ کردار ادا کرنا ان کے لیے ممکن ہو جائے جو تقدیرِ الٰہی کے مطابق انھیں تاریخ میں ادا کرنا تھا۔

حضرت عائشہ کی لیاقت کے بارے میں لوگوں نے بہت اعلیٰ رائیں دی ہیں۔ مثلاً عطا بن ابی رباح نے کہا: كانت عائشة افقه الناس واعلم الناس (عائشہ سب سے زیادہ فقیہ اور سب سے بڑی عالم تھیں) حضرت موسیٰ الاشعری کہتے ہیں کہ اصحاب محمد کے سامنے جب بھی کوئی مشکل مسئلہ آتا تو وہ عائشہ سے پوچھتے اور ان کے پاس وہ اس کا علم پا لیتے (البدایہ والنہایہ ۹۲/۸)

الحافظ، ابو عبد اللہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) نے لکھا ہے کہ عائشہ فقہاء صحابہ میں سب سے عظیم تھیں (كانت اكبر فقهاء الصحابة) تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ ان سے

زیادہ ذہین اور اخّاذ ہیں۔ حضرت سودہؓ نے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہ کو دے دی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر تک رسول اللہؐ کی صحبت میں رہیں اور زیادہ سے زیادہ اخذ اور استفادہ کر سکیں اور پھر امت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں۔ گویا حضرت سودہؓ بالواسطہ طور پر اس تاریخی کردار میں شریک ہو گئیں جو حضرت عائشہ کو براہ راست طور پر ادا کرنا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اگرچہ کچھ استنباطات کی روایت کی گئی ہے۔ تقی الدین السبکی نے "فتاوی ابی ھریرۃ" کے نام سے ان کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ خداوندی کے اعتبار سے حضرت ابوہریرہ کی اصل حیثیت ناقل کی ہے۔ اسی لیے ان کو غیر معمولی حافظہ دیا گیا تاکہ وہ نقل حدیث کا کام کامل انداز میں انجام دے سکیں۔

اس کے مقابلہ میں حضرت عائشہ کا رول تخلیقی یا اجتہادی تھا۔ انھیں صرف اقوال رسولؐ کو نقل کرنا نہیں تھا بلکہ آپ کے قول کو سن کر اور آپ کے عمل کو دیکھ کر اس سے مزید مسائل کو مستنبط کرنا تھا۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ کے یہاں نقلِ حدیث سے زیادہ استنباط کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ کو اسلام کی تاریخ میں جو اہم کردار ادا کرنا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم عمری میں پیغمبر خدا کی رفیقۂ حیات بن جائیں۔ اس طرح ایک طرف یہ ممکن ہو گیا کہ ان کی تشکیلی عمر کا ایک اہم حصہ پیغمبر کے ساتھ گزرے۔ دوسری طرف اسی بنا پر وہ اس ضروری انتظام کا وسیلہ بن گئیں کہ پیغمبر کی وفات کے بعد ماقبل پریس دور میں بھی آپ کی تعلیمات کی اشاعت مزید آدھی صدی تک مسلسل جاری رہے تاآنکہ کتابت حدیث کا عمل شروع ہو جائے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ لمبی مدت تک بہت قریب سے پیغمبر کی زندگی اور آپ کے قول و عمل کا مشاہدہ کر سکیں۔ اور اس کی حکمتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھ کر اسے اگلی نسلوں تک پہنچائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف گھر کی زندگی میں پیغمبر کو دیکھتی اور سنتی تھیں بلکہ مسجد سے متصل رہائش کی وجہ سے اکثر آپ کی باہر کی گفتگو اور تقریر کو بھی سنتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ سفروں میں بھی وہ پیغمبر کے ساتھ رہتی تھیں جو گویا ان کے لیے توسیعی تربیت گاہ کے ہم معنی تھا۔

ایک مثال

اس معاملہ کی ایک مثال وہ روایت ہے جو صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، ایک شخص کے سوالات کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ قرآن میں پہلے ایک عرصہ تک وہ آیتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگوں کے قلوب تیار ہو گئے تو حرام و حلال کے احکام اتارے گئے۔ اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو اور زنا نہ کرو تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم تو کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لا ندع الخمر ابداً، لا ندع الزنا ابداً) فتح الباری ۸/۶۶۵

حضرت عائشہ رضی نے اپنے اس قول میں وہ حکمت بیان کی ہے جس کو تدریجی عمل (gradual process) کہا جاتا ہے۔ تدریج کے اس معاملہ کو انھوں نے کیسے جانا۔ کیونکہ قرآن میں یا حدیث میں یہ بات کہیں بھی انھیں لفظوں میں موجود نہیں ہے۔ اس کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ طویل مدت تک ان کو پیغمبر کی صحبت و رفاقت مسلسل طور پر حاصل رہی۔

دین کی اس حکمت کو جاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ مکہ سے لے کر مدینہ تک پیغمبر کے احوال کو دیکھیں۔ وہ نزول قرآن کے مذکورہ دونوں دور کا براہ راست مشاہدہ کریں۔ دونوں دوروں کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیے بغیر کوئی مرد یا عورت نہ تو تدریجی عمل کی حکمت کو سمجھ سکتا اور نہ اس کو اتنے اعتماد کے ساتھ بیان کر سکتا۔

ایک سفر

اٹلی کی ایک مسیحی تنظیم کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو کی دعوت پر اٹلی کے چند شہروں کا سفر ہوا۔ اور وہاں ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کی۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۵ کی صبح کو ۳ بجے گھر سے نکلا۔ ہماری گاڑی دہلی کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایرپورٹ کی طرف جارہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کہ میں دہلی کو نہیں بلکہ دنیا ہی کو چھوڑ کر چلا جارہا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر آج نہیں تو کل ضرور مجھے اس دنیا کو چھوڑ کر اگلی دنیا کی طرف جانا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آئے گا، اس کے بارہ میں خداوند عالم الغیب کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

دہلی ایرپورٹ کی انتظار گاہ میں میرے سامنے ایک دکان ہے۔ اس کے اوپر روشن حروف میں لکھا ہوا ہے : ڈیوٹی سے مکت دکان (duty free shop) میں نے اندر کی الماریوں کی طرف دیکھا تو اس کے اندر زیادہ تر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ جہاز میں بیٹھا تو اس کے اندر بھی جہاز کا ایک آدمی مخصوص گاڑی پر شراب اور سگرٹ لئے ہوئے یہ آواز لگا رہا تھا:

Selling liquor, cigarette, selling liquor, cigarette

میں نے سوچا کہ جدید تہذیب نے لوگوں کو شراب میں سکون تلاش کرنے والا بنا دیا۔ اس کے بعد میرا ذہن اسلام کی طرف گیا۔ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جو شراب کے بجائے معرفت خداوندی میں انسان کو سکون کا راز بتا رہا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین نے اسلام کی سیاسی تعبیر کرکے اسلام کو صرف جنگجوئی کا مذہب بنا دیا ہے۔ آج اسلام کے علمبردار ساری دنیا میں تشدد کا کلچر چلا رہے ہیں۔ حتی کہ جدید انسان اسلام کو تشدد کا مذہب سمجھ کر اس سے متوحش ہو رہا ہے نہ کہ اس کو اطمینان قلب کا راز سمجھ کر اس کی طرف دوڑے۔

ایرپورٹ کے مناظر حسب معمول تھے۔ ایک کے بعد ایک مختلف مقامات پر جانے والی پروازوں کا اعلان ہو رہا تھا، اور مسافر اٹھ اٹھ کر گیٹ کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ اس کے بعد میری فلائٹ کا اعلان ہوا۔ ضروری مراحل سے گزرتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہوا۔ یہ ایرانڈیا کی

فلائٹ ۷۹ا تھی جس کے ذریعہ مجھ کو دہلی سے روم جانا تھا۔

جسٹس ایچ آر کھنا بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کانفرنس کی طرف سے مجھ کو دعوت نامہ ملا تو میں نے منتظمین سے ٹیلی فون کے ذریعہ ربط قائم کرنا چاہا مگر ربط قائم نہ ہو سکا۔ پھر میں نے چاہا کہ کوریر سے انھیں خط بھیجوں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یورپین ایجنسی میں اس کی فیس تقریباً ایک ہزار روپیہ ہے۔ اسی درمیان میں دہلی کے پوسٹ مین سے ذکر ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ اسپیڈ پوسٹ سے بھیجئے۔ چنانچہ انھوں نے اسپیڈ پوسٹ سے بھیجا جس کا چارج صرف چار سو روپیہ تھا۔ اس تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ اسپیڈ پوسٹ کی سروس صرف انڈیا کے لئے نہیں ہے بلکہ باہر کے لئے بھی ہے۔

جسٹس کھنہ بہت کھلے ذہن کے آدمی ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو انھوں نے ایل کے آڈوانی سے کہا کہ تم لوگوں نے ایسا کام کیا ہے کہ اب میرے جیسے ہندستانی کو ہندستان میں رہتے ہوئے شرم آئے گی۔

Justice H.R. Khanna, 5-368, Panchshil Park
New Delhi 110 017 (Tel. 6442726)

راستہ میں ایر انڈیا کی فلائٹ میگزین نمسکار (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون گاندھی جی کے بارہ میں تھا۔ اس کا دوسطری عنوان اس طرح تھا:

Mohandas Karamchand Gandhi,
And, it was no ordinary light

یہ دراصل گاندھی جی پر حال میں شائع شدہ کتاب کا ایک حصہ تھا۔ کتاب کا نام یہ ہے:

A Higher Standard of Leadership:
Lessons from the Life of Gandhi
by Keshavan Nair

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سچائی کے بارہ میں گاندھی جی کا نظریہ کیا تھا۔ اس کے مطابق، سچائی (truth) ایک ایسی چیز تھی جو ہر آدمی کو الگ الگ دریافت کرنا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو

اپنے ذاتی مذہب پر جینا ہے۔ اس کا کوئی ایسا فارمولا نہیں جو کسی سابق مقدس کتاب میں موجود ہو۔ بلکہ ہر ایک کو اپنا مذہب خود دریافت کرنا ہے :

We have to live life according to one's dharma, not by some formula found in some ancient texts…but by going through the process of discovering one's dharma. (p. 45)

اسی کے ساتھ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ گاندھی جی یہ کہتے تھے کہ ہر ہر گھر کے اندر بجلی ہونا چاہئے :

Gandhi talked of electricity in every home. (p. 45)

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ گاندھی جی (اور ان کے جیسے دوسرے لوگ) سچائی کو پانے کا جو طریقہ بتاتے ہیں، وہی طریقہ اگر وہ بجلی کے حصول کے لئے بھی بتائیں تو کسی ایک گھر میں بھی بجلی موجود نہ ہو۔ آج یہاں گھر گھر میں بجلی ہے۔ مگر وہ اس طرح نہیں پہنچی ہے کہ ہر ایک شخص نے خود اپنی کوشش سے بجلی کو دریافت کرکے اس کا نظام بنایا، اس کے برعکس، ماضی میں دریافت شدہ علم کو استعمال کرکے ہر آدمی اپنے گھر کو بجلی سے روشن کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہی اصول سچائی کے لئے بھی ہے۔ خدا کے پیغمبر پر حقیقت منکشف ہو چکی ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس سے سچائی کی روشنی لے کر اپنی فکر کو منور کریں۔ اگر ہر آدمی خود اپنی کوشش سے سچائی کو معلوم کرنے لگے تو ساری دنیا ہمیشہ کے لئے گمراہی کے اندھیرے میں پڑی رہے گی۔

فلائٹ میگزین میں ایک مضمون تفریح (entertainment) کے اوپر تھا۔ اس کی ایک سطر یہ تھی ـــــ اے آر رحمان، دھن کے نئے بادشاہ :

A.R. Rahman, The new king of rhythm (p. 69)

اس کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ملیں گے جنھوں نے ادبیات، شاعری، خطابت، مصوری، نشانہ بازی، کھیل اور فنون لطیفہ جیسے شعبوں میں کمال کا مظاہرہ کیا۔

مگر ایسا کوئی مسلمان موجودہ زمانہ میں نہیں ابھرا جو سائنس ٹکنالوجی اور عصری افکار جیسے شعبوں میں کمال کا ثبوت دے سکے۔ وہ آرٹ کے پہلوان تو ثابت ہوئے مگر حقائق کے میدان میں وہ مینار بن کر کھڑے نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا اصل سبب یہی ہے نہ کہ کسی مفروضہ دشمن کی سازشیں اور مؤامرات۔

نمسکار کے صفحہ ۱۳ پر اسکائی فون (sky phone) کا اشتہار تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اس جہاز کے اندر اسکائی فون (عالمی ٹیلیفون) کا انتظام ہے۔ آپ اس کے اندر سے دنیا کے کسی بھی مقام پر ٹیلیفون کر سکتے ہیں۔ یہاں پوری دنیا آپ کی انگلیوں کے نیچے ہے:

The world at your finger tips...

چارج کی ادائیگی کے سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ٹیلیفون کا بل بین اقوامی طور پر تمام قابل قبول کریڈٹ کارڈ یا کرنسی کے ذریعہ ادا کر سکتے ہیں۔ مثلاً امریکن اکسپریس، ماسٹر کارڈ، ایورو کارڈ، گریٹ وال کارڈ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں قابل قبول کرنسی کے تحت "دینار" کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ مگر کئی بار پڑھنے کے باوجود اس میں ہندستانی روپیہ یا ہندستانی کارڈ کا نام کہیں نہیں ملا۔ یہ ہمارے ملک کی حالت نہ صرف دنیا میں بلکہ خود ہماری نیشنل سروس ایر انڈیا میں بھی ہے۔

ہندستانی لیڈروں کے کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ ملک کو اس اقتصادی پچھڑے پن سے نکالیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی دوسری چیز ملک کو عالمی نقشہ پر باعزت مقام نہیں دے سکتی۔

دہلی سے روم کا فاصلہ ۶۳۹۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ ایک براہ راست فلائٹ تھی۔ سوا آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز روم کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس وقت مقامی ٹائم کے لحاظ سے صبح ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ میں اور جسٹس کھنا جہاز سے نکل کر باہر آئے۔

میرا معاملہ نہایت عجیب ہے۔ میں اپنے عجز کی بنا پر ہمیشہ اس اندیشہ میں مبتلا رہتا ہوں کہ میں ایک اجنبی دیس میں جا رہا ہوں۔ وہاں ایرپورٹ پر اتروں گا تو کیا ہوگا۔ وہاں میری مدد کے لئے کوئی شخص موجود نہ ہو تو میں کیا کروں گا۔ اور کہاں جاؤں گا۔ روم کے ہوائی اڈہ میں داخل ہوا تو وہاں بھی شدت کے ساتھ یہی احساس میرے اوپر چھایا ہوا تھا۔ مگر یہاں بالکل مختلف معاملہ پیش آیا۔

روم کے ایرپورٹ پر ساؤتھ انڈیا کے ایک صاحب نیجر کی حیثیت میں ہیں۔ ان کا نام مسٹر ٹی ایس بالاسبرانیم (Tel. 568-4630) ہے۔ وہ واکی ٹاکی اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہم دونوں کو رسیو کرنے کے لئے جہاز کے باہر موجود تھے۔ اس کے علاوہ خود ایئر انڈیا کے پبلک ریلیشنز آفیسر مسٹر دیش مکھ بھی ہماری رہنمائی کے لئے آگئے تھے۔ ہوائی جہاز سے اتر کر ہم لوگ ایئرپورٹ کے احاطہ میں داخل ہوئے تو یہ دونوں وہاں ہمارے منتظر تھے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر فرانسسکو (Dr. Francesco) وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے۔

چنانچہ معاملہ میرے اندیشہ کے بالکل برعکس ہوا۔ روم میں ایئرپورٹ پر کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انھوں نے ہم کو لے جا کر وی آئی پی لاونج میں بٹھادیا۔ پاسپورٹ لے کر انھوں نے خود یہاں کی ضروری کارروائی مکمل کر دی۔ میں یہ غیر متوقع منظر دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ خدایا، آخرت کی دنیا میں جب میرا داخلہ ہو تو وہاں بھی تو میرے ساتھ اسی طرح آسانی کا معاملہ فرما۔ وہاں بھی تو رحمت کے فرشتوں کو میرے استقبال کے لئے کھڑا کر دے۔

اس کے بعد بذریعہ کار فلارنس کے لئے روانگی ہوئی جہاں کانفرنس کی کارروائیاں ہونے والی تھیں۔ یہ چار گھنٹہ کا سفر تھا۔ ہمارے ڈرائیور ایک تعلیم یافتہ نوجوان سارجیو (M. Sargio) تھے۔ وہ انگریزی جانتے تھے اس لئے رابطہ میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔

یہ ایک بڑا خوشگوار سفر تھا۔ سڑک نہایت عمدہ تھی جس پر کار ۱۳۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ پورے سفر میں ایک بار بھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں اور باغوں کے درمیان جگہ جگہ خوبصورت مکانات تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب جنت کا بعید تعارف ہے۔ یہ چیزیں دنیا میں ناقص صورت میں ہیں۔ آخرت میں وہ کامل اور مکمل صورت میں خدا کے نیک بندوں کو دی جائیں گی (واتوبہ متشابھا)

درمیان میں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے ایک سروس اسٹیشن پر رکے۔ سروس اسٹیشن کا جو تصور ہندستان میں ہے یہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت دنیا تھی جس میں گاڑی کی ضرورت کے ساتھ انسان کی ضرورت کی تمام چیزیں نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کر دی

گئی تھیں۔ اس کو سروس اسٹیشن کے بجائے رسٹ ہاؤس کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

۱۹۴۷ میں آزادی کے بعد جو پہلی پارلیمنٹ بنی اس کے ایک ممبر کلکتہ کے پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کلکتہ سے دہلی آئے۔ فراغت کے بعد جب وہ بذریعہ ٹرین واپس جانے لگے تو ریلوے لائن کے دونوں طرف انھیں جھگی جھونپڑی کی قطاریں نظر آئیں۔ انھوں نے غربت اور گندگی کے مناظر دیکھے۔ کلکتہ پہنچ کر انھوں نے اس وقت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کو خط بھیجا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ جب میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے ان بستیوں سے گزرا تو مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ ہندستان کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میں انھیں کیا جواب دوں گا۔ جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں لکھا کہ اصل بات یہ ہے کہ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

یہ بلاشبہہ ایک غلط جواب تھا، پنڈت نہرو کو چاہئے تھا کہ وہ اس خط کو پڑھ کر تڑپ اٹھتے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو اسے پڑھاتے اور کہتے کہ اب آزادی کے بعد ہمیں سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ ملک کو غریبی اور جہالت کی دلدل سے نکالیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو آج ہندستان بھی یورپ کی مانند ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا۔

جسٹس کھنا نے ایک ملاقات میں صحیح کہا کہ آزادی کے بعد کام کی جو مدت ہندستان کو ملی وہی مدت سنگاپور، کوریا، ملیشیا اور جاپان کو بھی ملی۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ وہ ممالک ترقی کے اعلا درجہ کو پہنچ چکے ہیں اور ہندستان کی حالت یہ ہے کہ وہ دنیا کے چند سب سے زیادہ پسماندہ ملکوں کی فہرست میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔

فلارنس میں قیام کا انتظام ایک تاریخی عمارت میں کیا گیا تھا۔ یہ عمارت کئی سو سال پہلے مانسٹری کے طور پر بنائی گئی تھی۔ اس کا نام کانویٹو (Convitto Ecclessiale) ہے۔ اس کو ازسرنو جدید معیار کے مطابق درست کیا گیا ہے۔ آجکل وہ زیادہ تر مسیحی پیشواؤں کے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہاں میں کمرہ نمبر ۴۰ میں تھا اور جسٹس کھنہ کمرہ نمبر ۴۱ میں۔

یہ ایک پرشوکت بلڈنگ ہے جو پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ باہر سے وہ قدیم مگر اندر سے

پوری طرح جدید دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کمروں اور دیواروں کو ٹائل سے مزین کیا گیا ہے۔ کمروں اور باتھ روم وغیرہ میں جدید ترین فٹنگ کی گئی ہیں۔ پوری عمارت نہایت صاف ستھری اور مرصع نظر آتی ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر ذیل)

مذہبی حلقوں میں اکثر قدیم عمارتوں کو مقدس سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کو ہر اعتبار سے اس کی قدیم وضع پر باقی رکھا جائے۔ مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ اس کے بنیادی ڈھانچہ میں قدامت کا رنگ باقی رکھتے ہوئے اس کو مکمل طور پر جدید کر دیا جائے۔ عیسائی حضرات کی بہت سی قدیم عمارتوں کو دیکھنے کے بعد میرا اندازہ ہے کہ وہ لوگ اسی دوسرے نظریہ میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قدیم عمارتوں کو جدید تکنیک کے استعمال سے از سر نو شاندار بنا دیا ہے۔ وہ تاریخ کے اعتبار سے قدیم ہیں مگر استعمال کے اعتبار سے پوری طرح جدید۔

مانسٹری (monastery) تقریباً وہی چیز ہے جس کو ہمارے یہاں خانقاہ کہا جاتا ہے۔

مسیحیت کے بعد کے دور میں مانسٹری یورپ کے ملکوں میں بنائی گئی۔ یہ اکثر ایک وسیع عمارت ہوتی ہے جو ان لوگوں کے قیام کے لئے بنائی جاتی تھی جو اپنے آپ کو مسیحی مذہب کے لئے وقف کر چکے ہوں۔ یہ عام طور پر کسی چرچ کے پاس ہوتی تھی۔ اب غالباً نئی مانسٹری نہیں بنائی جاتی۔ تاہم قدیم زمانہ کی مانسٹریاں کثرت سے یورپ کے مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

مانسٹری کو ایبے (Abbey) بھی کہا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی ایک عمارت انگلینڈ میں ہے جو ویسٹ منسٹر ایبے (Westminister Abbey) کے نام سے مشہور ہے۔ مانسٹری کا طرز عام طور پر یکساں ہوتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں روم کے زوال کے بعد یہی مذہبی ادارے تعلیم اور اشاعت کا مرکز بن گئے (15/223)

فلارنس وسط اٹلی کا ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ کسی زمانہ میں وہ اٹلی کی راجدھانی تھا۔ روم سے وہ ۱۴۵ میل دور ہے۔ فلارنس میں ہر طرف تاریخی آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ قدیم عمارتیں، آرٹ کے نمونے، وغیرہ۔ یہاں بہت بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً لیونارڈو، مائیکل اینجلو، دانتے، میکیاویلی، گلیلیو وغیرہ۔ فلارنس کی موجودہ عظمت اس کے اسی ماضی کی بنا پر ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے کہا:

The present glory of Florence is its Past.

فلارنس کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں وہ ریاستی راجدھانی بنا۔ اور اس کی اقتصادی اہمیت کافی بڑھ گئی۔ قرون وسطی کے زمانہ میں مسلمانوں کی علمی ترقی کے اثرات فلارنس تک پہنچے تھے۔ مثلاً ماسٹر جیکب (Master Jacob) جو یہیں کا رہنے والا تھا، اس نے ۱۳۰۷ء میں اطالین زبان میں میتھمیٹکس پر ایک رسالہ تیار کیا۔ اس میں الجبرا کی دو درجی مساوات (quadratic equations) کے ان چھ طریقوں کو بیان کیا گیا تھا جو اس زمانہ کے مسلم حساب دانوں نے وضع کیا تھا۔ (ہٹی، صفحہ ۸۰-۳۷۹)

میرے کمرہ کی دیوار پر ایک بالشت لمبی لکڑی کی صلیب (✝) لگی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر حضرت مسیح کی ایک مزعومہ تصویر مصلوب حالت میں لٹکی ہوئی ہے۔ شاید اسی طرح یہاں کے تمام کمروں میں اس قسم کی صلیب لگی ہوئی ہو۔

میرا مزاج یہ ہے کہ اس طرح کی کسی چیز کو دیکھ کر میرے اندر غصہ یا جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ میں اس کی حقیقت پر غور کرنے لگتا ہوں۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ خیال آیا کہ مسیحیوں کے نزدیک، اپنے عقیدہ کے مطابق، ان کے پیغمبر کی تصویر یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے قربان ہو گیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی اپنی تاریخ کے مطابق، ان کے ذہن میں اپنے پیغمبر کی تصویر یہ ہے کہ اس نے دوسروں سے لڑ کر ان کے اوپر غلبہ حاصل کیا۔

مذکورہ مسیحی عقیدہ اور مذکورہ مسلم تاریخ نے دونوں قوموں کی مزاج سازی میں نہایت گہرا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مسیحیوں میں عام طور پر تواضع، خدمت خلق اور دوسروں کے لئے رحمت و رأفت کے جذبات ہوتے ہیں (الحدید ۲۷) دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں احساس برتری، دوسروں کے لئے عدم اعتراف اور بزور دوسروں کے اوپر غلبہ حاصل کرنے کا مزاج عام ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ جس طرح مسیحی عقیدہ غلط ہے۔ اسی طرح بعد کے مسلمانوں کی مرتب کی ہوئی اسلامی تاریخ بھی اصل واقعہ کے مطابق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح ابن مریم اور محمد بن عبد اللہ دونوں ہی خدا کے پیغمبر تھے۔ دونوں نے ایک ہی دین خداوندی کی تعلیم دی۔ دونوں کا پیغام یہ تھا کہ انسان کو خدا کا فرماں بردار بندہ بن کر رہنا چاہئے۔ انسان کو یہاں آخرت کا طالب بن کر زندگی گزارنا چاہئے نہ کہ دنیا کا طالب بن کر۔ دونوں میں جو اصلی فرق ہے وہ باعتبار پیغام نہیں ہے بلکہ باعتبار محفوظیت ہے۔ یعنی حضرت مسیح کا پیغام آج محفوظ حالت میں نہیں پایا جاتا۔ جب کہ حضرت محمد کا پیغام آج بھی پوری طرح محفوظ اور قابل اعتبار حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

عام طور پر میں صبح کو فجر سے کچھ پہلے اٹھ جاتا ہوں۔ مگر آج فلارنس میں پہلی رات تھی، سویرے نیند نہیں کھلی۔ ۲۱ اکتوبر کی صبح کو میں اپنے کمرہ (نمبر ۴۰) میں سو رہا تھا کہ اچانک دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اس کے بعد گھڑی دیکھی تو مقامی وقت کے لحاظ سے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ خدا کا فرشتہ تھا جو ٹھیک آغاز فجر کے وقت آیا۔ اور بتا گیا کہ اٹھو، خدا کو یاد کرو،

کیوں کہ نماز فجر کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ میرے دل نے کہا کہ خدایا، میں ایک عاجز انسان ہوں۔ اسی طرح جب میں غفلت میں پڑوں تو مجھے آگاہ کردے، جب میں بھولنے لگوں تو اپنی رحمت سے تو مجھے یاد دلادے۔

اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی۔ خیال آیا کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جو یہاں نماز ادا کر رہا ہے۔ جو تثلیث کے گھر میں توحید کا اقرار کر رہا ہے۔

اتفاق سے یہاں ایک پاکستانی مسلمان مل گئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے، میں نے خدا کو چھوا ہے۔ اس قسم کی بات بولنا تو کفر ہے۔ پھر آپ کیسے ایسا کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کا کلام ہمیشہ مجازی کلام ہوتا ہے۔ مجازی کلام میں ہمیشہ گویا کہ یا جیسے کہ محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً، اگر میں کہوں کہ آپ شیر ہیں تو یہ جملہ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں ہوگا۔ یعنی گویا کہ آپ شیر ہیں۔ آپ شیر کی طرح بہادر ہیں۔ اگر کوئی شخص اس جملہ کو سن کر کہے کہ وہ تو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ وہ پنجہ نہیں رکھتے، پھر آپ نے ان کو شیر کیسے کہہ دیا تو یہ ایک لغو بات ہوگی نہ کہ کوئی حقیقی اعتراض۔

پھر میں نے کہا کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ خود اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خدا کے بارہ میں اس قسم کی قربت کا احساس تو عین جزء ایمان ہے۔ جو ہر مومن کو ہونا چاہئے۔ دنیا میں اگر آپ پر واسجد واقترب والا تجربہ نہیں گزرا۔ اگر آپ نے کبھی تعبد اللہ کانک تراہ کا مشاھدہ نہیں کیا۔ اگر آپ پر یہاں تجدہ تجاھک جیسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اگر آپ پر وہ کیفیت نہیں بیتی جس کو حدیث میں یناجی ربہ کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے تو آپ نے دین کا صرف چھلکا پایا، دین کا مغز آپ کو نہ مل سکا۔

اس سفر میں کانفرنس کی طرف سے روم کے ڈاکٹر لیونارڈو کو میرا ساتھی اور گائڈ بنایا گیا تھا:

Dr. Leonardo Palmobi (Tel. 5803140, 7259 614)

وہ نہایت سادہ اور نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ وہ قرآن کی اس آیت کا مکمل مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اور جن لوگوں نے عیسیٰ بن مریم کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت

اور رحمت رکھ دی ہے (الحدید ۲۷)

افریقہ سے آنے والے ایک صاحب نے کہا کہ آپ ایک علمی آدمی ہیں۔ پھر بھی آپ اس طرح کی کانفرنسوں میں آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کانفرنسوں میں ہمیشہ میں بادل ناخواستہ ہی جاتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں ذاتی طور پر ایک علم پسند آدمی ہوں۔ میری سب سے زیادہ محبوب چیز کتابوں کا مطالعہ ہے۔ اس طرح کی کانفرنس کے لئے سفر کرنا میرے لئے گویا مطالعہ کے تسلسل کو توڑنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ تاہم ان کانفرنسوں کا ایک خاص فائدہ ہے جو کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں ذاتی طور پر اسی فائدہ کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس طرح کی کانفرنسوں میں دنیا بھر کے دانشور اور اہل فکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہاں عالمی ذہن کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کے لئے ذاتی بے رغبتی کے باوجود میں کانفرنسوں کی دعوت کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

تاہم اس طرح کی کانفرنسوں سے مذکورہ فائدہ حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ اور وہ اجنبی یا مخالف فکر کو کھلے ذہن سے سننے کی صلاحیت ہے۔ آپ کے اندر یہ مادہ ہونا چاہئے کہ آپ اپنے فکری سانچہ سے باہر آکر دوسروں کی بات کو سن سکیں۔ میرے اندر خدا کے فضل سے یہ صفت ہے کہ ایک طرف مجھے اپنے نقطۂ نظر پر کامل یقین ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ میرا ذہن فی الفور اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی فکر کو الگ رکھتے ہوئے فریق ثانی کی بات کو خود اسی کے اپنے زاویۂ نگاہ سے سن سکے۔ یہ صفت غالباً میرے اندر پیدائشی طور پر ہے، اور اس سے مجھے غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے ہیں۔

۲۱ اکتوبر کی صبح کو میں اور جسٹس کھنہ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلے۔ رہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ ڈاکٹر لیونارڈو موجود تھے، شہر کے اکثر خاص حصے دیکھے۔ بمبئی کی طرح یہاں ملٹی اسٹوری بلڈنگوں کی لائنیں نہیں ہیں۔ تقریباً تمام عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی نظر آئیں۔ ان کی وضع قدیم طرز کی تھی جس میں ایک خاص عظمت جھلک رہی تھی۔ یہ شہر دریائے آرنو (Arno) کے دونوں طرف آباد ہے۔ دریا کے اوپر جگہ جگہ پل بنے ہوئے ہیں۔ ایک پل کے دونوں طرف دو منزلہ دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ پتھر کے اسٹیچو اور چرچ دکھائی دئے۔ ایک جگہ بہت بڑے سائز

کا مرد و عورت کا اسٹیچو تھا جو بالکل ننگا تھا۔

سیاح بڑی تعداد میں ہر طرف گھوم رہے تھے۔ ایک جگہ ندی کے کنارے ایک بھیڑ تھی۔ وہاں ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت مخصوص لباس میں تھے۔ ان کے اوپر لوگ خوش ہو کر چاول پھینک رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شادی کی ایک رسم ہے جو صدیوں سے یہاں چلی آرہی ہے۔ ایک سڑک پر بڑی تعداد میں لڑکوں اور لڑکیوں کا جلوس نظر آیا۔ وہ جھنڈا لئے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کا بھاری انتظام تھا۔ یہ ایٹمی ہتھیار کے خلاف تھا۔ وہ نعرہ لگا رہے تھے: اسٹاپ نیوکلیر ٹسٹ۔

فلارنس میں ایک بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس کو بھی دیکھا۔ یہ غیر معمولی حد تک شاندار ہے۔ اس میں قدیم فنکاروں کے آرٹ کے نمونے ہیں۔ یہ زیادہ تر پینٹنگ کے نمونے ہیں یا پھر اسٹیچو کے۔ وہ اکثر مذہبی نوعیت کے نمونے تھے۔ بہت سی پینٹنگ میں حضرت مریم کو زمانۂ طفولیت کے مسیح کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیح کے مصلوب کئے جانے کے بارہ میں بہت سے چھوٹے بڑے نمونے تھے۔

جس طرح ہمارے شعرا مضمون بندی کرتے ہیں، اسی طرح مسیحی آرٹسٹوں نے مسیح کی پیدائش اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کے بارہ میں کثرت سے مضمون بندیاں کی ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ ان کے بارہ میں طرح طرح کی پینٹنگ یا اسٹیچو تیار کئے گئے ہیں۔

ایک مغربی سیاح کے ہاتھ میں ایک انگریزی میگزین تھا۔ اس نے میرا شوق دیکھ کر اس کو مجھے دیدیا۔ یہ ایک مسیحی تنظیم کی طرف سے نکلتا ہے۔ ۳۲ صفحہ کا یہ ماہانہ پرچہ دنیا کی ۱۲۱ زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ ان میں بنگالی، ترکی، فارسی اور اردو بھی شامل ہیں۔ اردو اڈیشن غالباً پاکستان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام اس طرح درج تھا:

The Watchtower
Announcing Jehovah's Kingdom

یہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ کا شمارہ تھا۔ اس کے صفحہ ۲ پر اس کے مقاصد اس طرح لکھے ہوئے تھے:

The purpose of the Watchtower is to exalt Jehovah God as Sovereign Lord of the universe. It keeps watch on world events as these fulfill Bible prophecy. It comforts all peoples with the good news that God's Kingdom will soon destroy those who oppress their fellowmen and that it will turn the earth into a paradise. It encourages faith in God's now-reigning King, Jesus Christ, whose shed blood opens the way for mankind to gain eternal life. *The Watchtower,* published by Jehovah's Witnesses continuously since 1879, is non-political. It adheres to the Bible as its authority.

۱۲ اکتوبر کو شام کا کھانا سینٹ میری مانسٹری میں تھا۔ یہ کافی بڑی عمارت ہے اور نہایت عمدہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے دیسع ہال میں آنے والوں کی کافی تعداد اکٹھا تھی۔ ہر طرف دھیمی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

میں جس میز پر کھانے کے لئے بیٹھا، اس پر مختلف ملکوں کے لوگ تھے۔ اٹلی، جرمنی، ایتھوپیا وغیرہ۔ زیادہ تر تفریحی انداز کی باتیں ہو رہی تھی۔ جرمنی سے آنے والے ایک صاحب نے ایتھوپیا کے نمائندہ سے پوچھا کہ آپ کا ملک کیا چیزیں اکسپورٹ کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چائے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ پھر تو آپ دنیا کو اس کی انرجی سپلائی کر رہے ہیں۔

دہلی کے آریہ سماجی لیڈر سوامی اگنی ویش بھی اس کانفرنس میں آئے ہیں۔ وہ شراب کو عنوان بنا کر سماجی اصلاح کی مہم چلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ شراب نوشی کی جڑیں تو ملک میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ اب اس کو اکھاڑنا سخت مشکل نظر آتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ ہم لوگ ہریانہ میں گئے۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ اس ریاست میں تو شراب کارخانہ ہے۔ یہاں ۹۰ فیصد لوگ شراب پیتے ہیں۔ یہاں مشکل سے دس فیصد لوگ اس سے بچے ہوں گے۔ پھر آپ یہاں شراب بندی کی مہم کو کس طرح کامیاب کریں گے۔ اس کے بعد ہم عملی تجربہ کے طور پر کئی گاؤں میں گئے۔ وہاں کے لوگوں کو جمع کیا۔ ہم نے پوچھا کہ کیا تمہاری عورتیں شراب پیتی ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ ہم نے کہا کہ پھر تو آبادی کا ۵۰ فیصد یوں ہی اس سے الگ ہو گیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ کیا تمہارے بچے شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، ہم نے کہا کہ ۲۵ فیصد وہ بھی نکل گئے۔ اس کے بعد ہم نے پوچھا کہ تمہارے بڑے کیا سب کے سب شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب نہیں۔ ان میں سے کچھ پیتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ان میں سے ایک تعداد کو الگ کر لو۔ اس طرح جب دیکھو گے

تو معلوم ہو گا کہ معاملہ الٹا ہے۔ یعنی ۹۰ فیصد لوگ شراب نہیں پیتے۔ صرف ۱۰ فیصد لوگ شراب پیتے ہیں۔
انھوں نے کہا کہ یہی اکثر معاملات میں ہوتا ہے۔ لوگ افواہوں کی بنیاد پر رائے قائم کر لیتے ہیں۔ تحقیق کر کے جاننے کی کوشش نہیں کرتے، حالانکہ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو اکثر یہ پتہ چلتا ہے کہ اصل حقیقت کچھ تھی اور عوام میں کچھ اور مشہور ہو گئی۔
جسٹس کھنا نے ایک گفتگو کے دوران کہا کہ دور درشن والوں نے مجھ سے پوچھا کہ یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اس کا مخالف ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ اس پر میری پوری فیملی نے مجھ سے اختلاف کیا۔ لڑکا، لڑکی، بہو، سب نے کہا کہ یونیفارم سول کوڈ تو ہونا ہی چاہئے۔
میں نے جسٹس کھنہ سے پوچھا کہ آپ نظریاتی بنیاد پر یونیفارم سول کوڈ کے مخالف ہیں یا عملی بنیاد پر۔ انھوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بجائے خود تو اچھی چیز ہے مگر اس کے لئے قانون جب بننا چاہئے جب کہ مسلمان بھی اس سے اتفاق کر لیں۔ گویا کہ جسٹس کھنا بھی اصولی طور پر وہی رائے رکھتے تھے جو ان کے گھر والوں کی رائے تھی۔
دہلی میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نے مجھ سے کہا کہ یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ کی نزاکت یہ ہے کہ ۹۹ فیصد ہندو اس کے حامی ہیں اور دوسری طرف ۹۹ فیصد مسلمان اس کے خلاف ہیں۔ میں نے سوچا کہ ایسی حالت میں یونیفارم سول کوڈ کے خلاف مسلمانوں کا محض شور وغل کرنا اور اس کو شریعت کے خلاف بتانا کافی نہیں۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ اس تصور کو عقلی دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کیا جائے۔ کیوں کہ گورنمنٹ اگر قانون نہ بنائے تب بھی اصل مسئلہ شدید تر صورت میں باقی رہے گا، اور وہ باہمی نفرت ہے۔
جسٹس کھنہ انتہائی بے تعصب اور دیانت دار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک فیصلہ میں مسز اندرا گاندھی کو ناخوش کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نہ بن سکے۔ ورنہ وہ چیف جسٹس آف انڈیا کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔
انھوں نے اپنے بہت سے قصے بتائے۔ انھوں نے کہا کہ آنجہانی جے آر ڈی ٹاٹا ایک بار ان کے یہاں آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنی

حالت بتاتے ہوئے کہا: میں مولیہ تو کھاچکا، اب بیاج پر رہ رہا ہوں۔

یہ اس انسان کی بات ہے جو موجودہ زندگی ہی کو آخری زندگی سمجھتا ہو۔ لیکن جو آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ موجودہ زندگی کے بعد ایک اہم تر زندگی آنے والی ہے، اس کا تاثر اس سے مختلف ہوگا۔

جسٹس کھنا نے بتایا کہ انھیں اردو شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ لاہور میں انھوں نے اردو پڑھی تھی۔ اقبال اور غالب کا کلام وہ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اردو شاعروں میں سب سے زیادہ کون آپ کو پسند ہے۔ انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ اقبال کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری حکومت کی نالائقی ہے کہ اس نے اقبال جیسے شاعر کی قدر نہیں کی۔ ۱۹۷۸ میں جب پاکستان میں اقبال کی جنم صدی منائی گئی تو اس سے بھی شاندار طور پر اس کو ہمارے یہاں منایا جانا چاہئے تھا، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ اس کے بعد انھوں نے بڑے شوق کے ساتھ اقبال کے کئی شعر سنائے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں اقبال کے خلاف تعصب اس لئے ہے کہ انھوں نے ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ مگر جسٹس کھنا نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ملک کے بٹوارہ کی ذمہ داری صرف کانگرس لیڈرشپ پر ڈالتا ہوں۔

انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے انھوں نے ایل کے آڈوانی سے کہا تھا کہ دیکھو آڈوانی، اجودھیا میں ایسا کام مت کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو اس دیش میں رہتے ہوئے شرم آئے۔ پھر جب بابری مسجد ڈھادی گئی تو دوبارہ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جسٹس کھنا نے مسٹر آڈوانی سے کہا کہ تم کو اجودھیا نہیں جانا چاہئے تھا اور نہ یہ کام کرنا چاہئے تھا۔ آڈوانی نے کہا: کھنا جی، اب تو جو ہوگیا ہوگیا۔ اب آگے کی بات کیجئے۔

یہ ایک سیاست داں کی طرف سے اپنی زبان میں غلطی کا اعتراف تھا۔ ۶ دسمبر کے بعد مسلم دانشوروں اور مسلم لیڈروں کو چاہئے تھا کہ حالات کا مطالعہ کرکے وہ اس حقیقت کو جان لیتے۔ اگر وہ بروقت اس حقیقت کو جانتے تو وہ سمجھ لیتے کہ بابری مسجد کا انہدام دراصل اس تخریبی عمل کے اوپر فل اسٹاپ ہے۔ مگر اپنی بے خبری کی وجہ سے انھوں نے اس کو کاما سمجھ لیا۔ تمام

مسلم لیڈروں اور تمام مسلم دانشوروں نے انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کہہ کر مسلمانوں کو ڈرانا شروع کیا کہ یہ آغاز ہے، اور اب یہ انتہا پسند عناصر اپنی فہرست کے مطابق تین سو یا تین ہزار مسجدوں کو ڈھانے کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں۔

تاہم حالات کے رخ نے اب خود ہی بتا دیا ہے کہ ۶ دسمبر اس تخریبی عمل کا اختتام تھا، وہ اس کا آغاز نہ تھا۔ اور یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو راقم الحروف نے بابری مسجد کے حادثہ کے فوراً بعد ان الفاظ میں لکھا تھا کہ: انتقام اپنی آخری حد پر پہنچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ غصہ جب اپنی آخری کارروائی کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ اعتراف میں ڈھل جاتا ہے۔ حیوانیت اپنا آخری روپ دکھانے کے بعد انسانیت کی طرف لوٹ آتی ہے۔ (الرسالہ، جنوری ۱۹۹۳، صفحہ ۴)

۲۱ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد دوبارہ ہم لوگ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلے۔ خاص طور پر یہاں کا کیتھڈرل دیکھا۔ وہ ہیبت ناک حد تک بڑا ہے۔ سفید اور کالے ماربل کو ملا کر وہ چودھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو اس کے وسیع ہال اور اس کی انتہائی اونچی چھت کے نیچے انسانوں کے قافلے بالشتیے کی مانند نظر آتے تھے۔

باہر نکلے تو اچانک ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ پاکستان کے مسٹر اسد صادق (پی آئی اے) تھے جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بطور سیاح یہاں آئے تھے۔ وہ کراچی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کس سلسلہ میں آئے۔ جسٹس کھنا نے کہا کہ پیس کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ وہ فوراً بولے: کتنا اچھا ہو کہ ہمارے دونوں ملک بھی آپس میں اس طرح کی پیس کانفرنس کریں۔ ان کی اہلیہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں میں دیکھ رہی ہوں کہ یورپ کے ملکوں کے لڑکے اور لڑکیاں آزادانہ طور پر گھوم رہے ہیں۔ کاش اسی طرح ہندستان اور پاکستان کے بچے بھی دونوں ملکوں میں آنے اور جانے لگیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات اتنی سادہ نہیں۔ اس کا تعلق فہم و تدبر سے ہے۔ یورپ کے لوگ اس راز کو جانتے ہیں کہ شکایتیں اور اختلافات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے انھوں نے یہ طے کیا کہ شکایتوں کو الگ رکھتے ہوئے میل جول قائم رکھو۔ اس کے برعکس آپ کے لیڈر یہ کہتے

ہیں کہ پہلے اختلاف اور شکایت کو ختم کرو، اس کے بعد ہم میل جول کی فضا قائم کریں گے۔ حالانکہ اختلاف زندگی کا لازمی حصہ ہے، وہ کبھی ختم ہونے والا ہی نہیں۔

روانگی سے ایک دن پہلے ۱۹ اکتوبر کی شام کو جے پور کے سردار موہندر سنگھ (Tel. 650715) دہلی میں مجھ سے ملے تھے۔ وہ بھی لاہور میں پیدا ہوئے اور وہاں انھوں نے اردو پڑھی۔ وہ راقم الحروف کے مضامین اکثر پڑھتے رہتے ہیں اور بہت زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُس وقت ہندو اور مسلمان ایک ہو کر رہتے تھے۔ میری ماں کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا۔ میرے محلہ میں ایک مسلم خاتون تھیں۔ وہ مجھ کو اپنے بیٹے کی طرح مانتی تھیں۔ ماں کے انتقال کے بعد میں ان کے گھر گیا تو وہ اپنے چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ مجھ کو دیکھ کر انھوں نے کہا: آؤ بیٹا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے اپنی گود میں لے لیا۔ ان کا بچہ ایک ٹانگ پر بیٹھ گیا اور میں دوسری ٹانگ پر۔ اس کے بعد انھوں نے دو لڈو منگائے۔ ایک انھوں نے مجھ کو دیا اور دوسرا اپنے بیٹے کو۔ یہ قصہ بتاتے ہوئے سردار جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس طرح کے واقعات لوگ اکثر بتاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب ہندو اور مسلمان میں اتنا میل ملاپ تھا تو آخر ملک کا بٹوارہ کیسے ہوا۔ میرے نزدیک اس کی ذمہ داری عوام پر نہیں بلکہ صرف لیڈروں پر ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے نہایت مل جل کر رہ رہے تھے۔ مگر لیڈروں نے نفرت کی باتیں کرکے دونوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ دیا۔ مثلاً جناح اور نہرو میں انا کا ٹکراؤ (ego clash) ہوا۔ مسٹر جناح اس کا بدلہ جواہر لال نہرو سے لے سکتے تھے۔ مگر مسٹر جناح نے اس کو پوری قوم کا مسئلہ بنا دیا۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تقسیم کے نظریہ کی خاموش حمایت کی۔ اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر ایک بشپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایتھوپیا سے آئے تھے۔ میں نے ایتھوپیا اور اریٹیریا کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ چند لوگوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے یہ تقسیم کی ہے۔ ورنہ وہ دونوں ایک ہی ملک تھے۔ میں نے دونوں کے اقتصادی حالات کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ اریٹیریا تو بہت چھوٹا ہے اور نہایت غریب بھی ہے۔

ایتھوپیا ہر لحاظ سے مقابلۃً زیادہ خوش حال اور ترقی یافتہ ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص اس کو ایک "متعصب مسیحی" کا تبصرہ کہے۔ مگر میں اس کو بالکل درست سمجھتا ہوں۔ آجکل اکثر ملکوں میں علیحدہ مسلم خطہ بنانے کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کئی مقامات پر اس نے تشدد کی صورت اختیار کرلی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اپنا ایک "اریٹیریا" بنانے کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ان علاقوں کے لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ پورے ملک کو اپنا میدان عمل بنائیں۔ موجودہ سمٹاؤ کی پالیسی ناقابل فہم حد تک بے معنی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ نسل اندھی تقلید کی حد تک اقبال کی پرستار ہے۔ مگر یہ سب کے سب لوگ عملی طور پر اقبال کے اس شعر کا مصداق بن رہے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

ناشتہ کی میز پر جسٹس کھنا بھی تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ جیسے سنجیدہ لوگ ہندستان میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ آپ لوگ مل کر تعمیر ہند کا کوئی ابھیان کیوں نہیں چلاتے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کچھ لوگوں نے اس قسم کی کوشش شروع کی تھی۔ مگر میڈیا ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ ہماری تعمیری باتیں بڑے اخباروں کے نزدیک قابل اشاعت نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو اخبار بیچنا ہے۔ ایک اخبار والے نے کہا کہ آپ لوگوں کی بات ہمارے نزدیک خبر (news) نہیں وہ تو صرف ایک فرسودہ چیز (Platitude) ہے۔

ایک صاحب نے ایک فلسطینی ادارہ کا چھپا ہوا ایک پمفلٹ دیا۔ اس کا ایک حصہ بوسنیا کے علی عزت بیگووچ کے بارہ میں تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا:

علی عزت بیگووچ ۱۹۲۵ میں پیدا ہوئے۔ سراجیو یونیورسٹی سے اولاً انھوں نے سوشل سائنس میں اور پھر قانون میں ڈگری حاصل کی۔ نوجوانی ہی کی عمر میں وہ بوسنیا ہرزے گووینا کی ایک اسلامی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس جماعت کی تاسیس بوسنیا کے دو نوجوانوں نے کی تھی جن کے نام محمد خارنبج اور رقاسم دوبراجا ہیں۔ یہ دونوں قاہرہ کی جامعہ ازہر کی فیکلٹی آف شریعۃ سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ قاہرہ کے زمانہ قیام میں وہ الاخوان المسلمون سے متاثر

ہوئے۔ چنانچہ واپسی کے بعد انھوں نے اخوانی فکر کو بوسنیا میں پھیلانا شروع کیا۔ یہ جماعت علی عزت بیگووچ اور اشرف تسار مبارا کی قیادت میں یہاں کے مسلمانوں میں انقلابی بیداری لانے کے لئے کام کرنے لگی۔ اس تحریک کا عربی نام حرکۃ الشبان المسلمین تھا۔

علی عزت بیگووچ نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مثلاً اسلام مشرق اور مغرب کے درمیان، عصر حاضر میں اسلامی مشکلات، اسلامی اعلان۔ وغیرہ۔ آخری کتاب کے "باغیانہ" مضامین کی وجہ سے ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۹ تک وہ جنرل ٹیٹو کی حکومت کے تحت جیل میں رہے۔ ایک بار مصر کے صدر جمال عبد الناصر کی ملاقات جنرل ٹیٹو سے ہوئی۔ اس ملاقات میں جنرل ٹیٹو نے صدر ناصر سے کہا تھا کہ علی عزت بیگووچ کی تحریک ان کے لئے الاخوان المسلمون ہی کی طرح خطرناک ہے۔ کیوں کہ اس کا نظریہ حکومت پر قبضہ کرنا ہے۔

علی عزت بیگووچ نے بوسنیا میں "جمہوری عمل پارٹی" بنائی۔ پارٹی کا بظاہر سیکولر نام انھوں نے اس لئے رکھا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسا نام رکھیں جس سے یورپ یا مغربی قوتوں کو یہ محسوس ہو کہ عین مشرقی یورپ کے بیچ میں ایک نئی اسلامی حکومت قائم ہونے جا رہی ہے۔ الیکشن میں علی عزت کی پارٹی کو اتنے زیادہ ووٹ نہیں ملے کہ وہ قطعی اکثریت حاصل کر لیتی۔ تاہم اس نے کثیر جماعتی حکومت میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ علی عزت بیگووچ ملک کے صدر منتخب ہو گئے۔

صدر علی عزت کے دور اقتدار میں بوسنیا میں اسلامی تاریخ کے احیاء کی بہت سی کوششیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے اذان اور دیگر علمی اور قرآنی محافل پر مبنی پروگرام نشر کئے جانے لگے۔ علی عزت کے دور حکومت میں پہلی بار صدارتی میٹنگ کو ایک گھنٹے کے لئے موخر کر کے نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اس واقعے پر سرب اور کروات نے اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔"

اس رپورٹ کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ بوسنیا کے مسلم لیڈروں کے لیے جب یہ موقع تھا کہ وہاں کے جمہوری نظام میں الکشن کے ذریعہ وہ صدر کے عہدہ تک پہنچ سکتے تھے تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ بوسنیا کو آزاد مسلم ریاست بنانے کا اعلان کر دیں اور اس کے نتیجہ میں وہاں کے غیر مسلم عوام اور فوج سے وہ لڑائی چھڑے جو بوسنیا کے مسلمانوں کو بالکل تباہ و برباد کر دے۔ ایسے ہی نادانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ جو آدھے پر راضی نہیں ہوتا اس کو پورا کھونا پڑتا ہے۔

۱- میڈیا اسٹار (دہلی) کے نمایندہ نے ۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق پاکستان میں ہونے والے بھیانک شیعہ سنّی فساد سے تھا۔
ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پر امن زندگی حاصل کرنے کا راز یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنا علاحدہ ملک بنوائیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ مسلمان دوسروں کے ساتھ صلح و آشتی اور صبر و تحمل کے ساتھ رہنا سیکھیں۔

۲- آل انڈیا ریڈیو کے نمایندہ مسٹر آر پی سری دھر نے ۱۸ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ ملک میں اخلاقی بگاڑ کیوں آیا ہے اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پہلے سماج کے بڑے لوگ اخلاقی رول ماڈل کا کام کرتے تھے۔ آزادی کے بعد یہ ماحول ختم ہو گیا۔ یہی خلاء اخلاقی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب ہے۔

۳- ویکلی اکھشر Akhshar کی نمایندہ مسز برکھا اروڑا نے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کم عمر میں لڑکیوں کی شادی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس طرح کے معاملات میں سماجی شعور ضروری ہوتا ہے۔ سماجی شعور پیدا کرنے سے پہلے قانون بنانا ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا۔

۴- ویکلی آوٹ لک (نئی دہلی) کی نمایندہ مسز ساگریکا گھوش (اسپشل کرسپانڈنٹ) نے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر لبرل مسلمان اور کنزرویٹو مسلمان کے مسئلہ سے تھا۔ اپنی ذات کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ میں ایک کٹر مسلمان ہوں — معروف معنوں میں میں لبرل مسلمان نہیں ہوں۔ اسلام اپنے پیرؤوں کو نفرت اور تشدد نہیں سکھاتا۔ اگر کچھ مسلمان نفرت اور تشدد کا طریقہ اختیار کریں تو یہ ان مسلمانوں کا فعل ہوگا نہ کہ اسلام کی تعلیم۔

۵- ہندستان ٹائمس کے نمایندہ مسٹر سدھیر پانڈے نے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

۱۱- ایک اسلامی ادارہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے امریکہ کا سفر کیا۔ یہ سفر تقریباً ایک مہینہ (اگست۔ستمبر ۱۹۹۶) جاری رہا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲- ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو ڈاکٹر اجے ساہنی سی ایف ٹی وی کی ٹیم کے ساتھ مرکز آئے۔ اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مذہب اور سیاست کے مسئلہ سے تھا ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی سیاست نے دنیا کو تباہی کا تحفہ دیا ہے۔ مگر اس کا سبب خود مذہب نہیں ہے۔ اس کا سبب وہ لوگ ہیں جو حقیقتہً مذہبی نہ تھے اور انھوں نے مذہب کو اکسپلائٹ کرنے کے لیے مذہب کا نام لیا

۱۳- سوسائٹی آف سرونٹس آف گاڈ (جانکیہ پوری، نئی دہلی) کے تحت ۲۵ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ورلڈ ریلیجنز پریر میٹنگ۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو وہاں اسلام پر ایک ٹاک دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق انھوں نے اس مشترک اجتماع میں اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی

۱۴- گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲۸ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک درس دیا۔ ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا کہ دین میں بلاشبہ مکمل اطاعت مطلوب ہے۔ مگر یہ مکمل اطاعت افراد یا جماعت کے اپنے حالات کے اعتبار سے ہے نہ کہ شرعی احکام کی تفصیلی فہرست کے اعتبار سے۔ یعنی ہم بقدر فہرست پیروی کے مکلف نہیں ہیں بلکہ اپنے دائرہ اختیار کے اعتبار سے مکلف ہیں۔

۱۵- پرفکٹ ہیلتھ میلہ (سنجے لیک پارک، نئی دہلی) میں ۴ اکتوبر ۱۹۹۶ کو نماز جمعہ کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے "نماز کیا ہے" کے موضوع پر تقریر کی۔ اور آخر میں سوالات کے جواب دیے۔

گستاخی کرنے والے کے لیے کیا مسئلہ ہے۔اس سلسلہ میں سعودی عرب کے عالم کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۶- سنت کرپال روحانی مشن کے تحت ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک بڑا جلسہ ہوا۔اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں تقریر کی۔اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا خدا کا باغ ہے۔آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کو باغ کی نظر سے دیکھے اور اس کے ہر پیڑ اور ہر پودے سے محبت کرے۔

۷- ہندستان ٹائمس کے نمایندہ مسٹر سدھیر شرما نے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔یہ انٹرویو جامعہ کے پرو وائس چانسلر کو سلمان رشدی کا حامی بتا کر ان کے خلاف چلنے والے ایجی ٹیشن کے بارہ میں تھا۔ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس قسم کا تخریبی مزاج دینی مدرسوں میں بنایا جاتا ہے۔اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ یہ مزاج اگر مدرسوں میں بنایا جاتا تو اس قسم کے ہنگامے سب سے پہلے مدرسہ میں نظر آتے۔حالاں کہ کسی بھی مدرسہ میں ایسا نہیں ہوا۔

۸- جرمنی (فرینکفرٹ) کے سفید فام اسکالرس کی ایک ٹیم ۲۳ ستمبر ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز میں آئی یہ نو افراد تھے۔اس ٹیم کی لیڈر ایک سینیر خاتون (Thea Mohn) تھیں۔اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کو برحق آپ کیوں مانتے ہیں۔کیا کسی استاد نے آپ کو ایسا یقین دلایا ہے۔صدر اسلامی مرکز نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسلام میری ڈسکوری ہے۔

۹- آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔اس کا عنوان تھا: قرآن کا رول انسانیت کی تاریخ میں۔

۱۰- امریکہ کی یونی ورسٹی آف ساوتھ کیرولینا کے پروفیسر ڈاکٹر رابرٹ ورسنگ (Dr Robert Wirsing) نے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔یہ انٹرویو پروفیسر کی ایک زیر ترتیب کتاب کے سلسلہ میں تھا۔بابری مسجد کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا:

Babri Masjid was demolished not by Mr Hindu; it was demolished by Mr Ego. And it was Muslim leadership which turned Mr Hindu into Mr Ego.

اُردو

Title	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہور اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
طلاق اسلام میں	3/-

Title	Rs
تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	8/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

Title	Rs
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	7 /-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	3/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ھندی

Title	Rs
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتک واد اور اسلام	7 /-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

Title	Rs
God Arises	95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad, The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	7/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam, The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Presenting the Qur'an	165/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
Treasury of the Qur'an	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-

آڈیو کیسٹ

- حقیقتِ ایمان
- حقیقتِ نماز
- حقیقتِ روزہ
- حقیقتِ زکوٰۃ
- حقیقتِ حج
- سنتِ رسولؐ
- میدانِ عمل
- رسول اللہؐ کا طریق کار
- اسلامی دعوت کے
- جدید امکانات
- اسلامی اخلاق
- اتحادِ ملت
- تعمیر ملت
- نصیحتِ لقمان

AL-RISALA BOOK CENTRE

Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔
اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

MUHAMMAD

GOD
ARISES

ISLAM
ZAMAN

RELIGION
and
SCIENCE

اللہ اکبر

دین کامل

MUHAMMAD
The Ideal Character

حكمة الدين

THE
TEACHINGS
OF ISLAM